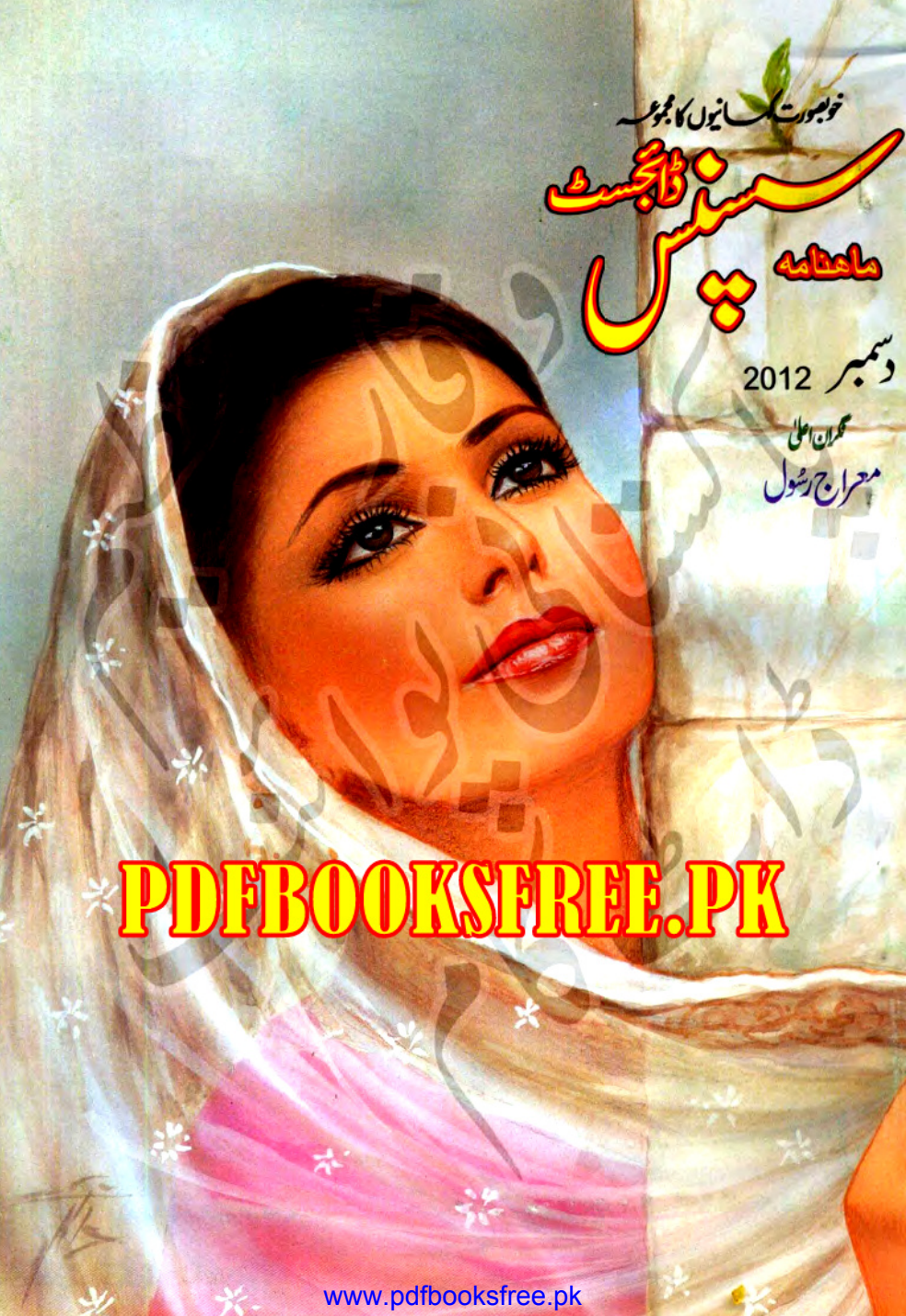

PDFBOOKSFREE.PK

www.pdfbooksfree.pk

سسپنس ڈائجسٹ
مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

11 انشائیہ
جون ایلیا
غم حالات پر ایک صاحب دل کا نوحہ الم

12 آپ کے خط
مدیر اعلیٰ
سسپنس کی مجلس مشاورت قارئین کی تلخ و شیریں باتیں، گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

20 بت شکن
ڈاکٹر ساجد امجد
ماضی کا آئینہ با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

63 منتقم مزاج
کاشف زبیر
آستین میں چھپے سانپوں کی بدلتی کروٹوں کا احوال

80 کشکول
انوار صدیقی
اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد طویل سلسلہ

109 بلی کی چوری
اقبال کاظمی
اصول پسندی کو حقیقت پسندی کے قالب میں ڈھالنے والے نک ویلوٹ کا ایک اور کارنامہ

124 پہاڑ او جھل
ملک صفدر حیات
زندگی کے نازک دوراہے پر مجرم کو محرم بنانے والے پولیس انسپکٹر کی فرض شناسی

149 خوئے نہاں
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
وڈیرا شاہی نظام کا ایک لرزہ خیز منظر

158 محفل شعر و سخن
قارئین
آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

161 گوشۂ عافیت
تنویر ریاض
کبوتر کے مانند آنکھ بند کر کے مشکلات سے فرار حاصل کرنے والوں کا قصہ

168 مسافر
ناصر ملک
گل و گلزار سے راہ پرخار تک ایک مسافر بے نوا کی روداد حیات

211 پیش عقل
مریم کے خان
ایک ایسے مقابلے کی روداد جس سے کتنے ضمیر جھنجھنا اٹھے

215 سرمد شہید
ضیا تسنیم بلگرامی
دنیاوی تجارت کی نفی کرنے والے ایک ولی کی سچی اور کھری باتیں

227 کمائی دمائی
منظر امام
محبت کے دام کھرے کرنے والی ایک معصوم حسینہ کی چالاکیاں

230 چار سمت ایک چوراہا
احمد اقبال
رشتوں کی بگڑتی صورت حال..... جذبات کے بھونچال اور مقدر کی لڑکھڑاتی چالوں کا احوال

000 کترنیں
ادارہ
دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطیفے، چٹکلے اقتباسات، مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کے لیے

جلد 41 • شمارہ 12 دسمبر 2012 • زرسالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

www.pdfbooksfree.pk

کراچی
ماہنامہ
پاکیزہ

دلچسپ ومنفرد زبان وبیان لیے
دسمبر 2012ء کے شمارے کی گرماتی جھلکیاں

عکس...... عمیرہ احمد
عکس در عکس پھیلے سلسلۂ زندگی کے پوشیدہ پہلوؤں کی کھوج وجستجو کا دلکش اختتام

زندگی...... ناہید سلطانہ اختر
زندگی کی تلخ وشیریں حقیقتوں سے روشناس کراتا منفرد ناول

کھیں دیپ جلے کھیں دل...... قیصرہ حیات
زمانے کے سرد وگرم سے نبرد آزما ہوتے کرداروں کی دلکش داستان

مجھے رنگ دے...... شوکت رانا الطاف
راہِ زیست کے پُرپیچ راستوں سے گزرتی حسینہ کا دلفریب احوال

فیصلے کی صلیب...... اسما قادری
اشرف المخلوقات ہونے کا زعم کچھ ایسے ہی حالات پیدا کرتا ہے

وہ آئے بزم میں...... نزہت اصغر
''سوائے دعاؤں کے قارئین کی محبتوں کا کوئی صلہ نہیں دیا جاسکتا'' نامور وہردلعزیز مصنفہ رفعت سراج سے پُرکیف گفتگو

اس کے علاوہ

شیریں حیدر، صائمہ اکرم، عقیلہ حق، رضوانہ پرنس ودیگر مصنفات کی منفرد کاوشیں مستقل سلسلوں کا خوب صورت امتزاج لیے سرما کے دنوں کو گرماتا خصوصی شمارہ صرف آپ کے لیے

انشائیہ

ایک آرزو

جون ایلیا

میں گلہ کرتا ہوں، میں لہو میں لتھڑا ہوا گلہ کرتا ہوں۔ زندگی اس شہر میں بُری طرح بے حرمت ہوئی ہے۔ خوں ریزی کے اُن جانے ہنرمندوں نے اس شہر کی زندگی کو بڑی سفاکی سے لتاڑا ہے اور اس شہر کا حلیہ بگاڑا ہے اور اس کی راہوں اور اس کے چوراہوں کو بڑی شقاوت سے اجاڑا ہے۔

''جون ایلیا! یہ بات تو تم نے پرسوں بھی کہی تھی اور کل بھی۔''

''ہاں، یہ بات میں نے پرسوں بھی کہی تھی اور کل بھی۔ اور یہ بات میں آج بھی کہہ رہا ہوں، کل بھی کہوں گا، پرسوں بھی کہوں گا اور کہتا ہی رہوں گا اس لیے کہ جو کچھ تھا، وہ ہے اور جو کچھ ہوتا رہا ہے وہ ہوئے جا رہا ہے۔ مجھے اس شہر کے شہریوں کے دکھ جھیلنے کی نوکری ملی ہے۔ اگر اس نوکری سے میرا دل اچاٹ ہوگا تو میں اپنے آپ کو حرام خور سمجھوں گا۔ یہ نوکری پاکستان اور ہندوستان کی تاریخ نے مجھے بڑی بڑی سفارشوں کے بعد دی ہے۔

''ہاں، میں اس شہر کے وجود کے سڑے ہوئے زخموں کا، پھپھوندے ہوئے پھوڑوں کا نوکر ہوں، چاکر ہوں۔ اور یہ نوکری، یہ چاکری میرے لیے بڑی عزت کی نوکری اور بڑے فخر کی چاکری ہے کہ اس کی کوئی تنخواہ نہیں ہے۔ کیا میں زخموں سے، اپنے ہی زخموں سے تنخواہ لوں گا؟ کیا میں پھوڑوں سے، اپنے ہی پھوڑوں سے روزینہ طلب کروں گا؟''

''تم جو ہو یعنی تم! تم بھی عجب ہو اور تمہارا روگ بھی عجب ہے۔''

''ہاں، میں بھی عجب کوئی ہوں اور میرا روگ بھی عجب کچھ ہے۔ مجھے اپنے اس روگ کی پہچان نے دل اور دماغ کی جو صحت بخشی ہے، وہ میری روح کا بہت ہی بڑا ابتلا ہے۔ میں اپنی روح کے اس ابتلا سے کسی طرح بھی نجات نہیں پا سکتا۔''

''تم اپنی روح کے اس ابتلا سے کسی طرح بھی نجات نہیں پا سکتے! آخر ایسا کیوں ہے؟''

''ایسا یوں ہے کہ یہ ابتلا میرا، میرا ہی نہیں ہمارا مقسوم ہے۔ یا یوں کہہ لو کہ یہی میری بود و نبود ہے۔ ہماری بود و نبود ہے۔

''لوگو! کیا تم نہیں جانتے، کیا تم میری یہ بات نہیں مانتے کہ میں تم میں ایک عمر سے بڑی اذیت ناکی کے ساتھ تڑپایا گیا ہوں۔ پر کسی کے نہ جاننے اور نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے اور ایسا تو ہونا ہی تھا۔ مجھے تو اپنے لہو سے اپنے زخموں کو دھونا ہی تھا۔ پر میں ہوں کون؟ یعنی یہ کہ میں ہوں کون، میں کوئی بھی تو نہیں ہوں۔ یعنی یہ کہ تم، یعنی یہ کہ میں۔ ہاں، میں اور تم!

''میں اپنے آپ پر اور اس شہر کے شہرۂ آفاق شہریوں پر صبح سے شام تک اتنی بار ہنستا ہوں، اتنی بار ہنستا ہوں اور اتنی بار روتا ہوں، اتنی بار روتا ہوں کہ بس۔ کیا ہماری سرنوشت ایسی نہیں ہے کہ اس پر بار بار ہنسا اور بار بار رویا جائے؟''

''ہاں، تمہاری سرنوشت ایسی ہی ہے کہ اس پر بار بار ہنسا اور بار بار رویا جائے۔''

ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ میں اپنے ہونے کا ایسا بھگتان بھلا کس گروہ نے بھگتا ہوگا جیسا بھگتان تم نے بھگتا۔ مجھے تمہارا ہونا، ہر لحہ ہونا بہت ہی اولوا اولو لگتا ہے، بہت ہی اولوا اولو کہ ہو اور ہرگز نہیں ہو۔

کھڑکی کے باہر رات بلا کی اندھیری ہے۔ جانے اس وقت کیا بجا ہوگا! وقفے وقفے سے گولیاں چلنے کی آوازیں آرہی ہیں۔ ہم ان آوازوں کو اپنے وجود کا لحن کیوں نہ جانیں۔ اپنی نمود کا آہنگ کیوں نہ گردانیں؟ اے گروہ! اگر تیری تہذیب کے سب سے بڑے نواگر امیر خسرو اس لحن اور اس آہنگ کو سنتے تو کتنے چاؤ سے سر دھنتے!

''اس شہر کا چارہ گر کون ہے اور تیاردار کون؟''

''اس شہر کا چارہ گر کون ہے اور تیاردار کون...... یہی تو کہا تھا تو نے؟''

''ہاں، میں نے یہی کہا اور اپنی اس کہن کو سہا۔''

اس شہر کا کوئی چارہ گر نہیں ہے، کوئی تیاردار نہیں ہے۔ دوسرے شہر اس شہر کی حالت پر بس ترس ہی کھا سکتے ہیں اور اس کے سوا بھلا وہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟ سو وہ ترس کھا رہے ہیں۔ اے ترس کھانے والو! میں تم سے اس شہر کی حالت پر بہت زیادہ ترس کھانے کی بھیک مانگتا ہوں۔ یہ شہر اپنے ہونے کے جس عذاب میں مبتلا ہے، اس کا اندازہ لگانا آسان نہیں ہے۔ پر اس کا اندازہ لگانا اس ملک کی ہر بستی اور ہر شہر کا فرض ہے۔ یہ شہروں کا شہر ہے۔ یہ کسی ایک زبان بولنے والے گروہ کا شہر نہیں ہے۔ یہ تو برادریوں کی برادری کا شہر ہے۔

''اے شہر! یرمیاہ نبی نے یروشلم کا مرثیہ کہا تھا۔ میرا سینہ بھی دکھ سے بری طرح بھرا ہوا ہے۔ میرے پپوٹے بھی سوج گئے ہیں۔ تیری راتیں مجھے بڑی بے رحمی سے جگاتی ہیں۔ تیرے دن مجھے جان لیوا اذیت سے ہلکان رکھتے ہیں۔ تیری گلیاں، تیرے راستے اور تیرے چوک میرے خون سے لتھڑے ہوئے ہیں۔ میرا خون میں نہایا ہوا بدن جگہ جگہ پڑا ہوا تڑپ رہا ہے، میں جگہ جگہ دم توڑ رہا ہوں۔ آخر میں اپنی لاشیں کہاں کہاں سے اٹھاؤں؟

''میں تجھے... تازہ دم دیکھنا چاہتا ہوں۔ تجھے ایک نئے انداز کی زندگی سے آراستہ دیکھنے کی آرزو رکھتا ہوں۔ مجھے ایک بات کہنی ہے۔ میری اس بات کو دھیان دے کے سننا اور وہ یہ کہ زندگی ایک طور کا نام ہے۔ نفس کے ایک طور کا نام ہے۔ تو بہت ہارا مارا ہے پر دیکھنا نفس کے اس طور کو کبھی نہ ہارنا۔'' ★

www.pdfbooksfree.pk

آپ کے خط

عزیز قارئین!

تسلیمات!

دسمبر 2012......الوداع کہتے ہوئے سال کا آخری شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے......دسمبر کا مہینا تاریخ عالم اور تاریخ پاکستان میں اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس ماہ کی 25 تاریخ دو اہم شخصیات کی پیدائش کے حوالے سے نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ پہلے تو اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح......تمام عیسائی برادری کو کرسمس کی مبارکباد۔ عیسوی کیلنڈر کے اس آخری ماہ سے پہلے ہی ہمارا اسلامی ہجری کیلنڈر کا نیا سال شروع ہو چکا ہوگا۔ جس کا پہلا مہینا ''محرم الحرام'' نہایت محترم مہینا ہے۔ جب کرب و بلا کے میدان میں حق و باطل کا عظیم معرکہ رونما ہوا اور عزم و ہمت اور تسلیم و رضا کی لازوال داستان رقم ہوئی...... پچھلے دنوں لاہور میں منعقدہ پنجاب یوتھ فیسٹیول کے موقع پر پاکستانی نوجوانوں نے تین اجتماعی جبکہ 8 انفرادی عالمی ریکارڈز گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے نمائندوں کی موجودگی میں قائم کیے۔ سب سے پہلے تو نیشنل ہاکی اسٹیڈیم میں بیالیس ہزار آٹھ سو تیرہ نوجوانوں نے ایک ساتھ قومی ترانہ پڑھ کر عالمی ریکارڈ قائم کیا، اس سے قبل قومی ترانے کا ریکارڈ بھارت کے پاس تھا جبکہ آخری مرحلے میں چوبیس ہزار 2 سو نوجوانوں نے دنیا کا سب سے بڑا قومی پرچم بنایا جبکہ پرچم کا ریکارڈ ہانگ کانگ کے پاس تھا۔ اس کے علاوہ انفرادی کامیابی حاصل کی ایک 12 سالہ بچی مہک گل نے، صرف 45 سیکنڈ میں شطرنج کی بساط بچھا کر...... ریکارڈ قائم کر کے۔ گویا جاتے ہوئے سال سے جہاں کچھ افسردہ لمحات جڑے ہیں وہاں کچھ خوشگوار یادیں بھی وابستہ ہیں......اور جناب اس کے ساتھ ہی چلتے ہیں اپنے نٹ کھٹ دوستوں کی جانب جو کچھ کھٹی میٹھی باتیں لیے بیٹھے ہیں۔

✠ **قیصر اقبال کلول**، ضلع بھکر سے تبصرہ کر رہے ہیں ''میرا پہلا خط ہے، امید ہے کہ خوش آمدید ضرور کہا جائے گا (خوش آمدید......خوش آمدید) سرورق کی حسینہ کو دیکھا تو اسے کچھ پریشان سا پایا۔ سوچوں میں غرق پتا نہیں کہاں کھوئی ہوئی تھی۔ سو اسے اس کے حال پر چھوڑا اور سیدھی انٹری ماری انشائیہ میں۔ جون ایلیا کا پُرمغز انشائیہ دل کو لگا اور پھر ہم اگلی انٹری خطوط کی محفل میں مار چکے تھے جہاں صنف وجاہت اور صنف نازک کے درمیان سنسنی خیز میچ کا آغاز ہو چکا تھا۔ دو سینئر کپتان اپنی اپنی ٹیم کی قیادت سنبھالے ہوئے تھے۔ صنف وجاہت کی کپتانی تفسیر عباس بابر کے ہاتھ میں تھی تو صنف نازک کی قیادت ماہا ایمان کے ہاتھ میں تھی۔ قیادت ماہا ایمان کے ہاتھ میں ہونے سے امید کی جا رہی تھی کہ کانٹے کا مقابلہ ہوگا لیکن یہ مقابلہ یکطرفہ رہا اور اکیس گول (خطوط) میں سے چودہ گول (خطوط) صنف وجاہت نے داغے اور صنف نازک صرف سات گول (خطوط) داغ سکی اور یوں ماہا ایمان کی ٹیم سات کے مقابلے میں چودہ گول (خطوط) کے بڑے مارجن سے ہار کر اپنا سا منہ لے کر میدان سے باہر نکلی۔ خطوط کے میچ میں پہلا گول (خط) داغ کر مین آف دی میچ کا ایوارڈ لینے والے شیر علی خان کا جامع تبصرہ پسند آیا، مبارکاں۔ محمد عمار کشف عرف ساحر ناز نے حکیم سلامت پوری سے دماغی کشتے کھا کر ایسا گاڑھا تبصرہ لکھا کہ بندے کا دماغ چکرا جائے، سو اس تبصرے سے فوراً نکل کر بھاگے اور تفسیر عباس بابر کے پہلو میں جا کر پناہ لی، لیکن تفسیر صاحب نے کہا کہ حکیم سلامت پوری کے کشتے صرف محمد عمار کشف نے ہی نہیں کھائے میں بھی اسی کے زیر علاج رہا ہوں۔ اس تبصرے کو چھوڑو، میرا تبصرہ پڑھو، تو ہم آسمان سے گرے، کھجور میں اٹکے کے مصداق تفسیر صاحب کے تبصرے میں اٹک گئے۔ یہاں سے آگے نگاہ کی تو اپنے ہمایوں سعید نظر آئے۔ جنہوں نے جیسے ہی راج گیری چھوڑی، تو ان کے ذہن میں آندھیاں چلنے لگیں۔ ان آندھیوں کو ایسا ہی چلتا چھوڑ کر ہم آگے بڑھ گئے اور عبدالغفور، سارہ، قیصر عباس اور حافظ شاہد عمران سے ہیلو ہائے کرتے ہوئے جا کر رکے محمد جاوید بلوچ کے پاس، لیکن بلوچ صاحب سعدیہ بخاری کی جوئیں گننے میں اتنے غرق تھے کہ ہم انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر چودھری احمد خان سے ہاتھ ملا کر طاہرہ گلزار کے پاس جا رکے۔ مگر موصوفہ کو کسی کے غم میں گھلتا دیکھ کر ہم نے آگے بڑھ کر ہیلو کہا ابرار وارث کو، آگے دیکھا تو ماریہ فاروق اور ساجدہ راجا مسافر کی کسی پچھلی قسط کا رونا رو رہی تھیں۔ سو انہیں تسلی دی۔ ماہا ایمان میدان میں ڈٹ کر کھیل رہی تھیں، سو ہم آگے بڑھ کر ادریس احمد خان، رمضان پاشا اور عباسہ مغل سے سلام دعا کرتے ہوئے محمد قدرت اللہ نیازی حکیم کے پاس جا ٹھہرے اور ان سے ان کی حکمت کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگے میاں صاحب زادے، میں حکیم نہیں ہوں۔ یہ خانیوال میں جگہ کا نام حکیم ٹاؤن ہے اور ہم تو (Natural) نیچرل خان ہیں۔ اس سے پہلے کہ نیچرل (قدرتی) صاحب کچھ اور فرماتے۔ ہم سرپٹ دوڑے اور بلال اصغر کو فقط ہاتھ ہلا کر ہائے کہا اور سیدھا جا کر پناہ لی، محترمہ تصویر العین کے پاس اور تصویر العین کا بھی شکریہ کہ انہوں نے ہمیں یہ کہہ کر آگے جانے سے روکا، اب یہاں سے مت ہلو، آگے سوائے کالی لسٹ کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ سو آگے کوئی جائے پناہ نہ پا کر اسی پناہ کو غنیمت سمجھا۔ تصویر العین صاحبہ، آپ کو ہمارا آپ کے پاس ٹھہرنا برا تو نہیں لگا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے فاتح کو اختتام تک لے کر گئے۔ صلاح الدین ایوبی کے کارنامے پڑھ کر دل سے دعا نکلی کہ یااللہ! آج بھی کوئی صلاح الدین ایوبی پیدا کر دے جو امت مسلمہ کی درست کمانڈ کر سکے، انوکھا ملاپ میں دو محبت کرنے والوں نے اپنا خون پلا کر اپنی محبت کو امر کیا۔ کشکول میں شیخ حامد کے گرد گھیرا تنگ ہوتا جا رہا ہے اور اب تو لیاقت حسین بھی گاؤں سے واپس آ گیا ہے۔ سیاسی محبت میں لیڈی گورڈن آخر میں سرخرو ٹھہری اور لارڈ اسمتھ گورڈن کی وارث ٹھہری۔ دائمی نجات میں مرزا امجد بیگ نے تو فرزانہ کو چھٹکارا دلا دیا تھا لیکن اینڈ میں فرزانہ کا انجام پڑھ کر دکھ ہوا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید جو کیڑی سوکائی میں ایک تلخ حقیقت لے کر آئے۔ اس فرسودہ نظام سے پتا نہیں کب تک جاگیردار اور ہاری کی کہانیاں جنم لیتی رہیں گی۔ ش صغیر ادیب کا بوڑھا درخت ان لوگوں کے لیے مشعل راہ ہے جو محبت میں ناکامی کے بعد اپنے آپ کو بھلا کر جینے کا حوصلہ کھو دیتے ہیں۔ تنویر ریاض کی خطرناک عشق میں یہ جان کر جھٹکا سا لگا کہ روڈی لڑکی نہیں، لڑکا تھا، اچھی کہانی تھی۔ سگ گزیدہ میں نرس کے سوالنامے نے اچھے خاصے بندے کو

پاگل کر دیا۔ مسافر کی یہ قسط بھی بہت زبردست تھی۔ شہریار کے اغوا کے بعد اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ جلتی چھاؤں میں نسیمہ کے درد نے دل کو رلا دیا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے ایمان افروز واقعات پڑھے...... جنہیں پڑھ کر سکون ملا۔ جناب عالی میں جمیل کو رنگ بدلتا دیکھ کر چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ محی الدین نواب کی آخری صفحات پر ممنوعہ پڑھی۔ ممنوعہ ہمارے معاشرے کی تلخ حقیقتوں کو اجاگر کرتی دل میں اترنے والی تحریر تھی۔ محفل شعر و سخن اور چٹکلے بھی زبردست تھے، آخر میں دو باتیں، پہلی تفسیر صاحب سے، عون اور عوف ایک وزن پر دو نام ہیں۔ اگر عوف کے اسپیلنگ (AUF) ہے تو پھر عون کے (AON) کیوں؟'' (دلکش تبصرے کا شکریہ)

✠ **محمد جاوید بلوچ**، تحصیل علی پور سے چلے آ رہے ہیں ''صفحہ اول پر موجود ماہا ایمان کی صورت یہ سوچ سوچ کر، رو رو کر بوسیدہ ہو رہی ہے کہ ان کا اصل اصیل چکن مرغا روز بہ روز کمزور کیوں ہوتا جا رہا ہے؟ عقب میں ہمایوں سعید صبح صادق سے خالی پیٹ، بنا کھائے پیے سعدیہ بخاری کے گھر کے سامنے قربانی کے گوشت کی آس لگائے بیٹھے ہیں اور آج سعدیہ بخاری نے بھی باہر نہ نکلنے کی ٹھان رکھی ہے۔ ماہا ایمان کی ایٹی نائن (نواسی) طاہرہ گلزار ہماری اطلاع کے مطابق ہمایوں سعید کو تو قربانی کے لیے اپنی پسند کی گائے مل گئی ہے۔ آپ کا اشارہ کس طرف ہے؟ آپ خواتین میں کوئی قدر مشترک ہو نہ ہو مگر یہ جگہ جگہ کی خبریں سونگھنے کی قدر ضرور مشترک ہے۔ سب سے زیادہ خوشی محمد ہمایوں سعید کے نام میں مثبت تبدیلی سے ہوئی۔ سارہ فرام کراچی اینڈ عباسہ مغل ویلکم ٹو سسپنس...... سسپنس کلب میں آپ سب نو آموز کا سواگت (سواگت! لگتا ہے کہ آپ بھی ہندوستانی ڈرامے دیکھ دیکھ کر ہندی سیکھ رہے ہیں۔ سواگت کے بجائے اگر آپ استقبال لکھتے تو ہمیں خوشی ہوتی) کیا جاتا ہے بس ذرا ٹھنڈی ہو کے رہنا ورنہ ماہا ایمان اور سعدیہ بخاری کی طرح ہائے کر کے بیٹھو گی اور امی کہہ کے اٹھو گی۔ رمضان پاشا چونکہ چپکے چپکے کوزہ تفسیر عباس سے اڑا لے گئے تھے لہٰذا بہ سبب مجبوری ہمیں لوٹے پر گزارہ کرنا پڑا۔ حافظ شاہد عمران کا تبصرہ حجریہ سازی کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ ماہا ایمان چشم آسمان نے بھی دیکھی ہے نظارے کیسے کیسے، ایک وقت تھا کہ آپ اپنی زبان کی غیر معمولی طوالت کی مدد سے ناک پر بیٹھی ہر مکھی اڑا دیا کرتی تھیں آج نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ ہمایوں کے مسلسل تابڑ توڑ ڈرون حملوں کے کارن دست بستہ جواب......عرض کرنے پر مجبور ہیں۔ رائے قیصر عباس کھرل...... آپ نے تبصرہ تو اچھا کیا...... مگر ماہا ایمان نامی جڑی بوٹی کا اضافہ کر کے اپنی محنت پر آپ نے جھاڑو پھیر دی۔ نیازی صاحب بھینس کالی ہو یا بھوری سعدیہ بخاری سے رجوع کریں۔ مشترکہ چاچو جی نئی نئی آنے والی آنٹیوں کو کہانیوں پر قدرے چھوٹ دی جائے ورنہ معدودے چند کوتاہ کج عقل آنٹیوں کے سب صنف نزاکت کے سر سے سینگوں کی طرح غیاب کا افسردہ عمل جاری و ساری رہے گا۔ تفسیر عباس اگر آپ اور ماہا کے ٹائٹل پر ریمارکس درست مان لیے جائیں تو گویا...... ماہا ایمان نے بائیں ہتھیلی کو شیشہ بنا کر اپنا فیصلہ خود کیا۔ جویریہ نعیم...... مانسہرہ آپ کے نام کے معنی کیا ہیں؟ ادریس احمد خان آپ کی بڑھتی ہوئی توانائی کا جان کر سکھ کی سانس خارج ہوئی یقیناً ملک پاکستان کا لاینحل مسئلہ توانائی آپ کی توانائی کی بدولت حل ہو کے رہے گا۔ خدا خدا کر کے مغلیہ دور کی رذیلی تاریخ سے جان چھوٹی، اسلامی معرکوں پر مشتمل طویل داستان پڑھنے کو ملی کہ دل گارڈن گارڈن ہو گیا۔ طاہر جاوید مغل نے ایک سائنس دان کے پیٹ اور جنس کی بھوک پر کیے گئے تجربے کو قدرے رد و بدل کے بعد سیڑھی بنا کر رقم کی جانے والی تخلیق انوکھا ملاپ اچھی کہانی رقم کی۔ نامحرم عورت اور مرد کا ملاپ جسے دنیا عشق عشق کی گردان کرتے نہیں تھکتی نے کتنے فتنہ و فساد جنم دیے۔ کسی بھی چشم سے پوشیدہ نہیں اس جذبۂ نفس نے ان گنت گھر اور دل خاکستر کیے ان کا شمار تو ناممکن...... مگر ممنوعہ سے اس کے رذیل رذیل نتائج کا جائزہ کما حقہ لگایا جا سکتا ہے۔ دو نامحرم جنسوں کے بیچ تیسرا شیطان ہوتا ہے اور اس تیسرے کو جیسے ہی موقع ملتا ہے اپنا وار کر گزرتا ہے۔ بلاشبہ ناہید اختر سلطانہ کا شمار سسپنس ڈائجسٹ کے ادب کے پرانے خدمت گاروں میں ہوتا ہے محض قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر عہد و پیمان کر کے اگر ازدواجی تعلقات قائم کیے جائیں تو معاشرے میں اخلاقیات کا توازن ڈانواں ڈول ہو جائے پھر ہر تیسری عورت کی گود آفاق کا ناجائز بوجھ اٹھائے ہوگی۔ جو کیری سوکائی دل پر سچ کے تازیانے برسا گئی جس کے اختتام پر آنکھوں کے سامنے روائے دردسی تن گئی۔ انوار صدیقی کا قلم اس بار بھی ہن برساتا رہا، شیخ حامد کی واپسی اسٹوری میں جان ڈال گئی اور پھر بات ہو جائے مسافر کی تو...... پھر مسافر کے کیا ہی کہنے بہت زبردست جا رہی ہے، کہانی کے اختتام نے پھر بے چینی پیدا کر دی۔ ش صغیر ادیب صاحب بوڑھا درخت ویری نائس بیوٹی فل تعمیری تحریر ثابت ہوئی۔ سگ گزیدہ میں روسی مصنف نے کچھ زیادہ ہی لمبی پھینکی ہے۔''

✠ **طاہر الدین بیگ**، میرپور خاص سے چلے آ رہے ہیں ''نومبر کا شمارہ اس کے بعد دسمبر پھر جنوری 2013ء دن ہیں کہ پر لگا کر اڑ رہے ہیں۔ ہم سارے پاکستانی بقول تفسیر عباس بابر اور شیر علی خان کیا خوب لکھا ہے اسی طرح کے ماحول میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کراچی میں ہر روز دس بارہ خون ناحق روز کا معمول ہے۔ اب تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ سارے ہی کام سپریم کورٹ کو کرنے پڑیں گے۔ جاوید بلوچ صاحب، طاہرہ گلزار اور ماہا ایمان صاحبہ اپنے اپنے خوب صورت اور زبردست تبصروں کے ساتھ محفل کی رونق بڑھا رہی ہیں۔ جو نئے ستارے اس مرتبہ محفل کی رونق بنے انہیں ہم بھی خوش آمدید کہتے ہیں۔ فاتح پڑھ کر دل بہت خوش ہوا کافی عرصے سے صلاح الدین ایوبی پر ڈاکٹر صاحب کی تحریر کا انتظار تھا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی اور کنگ رچرڈ تاریخ کے بہت خوب صورت کردار ہیں۔ صلاح الدین ایوبی مسلمانوں کا ایک عظیم جنرل جس پر جتنا فخر کریں کم ہیں۔ سلطانوں کے تصرف میں بے شمار دولت اور زر و جواہرات ہوتے ہیں لیکن جب یہ عظیم مسلمان سلطان فوت ہوا تو اس کا اثاثہ صرف سینتالیس (47) درہم اور اشرفی تھا۔ کہانیوں کی طرف چلتے ہیں۔ کشکول اور مسافر آہستہ آہستہ اپنی اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ افضل اور شبنم کے کردار آگے چل کر کیا رنگ دکھائیں گے یہی دیکھنا ہے۔ اورنگزیب کا اظہار مایوسی کیا رنگ لاتا ہے؟ موجودہ قسط میں لیاقت علی کا ذکر نہیں تھا۔ افضل خان، شبنم اور شیخ حامد بہت خوب کردار ہیں۔ کہانی رنگ بدلتی جا رہی ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ مسافر کی یہ قسط بڑی ہی تیز تر رہی، یقین جانیں کہ تمام صفحات ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالے اور پھر سوچنے لگے کہ اب آگے کیا ہوگا۔ چھاؤں اور وہ بھی جلی ہوئی، کیا خوب عنوان ہے۔ نسیمہ کی مشکلات، کہانی بڑی ڈرامائی انداز سے آگے بڑھتی ہے اور آخر میں ماہی بے آب کی طرح تڑپتی ہوئی ہمیں بھی تڑپا گئی۔ محی الدین نواب بڑے ہی عرصے بعد نظر آئے اور چھا گئے۔ بچے کا کردار بہت خوب صورت کردار تھا۔''

www.pdfbooksfree.pk

☩ **عادل خان**، چارسدہ سے محفل میں شریک ہو رہے ہیں "پہلی دفعہ سسپنس میں شرکت کر رہا ہوں (خوش آمدید! محفل میں شکل دکھا کر غائب نہ ہوجائیے گا) سرورق انتہائی دیدہ زیب تھا۔ جون صاحب کا انشائیہ بڑی مشکل سے سمجھ آیا۔ محفل میں پہنچے تو شیر علی خان اپنے خوب صورت تبصرے کے ساتھ سرفہرست تھے۔ ملالہ یوسف زئی پر حملہ افسوس ناک ہے۔ قوم کے دشمنوں کو سزا ملنی چاہیے۔ ہمایوں سعید صاحب لیجیے ہم تو محفل میں حاضر ہوئے۔ سب کے تبصرے بڑے خوب صورت اور جاندار تھے جن میں ہمایوں سعید صاحب، قدرت اللہ نیازی، ماہا ایمان اور طاہرہ گلزار سرفہرست ہیں۔ طاہرہ جی، آپ کو کیسے پتا کہ ہمایوں سعید نے اپنا پیار پالیا ہے۔ سب سے پہلے ڈاکٹر ساجد امجد کی تاریخی داستان پڑھی۔ طاہر جاوید مغل کی تحریر نے تو دل کی دھڑکن تیز کردی۔ واقعی آسیہ اور حامد کا ملاپ انوکھا تھا۔ کشکول میں لیاقت کا کردار پسند ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی تحریر افسوس ناک تھی۔ مسافر میں شہریار پھر پھنس گیا۔ جلتی چھاؤں ایک فکر انگیز داستان تھی۔ اصغر نے نسیمہ کے ساتھ بڑی بے وفائی کی۔ کاش وہ آفاق کو کہہ پاتی کہ میں ہی تو تیری ماں ہوں۔ حضرت یحییٰؑ کی تحریر سے ایمان تازہ کیا۔ آخری صفحات پر ممنوعہ ایک بہترین اور فکر انگیز داستان تھی۔ شعر و سخن میں، سنسان دل اور ماہا ایمان کے اشعار پسند آئے۔"

☩ **محمد ہمایوں سعید**، بنوں سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "سلیقے سے کیے گئے میک اپ کے ساتھ ٹائٹل گرل کافی سے زیادہ پیاری لگی۔ انکل بھی ہماری طرح ملالہ یوسف زئی پہ کیے گئے بزدلانہ حملے پہ افسردہ نظر آئے۔ شیرو برادر! پھر تو آپ یہ عمریں ماپنے والا جادوئی کیلکولیٹر قدرت اللہ کو گفٹ کر دیجیے۔ ہر آتی جاتی خاتون سے عمر پوچھنے اور اس کے خوفناک نتائج بھگتنے سے تو بچ جائے گا میرا دوست۔ تفسیر صاحب! یہ جو آپ ہر کسی کے نام کے ساتھ اس کا عارضی و مستقل پتا لکھتے ہیں۔ اگر ہم آپ کو اس عمل سے روکنے کی کوشش کریں تو آپ کتنے پیسوں میں مان جاؤ گے؟ جاوید بلوچ صاحب! قابلِ احترام انکل اور آنٹی سے آپ کے پوچھے گئے جاہلانہ سوال اور بدتمیزانہ انداز نے ہمیں بے تحاشا غصہ دلایا۔ گلی گلی، محلے محلے مسافر کی تیسری قسط کا واویلہ ڈراما اسٹیج کرنے کو ہم بتانا چاہتے ہیں کہ اگر وہ حالیہ قسط کو پڑھ کر اس پہ تبصرہ لکھ لیتی تو اس ڈرامے پہ کچھ نہ کچھ تو یقین آ ہی جاتا۔ مصروفیت کا ڈھنڈورا پیٹ پیٹ کر امپریشن جمانے والی ماہا ایمان صاحبہ! آپ جیسا اعلیٰ کوالٹی ڈائیلاگ، بہت ساری بولتی نظر سے گزری ہے مگر آج تک کسی کو بھی معمولی شکل و صورت اور غریب مسکین قسم کے بندے سے محبت نہیں ہوئی جبکہ خوش حال، خوش شکل، خوش لباس، خوش گفتار، خوش تعلیم اور خوش روزگار بندے سے ترجیحی بنیادوں پہ محبت فرمائی جاتی ہے۔ محترمہ سارہ! اسما قادری کی آخری صفحات پہ سچی کہانی سسپنس کے مزاج کے عین مطابق تھی۔ مسافر حسب معمول کافی تیز رفتار رہی۔ میڈم نے جس ذہانت سے ان دو بدمعاشوں کو زیر کیا بلاشبہ لائق تحسین ہے۔ عمران کا بار بار ٹھنڈے میٹھے پانی کے کنویں میں ڈبکیاں لگا لگا کر پیاسا نکلنا کنویں کے ساتھ ساتھ ہمارے لیے بھی باعثِ حیرت ہے۔ طاہر جاوید مغل کی کہانی ہمیشہ کی طرح دلچسپ ترین اور عجیب ترین رہی۔ مختصر کہانی بے شک مغل صاحب کی طرح کوئی بھی نہیں لکھ سکتا۔ بیگ صاحب اس بار عدالتی مناظر اور جارحانہ جرح سے عاری مگر دلچسپ کیس لیے حاضر ہوئے۔ اختر بیگ کی سگ گزیدہ کا مقصد سمجھ نہ آسکا۔ منظر امام کی جناب عالی بالکل حقیقی لگی۔ ناہید سلطانہ اختر کی جلتی چھاؤں بہت افسردہ کردینے والی کہانی تھی۔ حضرت یحییٰؑ کے متعلق اتنی معلومات فراہم کرنے پر ہم رضوانہ ساجد صاحبہ کے مشکور ہیں، آخری صفحات پہ ہمارے پسندیدہ محی الدین نواب خوب صورت میسج کی خوب صورت کہانی لیے حاضر تھے۔ اسلامی قیود سے باہر نکلنے کو بے تاب نئی نسل کے لیے ایک فکر انگیز مثال دی۔ بے شک اسلام کی قائم کردہ حدود کے اندر رہنا ہی ہمارے لیے باعث خیر اور رحمت ہے۔"

☩ **حسنین عباس بلوچ**، سرگودھا جیل سے چلے آرہے ہیں "اس ماہ کا شمارہ ملا، ٹائٹل پر موجود دوشیزہ عید مبارک کا پیغام بڑے خوب صورت انداز میں دے رہی تھی۔ دو ماہ کی مسلسل غیر حاضری کے بعد محفل میں واپسی یقینی بنائی۔ غیر حاضری کی وجہ بس اتنی سی ہے کہ اس جیل میں بھی ایک جیل ہے جہاں کوئی قیدی غلط کام مثلاً موبائل، منشیات اور دیگر قیدی کے ساتھ لڑائی جھگڑا کریں تو پنشمنٹ کے طور پر بند کردیا جاتا ہے اور مجھے بھی ایک معمولی خطا کرنے پر دو ماہ کے لیے بند کردیا گیا اور قیدی کی تمام سہولیات ختم کردی جاتی ہیں اور میری سہولیات بھی بند کردی گئیں اور اس وجہ سے محفل میں شریک نہ ہوسکا۔ دو ماہ بعد مجھے پھر اپنے وارڈ میں واپس بھیجا گیا کسی تگڑی سفارش بابا مرحوم قائداعظمؒ کی بدولت، خیر براوقت بتا کر نہیں آتا مگر جب آتا ہے تو اچھا سبق دیتا ہے۔ محفل میں کرسی سے لے کر بینچ تک تمام قارئین نے سرگودھا جیل کے تمام اسیروں کو شاید بھولنے میں وقت ضائع نہیں کیا اور ذکر بھی کرنا گوارا نہ کیا اور میرے بھائی عمران حیدر بلوچ جو اس وقت جیل کے اسپتال میں داخل ہیں اور دونوں گردے تباہ ہوگئے ہیں اور تمام قارئین سے التماس ہے کہ عمران حیدر بلوچ کی صحت یابی کے لیے خدائے بزرگ و برتر کے حضور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ عمران حیدر بھائی کو صحت و تندرستی دے (آمین۔ اللہ جلد از جلد اس مشکل گھڑی کو آسان کرے) میرے کیس کی اکتوبر کی 22 تاریخ تھی لیکن اب نومبر کی پانچ تاریخ ہے اور انشا اللہ میں بری ہوجاؤں گا کیونکہ میری مدعی فریق سے صلح ہوگئی ہے۔ امید ہے آئندہ شمارے میں آزاد فضاؤں اور ماں باپ کے قدموں میں ٹھنڈی چھاؤں میں ہوں گا۔ یہ سب قارئین کی دعائیں ہیں جو ہم اسیران کو خدا نے ان مشکلات سے نجات دی ہے۔ کہانیوں میں مسافر سے ابتدا کی، میڈم کی چالاکی اور شہریار کی بدبختی میرے اندازے کے مطابق شہریار کے چچا چچی اور بہن کے اغوا میں میڈم خود انوالو ہے یہ اسی کا کیا دھرا ہے، ویسے بھی شہریار سے دلی ہمدردی ہے کیونکہ وہ بھی خان برادری سے ہے دیگر تمام سسپنس کی جان اسٹوریز زیر مطالعہ ہیں ابھی تک مطالعہ نہ کرسکے کیونکہ آج عیدالاضحیٰ کا دوسرا روز ہے اور بکرا (میں میں) کر رہا ہے۔ آہو جی پیٹ میں بکرے نے شور مچایا ہوا ہے۔ ماہا ایمان صاحبہ نے کم بیک کیا اور نا تو دلنشین صاحبہ اور بہن حمیرا رضا صاحبہ آئیں۔ کیا حمیرا بہن آپ کو بھی اپنے بھائی کی آزادی کی خوشی نہیں ہوئی؟ تمام قارئین کا تہ دل سے مشکور اور ادارے کے اراکین کی دعائیں اللہ تعالیٰ نے قبول کیں اور... سات برس سے زندگی اور موت کی کشمکش میں رہنے کے بعد آخر کار زندگی جیت گئی۔"

☩ **انجم فاروق ساحلی**، لاہور سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "سسپنس کا مطالعہ جاری ہے، بعض اوقات خط لکھنے کا موقع نہیں ملتا۔ اس مرتبہ "فاتح" ماضی کا اچھا سبق تھا۔ "انوکھا ملاپ" معمول سے ہٹ کے خاصی منفرد کاوش تھی۔ سیاسی محبت متاثر نہ کرسکی۔ بزرگ افسانہ نگار صغیر ادیب

اس مرتبہ اچھی اور متاثر کن تحریر کے ساتھ آئے۔ جملے خوب صورت اور دلکش تھے۔ ان کا افسانہ قتیل شفائی کے اس شعر کی تفسیر معلوم ہوتا تھا۔

ہم سے بدل گیا وہ نگاہیں تو کیا ہوا
زندہ ہیں کتنے لوگ محبت کیے بغیر

جناب عالی دلچسپ تھی۔ دائمی نجات، خطرناک عشق، سگ گزیدہ متاثر نہ کرسکیں۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا بیان ایمان افروز تھا۔ جلتی چھاؤں اور ممنوعہ دونوں اچھی معاشرتی کاوشیں تھیں۔ مسافر اچھی ہنگامہ خیز تھی۔ ممنوعہ میں نواب صاحب کی معاشرتی جراحت خوب تھی۔ سانپ اور سیڑھی والی مثال بھی دلچسپ تھی۔"

☩ **تصویر العین**، اوکاڑہ سٹی سے چلی آرہی ہیں "عیدالاضحیٰ کے حوالے سے ٹائٹل زبردست تھا، خاص طور پر دوشیزہ کی آنکھیں۔ مجھے تو بہت پسند آیا۔ آپ کے خط میں انکل جی نے ملالہ یوسف زئی کی بات کی۔ واقعی یہ ایک افسوس ناک واقعہ ہے۔ اس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ملالہ یوسف زئی ہوش میں آگئیں اور صحت یاب ہو رہی ہیں۔ جب تک خدا کی طرف سے حکم نہ ہو' کوئی کسی کی جان نہیں لے سکتا۔ انیس دسمبر کو میری سالگرہ ہے۔ آپ سب مجھے ضرور وش کریں۔ (مبارک ہو، مبارک ہو...... محفل میں یہ کیسا شور ہو رہا ہے) پہلے نمبر پر شیر علی خان موجود تھے، مبارک ہو۔ صرف پہلے نمبر آنے پر ہی نہیں بلکہ عیدالاضحیٰ کی بھی۔ محمد عمار کشف آپ کہیں مرزا غالب کے جانشین تو نہیں۔ پلیز سکیس اردو میں بات کریں نا۔ تفسیر عباس بھائی اب پوچھنے کا کیا فائدہ آپ تو FM ہی نہیں سنتے۔ عبدالغفور خان مہنگائی تو مجبوری ہے جس کی وجہ سے قیمتوں میں اضافہ کرنا پڑا ہے ڈائجسٹ کی۔ اس میں ادارے کی کوئی غلطی نہیں۔ سارہ آپ کو نام پسند آیا شکریہ، اب خود نہ رکھ لینا یہ نام۔ رائے قیصر عباس کھرل ضروری تو نہیں کہ مسافر آپ کو پسند ہے تو سب کو پسند ہو۔ حافظ شاہد عمران آپ کی ملاقات تو ہوتی رہتی ہوگی رائے قیصر عباس سے آخر ایک ہی جگہ... آپ دونوں لہٰذا مسافر کہانی پر تو پھر خوب تبصرہ بھی ہوتا ہوگا، ہے نا۔ ضرور بتائیے گا۔ محمد جاوید بلوچ آپ کو تو حکومت پاکستان میں مردم شماری میں رکھا ہوگا کہ جا کر صرف خواتین کی عمریں پتا کرو۔ ہے نا۔ طاہرہ گلزار جو بم بار نیوز آپ نے سنائی ہے۔ اس کا کوئی ثبوت بھی دے دیتیں آپ۔ ویسے اگر خبر سچی ہے تو مجھے اس لڑکی سے بڑی ہمدردی ہے۔ خدا کرے کہ وہ ہمایوں سعید راج سے بھی چار ہاتھ آگے ہو۔ ماہا ایمان کا آنا بہت بہت اچھا لگا۔ سب کو خوب کرارے جواب دیے۔ رمضان پاشا اگر آپ شادی شدہ ہوتے تو اتنا گھبرانا بنتا تھا غیر شادی شدہ ہو کر گھبرانا! عباسہ مغل خوش آمدید، آتی رہیے گا۔"

☩ **احمد خان توحیدی**، پاکستان اسٹیل، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں "شمارۂ نومبر عید کے چاند کے ساتھ 17 اکتوبر کو نمودار ہوا، عید کی خوشیوں کے ساتھ۔ پھر گمبائی میں المناک سانحہ بہاولپور میں المناک حادثہ۔ انشائیہ، جون ایلیا کسی بھی طرح قیامت والی دوزخ گناہ گاروں کے لیے، یہاں راشی ڈاکٹر بدروحوں کی دوزخ سے بڑی کہاں؟ محفل خطوط، رہ جانے والوں میں نام، شکریہ پھر بھی۔ شیر علی خانیوال، کراسی صدارت مبارک۔ 14 دسمبر کو 60 سال کا ہوجاؤں گا۔ سسپنس، سرگزشت، جاسوسی، پاکیزہ سے ریٹائرڈ ہونے کا ارادہ ہے۔ تفسیر، اوکاڑہ، ماہا ایمان نام کی طرح ایماندار، قربانی کا پورا بھینسا کھانے کے بعد پھیل کر آپ نے راستہ بند کرلیا۔ تبصرہ گڈ۔ ہمایوں سعید، بنوں، نجی تاک جھانک بری بات۔ سعدیہ، اٹک کو کیا مجبوری؟ شریف لوگ جیل نہیں جاتے۔ ماریہ فاروق چمن، تاحال آپ کی انگلی میں کسی نے انگوٹھی نہ ڈالی جو عمران کی عمر پوچھ رہی ہیں؟ چوہدری احمد خان کو کیا دکھ؟ بادام باڑہ میں چودھری صاحب کا نام لے کر خرید لیں۔ ابرار وارث تبصرے واقعی طویل۔ میر انصیب ردی کی ٹوکری۔ چودھری احمد خان، راولپنڈی۔ آپ نے اپنی ساتھی کے لیے رفیق حاضر جناب۔ فاتح صلاح الدین ایوبی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ انوکھا ملاپ حامد نے ایرا کو حاصل کرلیا، گڈ اسٹوری۔ کشکول لیاقت کا خاص کارنامہ اور شیخ حامد سے فیصلہ کن معرکہ نہ ہوا۔ صفحات کم۔ سیاسی محبت، خطرناک عشق، سگ گزیدہ، صفحات کازیاں، دائمی نجات، ٹارگٹ کلنگ واقعہ لگتا ہے۔ راجا فتح، تابش ماہا ایمان اچھے اشعار۔ میرا ہر بار شعر بدل کیوں دیتے ہیں؟ (کوشش کریں کہ معیاری کلام ارسال کریں) مسافر، اسما کا حوالہ دشمن غلط بات۔ پروین کدھر؟ شہریار کا نوٹ نہ لینا گڈ، اغوا نتیجہ کے منتظر۔ جلتی چھاؤں، کلام پاک درمیان میں لا کر نکاح نہیں ہوتا۔ اصغر جیسے بہروپیے کے ساتھ جانا نسیمہ کی اپنی غلطی۔ بوڑھا درخت، شادی نجی مسئلہ۔ درخت کی کونپل سے سبق نوشابہ کی شادی میں شرکت اچھی بات۔ جناب عالی جیسے چاپلوسی ہر جگہ حاضر جناب۔ ممنوعہ، کلیم انگریز معاشرہ میں قید، نسیم کا حد سے گزرنا غلط اقدام۔ مانو کا شرعی عقد کے بغیر پردہ بالکل درست بات۔"

سالگرہ نمبر
جنوری 2013ء
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ
کے آخری صفحات پر
محی الدین نواب
کے سحر انگیز قلم سے ایک خوبصورت کہانی جو ابتدا سے اختتام تک آپ کو اپنی گرفت میں رکھے گی

☩ **رمضان پاشا** گلشن اقبال، کراچی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں "اس بار سرورق کی، مردانہ ناک والی حسینہ اچھی نہیں لگی، البتہ وہ منظر بہت

www.pdfbooksfree.pk

بھلا لگا جس میں ایک ناکام عاشق اپنی محبوبہ کی قبر پر نوحہ کناں نظر آ رہا تھا، ہاہاہا۔ اشتہارات اور انشائیہ سے کنی کاٹ کر محفل میں پہنچا۔ وہاں شیر علی خان پہلے نمبر پر نظر آئے، مبارکباد۔ شیر علی میں نے جس خون کا ذکر کیا ہے وہ محاورے والا خون تھا۔ حقیقی خون تو آپ کی فرمائش پڑھ کر گم ہو گیا۔ تفسیر عباس بابر صاحب میرے بارے میں آپ کا جملہ کچھ نامکمل سا تھا۔ ماہا ایمان جی آپ کی پیشگی مبارکباد وصول۔ جواباً آپ کو بھی قربانی کی ایک ایک بوٹی پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ بھائی ابرار وارث آپ نے اپنے پسندیدہ تبصرہ نگاروں میں مجھ ناچیز کا بھی نام شامل کر لیا، اس کے لیے میں آپ کا بہت مشکور ہوں۔ فاتح، اس مشہور و معروف اور معرکہ آرا داستان پر تبصرہ میں گزشتہ ماہ کر چکا ہوں اس ماہ بھی میرا وہی موقف ہے۔ انوکھا ملاپ، ایسی انوکھی اور منفرد کہانی پہلے کبھی نہیں پڑھی تھی۔ اختتام پر راز فاش ہوا تو لطف دوبالا ہو گیا۔ ماہ بہ ماہ کشکول اور مسافر کا ٹیمپو تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا ہے۔ یہ ایک خوش آئند عمل ہے، دونوں قلم کاروں کو بے شمار داد۔ جلتی چھاؤں، یہ تو خالص عورتوں والی کہانی ہے، ہمارے سسپنس میں کیوں لگایا۔ سیاسی محبت بہت ہی عمدہ کہانی تھی، مزہ آ گیا۔ ویسے ہمارے وطن عزیز میں بھی ایک سیاسی محبت پروان چڑھ رہی ہے، الاماشاءاللہ۔ دائمی نجات، اس دفعہ بٹ صاحب نے مایوس کیا، نہ عدالتی کارروائی نہ کوئی سسپنس، لطف نہیں آیا۔ محترم جناب شیر شاہ سید کی کہانی پسند نہیں آئی۔ معذرت! بوڑھا درخت، عشق میں ناکام ہونے والے نوجوانوں کے لیے ایک بہترین سبق آموز کہانی۔ خطرناک عشق، کہانی بہت عمدہ تھی لیکن اتنے پھیلاؤ کی ضرورت نہیں تھی۔ سگ گزیدہ میں مزہ نہیں آیا۔ البتہ جناب عالی نے خوب لطف بہم پہنچایا، اختتام پر خوب ہنسی آئی۔ ممنوعہ اس کہانی کے مصنف کا نام ہی کافی ہے، یعنی محی الدین نواب ممنوعہ اس ماہ کی بہترین کہانی، دی اسٹوری آف دی منتھ۔ مقدس اوراق ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ اشعار کی محفل میں محمد افتخار کا انتخاب اچھا تھا، کامران خالد کا چناؤ بھی پسند آیا، ماہا ایمان کا قطعہ بھی لاجواب تھا۔"

✠ **قیصر اقبال کلول**، ضلع بھکر سے تشریف لائے ہیں "میں جاسوسی اور سسپنس کا عرصہ دراز سے قاری ہوں لیکن خط پہلی دفعہ لکھ رہا ہوں (بہت دیر کی مہرباں آتے آتے) میں ایک اسکول میں پرنسپل ہوں۔ بہت مصروفیت ہوتی ہے۔ عمر 32 سال ہے، شادی شدہ ہوں اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے میرے دو بیٹے ہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ میرا خط ضرور شائع کریں۔ میں نے وقت نکال کر ایک بھرپور خط لکھا ہے۔ میری طرف سے سسپنس کی ایڈیٹر عینی احمد کو بہت بہت سلام۔ آخر میں میری طرف سے آپ کی ساری ٹیم کے لیے نیک تمنائیں اور سلام اور سب کو عید کی مبارک باد۔" (محترم آپ کے اس بھرپور خط میں سسپنس کے متعلق کوئی رائے ڈھونڈنے سے بھی نہ ملی۔ امید ہے آئندہ کہانیوں پر بھی تبصرہ شامل ہوگا)

✠ **محمد قدرت اللہ نیازی**، حکیم ٹاؤن خانیوال سے محفل میں شریک ہو رہے ہیں "سرورق کافی اچھا تھا۔ محفل میں اپنے خانیوالیے کو کرسی صدارت پر دیکھا تو ہم نے بھی کالر اکڑا لیے مبارک ہو جناب! ایک نصیحت ہماری یاد رکھیں بزرگوں پر تنقید مت کیا کریں اور ہمایوں سعید کو جو مشورہ آپ نے دیا قابلِ عمل نہیں کیونکہ یونیورسٹی کی ساری لڑکیوں نے ہمایوں کو بھائی بنا رکھا ہے۔ محمد عمار کشف! اف یار آپ نے تو تفسیر عباس کی اردو دانی کو بھی مات دے دی، کچھ پتلا کریں گاڑھی اردو کو۔ تفسیر عباس جناب آپ کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح بہترین لگا اور آپ نے اور جاوید بلوچ نے بھی ماہا کے بارے میں جو ذو معنی باتیں کی ہیں ان کی تہ تک ہم پہنچ چکے ہیں۔ محمد ہمایوں سعید! ارے بھئی یہ راج کا دم چھلا کہاں غائب ہو گیا۔ طاہرہ گلزار! رونا رونے سے مہنگائی کون سا کم ہو جاتی ہے اور ظالمو، بادام تجویز کیے گئے تھے سعدیہ بخاری کے لیے اور اس کو کوئی پوچھتا تک نہیں۔ ماریہ فاروق! جہاں سے نیا رسالہ لیتی ہیں وہیں سے آپ کو پرانا بھی مل جائے گا واویلا نہ مچائیں۔ ماہا ایمان آپ کے خط پر No Coments اپنا کچا چٹھا خود ہی کھول دیں اور اصلیت بتا دیں سب کو۔ ایک قول ہے کہ "تعلق امتحان نہیں ہیں پھر لوگ دھوکا کیوں دیتے ہیں۔" باقی عقلمند کے لیے اشارہ کافی ہوتا ہے۔ تاریخی کہانی پڑھ کے بہت اچھا لگا کاش آج ہمیں صلاح الدین ایوبی جیسا کوئی حکمران میسر آئے۔ کشکول ہمیشہ کی طرح زبردست رہی۔ شیخ حامد کی بوکھلاہٹ بہت مزہ دے رہی ہے، بلیک میلنگ مواد وصول کرنے کے بعد اس کا جو حال ہوا بہت خوشی ہوئی۔ مسافر میں اسٹوری کو میڈم شکیلہ اور شہر یار پر روک دیا گیا ہے۔ شہریار نے بھی اناڑی کے فیکے پتر کی طرح ہر قسط کے آخر میں اغوا ہونا شروع کر دیا ہے۔ طاہر جاوید مغل کی انوکھا ملاپ، محبت فاتح عالم کی تعبیر محسوس ہوئی، سردار آروش خاں کا نظریہ بالکل درست ہونے کے باوجود محبت کے آگے غلط ثابت ہو گیا۔ ممنوعہ میں محی الدین نواب حسب سابق معاشرتی برائیوں کو موضوع بنائے ہوئے ہیں ان کی نشتر زنی جاری ہے۔ کترنوں میں سید حکیم رضا کی ایک لوہار کی بہت پسند آئی۔ محفل شعر و سخن میں غلام رسول خان، مانگا منڈی اور سارہ، نیو کراچی کا انتخاب اچھا لگا۔"

✠ **ادریس احمد خان**، ناظم آباد، کراچی سے چلے آ رہے ہیں "نومبر کا سسپنس دو تین دن کی تاخیر سے ملا۔ دیدہ زیب رنگوں سے سجا سرورق وسرورق والی اچھی لگی۔ اس کے بعد انشائیے سے مستفید ہوئے اور حکمت و دانائی کے موتی چنے، اداریے سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے خطوط کی کہکشاں سے سجی اپنی محفل میں پہنچے۔ شیر علی خان کو مبارکباد، محمد جاوید بلوچ کا خط اچھا لگا۔ تصویر العین، سج سنور کر ہی کسی کا انتظار کیا جاتا ہے پھر سراہنے والا اپنے خیالات کا اظہار نہ کرے تو بدذوق کہلائے گا۔ ناموں کی انجمن میں اپنا نامہ بھی نظر آیا، بہت بہت شکریہ۔ کشکول بھی دورخی سے جاری و ساری ہے۔ کہانی تیزی سے اپنے اختتام کی طرف رواں دواں ہے۔ فاتح نے کافی متاثر کیا، صلاح الدین ایوبی کا نام بلاشبہ سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ یقین کامل ہے انشاءاللہ ایسا مرد آہن پھر پیدا ہوگا (آمین) جاوید مغل کا انوکھا ملاپ نے بھی اچھا تاثر دیا۔ سیاسی محبت بہت اچھی لگی کہ محبت سے زیادہ فرض کو مقدم جانا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی کہانی بھی دلوں کو جھنجوڑ دینے والی تھی۔ واقعی غریب کی کوئی زندگی نہیں ہے۔ بوڑھا درخت بھی بہتر تھی محفل شعر و سخن میں اپنا شعر بھی تھا اس کے لیے بھی شکریہ۔ پروفیسر ملک کا شعر اچھا لگا۔ اس کے بعد خطرناک عشق کی طرف بڑھے۔ عشق تو خطرناک ہی ہوتا ہے۔ گویا کہ ایک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔ روسی ادب سے ماخوذ کہانی سگ گزیدہ بھی دلچسپ تھی۔ جلتی چھاؤں ناہید سلطانہ اختر کی خوب صورت ترین کہانی تھی۔ بہو کے آتے ہی ماں باپ کو اپنی محبت قربان ہوتی نظر آتی ہے۔ بہو سسرال میں آتے ہی ان کے بیٹے کو بلاشرکت غیرے اپنی جاگیر سمجھنے لگتی ہے۔ ان ماں باپ کے احساسات کیا ہوتے ہوں گے جن کے ساتھ ایسی صورتِ حال پیش آتی ہوگی۔ ایمان کی روشنی سے منور کرنے والی تحریر حضرت یحییٰ علیہ السلام بھی ذوق و شوق سے آخری قسط پڑھی۔ منظر امام کی جناب عالی کا بھی مطالعہ کیا اس دنیا میں خوشامدی اور چاپلوسی آدمیوں کی کمی نہیں ہے۔ ممنوعہ محی الدین نواب کی تحریر تھی۔ واقعی وہ ایسی شاندار تحریریں لکھ سکتے ہیں۔ تمام ہی دوستوں کو عیدالاضحیٰ کی بہت بہت مبارک باد۔"

✠ **بابر عباس، حسنین عباس، کمیل عباس**، گلیانہ روڈ، کھاریاں سے محفل میں شامل ہوئے ہیں "آپ سب کو اپنی طرف سے اپنی فیملی کی طرف سے عید کی بہت ساری مبارک باد۔ نومبر کا سسپنس ایک اذیت ناک انتظار کے بعد آج 20 اکتوبر کو ملا (ہمارا خیال تھا کہ پرچہ آپ تک دو دن میں پہنچ جایا کرے گا لیکن ٹرینیں بند ہونے اور لیٹ ہونے نے ہمارے اندازے بالکل غلط کر دیے۔ ہم آپ سب سے معذرت خواہ ہیں) اس بار سرورق کچھ طلسمی سا لگا اور حاتم طائی کی یاد تازہ کروا گیا۔ فہرست کو چیک کیا تو اپنے پسندیدہ رائٹر ایم اے راحت کو غائب پایا مگر اس سے زیادہ خوشی آخری صفحات پر نواب صاحب کو دیکھ کر ہوئی۔ جون ایلیا مرحوم کا انشائیہ حسب معمول اور حسب حال زبردست تھا۔ پچھلی بار آپ نے مہنگائی کے بارے میں فکر انگیز باتیں کی تھیں اس میں کوئی شک نہیں ہمارے حکمرانوں نے مہنگائی کی شکل میں جو عفریت ہم پر چھوڑ رکھا ہے اسے غالباً آئی ایم ایف بھی کہتے ہیں۔ سر جی ایک درخواست تھی، آپ بے شک سسپنس کی قیمت دس روپے اور بڑھا لیں مگر خدارا اس کے دو تین صفحے بڑھا کر بلیک لسٹ کو ختم کر دیں (خطوط اگر وقت پر مل جائیں تو ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ مختصر ہی سہی لیکن شامل کر لیا جائے۔ دیر سے ملنے کی صورت میں نام شائع کر کے حاضری لگائی جاتی ہے) اس بار کرسی صدارت پر شیر علی خان آف خانیوال تشریف فرما تھے۔ آپ کا خط پسند آیا مجھ کو۔ محمد عمار کشف بیٹا، اپنی اصلی شناخت انسان کے لیے بہت ضروری ہے۔ جان عزیز ایک مشورہ دوں جھوٹ مت بولنا کبھی۔ بندے کو صحت کے مطابق کام کرنا چاہیے۔ تفسیر عباس بابر بھائی زبردست، اس میں کوئی شک نہیں آپ ایک اچھے شاعر اور خوب صورت لکھاری ہیں، آپ الفاظ کا انتخاب کر کے ان میں اپنی تحریر کے ذریعے جان ڈالتے ہیں۔ محمد ہمایوں سعید راج، راج کپور صاحب کے جاں نشین صاحب بھایا ٹھیک تو ہے ناں۔ عبدالغفور خٹک صاحب اگر سسپنس سو روپے کا بھی ہو جائے تو بھایا اس کے دیوانے اس کو ضرور خریدیں گے۔ سارہ جی خط لکھنے کے معاملے میں آپ میری شاگرد بن جائیں، یقین کریں سب کو پیچھے چھوڑ دیں گی۔ رائے قیصر عباس کھرل صاحب خوش آمدید، آپ کو ایک بار پھر محفل میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ محمد جاوید بلوچ صاحب آپ کا خط پڑھ کر خوشی ہوئی۔ الفاظ کا چناؤ بھی ٹھیک تھا۔ سوچ رہا ہوں کس بات کو لے کر آپ کے خط کو تنقید کا نشانہ بناؤں۔ چودھری صاحب بات یہ ہے ہر کوئی ایویں ای کسی کے پیچھے نہیں پڑ جاتا۔ ہم نے کون سا لاحول ولا پڑھی ہے کہ ماہا ایمان صاحبہ میدان چھوڑ کر ہی بھاگ گئی ہیں۔ واہ جی واہ، اس بار تو آنٹی طاہرہ گلزار بھی آئی ہوئی ہیں۔ لیس آنٹی جی آپ کا رونا دھونا کام آ گیا۔ باقی میں کوئی ٹیلی پیتھی نہیں جانتا جو ماہا ایمان کے دماغ میں گھس جاؤں گا۔ ابرار وارث بھایا میں نے اور تفسیر نے کسی کو نہیں روکا لکھنے کے لیے اب یہ اپنی اپنی ہمت کی بات ہے، ہمیں تو خوشی ہوتی ہے جب محفل میں نئے لوگ آتے ہیں۔ ماریہ فاروق صاحبہ ہمارا یہ ملک بہت پیارا ہے اور ہم اٹھارہ کروڑ عوام اس سے بہت محبت کرتے ہیں۔ عزیزہ آپ نے شاید سسپنس ابھی پڑھنا شروع کیا ہے میں تو سسپنس کو اس وقت سے پڑھ رہا ہوں جب اس کی قیمت ڈیڑھ روپیہ تھی۔ جائیں ساجدہ راجا صاحبہ آپ کو معاف کیا، آپ کو کچھ نہیں کہتا۔ واہ ماہا ایمان واہ، اسے کہتے ہیں ڈر۔ ارے ماہا ایمان صاحبہ مجھ سے ڈر کر آپ کی برادری کی اریفہ بخاری، بشریٰ افضل، آمنہ افضل، سعدیہ ہما شیخ، نورین خاکوانی، ارم خان، بلیک کیٹ، طاہرہ یاسمین، ہمیرا افضل اور بہت سی بھاگ گئی تھیں آپ بھلا کس کھیت کی گاجر ہیں۔ سوری پاشا بھائی مجھے نہیں پتا تھا کہ آپ ابھی تک کنوارے ہیں خدا آپ کو ایک عدد اچھی بیوی دے۔ محمد قدرت اللہ نیازی بھائی یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ محفل کی مقبول ترین شخصیت کو آپ نے بھلا دیا، یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ حسنین عباس اور عمران حیدر بلوچ اور دوسرے ساتھی جو کہ ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے تعلق رکھتے تھے غیر حاضر ہیں۔" (سلام دعا...... خیر خیریت اور چھیڑ چھاڑ کا شکریہ مگر...... پرچے پر تبصرہ غائب)

✠ **یاسر علی راجپوت**، ٹوبہ ٹیک سنگھ سے چلے آ رہے ہیں "پہلی بار 10 سال کی عمر میں اپنے چاچو سے سسپنس لے کر ملک صفدر حیات کی کہانی پڑھی بس پھر کیا، شروع ہو گئے۔ پھر یہ محبت کا رشتہ آج تک قائم ہے۔ نومبر کا سسپنس 26 تاریخ کو کافی لیٹ مل سکا۔ گاؤں میں رہنے والوں کی یہی تو پریشانی ہے۔ سب سے پہلے نورالدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی کی داستان جو جذبہ ایمانی سے سرشار کر دینے والی داستان تھی، پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا۔ ناصر ملک صاحب کی مسافر بہت اچھی لگی۔ انہوں نے اس میں میڈم کے کردار کو ہر فن مولا کر دیا ہے۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی داستان پڑھی، جو یقیناً اہلِ ایمان کے لیے بہت بڑا سبق ہے۔ اور آخر میں مرزا امجد بیگ صاحب کی دائمی نجات پڑھی۔ مرزا امجد بیگ صاحب اچھے طریقے سے کیس لڑتے ہیں اور مدعا علیہ سے لیے گئے پیسے کا حق ادا کرتے ہیں ورنہ غریب آدمی کو پاکستان میں عدلیہ سے انصاف کے لیے لوہے کے جوتے درکار ہیں۔"

✠ **سعدیہ بخاری**، اٹک سے خوبصورت تبصرے کے ساتھ محفل میں آئی ہیں "دو ماہ کی غیر حاضری کے بعد پھر سے حاضر ہیں۔ نومبر کا سسپنس دو دن کی تاخیر سے اکتوبر کی 20 تاریخ کو موصول ہوا۔ سرورق کو ملاحظہ کیا اس کی تعریف صنف کائیں کائیں پر چھوڑتے ہوئے اور اشتہارات کو درگزر کرتے ہوئے انشائیہ کا سرسری جائزہ لیا اس کو بھی دیگر ذہین و فطین قارئین پر چھوڑتے ہیں اور اپنی عزیز از جان محفل کا رخ کرتے ہیں۔ ابتدائیہ خاصا بڑا ہے پہلے نمبر پر شیر علی صاحب شیر بنے بیٹھے ہیں، صدارت کی مبارکباد۔ عمار کشف آپ آثار قدیمہ کے کون سے کھنڈر سے برآمد ہوئے ہیں کیا آپ کی پسندیدہ ڈش مغز ہے؟ ہمایوں سعید آہ...... ذرا اس دکان کا نام تو بتا تا جہاں سے دل جوڑنے والی ایلفی ملتی ہے۔ باجی طاہرہ گلزار ہمایوں کے پرایا ہو جانے کی خبر ایسے ہی ہے جیسے ہمارے سابق وفاقی وزیر پانی و بجلی کا یہ بیان کہ "اس سال کے آخر تک لوڈ شیڈنگ کا مکمل خاتمہ کر دیا جائے گا۔" ماہا ایمان اس دور میں بھی محبت نفع ونقصان دیکھ کر نہیں کی جاتی پر اپنا نہیں دوسرے کا۔ جاوید بلوچ آپ ثقیل اردو اور عقل قلیل و بلیل کے سہارے لٹک کر اپنا تبصرہ طویل کر ہی دیتے ہیں۔ بابر عباس چوٹ آپ کی ٹانگ پر لگی متاثر آپ کا دماغ ہو گیا، ادب کے ساتھ اگر میرا مارا ہوا کوئی چھکا سیدھا جا کر آپ کی کنپٹی پر لگا ہے تو اس میں مجھ معصوم کا کیا

التماس سورۂ فاتحہ

ادارے کے قدیم معاون اور قلم کار حسام بٹ کی والدہ محترمہ 11 نومبر 2012ء اور ہمارے پرانے قاری محمد الیاس خان (سانگھڑ) کی والدہ ماجدہ مریم سلطان 2 نومبر 2012ء کو خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ قارئین سے التماس ہے کہ وہ مرحومین کے لیے سورۂ فاتحہ پڑھ کر دعائے مغفرت فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

www.pdfbooksfree.pk

قصور؟ مانسہرہ کے ڈبل ایم اے اور خوشبو لگا کے والے محمد نعمان پیارے آپ دونوں تو ایسے غائب ہوئے جیسے پاکستان سے امریکن سنڈی۔ دائمی نجات کیس جتنا سادہ اور آسان تھا اس کا انجام اتنا ہی تکلیف دہ۔ آخری صفحات پر نواب محی الدین کا نام دیکھ کر سیدھے ادھر ہی پہنچے، بہت خوب! اتنے عرصے بعد اپنی کہانی کے ساتھ آئے اور چھا گئے۔ مسافر میں شہر یار اور میڈم شکیلہ کا رومانس اب بور کرنے لگا ہے، یہ قسط بہت سست رفتار رہی جہاں سنسنی خیز موڑ آیا وہاں جاری ہے لکھا ہوا تھا۔ تاریخی کہانی فاتح میں عالم اسلام کے ہیرو صلاح الدین ایوبی کے بارے میں اگرچہ پہلے بھی پڑھ چکے ہیں لیکن ان کے کارنامے ایسے ہیں کہ جتنی بار بھی پڑھا جائے کم ہے۔ کشکول کی یہ قسط بھی سوائے ذہنی ورزش کے کچھ نہ تھی۔ مختصر کہانیوں میں جہاں منظر امام کی جناب عالی نے مسکرانے پر مجبور کر دیا وہیں ڈاکٹر شیر شاہ کی جو کیڑی سوکائی نے بہت افسردہ کیا۔ انوکھا ملاپ میں محبت فاتح ٹھہری، مزہ آ گیا کہانی کا۔ سیاسی محبت میں میریا نے محبت پر شوہر تو قربان کر دیا مگر محبت پر اپنا فرض قربان نہ کر سکی۔ بوڑھا درخت میں محبت دولت کے آگے ہار گئی۔ خطرناک عشق میں عاشق خطرناک کا واسطہ فراڈیوں سے پڑ گیا۔ سچ کہتے ہیں عشق اندھا ہوتا ہے۔ ناہید سلطانہ اختر جانی اور مانی ہوئی رائٹر ہیں بہت ہی خوب صورت انداز تحریر اور کہانی تھی۔ نسیمہ نے اتنی قربانیوں کے بعد بھی سب کچھ کھو دیا۔ اشعار میں محمد افتخار جوئیہ اینڈ جنید احمد ملک کے اشعار بہت پسند آئے۔"

✠ **ماریہ فاروق**، چمن سے تشریف لائی ہیں۔ "آپ نے ماہ اکتوبر میں میرے خط کی تعریف کی تھی اس دفعہ ہم نے ذرا اور ہی طریقے سے خط سجا لیا (بہت خوب) پچھلے ہفتے کتابوں میں میرے ہاتھ 2002ء کا پرانا شمارہ لگ گیا قیمت 30 روپے اور صفحے آج کے سسپنس کے مقابلے میں دگنے! مانا کہ بڑھتی ہوئی مہنگائی سے ہر کوئی پریشان حال ہے مگر یہ بھی تو کوئی انصاف کی بات نہ ہوئی کہ آپ رسالہ 60 روپے کا کر کے اس کے صفحے بھی کم کر دیں (دگنے صفحات والا پرچہ ہم بھی نہیں دیکھ سکے۔ رہی صفحات کم کرنے والی بات تو وہ کم نہ کرنے کی وجہ سے ہی قیمت بڑھانی پڑی) جو محفل کے دوست میرے اس گلے سے متفق ہیں وہ اپنی رائے کا اظہار ضرور کیجیے گا (اور جو متفق نہ ہوں وہ کیا کریں؟) محفل شعر و سخن میں صوبیہ تفسیر بابر اور عون عباس بابر دونوں اوکاڑہ سے تھے، آپ دونوں کا آپس کا کوئی رشتہ تو نہیں؟ محمد قدرت اللہ نیازی صاحب آپ کے تبصرے ہمیں اچھے لگتے ہیں۔ آپ کا شعر بھی بہت زبردست تھا۔"

✠ **اے ایم چودھری**، احمد پور شرقیہ سے محفل میں شرکت کر رہی ہیں "سسپنس نومبر بڑی مشکل سے آج ملا ہے۔ محفل دوستاں میں چھلانگ لگائی اور یہ کیا...... ابھی رات یعنی 17 اکتوبر کو تو عید کا چاند دیکھا تھا اور آج 18 کو پھر نظروں کے سامنے موجود ہے؟ ارے جناب ہم اپنی پیاری بہنا ماہا ایمان کی بات کر رہے ہیں۔ سب سے پہلے محفل میں داخل ہوئی جہاں شیر علی صاحب جنگل کے بادشاہ بننے کی کوشش میں مصروف نظر آئے۔ شیر صاحب میری فکر میں دبلا ہونے کے بجائے آپ ڈاکٹر سے رجوع فرمائیں۔ بہر حال جناب، اول نمبر آنے پر مبارک باد قبول ہو۔ دوسرے نمبر پر محمد عمار کشف صاحب تشریف فرما تھے۔ جناب کا تبصرہ بہت ہی پسند آیا۔ پھر تفسیر صاحب اپنی گفتگو کی تفسیر کرتے ہوئے نظر آئے۔ سر ہم بالکل آپ سے متفق ہیں کہ شوق اور محبت کا کوئی مول نہیں، تو جناب سسپنس اگر 500 کا بھی ہو جائے تو پھر بھی ہم پڑھیں گے۔ تفسیر صاحب، کنجوسی کی بھی حد ہوتی ہے، جناب اک کتاب ہی مانگی ہے آپ سے شاعری کی، وہ بھی آپ نہیں عطا فرما رہے؟ ہمایوں سعید راج جی اب بھی آپ بیاباں دل، بنجر دل اور ویران دل ہیں؟ حالانکہ آپ کی پسند آپ کو مل چکی۔ سارہ فرام نیو کراچی، سسٹر خوش آمدید۔ کھرل بھائی آپ کو اور تمام جیل والے بھائیوں کو اللہ عزوجل رہائی نصیب عطا فرمائے (آمین) ارے رائے کھرل بھائی کیا واقعی آپ فرار ہو گئے ہیں؟ طاہرہ گلزار باجی کیسی ہیں آپ؟ بہت دل کر رہا ہے آپ سے بات کرنے کو انشاء اللہ عید کے دنوں میں ضرور بات کروں گی۔ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ ساجدہ راجا ڈیئر سسپنس حاصل کرنا ہر ماہ ہی میرے لیے مشکل ہوتا اور وقت پر پڑھنا اور زیادہ مشکل اور اگر آپ ایڈریس دیں تو اکتوبر کا شمارہ ہم آپ کو پہنچا دیں گے۔ رمضان پاشا بھائی تو ٹینشن کس بات کی ہے کہ بھابی نہیں ہے آپ فوراً سے پیشتر شادی کے حسین بندھن میں بندھ جائیں اور ہماری بھابی لے آئیں نا...... محمد قدرت اللہ نیازی بھائی کیسی طبیعت ہے۔ تصویر العین سسٹر کا خط بھی پسند آیا۔ من پسند کہانی مسافر میں جہاں شہر یار خان، میڈم اور دشمنوں کے جال میں دھنستا جا رہا ہے، یہ قسط بہت زبردست رہی، اب یقیناً شہر یار دشمن کے چنگل سے نکل جائے گا یا پھر والدین کے قاتل کو دنیا سے رخصت کر وائے گا۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ اس کے بعد کشکول میں جھانکا جہاں اورنگ زیب، سراج اینڈ کمپنی سے ذرا پوشیدہ معاملات کو رکھ کر بگ باس کے گرد جال تنگ کرتے نظر آئے۔ آخر میں نواب انکل کی تخلیق کردہ ممنوعہ کو پڑھا بس اتنا ہی کہوں گی کہ نواب انکل لاجواب لکھتے ہیں۔"

✠ **ریاض شاہد**، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "اس ماہ کا شمارہ سسپنس جاں فشانی سے اخبار والے سے وصول کیا۔ ٹائٹل کی تراش خراش دیکھی، بلکتی دمکتی حسینہ عید مبارک کہہ رہی تھی۔ محفل یاراں میں سب سے پہلے کرسی صدارت پر شیر علی کو شیر۔ مانند دھاڑتے اور گرجتے چمکتے ہوئے پایا۔ مبارک باد قبول ہو، باقی ماندہ خطوط بے پناہ تفریح کا باعث ثابت ہوئے۔ تفسیر عباس بابر صاحب اور ادریس احمد خان صاحب مجھ ناچیز کو یاد رکھنے اور دعائیں دینے پر میں آپ کا بے حد مشکور ہوں اور دوبارہ خط نہ لکھ سکنے کی وجہ ہائی کورٹ میں کیس سماعت ہو رہا تھا اور آپ تمام رائٹر اور قارئین کی دعاؤں کے طفیل اللہ رب العزت نے مجھے سزائے موت سے بری کر دیا ہے (مبارک ہو) کہانیوں میں مسافر سے ابتدا کی، بے پناہ اچھی اسٹوری ہے شہر یار کا کردار لائق تحسین ہے اور میڈم کے رنگ ڈھنگ بھی قابل غور ہیں۔ دیگر تمام سسپنس ابھی زیر مطالعہ ہے۔ باقی ہمارے اسیر بھائی عمران حیدر بلوچ جیل اسپتال میں داخل ہیں اور بہت سخت بیمار ہیں خصوصی دعاؤں کے لیے التماس ہے۔ محفل شعر و سخن میں اشعار کا انتخاب معیاری اور پائیدار تھا۔"

✠ **عدنان یوسف**، بنوں سے چلے آ رہے ہیں "نومبر کا سسپنس اکتوبر کی 20 تاریخ کو ملا۔ سرورق پر موجودہ لڑکی دل کو کچھ زیادہ ہی بھا گئی۔ اتنی خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر دل تو نہیں چاہتا تھا کہ سرورق کو چھوڑ و لیکن کیا کرتا باقی رسالہ کو بھی پڑھنا تھا۔ کہانیوں میں ہمیشہ کی طرح پہلے مسافر پڑھی۔ شہر یار نے خانزادی اسما کا مشن تو کامیابی سے کر لیا لیکن پھر بری طرح پھنس گیا۔ میرے خیال میں وہ شخص سردار حیدر خان ہوگا، اب تو شہر یار اور میڈم شکیلہ کچھ زیادہ ہی فری ہو گئے۔ مسافر ایک زبردست ناول ہے۔ رہی بات کشکول کی، جو بہترین جا رہی ہے۔ آپ سے التماس ہے کہ کشکول کے صفحے مزید بڑھائے جائیں۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی انوکھا ملاپ اور کاشف زبیر صاحب کی سیاسی محبت نے واقعی دل کے تار چھیڑ دیے۔ یہ دونوں کہانیاں بہت اچھی

تھیں۔ محفل میں ایک بار پھر ماہا ایمان کو دیکھ کر دل باغ باغ ہوا۔ ماہا جی! آپ کا کیا خیال ہے کہ چند ماہ غیر حاضر ہونے سے آپ کی قدر بڑھ جائے گی۔ عباسہ مغل، ماہا ایمان نے فرار کی اچھا بہانہ بنایا۔ شیر علی خان آپ کا تبصرہ بہت اچھا تھا، کرسی صدارت مبارک ہو۔ محمد عمار کشف یار آپ نے کیسا یہ لڑکیوں والا کام کیا ہے۔ اپنا نام تبدیل کرنا، عمر تبدیل کرنا تو کوئی ان سے سیکھے، آئندہ اپنی شناخت پر فخر کرنا ہے نہ کہ کھو دینا۔ باقی محمد ہمایوں سعید، تفسیر عباس بابر، طاہرہ گلزار، رمضان پاشا، محمد قدرت اللہ نیازی اور تصویر العین کے تبصرے اچھے تھے۔"

✠ **احسان سحر**، زادے خیلا نوالہ، میانوالی سے تشریف لائے ہیں "سب سے پہلے پیاری آنٹی اور انکل کو پیار بھرا اسلام۔ سسپنس 17 کو ملا۔ ٹائٹل دیکھ کر موسم کی طرح ٹھنڈے ٹھار ہو گئے، خوشبو کی طرح دل میں بستا ہوا، سوتے ہوئے گلاب کی طرح تر و تازہ صنف نازک کا معصوم اور جاذب نظر چہرہ دیکھ کر تو اندھے ہو گئے...... جون ایلیا مرحوم کا انشائیہ پڑھا اور دل میں محفوظ کر لیا، محفل زعفران میں پہنچے تو ایک خوشخبری ہماری منتظر تھی، لیکن اتنے سارے غموں اور غموں کے پہاڑ کا یہ چھوٹی سی خوشخبری مداوا کر سکے گی یہ تو خیر وقت ہی بتائے گا۔ شیر علی خان محفل یاراں کے نمبرون ممبر قرار پائے۔ مبارکاں جی، کھلے اور نرم دل سے اور کچھ دوستوں کی ٹانگیں اور کچھ کو نصیحتیں کرتے نظر آئے، کاش خود بھی ان پر عمل کریں آپ۔ عمار کشف جی پر آپ نے تبصرہ لکھا ہے کہ...... اتنے او کھے (مشکل) الفاظ آئندہ ہمیں ان سے بچائیں۔ تفسیر عباس بابر صاحب نے ہمایوں سعید کی عمر کا انکشاف کر کے ہمیں حیران کر دیا۔ سارہ جی پہلی واری آتے ہی اتنا لمبا تبصرہ کھینچ مارا پھر بھی کہتی ہو لکھنے کا طریقہ نہیں آتا۔ طاہرہ گلزار کا تبصرہ اچھا پر تھوڑا اسا مشکارہ (مزاحیہ) تھا۔ ہم مرنے نہیں انسان ہیں، ہماری قدرت اللہ نیازی کی طرح دم نہیں ہے جی۔ ماہا ایمان بھی آ گئیں۔ واہ اچھی گل (بات) ہے۔ سب سے پہلے تاریخی کہانی پڑھی اور جی اٹھے۔ صلاح الدین ایوبی کی بہادری نے سرشار کیا، کاش اس وقت بھی کوئی ایسا حکمران آ جائے جو ہمارے پیارے پاکستان کو بچا لے۔ بوڑھا درخت دل کے تاروں کو چھیڑ گئی اور ہم کو بھی اپنی پرانی یادوں میں دھکیل گئی پر افسوس ہمارے پاس بوڑھا درخت نہیں جسے دیکھ کر ہم بھی نصیحت پکڑیں اور سبق سیکھیں۔ جناب عالی اچھی اور اچھا موضوع رہا۔ جو کیڑی سوکائی، ہمارے اپنے دیہاتوں کی عکاس جنہیں ہمارے حکمران بھی فراموش کر چکے ہیں، دیہاتیوں اور دیہات کو۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام بار بار پڑھی اور دل کو سکون اور راحت سے نوازا۔ طاہر صاحب اس دفعہ الگ انداز کی جداگانہ تحریر لے کر حاضر ہوئے۔ انوکھا ملاپ واقعی حیران کر دینے والا ملاپ تھا۔ خلوص اور چاہت میں لہو بھی شامل ہو تو اس سے بھوک کیا ہر چیز اور بڑی سے بڑی رکاوٹ دور ہو جاتی ہے۔ سگ گزیدہ مختصر مگر اچھی تحریر تھی۔ خطرناک عشق اور جلتی چھاؤں نے دل کو کافی سکون مہیا کیا۔ خوب صورت شاہکار رہے۔ کشکول اب اچھے انداز میں چل رہی ہے، لیاقت حسین سے زیادہ اورنگ زیب ایکشن میں نظر آ رہا ہے۔ پراسراریت میں تھوڑا اور اضافہ کریں تو بات سولہ آنے بہترین ہو جائے گی۔ مسافر کی ہر قسط میں شہر یار ایک نیا مشن کرتے کرتے خود ہی مشین نہ بن جائے اگر ایسا ہو جائے تو مزہ آئے گا ہر ماہ نئے مشن کے ساتھ کچھ ایڈونچر بھی دیکھنے کو مل جائے گا۔ اشعار سب کے سب بہت اچھے رہے۔ سیاسی محبت کافی عرصہ بعد سسپنس میں مصر کے حوالے سے کہانی پڑھی، بہت زیادہ پسند آئی، خاص کر صحرائی علاقے میں اونٹوں کا بدکنا، ویلڈن...... اینڈ شکریہ۔" (بھرپور تبصرے کا شکریہ)

✠ **رضوان تنولی کریڑوی**، اورنگی ٹاؤن، کراچی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں "ایک طویل غیر حاضری کے بعد ادارہ سسپنس، اسٹاف و قارئین کو اسلام علیکم (وعلیکم السلام) ماہ نومبر کا شمارہ 17 تاریخ کی صبح اسٹال پر جگمگاتا نظر آیا قدم بے اختیار رک گئے اور دل مچل اٹھا ہاکر سے سسپنس لے کے پیسے دیے تو اس نے بتایا پرچہ 2 ماہ سے 60 روپے کا ہو چکا ہے، مہنگائی کے اس دور میں جب سب ہی پاکستان کی ادھ موئی عوام کا خون چوسنے اور چمڑی ادھیڑنے میں مصروف ہیں تو یقیناً ادارہ سسپنس بھی اس مہنگائی کی لپیٹ میں آئے گا۔ قارئین سسپنس کو ادارے کی مجبوری کا احساس ہے اور عاشقان سسپنس کے لیے قیمت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ (آپ سب کی محبت کو ہم بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں) سرورق کی حسینہ کا تبصرہ بابر عباس کے لیے چھوڑتے ہوئے صفحہ پلٹا اور استاد معظم جون ایلیا کی کلاس اٹینڈ کی مرحوم نہایت درد مند دل رکھتے تھے۔ محفل خطوط کی ابتدا آپ کے تبصرے سے کی۔ چاچو جی ملالہ کا ذکر چھیڑا تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ بات مختصر کرتے ہوئے عرض کروں بابائے قوم کا پاکستان، عظیم المرتبت مصیبتوں کی بے مثال قربانیوں کا پاکستان، شہیدوں کا پاکستان چاروں طرف سے دشمنوں کے گھیرے میں ہے۔ اے اللہ رب العزت پاکستان کی حفاظت فرما۔ خطوط کی محفل کے صدر شیر علی کو منصب صدارت کی مبارک باد۔ عزیز ساتھیوں میں کافی عرصہ بعد آپ سے ہم کلام ہوں۔ محفل میں کسی بھی قسم کا کوئی ہلہ گلہ نظر نہیں آیا اور ہلچل کے بغیر مجھے محفل ادھوری لگتی ہے۔ سوچ رہا ہوں میں کس کی دم پے پاؤں رکھ کے ابتدا کروں، خوب صورت چڑیلیں سائڈ پکڑ لیں کیونکہ چمٹے بیلن سے اپنا کوئی جوڑ نہیں ویسے محفل کا مزہ بھی صنف اوئی، آہ، اف، ہائے سے ہے۔ ہے کوئی مرد جوان جو قلم کی تلوار پکڑ کے میرے مدمقابل آئے، ہے کوئی شیر دل جو میری ایک کے بدلے 4 سنائے۔ میں بچپن سے ہی سسپنس کی پہلی تاریخی کہانی اور صرف قسط وار کہانیوں کو پسند کرتا ہوں اس لیے کہانیوں کی ابتدا اپنی محبوب تحریر ڈاکٹر ساجد امجد کی شاہکار تحریر فاتح سے کی۔ صلاح الدین ایوبی ایک عظیم ماں کا عظیم بیٹا، قبلہ اول کا فاتح مرد مجاہد آج بھی دنیائے اسلام کے دلوں میں زندہ ہے۔ تاریخ کے مطالعے سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ عیسائی آج بھی ہم سے صلیبی جنگیں لڑ رہے ہیں۔ انوار صدیقی کی کشکول کا آٹھ ماہ بعد مطالعہ کیا اور کشکول بچھڑی ہوئی محبوبہ کی طرح ملی، صدیقی صاحب اتنی شاہکار داستان کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں۔ مسافر ناصر ملک کے خوب صورت قلم کی تحریر میڈم شکیلہ کے کردار سے اپنی محفل کی مایہ ناز جنگجو لڑاکا مس شکیلہ کی یاد تازہ ہو گئی۔ مس جی آپ کہاں ہیں میں آپ کے خالص زنانہ اسٹائل کو اکثر یاد کرتا ہوں کستوری لگا کے۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

چودھری رضا خان، راولپنڈی۔ توقیر خان، اوکاڑہ۔ طاہرہ گلزار، پشاور۔ محمد زبیر ساگر، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ میمونہ عزیز، اسلام آباد۔ محمد عامر، لاہور۔ محمد انضمام، کراچی۔ یاسر امین، اورنگی ٹاؤن، کراچی۔ الیاس تنویر، سیالکوٹ۔ محمد زبیر، حیدر آباد

www.pdfbooksfree.pk

بت شکن

ڈاکٹر ساجد امجد

ماضی کے اوراق طرح طرح کے واقعات سے بھرے پڑے ہیں جنہیں دہرانے والے ہر بار ایک الگ ہی انداز میں دیکھتے ہیں۔ انہی اوراق میں والیِ خراسان الپتگین کے غلام سبکتگین نے جب ایک روز ہرنی کے بچے پر رحم کرتے ہوئے اپنے شکار کو آزاد کیا اور آگے چل کر اسی غلام کے ہونہار بیٹے محمود غزنوی نے اشاعتِ اسلام اور بُت پرستی کے خلاف یادگار سترہ حملے کیے اور تاریخ میں بت شکن کا خطاب پایا۔ یہی غلام آگے بڑھ کر غزنی کا بادشاہ بنا جس کے خوابوں میں بھی ہمیشہ کوئی نہ کوئی رمز پوشیدہ ہوتا تھا... محمود شکلاً تو خوب صورت نہیں تھا مگر اس کا غلام ایاز حسین چہرے اور ضرب المثل ذہانت کا مالک تھا۔ محمود علم کا اس قدر شیدائی تھا کہ اس کے دربار میں علما کا ہجوم رہتا تھا۔ اس کے خیال میں اہلِ علم کی زمین ایسی زرخیزی لیے ہوئے ہوتی ہے جس میں خلوص اور احسان کے بیج بوئے جائیں تو ایسے پھل اور سائے نصیب ہوتے ہیں جن سے دین اور دنیا کی ٹھنڈک اور ذائقے نصیب ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے اس کے دربار سے علم نجوم کا ماہر ابوریحان البیرونی اور کئی درخشندہ ستارے وابستہ تھے۔ تاریخ پر چھا جانے والے یہ لوگ بڑے عجیب مزاج و کردار کے مالک ہوتے ہیں۔ ایک طرف تلوار اٹھاتے ہیں اور دوسری جانب عشق و عقیدت کے پھول کھلاتے ہیں۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

اس کا معمول تھا کہ اپنے واحد گھوڑے پر سوار ہو کر جنگل میں گھومتا اور چھوٹا موٹا شکار کیا کرتا تھا۔ ایک دن اسی شغل میں مشغول تھا کہ اس کی نظر ایک ہرنی پر پڑی۔ ہرنی کا بچہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ دونوں کسی کی آمد سے بے خبر گھاس چرنے میں مگن تھے کہ ہرنی کے کان کھڑے ہوئے۔ اسے احساس ہوا کہ کوئی اس طرف آرہا ہے۔ اس نے ایک مخصوص آواز نکالی۔ شاید وہ اپنے بچے کو خبردار کر رہی تھی کہ خطرہ قریب ہے۔ ہرنی نے گردن گھما کر دیکھا۔ گھوڑا اور اس پر بیٹھا ہوا سوار اسی کی طرف آرہے تھے۔ ہرنی بھاگ کھڑی ہوئی۔ ماں کے ساتھ بچے نے بھی زقند بھری، سوار نے گھوڑے کو سرپٹ دوڑا دیا۔ ہرنی تو چھلانگیں بھرتی ہوئی ہوا ہوگئی لیکن بچہ بھاگتے بھاگتے تھک گیا۔ ایسی ٹھوکر لگی کہ دور تک گھسٹتا چلا گیا۔ سوار نے گھوڑا روکا، ہرنی کے بچے نے ایک مرتبہ پھر اٹھنے کی کوشش کی لیکن سوار نے اسے پکڑ لیا۔ ہاتھ پاؤں باندھے اور زین کے ساتھ باندھ دیا اور شہر کی طرف روانہ ہوا۔ اب وہ گھوڑے کو تیز نہیں دوڑا رہا تھا۔ کچھ سرشاری تھی کچھ اطمینان، گھوڑے کو دلکی چال چلا رہا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد اس نے غیر ارادی طور پر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ہرنی اس کے پیچھے بھاگتی چلی آرہی ہے۔ ہرنی کے چہرے سے رنج اور ملال کی کیفیت ظاہر ہو رہی تھی۔ سوار کو اچانک یاد آیا کہ ہرنی کا بچہ اس کے پاس ہے۔ پہلے اس نے سوچا کہ ہرنی کو دوڑاتا ہوا شہر تک لے چلے لیکن دوسرے ہی لمحے اس کا دل یہ سوچ کر لرز اٹھا کہ یہ ہرنی محض ہرنی نہیں ہے، ایک ماں ہے جو اپنے بچے کی رہائی کے لیے بے چین ہے۔ اس نے بغیر کسی توقف کے بچے کے ہاتھ پاؤں کھولے اور اسے زمین پر چھوڑ دیا۔ بچہ بھاگتا ہوا ماں کے پاس پہنچ گیا۔ وہ منظر دیکھنے کا تھا جب بے زبان ہرنی اپنے بچے کو بے تحاشا چوم رہی تھی اور بار بار نظریں اٹھا کر سوار کی طرف دیکھ لیتی تھی جیسے آنکھوں آنکھوں سے اس کا شکریہ ادا کر رہی ہو۔ پھر اس نے بچے کو ہمراہ لیا اور جنگل کی طرف پلٹ گئی۔ یہ منظر دیکھ کر سوار کی آنکھوں میں نئی تر گئی۔

وہ جب رات کو سونے کے لیے لیٹا، اس وقت بھی وہ ماں کی ماری ہرنی پر غور کر رہا تھا۔ پھر اسے نیند آگئی اس نے خواب میں آنحضرت ﷺ کو دیکھا۔ آپ فرما رہے تھے۔

”تو نے ایک بے زبان جانور پر جو رحم کیا ہے وہ خداوند تعالیٰ کی درگاہ میں بہت مقبول ہوا ہے لہٰذا اس کے صلے میں تجھے چاہیے کہ یہی طریقہ اختیار کرے اور کبھی رحم کو ہاتھ سے

www.pdfbooksfree.pk

نہ جانے دے کیونکہ یہ طریق دین و دنیا کا سرمایہ ہے۔"

یہ رحم دل سوار سبکتگین تھا جو والی خراسان الپتگین کا غلام تھا، اسی کے ہونہار بیٹے سلطان محمود غزنوی نے تاریخ اسلام میں "بت شکن" کا خطاب پایا۔

سبکتگین کے ابتدائی حالات میں آتا ہے کہ وہ نسلاً ایران کے بادشاہ یزدجرد کے خاندان سے تھا۔ اسے ایک سوداگر ترکستان سے بخارا میں لایا اور پھر اسے الپتگین کے ہاتھ فروخت کر دیا، الپتگین نے اس کے چہرے پر عقل و دانش کے آثار دیکھے تو اسے اپنے خاص لوگوں میں شامل کرلیا۔ بعد میں اسے اپنے لشکر کا امیر الامرا بنایا۔

حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ایران کا بادشاہ یزدجرد قتل کرایا گیا تو اس کی اولاد ترکستان کی طرف بھاگ گئی۔ سبکتگین انہی کی اولاد سے تھا۔

وہ نہ جانے کب تک اسی حال میں رہتا کہ اس پر ترقی کے دروازے کھلنے لگے۔ ہوا یوں کہ خلیفہ عبدالملک کا انتقال ہوگیا۔ امرائے بخارا نے الپتگین کے پاس ایک قاصد بھیجا۔

الپتگین اس وقت اپنے غلام سبکتگین سے عقل و دانش کی باتیں سیکھ رہا تھا کہ چوب دار نے بخارا سے آئے ہوئے قاصد کے آنے کی اطلاع دی۔ الپتگین نے اسی وقت اسے بلوالیا۔ وہ قاصدوں سے ہمیشہ خلوت میں ملاقات کرتا تھا لیکن قاصد بخارا سے آیا تھا اور عبدالملک کے انتقال کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے اس لیے اس نے یہی سمجھا کہ کوئی ازحد ضروری پیغام ہوگا۔ اس نے اتنا وقت بھی ضائع نہیں کیا کہ اٹھ کر جاتا یا غلام کو باہر جانے کو کہتا۔

"جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، خلیفہ قضائے الٰہی سے رحلت فرما چکے ہیں اور یہ فیصلہ اب تک نہیں ہوسکا ہے کہ حکومت کسے سونپی جائے۔ امرائے بخارا نے دریافت فرمایا ہے کہ آل سامان میں اب کوئی ایسا شخص ہے جو حکومت کرنے کا اہل ہو؟"

الپتگین نے جواب طلب نگاہ سے سبکتگین کی طرف دیکھا۔ پھر اچانک اسے اپنی حیثیت یاد آگئی۔ قاصد کی موجودگی میں ایک غلام سے رائے لینا ٹھیک نہیں۔ اس نے خود جواب دینا مناسب سمجھا۔

"میرا یہ پیغام امرائے بخارا تک پہنچا دو کہ منصور بن عبدالملک ابھی نوجوان ہے لہٰذا حکومت کا اہل اس کے چچا سے زیادہ کوئی نہیں۔"

قاصد کے رخصت ہوجانے کے بعد سبکتگین نے بولنے کی جسارت کی۔ "یہ آپ نے کیا پیغام پہنچا دیا۔"

"میری رائے میں یہی مناسب تھا۔ کیا تمہارا خیال اس کے برعکس ہے؟"

"یہ صحیح ہے کہ رموز مملکت بادشاہ ہی جانتے ہیں لیکن اگر اجازت ہو تو غلام کچھ عرض کرے۔"

"تمہاری باتوں کو میں نے ہمیشہ سے سنا ہے۔"

"آپ نے ایک طرح سے منصور بن عبدالملک کی مخالفت کردی ہے۔ اگر امرائے بخارا منصور ہی کو تخت پر بٹھا دیتے ہیں تو یہ مخالفت منصور کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی رہے گی۔ اگر وہ تخت پر نہیں بیٹھ سکا تو بھی وہ اس حق تلفی کو آپ کی مخالفت کا نتیجہ سمجھے گا۔ آپ کو سکوت اختیار کرنا چاہیے تھا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو لیکن اب تو تیر کمان سے نکل چکا۔"

سبکتگین کا اندلذہ درست نکلا۔ قاصد یہ پیغام لے کر بخارا آیا تو امرا نے الپتگین کی رائے کو کوئی اہمیت نہیں دی اور منصور کو تخت نشیں کردیا۔ بعض امرا نے منصور کے کان میں یہ بات بھی ڈال دی کہ الپتگین نے اس کی مخالفت کی تھی۔

منصور بن عبدالملک نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی الپتگین کو اپنے حضور طلب کیا۔ الپتگین کے دل میں چور تھا کیونکہ وہ منصور کی مخالفت کر چکا تھا۔ اس کے پاس جانا آزادی کو قید سے بدلنا تھا۔ اس نے علم سرکشی بلند کیا۔ دو تین ہزار سواروں کو ساتھ لیا جو اس کے غلام تھے اور خراسان سے غزنی کی طرف روانہ ہوا۔ سبکتگین اس کے لشکر کا سپہ سالار تھا۔

سبکتگین نے دلیری دکھائی اور ایک ہی حملے میں غزنی کو فتح کرلیا۔

الپتگین غزنی کا خود مختار حکمراں بن گیا۔ خراسان اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔

الپتگین نے پندرہ سال تک ہمت و اقبال مندی سے حکومت کی۔ اس عرصے میں سبکتگین کے جوہر خوب کھلے۔ اس نے اپنے آقا کے حکم سے کئی بار ہندوؤں سے جہاد کیا اور کامیابی حاصل کی۔

الپتگین کے انتقال کے بعد حکومت اس کے بیٹے ابواسحٰق کے پاس گئی لیکن کچھ ہی عرصے بعد اسحٰق کا انتقال ہوگیا۔ ارکان سلطنت نے سبکتگین کے چہرے پر فتح مندی کے آثار دیکھ کر اسے بادشاہ تسلیم کرلیا۔

ایک غلام غزنی کا بادشاہ بن گیا۔ ایک شاہانہ عزم کے ساتھ جہاد پر کمربستہ ہوگیا۔ وہ ہندوستان پر حملے کرنے لگا،

وہاں سے غلام اور مال غنیمت لاتا تھا۔

اس نے الپتگین کی بیٹی سے شادی کرلی۔

وہ ان دنوں دریائے چناب کے کنارے واقع شہر سوہدرہ (وزیرآباد) میں ایک مقامی ہندو حکمراں سے برسرپیکار تھا۔ اس نے یہاں ایک خواب دیکھا کہ اس کے مکان کے آتش دان سے ایک بڑا درخت پیدا ہوا جس کے سائے کے تلے پوری دنیا آگئی۔ آنکھ کھلی تو وہ اس خواب کے بارے میں سوچنے لگا، خواب مبارک معلوم ہورہا تھا لیکن کوئی واضح تعبیر سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اس نے باقی رات کچھ سوتے، کچھ جاگتے گزار دی۔

اس نے سوچا تھا کہ صبح ہوتے ہی وہ اس خواب کے بارے میں کسی سے مشورہ کرے گا لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ خواب کی تعبیر خود اس کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔

ایک شخص غزنی سے آیا تھا اور اتنی تیزی میں تھا کہ گھوڑا دوڑاتا ہوا سبکتگین کے خیمے کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا حالانکہ یہ بے ادبی تھی۔ اسے پیدل چلتے ہوئے آنا چاہیے تھا۔ اس نے پہرے داروں کی پروا بھی نہیں کی اور سبکتگین کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔

"اے شخص! کیا تو سارے آداب بھول گیا ہے حالانکہ میں نے تجھے پہچان لیا ہے۔ تجھے کیا کہنا ہے؟"

"حضور، بات ہی اتنی خوشی کی ہے کہ مجھے کچھ یاد نہ رہا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرزند عطا کیا ہے۔"

"اللہ تیرا شکر ہے۔" سبکتگین کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ "تو نے میرے خواب کو سچ کر دکھایا۔"

پیغام لانے والا کچھ بھی نہ سمجھ سکا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس نے سبکتگین کی جانب سے انعام وصول کیا اور خیمے سے باہر نکل گیا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ سوہدرہ کے کنارے واقع مندر کو سبکتگین کے لشکر نے مسمار کردیا اور حریف راجا فرار ہوگیا۔ سبکتگین اس لڑکے کی پیدائش پر شکر گزار ہوا جس کے طالع کی مدد سے بت خانہ مسمار ہوا۔ سبکتگین نے اس لڑکے کا نام محمود رکھا۔ یہی لڑکا تاریخ میں سلطان محمود غزنوی کے نام سے مشہور ہوا۔

سبکتگین نے محمود کے ہوش سنبھالتے ہی اسے جنگی تربیت سے آراستہ کرنا شروع کردیا۔ اس بچے میں بھی کچھ ایسی خداداد صلاحیتیں تھیں کہ بچپن ہی میں وہ ایک اچھا شہسوار بن گیا۔ اس کی حرکات و سکنات سے دلیری اور بہادری بھی ظاہر ہوتی تھی۔ سبکتگین اسے ہر لڑائی میں ہم رکاب رکھنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ جوانی کی عمر میں پہنچ گیا۔

حکم خداوندی

ایک فقیر نے کسی درویش کو دیکھا جو نشے کی حالت میں بدمست ہورہا تھا۔ اسے دیکھ کر فقیر اپنے زہد پر فخر و غرور کرنے لگا۔ پھر اس نے تکبر کی وجہ سے اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔

وہ بدمست فقیر سر اٹھا کر کہنے لگا اگر خدا نے تجھ پر انعام کیا ہے تو اس کا شکر ادا کر، تکبر نہ کر کیونکہ غرور کرنے والوں کو محرومی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ شیطان تکبر کی وجہ سے ہی ذلیل و مردود ہوا تھا، کسی کو مصیبت میں گرفتار دیکھ کر ہنسنا نہیں چاہیے۔ کیونکہ خدانخواستہ کل تم بھی کسی مصیبت میں پھنس گئے تو پریشان ہوجاؤ گے۔ کیا خبر کہ قسمت کے پھیر سے کل تو بھی میری طرح نشے سے بدمست ہوکر گر پڑے اور لوگ تجھ پر ہنسیں۔ اگر خدا نے تجھے مسجد میں بیٹھنے کی توفیق دی تو آتش کدوں میں بیٹھنے والوں کی ہنسی تو نہ اڑا۔ ایسا نہ ہو کہ خدا انہیں مسجد میں اور تجھے آتش کدے میں پہنچا دے۔

مسلمان کو ہر حال میں خدا سے ڈرنا اور اس کا شکر ادا کرنا چاہیے اس لیے کہ حکم خداوندی کے بغیر پتا بھی حرکت نہیں کرسکتا۔ زمین و آسمان تقدیر سے باہر نہیں ہے۔ اس لیے اپنے عمل پر غرور کرنے کے بجائے تقدیر الٰہی سے خوفزدہ اور ذات باری پر متوکل ہونا چاہیے۔ اگر انسان کو توکل نصیب ہوجائے تو یہ بڑی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔

نصیحت: "دوسرے کی عیب جوئی نہیں کرنا چاہیے۔ توکل اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتوں میں سے ایک ہے۔"

قلمی تعاون محمد زریان سلطان۔ کراچی

www.pdfbooksfree.pk

اس کی عمر سولہ سال تھی کہ اسے اپنے باپ کے ساتھ ہندوستان کے راجا جے پال سے جنگ لڑنے کا موقع ملا۔

ان دنوں شمالی ہندوستان کا سب سے بڑا راجا جے پال تھا۔ اس کی سلطنت ایک طرف جلال آباد اور پارہ چنار تک تو دوسری طرف کشمیر کے جنوبی پہاڑی علاقے سے لے کر ملتان تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کے لیے ایک مقام بھٹنڈہ میں قیام کیا اور پھر ایک بہت بڑا لشکر لے کر مسلمانوں کی سلطنت کی طرف بڑھا۔ اس کے جواب میں سبکتگین نے بھی لشکر تیار کیا اور اس سے مقابلے کے لیے غزنی سے روانہ ہوا۔ کم سن محمود غزنوی جس کی ابھی مسیں بھیگ رہی تھیں، باپ کے ہم رکاب تھا۔ اس کے لیے یہ پہلی اتنی بڑی جنگ تھی لیکن وہ بے خوف بھی تھا اور چوکنا بھی۔ قدم قدم پر باپ کو مشورے دیتا جاتا تھا۔

''ہمارا لشکر راجا کے مقابلے میں بہت کم ہے۔'' محمود نے سبکتگین سے کہا۔

''تو کیا ہم واپس پلٹ جائیں؟''

''میرا یہ مقصد نہیں تھا بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس جنگ میں ہمیں طاقت سے زیادہ حکمت عملی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔''

''کوئی تجویز ہے تمہارے پاس؟''

''غورینہ اور گنڈا بک کے پہاڑ میری تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تیار کھڑے ہیں۔''

''کیسی تجویز؟''

''آپ میرے ساتھ اس پہاڑ کی چوٹی پر چلیے۔''

وہ اپنے باپ سبکتگین اور چند سرداروں کے ساتھ پہاڑ کی بلند چوٹی پر چلا گیا۔

''آپ لوگ جے پال کا لشکر ملاحظہ فرمائیں۔ انسانی سمندر ہے جو ٹھاٹیں مار رہا ہے۔ میں کل ہی اس چوٹی پر آیا تھا اور جے پال کے لشکر کو دیکھا تھا۔''

''ہم اسی لشکر کو اپنی طاقت سے چیونٹی کی طرح مسل دیں گے۔''

''یہ سمندر ہمیں ڈبو بھی سکتا ہے۔ اسی لیے میں نے بابا جانی کو مشورہ دینے کی جسارت کی تھی کہ وہ میری تیار کردہ حکمت عملی پر غور فرمائیں۔ مصلحت اس وقت اسی میں ہے کہ پانچ پانچ سو سواروں کے دستے بنائے جائیں۔ یہ دستے باری باری لڑیں۔ پہلے ایک دستہ میدان میں جائے۔ باقی لوگ پہاڑوں میں چھپے رہیں، جب یہ دستہ تھک جائے تو دوسرا روانہ ہو۔''

سبکتگین نے اس رائے کو پسند کیا۔ پہاڑ سے نیچے اتر کر دوسرے سرداروں سے بھی مشورہ کیا۔ سب نے اس رائے کو پسند کیا۔ سبکتگین کا سینہ اس وقت فخر سے پھول گیا۔

''محمود، میرے عظیم فرزند! میں نے تیری پیدائش کے وقت خدا سے دعا کی تھی کہ یہ بچہ میرا نعم البدل بنے۔ میرے ادھورے کاموں کو مکمل کرے۔ کفرستانِ ہند سے باطل کا خاتمہ کرے۔ بت فروش نہ ہو، بت شکن بنے۔ مجھے آج محسوس ہو رہا ہے میری یہ دعا قبول ہوئی ہے، تو ضرور تاریخ عالم میں نام پیدا کرے گا۔''

محمود کی تجویز کے مطابق دفاعی مورچے قائم کر دیے گئے جہاں غزنی فوج کے دستے متعین کر دیے گئے۔ ان سب کو اپنی اپنی باری پر دشمن کے سامنے آنا تھا۔

جنگ شروع ہوئی تو امیر سبکتگین، محمود غزنوی اور دوسرے سردار محض چند ہزار سواروں کے ساتھ دشمن پر جھپٹے۔

راجا جے پال اپنے ہاتھی پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ اس کی ایک لاکھ سپاہ کے مقابلے میں چند ہزار سوار میدان میں اترے تھے۔ ہنسنے کی تو بات ہی تھی لیکن کچھ ہی دیر میں وہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔

''یہ بالک کون ہے؟'' جے پال نے اپنے ایک سردار سے محمود کے بارے میں پوچھا۔ ''اس کے بدن میں بجلی سی بھری ہوئی ہے، کس بہادری سے لڑ رہا ہے۔ کون ہے؟''

''مہاراج! یہ سبکتگین کا بیٹا محمود ہے۔''

''اگر سبکتگین کے بعد حکومت اسے مل گئی تو یہ ہندوستان کے لیے بڑا خطرہ بن جائے گا۔''

''مہاراج! ابھی یہ ہماری تلواروں کے دم خم سے واقف نہیں۔''

''اپنے آدمیوں سے کہو، سب کو چھوڑ کر اس دلیر کو گھیر لیں۔ اس جنگ میں یہ بچ کر نہ جانے پائے۔''

جے پال کی نظریں محمود پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کی تلوار برق کی طرح کوند رہی ہے۔ گردنیں اڑاتی چلی جا رہی ہے۔ کبھی وہ قلب میں نظر آ رہا تھا، کبھی میمنہ اور میسرہ میں۔ پھر اس نے یہ بھی دیکھا کہ اس کے چند سرداروں نے محمود کو گھیرے میں لے لیا ہے لیکن یہ کیا، محمود گھیرا توڑ کر نکل گیا۔ اس کی مدد کے لیے غزنی سردار پہنچ چکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی لشکر کی پشت پر شور مچا۔ دفاعی مورچوں سے پانچ سو سواروں کا دستہ نکل آیا تھا۔ جے پال کی فوج کو اتنی عددی برتری حاصل تھی کہ اس نے اس حملے کو

سنبھال لیا۔ تھوڑی دیر نہیں گزری تھی کہ ایک اور تازہ دم دستے نے حملہ کر دیا۔ ہندو لشکر اس دستے کے خلاف بھی جم کر لڑنے لگا۔ اس کے بعد جنگ کا نقشہ ہی بدل گیا۔ دفاعی دستے ایک ساتھ باہر نکل آئے اور چاروں طرف سے حملہ کر دیا۔ ہندو لشکر اس ناگہانی آفت سے بوکھلا گیا۔ ان لوگوں نے یہ سمجھا کہ سبکتگین کو کہیں سے تازہ کمک مل گئی ہے۔ انہوں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ اس فرار میں بے شمار ہندو قتل ہوئے۔ لشکر کی تعداد کم ہوئی تو جے پال کا ہاتھی بھی میدان سے نکل گیا۔

مسلمانوں نے نیلاب (سندھ) کے کنارے تک ان کا تعاقب کیا اور وسیع پیمانے پر قتل وغارت گری کی۔ پشاور کے ملک دریائے نیلاب کے کنارے تک مسلمانوں کے ہاتھ میں آ گئے۔ ان مفتوحہ علاقوں میں قانون اسلامی رائج ہوا اور سبکتگین کے نام کا خطبہ وسکہ رائج ہوا۔

اس جنگ میں شاندار کامیابی کے بعد وہ امیر نوح بن منصور کی مدد سے آگے بڑھا اور خراسان اور ماوراءالنہر میں کئی شاندار کامیابیاں حاصل کیں۔

ان دنوں محمود نیشاپور میں تھا کہ اس کے پاس امیر سبکتگین کے انتقال کی روح فرسا خبر پہنچی۔ اس خبر کو سن کر وہ نیشاپور سے نکلنے ہی والا تھا کہ اس خبر نے اس کا پاؤں رکاب تک نہیں پہنچنے دیا کہ اس نے سنا اس کا بھائی اسمٰعیل (دوسری ماں سے) بلخ میں تخت نشیں ہو گیا ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ باپ نے مرنے سے پہلے خود اسے نامزد کیا تھا۔

محمود غزنوی، باپ کی نامزدگی کے احترام میں خاموش ہو گیا لیکن بہت جلد یہ خبریں بھی اس تک پہنچنا شروع ہو گئیں کہ اسمٰعیل ایک نااہل حکمران ثابت ہوا ہے۔ مملکت کے کام کاج انتشار کا شکار ہیں۔ معاملہ بھائی کا تھا اس لیے وہ لشکر کشی سے دور رہنا چاہتا تھا۔ اس نے بھائی کی نصیحت کے لیے ایک خط تحریر کیا۔

''والد گرامی جو ہم سب کے پشت پناہ تھے، وہ اس دنیا سے کوچ کر چکے ہیں۔ ان کے بعد تم سے زیادہ مجھے کوئی عزیز نہیں۔ تم میری آنکھیں ہو۔ جو کچھ تمہاری خواہش ہو میں اسے پورا کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن سلطنت کے قیام کے لیے سن رسیدہ اور پختہ کار ہونا ضروری ہے۔ تم مجھ سے عمر میں چھوٹے ہو اور تمہاری عقل ودانش بھی تمہاری عمر کے مطابق ہے۔

والد صاحب نے جو تمہیں اپنا جانشین مقرر کیا تھا وہ مصلحتِ وقت کا تقاضا تھا کیونکہ میں دور تھا۔ اچھائی اور برائی کے فرق کو سمجھو۔ غزنی جو ہماری حکومت اور رعب داب کا سرچشمہ ہے مجھے دے دو تاکہ بلخ وخراساں کو دشمنوں سے پاک صاف کر کے تمہیں دے دوں۔ یہ تمہارے قابو میں آنے والے نہیں۔''

امیر اسمٰعیل نے اپنے بھائی کے خط کی مطلق پروا نہیں کی اور مخالفت پر ڈٹا رہا۔ محمود نے یہ حال دیکھ کر اپنے چچا اور سب سے چھوٹے بھائی کے ساتھ لشکر جرار اکٹھا کیا اور دارالحکومت کے قریب پہنچ گیا۔ امیر اسمٰعیل بھی اپنا لشکر لے کر بلخ سے آگے بڑھا۔ محمود نے اپنے سب سے چھوٹے بھائی نصیر الدین کو اسمٰعیل کے پاس بھیجا کہ وہ اسے اس جنگ سے باز رہنے کی تلقین کرے۔ اسمٰعیل اپنی ضد پر ڈٹا ہوا تھا بلکہ اس نے مزید کسی سفارت کا انتظار بھی نہیں کیا اور حملے میں پہل کر دی۔ جنگ ہوتی رہی اور بالآخر محمود نے اپنے قلب لشکر سے نکل کر ایسا زبردست حملہ کیا کہ اسمٰعیل کی فوج سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑی ہوئی اور غزنی میں قلعہ بند ہو گئی۔

محمود نے مختلف عہد وپیمان کر کے ان لوگوں کو قلعہ سے باہر نکالا اور ملک کے خزانے وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔ امیر اسمٰعیل اس کے سامنے لایا گیا۔

محمود نے اس سے پوچھا۔ ''اگر تمہاری قسمت یاوری کرتی اور تم جیت جاتے تو تم میرے ساتھ کیا سلوک کرتے؟''

اسمٰعیل نے جواب دیا۔ ''میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ اگر مجھے فتح نصیب ہوتی تو تمہیں ایک قلعے میں نظر بند کروں گا اور وہاں تمہیں راحت وآرام کا تمام سامان بہم پہنچاؤں گا۔''

سلطان محمود اپنے بھائی کے اس خیال کو سن کر خاموش ہو گیا لیکن چند دنوں بعد اس نے اسمٰعیل کو جرجان کے قلعے میں نظر بند کرا دیا اور راحت وآرام کا تمام سامان بہم پہنچا دیا۔

اسے یہ بھی کہلا بھیجا۔ ''اگر تم میں ذرا بھی عقل ہوتی تو میرے سوال کے جواب میں یہ کہتے کہ تم مجھے معاف کر دینے کا پکا ارادہ کر چکے تھے تاکہ میں بھی تمہارے ساتھ وہی سلوک کرتا۔''

بھائی کو سزا سنانے کا دکھ اسے اتنا تھا کہ اپنے چہرے کے تاثرات دیکھنے کے لیے آئینے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت وہ نہ جانے کس عالم میں تھا کہ ہزار مرتبہ کا دیکھا ہوا چہرہ آج اسے بدصورتی کا احساس دلا رہا تھا۔ اس کی صورت خوش نما اور خوب نہ تھی۔ چیچک کے داغوں نے اس کی صورت کو مزید بدنما بنا دیا تھا۔ وہ پہلی مرتبہ آئینہ نہیں

www.pdfbooksfree.pk

دیکھ رہا تھا لیکن اس وقت اسے اپنی بدصورتی کا شدت سے احساس ہوا۔ شاید اس لیے کہ اب وہ سلطان محمود تھا۔ ایک بڑی اسلامی مملکت کا بادشاہ۔

اس کا غلام ایاز جس سے وہ عشق کی حد تک لگاؤ رکھتا، حسن و جمال میں یکتا تھا۔ اس کے قریب کھڑا اپنے آقا کی بدلتی ہوئی کیفیات کو دیکھ رہا تھا۔

محمود نے اس سے کہا۔ ”مشہور ہے کہ بادشاہوں کی صورت دیکھ کر آنکھوں میں روشنی آتی ہے۔ ایک میری صورت ہے جسے دیکھ کر شاید دیکھنے والوں کو تکلیف ہوتی ہو۔“

ایاز کی ذہانت ضرب المثل تھی۔ اس وقت بھی اس نے ایسا جواب دیا کہ محمود کی تشفی ہوگئی۔ اس نے کہا۔ ”مالک! آپ کی صورت دیکھنے والے کم ہیں لیکن سیرت سے سب کا تعلق ہے۔ آپ کی اچھی سیرت خلق خدا کی بھلائی کا باعث بنے گی اور آپ کو ہر دل عزیزی حاصل ہوگی۔ خلق خدا پر آپ کی مہربانیاں اور آپ کے کارنامے آپ کو خوب صورت بنا دیں گے۔“

ایاز کی باتیں سن کر محمود کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

”آقا، میں نے کوئی غلط بات کہہ دی؟“

”یہ بات نہیں بلکہ تمہاری نصیحت سن کر مجھے ابا حضور کی یاد آگئی۔ میں نے اپنی جوانی کے ابتدائی دنوں میں غزنی کے اندر ایک باغ لگوایا تھا۔ اس میں ایک شاندار عمارت بھی تعمیر کرائی تھی۔ میرے والد اور دوسرے ارکان دولت جب اسے دیکھنے آئے تو والد نے فرمایا۔

”ایسی چیزیں تو تمہارے ملازم بھی بنوا سکتے ہیں۔ بادشاہوں کی شان و شوکت کا تقاضا تو یہ ہے کہ وہ ایسی عمارت کی بنیاد ڈالیں جس کی مثال پیدا نہ کی جا سکے۔“

میں نے پوچھا۔ ”وہ کون سی عمارت ہے؟“

ابا حضور نے فرمایا۔ ”ایسی عمارت سے مراد اہل علم کے دل ہیں۔ ان کے دل ایسے زرخیز ہیں کہ اگر تم ان میں اپنی محبت اور احسان کے بیج بو گے تو ان کے پھل ایسے ہوں گے جن کے چکھنے سے تمہیں دین و دنیا کی سعادت کی لذت ملے گی اور تمہارا نام حشر تک زندہ رہے گا۔“

ایاز، بالکل یہی بات آج تمہاری زبان سے ادا ہوئی ہے۔ میں نے اس وقت تو اس پر عمل نہیں کیا لیکن اب ضرور کروں گا۔ ایسے اہل علم کو دربار میں جگہ دوں گا جن کی قدر و منزلت فلک بلند سے بھی بلند ہوگی۔ ان کے کارناموں سے میری زندگی کا باب بھی روشن رہے گا۔ کبھی عدل و انصاف کو ہاتھ سے جانے نہیں دوں گا۔“

اس بات کو ہوئے چند روز گزر رہے تھے کہ اس کے دربار میں ایک شخص اپنی فریاد لے کر آیا۔ محمود نے اس سے اس کی شکایت پوچھی تو اس نے عرض کیا۔ ”میری شکایت ایسی نہیں کہ سب کے سامنے بیان کر سکوں۔“ محمود اسے فوراً اکیلے میں لے گیا۔

”اب بتاؤ تم پر کیا بپتا ٹوٹی ہے؟“

”میں تو آپ سے کہتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں کہ کہیں عتاب شاہی نازل نہ ہو۔“

”تم بے خطر ہو کر کہو۔“

”حضور، آپ کے بھانجے نے چند دنوں سے یہ روش اختیار کر رکھی ہے کہ وہ رات کو مست ہو کر میرے گھر میں داخل ہوتا ہے۔ مجھے تو مار مار کر گھر سے باہر نکال دیتا ہے اور خود میری بیوی کے ساتھ رات بسر کرتا ہے۔ ہم دونوں میاں بیوی دن بھر اس بے عزتی پر روتے رہتے ہیں۔ میں نے ہر امیر سے کہہ کر دیکھ لیا لیکن معاملہ چونکہ آپ کے بھانجے کا ہے اس لیے کسی میں اتنی جرأت نہیں کہ اسے روک سکے۔ اب میں آپ سے فریاد ہی کروں، آپ مجھ پر رحم فرما کر میرے معاملے میں انصاف کریں۔“

محمود اس کی داستان سن کر رونے لگا۔ ”اے شخص! تو اس سے پہلے میرے پاس کیوں نہیں آیا۔ یہ ظلم کیونکر برداشت کرتا رہا؟“

”میں پہلے دن سے یہ کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح آپ کے حضور حاضر ہو سکوں لیکن دربان مجھے آنے ہی نہیں دیتے تھے۔ آج بھی نہ جانے کس طرح نظر بچا کر اندر آ سکا ہوں۔“

”اچھا، اب ایک بات غور سے سنو۔ مجھ سے ملاقات کا حال کسی پر ظاہر مت کرنا۔ جب وہ سفاک تمہارے گھر میں داخل ہو اور تمہیں باہر نکال دے تو فوراً میرے پاس چلے آنا۔“

”حضور، رات کے وقت؟ مجھے آپ سے کون ملنے دے گا۔“

محمود نے دربانوں کو بلا کر اس کی صورت دکھا دی اور انہیں حکم دیا کہ یہ شخص جس وقت بھی آئے اس کی ملاقات مجھ سے کرا دینا۔

یہ شخص مطمئن ہو کر اپنے گھر چلا گیا۔ رات ہوئی تو وہ بادشاہ کے بھانجے کا انتظار کرنے لگا لیکن وہ بدبخت اس رات نہیں آیا۔

دوسری رات کو واقعہ پیش آ گیا۔ وہ ظالم گھر میں داخل ہوا اور اس شخص کو گھر سے نکال اس کی بیوی کے ساتھ

عیش و عشرت میں مشغول ہو گیا۔ وہ شخص گھر سے نکلا اور دوڑتا ہوا شاہی محل میں پہنچ گیا۔ دربانوں نے اسے سلطان محمود تک پہنچا دیا۔

”حضور، وہ گھڑی آ گئی ہے۔ آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔“

سلطان محمود اس کے گھر کی طرف چل دیا۔ گھر کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ شخص دیوار پھاند کر اندر گیا اور کنڈی کھول کر محمود کو اندر بلا لیا۔ محمود نے دیکھا کہ اس کا بھانجا بستر پر بے خبر سو رہا ہے۔ اس شخص کی بیوی اس کے قریب بیٹھی سسکیاں لے رہی ہے۔ محمود نے سرہانے رکھی شمع کو ہاتھ بڑھا کر بجھا دیا اور اپنا خنجر نکال کر بھانجے کا سر اس کے تن سے جدا کر دیا۔

”اگر تیرے گھر میں پانی ہے تو فوراً لے آتا کہ میں اپنی پیاس بجھاؤں۔“ سلطان نے پانی پیا اور رخصت ہونے لگا۔ ”اب صبح ہونے کو ہے۔ میرے سپاہی آ کر اس بدبخت کی لاش یہاں سے اٹھا لیں گے۔ اس وقت تک تو اس ناپاک وجود کو برداشت کر لے۔“

وہ جانے لگا تو اس شخص نے محمود کا دامن تھام لیا۔ ”بادشاہِ وقت! دین و دنیا کی نعمتیں آپ کو فیض یاب کریں۔ اس راز سے پردہ اٹھا دیجیے کہ شمع گل کرنے اور سفاک کا سر تن سے جدا کرنے کے فوراً بعد پانی پینے میں کیا مصلحت تھی؟“

”سننا چاہتا ہے تو سن۔ شمع تو میں نے اس لیے بجھائی تھی کہ اپنے بھانجے کا چہرہ دیکھ کر مجھے رحم نہ آ جائے اور انصاف ہاتھ سے چلا جائے۔ پانی مانگ کر پینے کی وجہ یہ تھی کہ جس دن سے تو نے اپنی روداد غم بیان کی تھی تو میں نے عہد کیا تھا کہ جب تک انصاف نہیں کر لوں گا نہ کچھ کھاؤں گا نہ پیوں گا۔“

اس شخص نے اپنی فریاد بہت راز میں رکھی تھی لیکن جلد ہی یہ قصہ باہر نکل گیا اور ہر طرف محمود کے عدل و انصاف کی دھوم مچ گئی۔

کئی مواقع اور ایسے آئے کہ دادرس کو انصاف مہیا ہو گیا اور محمود کی مقبولیت میں اضافے کا باعث بنا۔ وہ اب ایسی شاہراہ پر چل رہا تھا جہاں اس کی ہر دل عزیزی اس کی منتظر تھی۔ اس نے علم و ہنر کی ایسی پرورش کی کہ اس کا دربار اس وقت کے مشہور شعرا سے آراستہ ہو گیا۔ مورخین کا بیان ہے کہ محمود کے دربار سے چار سو شاعر وابستہ تھے۔

ان شعرا کو انعام و اکرام سے نوازنے میں بھی محمود کا کوئی مدمقابل نہیں تھا چنانچہ مشہور ہے کہ عصائری نام کا شاعر جو ”رے“ سے غزنی آیا تھا، اس نے محمود کی شان میں ایک قصیدہ لکھا جس کے معاوضے میں محمود نے اسے چودہ ہزار درہم دیے تھے۔ فردوسی جیسا شاعر بے بدل اس کے دربار سے وابستہ تھا جس نے ”شاہ نامۂ فردوسی“ تخلیق کیا۔ ابوریحان البیرونی جیسا باکمال بھی محمود کے خوانِ نعمت سے وابستہ تھا۔ محمود خود بھی علم و فضل میں کمال رکھتا تھا۔ بعض مصنفین نے اسے فقہا میں شمار کیا ہے۔

محمود نے شاید سوچ لیا تھا کہ وہ ایک ایسے بادشاہ کی صورت میں تاریخ کے سامنے آئے گا جس کی علمی خدمات کا شہرہ ہوگا لیکن قسمت اسے بے شمار جنگوں کی طرف لے گئی۔ وہ دور ہی ایسا تھا جب بادشاہوں کو اپنا رعب قائم کرنے کے لیے جنگوں کا سہارا لینا ہی پڑتا تھا۔ خونریزی اور تلوار بازی سے گریز ممکن ہی نہیں تھا۔ محمود کے سامنے ایسے ہی حالات تھے جب وہ لشکر لے کر غزنی سے نکلا۔

امیر سبکتگین کے دور حکومت میں افغانستان کا کافی حصہ ہندوستان میں شامل تھا یا وہاں کے لوگ ہندو راجاؤں کے باجگزار تھے۔ امیر سبکتگین نے راجا جے پال سے کچھ علاقے چھین کر وہاں اسلامی قوانین رائج کر دیے تھے۔ ان جنگوں میں خود محمود بھی شامل رہا تھا۔ سبکتگین کے دنیا سے اٹھتے ہی جے پال ان علاقوں پر دوبارہ قابض ہو گیا۔

جے پال کی سرکشی کی اطلاعات برابر غزنی پہنچ رہی تھیں۔ پھر وہ سردار بھی واویلا کرتے ہوئے آ گئے جو پشاور اور آس پاس کے علاقوں میں متعین تھے۔ جے پال کے لشکر نے انہیں مار بھگایا تھا۔

سلطان محمود ان دنوں خراسان میں تھا کہ ان سرداروں نے محمود سے ملاقات کی۔

”میں نے یہ عہد تو کیا تھا کہ تخت نشیں ہوتے ہی ہندوستان کے راجاؤں سے جنگ کروں گا لیکن دربار کی درستگی نے مجھے اس جانب متوجہ ہی نہیں ہونے دیا۔ شاید یہ اسی کی سزا ہے جو میرے سردار اس ذلت و خواری کے ساتھ مجھ تک پہنچے ہیں۔ میں ہندوؤں کے خلاف جہاد کروں گا اور غزنی سے ہندوستان تک اسلامی پرچم بلند کروں گا۔“ اس دن کے بعد سے اس نے ہندوستان کے بارے میں معلومات جمع کرانا شروع کر دیں۔

ان دنوں ہندوستان بے شمار چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم تھا۔ پنجاب اور سرحد میں جے پال کی حکومت تھی۔ راجپوتوں کے مختلف گروہ مختلف علاقوں میں حکمران تھے۔

www.pdfbooksfree.pk

چوہان اجمیر میں حکمران تھے۔ تومار دہلی میں، پوار مالوہ میں، بھاٹیہ قوم بھیرہ میں تھی، ہری پر اس قنوج میں اور چنڈال بندیل کھنڈ میں حکومت کرتے تھے۔

یہ معلوم ہونے میں بھی محمود کو دیر نہیں لگی کہ ہندوستان میں مندروں کی تعداد ان گنت ہے۔ ان مندروں میں چھپی ہوئی بے پناہ دولت کے قصے بھی محمود کے کانوں تک پہنچے۔

''سلطان مکرم! ہندوستان کے مندروں میں اتنی دولت ہے کہ ہماری سلطنت مالا مال ہوجائے گی۔'' محمود کے سرداروں نے اسے ترغیب دینے کے لیے کہا۔

''جنگوں میں مال غنیمت ہمارے ہاتھ لگتا ضرور ہے لیکن ہم مال غنیمت کے لیے جنگ نہیں کرتے۔ میں نے ان جنگوں کا ارادہ اشاعت اسلام کے لیے کیا ہے نہ کہ مال و دولت کے لیے۔ آپ لوگ مندروں میں چھپی دولت کے بجائے ہندوستان کے راجاؤں کی فوجی طاقت کے بارے میں مجھے بتائیں تاکہ میں بھی اسی معیار کی تیاری کرسکوں۔''

محمود کے اس مطالبے پر ایک سردار اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور کہنا شروع کیا۔ ''ہند کے راجاؤں کی مجموعی افواج کسی بھی حملہ آور کو شکست دینے کے لیے کافی ہیں۔ ان راجاؤں کا سب سے بڑا ہتھیار مست جنگی ہاتھی ہیں جن کی سونڈیں دشمن کے سپاہیوں کو اٹھا کر پٹخ دیتی ہیں۔ راجپوتوں کی بہادری کا یہ عالم ہے کہ جب کمزور پڑنے لگتے ہیں تو اپنا تمام مال واسباب اور بیش قیمت اشیا حتیٰ کہ اپنی عورتوں تک کو نذر آتش کرکے میدان میں کود پڑتے ہیں۔ اس وقت انہیں اپنی موت کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ اس حالت میں ان راجپوتوں سے مقابلہ کرنا آسان نہیں ہوتا۔''

''ان کی یہ کمزوری تو بہرحال اپنی جگہ ہے کہ یہ ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ہندوستان پر اس وقت کوئی ایک راجا حکومت نہیں کررہا ہے۔ ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔'' محمود نے اپنی رائے دی۔

وہ سردار پھر بول اٹھا۔ ''ان راجاؤں کا اختلاف صرف آپس کی حد تک ہے لیکن مذہب کے نام پر سب ایک ہوجاتے ہیں۔ اگر کوئی غیر مذہب کا حکمران ان پر حملہ کرے تو سب مل کر اس سے لڑتے ہیں۔''

''آپ لوگوں کی فراہم کردہ معلومات سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہندوستان کو ایک ہی حملے میں زیر کرنا ممکن نہیں۔ ہمیں بار بار ہندوستان کی طرف جانا ہوگا۔ یہ وہ دشمن ہے جسے مارا نہیں جاسکتا، کمزور کرنا ہوگا۔ اتنا کمزور کہ وہ اپنی موت خود مرجائے۔''

اس کے سرداروں نے اس سے اتفاق کیا۔

اس کا غلام ایاز ابھی اس کے پاس سے اٹھ کر گیا تھا۔ رات بہت بیت گئی تھی۔ اب تہجد کا وقت قریب تھا۔ اس نے وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑا ہوگیا۔

سلام پھیرنے کے بعد اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

''مالک عزوجل۔ تیری مدد کے بغیر میں حقیر بندہ کچھ بھی نہیں۔ میری افواج میرا لشکر کسی کام کا نہیں۔ اگر تیری مدد شامل حال نہ ہو۔ میں نے کفرستان ہندوستان پر حملہ آور ہونے کا قصد کیا ہے۔ مال غنیمت اور کشور کشائی کے لیے نہیں بلکہ دین حنیف کی اشاعت کے لیے، نعرۂ توحید بلند کرنے کے لیے۔ اگر مجھے شکست ہوئی تو اس ظلمت کدے میں چراغ جلانے والا کوئی دوسرا بادشاہ مجھے نظر نہیں آتا۔ مجھے غیب سے طاقت عطا فرما۔ ہندو راجاؤں پر میری ہیبت طاری فرمادے۔ مجھے نصرت سے ہمکنار فرما۔''

اس وقت سلطان کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اور وہ خدا کے حضور گڑگڑا رہا تھا۔ یہاں تک کہ فجر کی اذان بلند ہوئی۔ سلطان نے مسجد پہنچ کر باجماعت نماز ادا کی اور خلاف معمول علی الصباح دربار خاص طلب کرلیا۔

اراکین سلطنت جمع ہوئے تو اس نے ان سب کو مخاطب کیا اور اپنے عزائم ان پر ظاہر کیے۔

''مسلمان بادشاہوں کو صرف اتنا ہی زیب نہیں دیتا کہ وہ درباروں کی زیب و زینت کا اہتمام کرتے رہیں۔ تلوار اگر اٹھائیں بھی تو اپنے ذاتی مفاد کے لیے بلکہ ان کا فرض ہے کہ وہ خدا کے دشمنوں سے جنگ کریں اور کفر کے اندھیروں میں اسلام کی شمع روشن کریں۔ ہندوستان اس وقت کفر وضلالت کا گڑھ بنا ہوا ہے۔ ہندوؤں کے مضحکہ خیز اعتقادات، پجاریوں اور پنڈتوں کی عیاشیوں کی بے شمار داستانیں ہمارے کانوں تک پہنچتی رہتی ہیں۔ ہمیں اس پر بھی اعتراض نہیں تھا لیکن ہندو راجاؤں کے عزائم یہ ہیں کہ وہ اسلامی علاقوں پر قابض ہوجائیں اور وہاں بھی اپنی بے ہودہ رسومات رائج کریں۔

ان راجاؤں میں سب سے زیادہ شرانگیز راجا جے پال ہے جو فتنے پیدا کرتا رہتا ہے۔ امیر سبکتگین نے جے پال سے پشاور کا علاقہ اور کابل و درۂ خیبر کا درمیانی علاقہ جنگ کرکے حاصل کیا تھا اور وہاں اسلامی قوانین رائج کیے تھے مگر اب جے پال نے یہ علاقے دوبارہ اپنے قبضے میں کرلیے ہیں۔ وہ سمجھ رہا ہے کہ اب کسی مسلمان امیر میں یہ

طاقت نہیں رہی کہ وہ راجا کا مقابلہ کرسکے۔ اس کی یہ غلط فہمی دور کرنے کی ضرورت ہے ورنہ اس کی ہمت دراز ہوتی رہے گی۔ میں نے پختہ ارادہ کرلیا ہے کہ میں ہندوستان پر حملوں کا آغاز کروں گا اور اس کی ابتدا جے پال سے مقابلے کی صورت میں ہوگی۔ آپ لوگ تیاری کریں اور یہ یاد رکھیں کہ دعوت اسلام پھیلانے کے لیے دریائے سندھ تک کا علاقہ فتح کرنا اور راجا جے پال کی فوجی قوت کو کچلنا نہایت ضروری ہے۔''

اس کے حکم کے مطابق اس کے سرداروں نے لشکر فراہم کیے۔

شوال کا مہینا تھا 391ھ کا سال آگیا تھا کہ محمود غزنوی دس ہزار سوار لے کر پشاور آگیا۔ راجا جے پال بھی بارہ ہزار سوار، بہت سے پیادے اور تین سو ہاتھی لے کر مقابلے پر آیا۔

جے پال نے صفیں درست کرکے ہاتھیوں کو سب سے آگے رکھا۔ محمود نے تیراندازوں کو حکم دیا، تیروں کی بارش نے ہاتھیوں کو بدحواس کردیا۔ شمشیر زنوں نے ہاتھیوں کی سونڈیں کاٹ ڈالیں۔ دوبدو جنگ شروع ہوئی تو میدان جنگ ہندوؤں کی لاشوں سے پٹ گیا۔

دوپہر ہونے کو تھی کہ میدان تکبیر کے نعروں سے گونج اٹھا۔ محمود نے ایسا بھرپور حملہ کیا کہ دشمن گھبرا کر بھاگ کھڑا ہوا۔

اس مرتبہ جے پال کو بھاگنے کا موقع نہ مل سکا۔ وہ اپنے چند رشتہ داروں کے ساتھ گرفتار کرلیا گیا تاہم بھاری تاوانِ جنگ وصول کرکے اسے خراج کی ادائیگی کے وعدے پر رہا کردیا گیا۔

محمود نے چند حفاظتی دستے وہاں چھوڑے اور غزنی کی راہ لی۔

راجا جے پال اپنے بچے کھچے علاقوں میں واپس گیا تو شرمندگی سے اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ رانیوں نے اس کا سواگت کیا لیکن وہ خاموش رہا۔

محمود سے شکست کے بعد وہ ایسا دلبرداشتہ ہوا کہ کھانا پینا اور رانیوں کے پاس جانا سب کچھ چھوڑ دیا۔ پھر ایک دن اس کے جی میں کیا سمائی کہ اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ ایک چتا تیار کرو اور اس میں اچھی طرح آگ بھڑکا دو۔'' وہ حیران تھے کہ یہ حکم کس لیے دیا جارہا ہے لیکن حکم عدولی بھی نہیں کرسکتے تھے۔ جب چتا تیار ہوگئی تو اس نے اپنے بیٹے انند پال کو بلایا۔

''انند پال، میں نے جب محمود کو پہلی مرتبہ اس کے باپ سبکتگین کے ہم رکاب دیکھا تھا اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ یہ لڑکا ہندوستان کے لیے خطرناک ثابت ہوگا۔ اس نے مجھے شکست دے کر یہ بات سچ کر دکھائی۔ ہمارے بزرگوں کا قاعدہ رہا ہے کہ جب کوئی راجا دو مرتبہ شکست کھا جائے تو اسے حکمرانی کا حق نہیں رہتا۔ میری غیرت نہیں چاہتی کہ میں زندہ رہوں۔ چتا جل رہی ہے۔ کچھ دیر میں یہ آگ مجھے پاک کردے گی۔ میں تمہیں ولی عہد مقرر کرتا ہوں اور نصیحت کرتا ہوں کہ محمود سے لڑائی کرنے میں کبھی پہل مت کرنا۔ محمود خطرناک حکمران ہے۔ اگر جنگ کرنا ہی پڑجائے تو تمام راجاؤں کو ساتھ ملا کر اس سے مقابلے کے لیے نکلنا۔''

جے پال نے بیٹے کو نصیحت کی اور خود بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلوں کے درمیان بیٹھ گیا۔

جے پال کے اس انجام نے محمود کو مطمئن کردیا تھا لیکن وہ طے کرچکا تھا کہ ہر ایک سال کے وقفے کے بعد ہندوستان پر حملے کیا کرے گا اور آہستہ آہستہ پورے ہندوستان پر قابض ہوجائے گا۔ اس مرتبہ اس کے نشانے پر ملتان کے قریب ایک علاقہ بھاطنہ یا بھاٹیہ تھا جو ایک ہندو راجا ''بجے راؤ'' کا دارالسلطنت تھا۔ اس راجا نے چونکہ سلطان کے خلاف جے پال کی مدد کی تھی اس لیے اس کی سرکوبی ضروری تھی۔

سلطان غزنوی، ملتان کی سرحد سے گزر کر بھاطنہ کے قریب اتر گیا۔ بھاطنہ کے گرد کھنچی ہوئی شہر پناہ بے حد بلند اور مضبوط تھی۔ اس کے گرد نہایت چوڑی اور گہری خندق تھی جسے عبور کرنا تقریباً ناممکن تھا۔

راجا بجے راؤ کو اپنی فوج کی کثرت اور ہاتھیوں پر اتنا ناز تھا کہ محمود سے مقابلے کے لیے نکل آیا، ورنہ شہر پناہ سے اندر جانا محمود کے لیے تقریباً ناممکن تھا یا اسے ایسی سرتوڑ کوشش کرنی پڑتی جو اس نے پہلے کبھی نہیں کی ہوتی۔

فریقین میں زبردست جنگ ہوئی۔ بجے راؤ کا غرور بے جا نہیں تھا۔ تین روز کی خوں ریز جنگ کے بعد بھی حالت یہ تھی کہ کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔ تیسرے دن تو یہ حالت تھی کہ مسلمانوں کے قدم اکھڑنے لگے تھے۔ اندھیرے نے جنگ روک دی ورنہ شاید فیصلہ ہو ہی جاتا۔

سلطان محمود ابھی ابھی میدان جنگ سے لوٹا تھا، اس کے کپڑے گرد آلود تھے۔ جوتوں میں پاؤں جل رہے تھے لیکن اس نے تھکن اتارنے کے لیے آرام کی زحمت بھی نہیں کی اور تھکے ہارے سرداروں کو بھی اپنے حضور طلب کرلیا۔

''آپ لوگ دیکھ رہے ہیں کہ تین دن گزر جانے کے

www.pdfbooksfree.pk

باوجود ہمیں کامیابی نہیں مل سکی ہے۔"

"سلطان، ہم شرمندہ ہیں۔"

"میں آپ لوگوں کو الزام نہیں دے رہا ہوں۔ میں نے تو صرف یہ کہنے کے لیے آپ کو بلایا ہے کہ کل "سلطانی جنگ" ہوگی۔ فوج کا ہر فرد جان دینے کے لیے تیار ہوجائے۔ کل یا تو ہم نہیں ہوں گے یا فتح ہمارے ساتھ ہوگی۔ بس اب آپ لوگ جائیں اور آرام کریں۔"

رات آگئی تھی۔ محمود کی لشکر گاہ میں ہر طرف خاموشی تھی۔ دن بھر کی لڑائی کے بعد تھکے ہارے سپاہی اپنے جسموں کو آرام دے رہے تھے۔ جانور بھی اتنا تھک گئے تھے کہ ہنہنانا بھول گئے تھے۔

محمود اپنے رب کے آگے سجدہ ریز تھا اور رو رو کر اپنی فتح کے لیے مدد طلب کر رہا تھا۔

بجے راؤ کا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ وہ مندر میں تھا اور اپنے معبودوں سے مدد کا خواستگار تھا۔

اس دن کا سورج طلوع ہوا تو بجے راؤ نے اپنی فوج کو مسلح ہونے کا حکم دیا اور اپنے لشکر کو لے کر میدان میں آیا۔ غزنی لشکر بھی مقابلے کے لیے تیار تھا۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ چند گھنٹوں بعد کون زندہ رہتا ہے کون شہید ہوتا ہے۔

حکم ملتے ہی مسلمانوں نے دائیں اور بائیں سے بہ یک وقت ہندوؤں پر حملہ کر دیا۔ پسینے سے زیادہ خون بہہ رہا تھا۔ دونوں طرف کے سیکڑوں سپاہی مارے جا چکے تھے لیکن ہندوؤں کے پاؤں ابھی تک زمین پر لگے ہوئے تھے۔

محمود قسم کھا چکا تھا کہ یہ جنگ کا آخری دن ہوگا لیکن اب سورج چھپنے میں کچھ ہی دیر رہ گئی تھی اور فیصلہ ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ محمود نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور اپنے قلب لشکر کو لے کر ہندوؤں کے قلب لشکر پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا زبردست تھا کہ ہندوؤں کا لشکر تتر بتر ہوگیا۔ ان کے قدم اکھڑنے لگے، محمود نے یہ دیکھ کر حملے میں مزید تیزی پیدا کی۔ بجے راؤ نے دیکھ لیا کہ نتیجہ سامنے ہے۔ اس نے اپنی بھاگتی ہوئی فوج کو ساتھ لیا اور قلعے میں پناہ گزیں ہوگیا۔

اس کے اور محمود کے درمیان گہری خندق حائل تھی۔ محمود نے خندق کو پاٹنے کا حکم دے دیا۔ کئی دنوں کی کوشش کے بعد یہ گہری خندق اس قابل ہوگئی کہ اسے پار کیا جاسکتا تھا۔

بجے راؤ یہ سب کارروائیاں دیکھ رہا تھا۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ محمود کے سپاہی خندق پار کرلیں گے تو وہ بدحواس ہوگیا۔ اس کے ساتھ جو لشکر تھا وہ دشمن سے لڑنے کی تیاری کرنے لگا لیکن بجے راؤ نے بزدلی کا مظاہرہ کیا، اس نے اپنے لشکر کو محمود کے مقابلے پر چھوڑا اور خود رات کے اندھیرے میں اپنے چند خاص آدمیوں کے ساتھ فرار ہوگیا۔

بجے راؤ کے لشکر نے محمود کی فوج کو روکنے کی کوشش کی لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ بجے راؤ فرار ہوگیا ہے تو انہوں نے قلعے کی دیواروں پر سفید جھنڈا لہرا دیا۔ محمود کسی خاص کوشش کے بغیر قلعے میں داخل ہوگیا۔

بھاطنہ اپنے تمام مضافات کے ساتھ اسلامی مملکت میں داخل ہوگیا۔

محمود کو اب بجے راؤ کی تلاش تھی جو مفرور تھا۔ محمود کے جاسوس ادھر ادھر گھوم پھر کر یہ جاننے کی کوشش کر رہے تھے کہ بجے راؤ بھاگ کر کہاں گیا ہوگا۔ اس مہم کے دوران اڑتے اڑتے یہ خبریں ملیں کہ وہ دریائے سندھ کے قریب جنگل میں چھپا ہوا ہے۔ اس کی تصدیق اس طرح بھی ہوگئی کہ ایک روز چند ہندو تاجر اپنے حق میں رعایتیں طلب کرنے کے لیے محمود کے پاس آئے۔ محمود نے ان کی باتیں بڑی توجہ سے سنیں اور مہربانی سے انہیں کچھ رعایتیں دے دیں۔ یہ تاجر محمود کے رویے سے سخت متاثر ہوئے اور بجے راؤ کی شکایتیں کرنے لگے۔

"مہاراج بجے راؤ تو ہمارا ہم قوم تھا لیکن محصول میں اتنی رقم وصول کر لیتا تھا کہ ہمیں گھاٹا ہی گھاٹا دیکھنا پڑتا تھا۔ اسے ہماری ہائے لگی ہے کہ اب سندھ کے جنگلوں میں خاک چھانتا پھر رہا ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم کہ وہ وہاں ہے؟"

"آس پاس کے دیہاتیوں نے تو ہمیں یہی بتایا ہے۔ انہی کی زبانی ہمیں یہ معلوم ہوا کہ بھاطنہ میں اب مسلمانوں کی حکومت ہے۔ ہم تو بہت ڈر رہے تھے یہاں آتے ہوئے مگر آپ تو بڑی مہربانی سے ملے۔"

اب اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ بجے راؤ دریائے سندھ کے کنارے جنگل میں چھپا ہوا ہے۔ وہ ہمیشہ وہاں چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ وہاں سے چلا جائے اسے تلاش کر کے گرفتار کرنا ضروری تھا۔ محمود نے اپنے لشکر کا ایک حصہ اس کی گرفتاری کے لیے روانہ کر دیا۔

یہ لشکر برق رفتاری سے روانہ ہوا اور جنگل میں داخل ہوگیا۔ بہت جلد ایسے آثار مل گئے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ بجے راؤ یہیں ہے۔

بجے راؤ نے خطرے کو بھانپ کر یہاں سے بھی بھاگنے کی کوشش کی لیکن محمود کا لشکر اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس

نے جب دیکھا کہ فرار کا کوئی راستہ نہیں تو اپنا خنجر اپنے پیٹ میں گھونپ لیا۔

مسلمان سپاہیوں نے اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا اور بجے راؤ کا سر کاٹ کر محمود کی خدمت میں پیش کر دیا۔

ملتان کا حاکم شیخ حمید لودھی، امیر سبکتگین کے بہی خواہوں میں سے تھا، اطاعت و فرمانبرداری کرتا رہا تھا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا پوتا داؤد بن نصر ملتان کا حاکم مقرر ہوا۔

یہ شخص "قرامطی" فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔

قرامطیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بہ ظاہر تو مسلمان تھے لیکن ان کے عقائد اسلام سے بالکل مختلف تھے، وہ کہتے تھے نیکی اور بدی کوئی چیز نہیں۔ نہ کوئی جزا ہے نہ سزا۔ زندہ رہو اور عیش کرو۔ حرام حلال کی تمیز کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

یہ تعلیمات خفیہ رکھی جاتی تھیں۔

مورخوں نے لکھا ہے کہ درحقیقت یہ فرقہ عیسائی مبلغوں کی سازش کے تحت وجود میں آیا تھا۔ اس کے ذریعے مسلمانوں کی بربادی مقصود تھی۔

یہ فرقہ ایران سے ہندوستان میں وارد ہوا۔ یہاں چونکہ اسلام دشمنی میں ہندو راجاؤں نے اس فرقے کی حمایت کی اس لیے اس فرقے کو یہاں پنپنے کے خوب مواقع ملے۔ ملتان کا حاکم داؤد بھی اس فرقے میں شامل ہوگیا اور جے پال کے بیٹے انند پال کے ساتھ مل کر سازشیں شروع کر دیں۔ محمود کی اطاعت سے بالکل ہی ہاتھ اٹھا لیا۔

محمود غزنی پہنچ کر اپنی مملکت کے انتظام و انصرام میں مشغول ہوگیا تھا لیکن یہ خبریں برابر اس تک پہنچ رہی تھیں۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ داؤد بن نصر نے انند پال سے گٹھ جوڑ کر لیا ہے۔

یہ خبریں اسے غضب ناک کرنے کے لیے بہت تھیں۔ اس نے لشکر تیار کیا اور ملتان کی فتح کے لیے روانہ ہوا۔ اس کے لشکر نے ابھی دھول اڑائی تھی کہ حاکم ملتان داؤد کا چہرہ گرد آلود ہوگیا۔ اس نے انند پال کی طرف آدمی دوڑائے۔

"مسلمانوں کا بادشاہ سلطان محمود ملتان کو غارت کرنے کے لیے آگے بڑھ رہا ہے۔ آپ مجھ سے دوستی کا حق ادا کیجیے اور محمود کا راستہ روکنے کے لیے فوجیں روانہ کیجیے۔ ادھر میں ملتان کی مضبوطی کا انتظام کرتا ہوں۔"

محمود کی فوجیں بڑھی چلی آرہی تھیں کہ انند پال کی فوج نے اس کا راستہ روک لیا۔ انند پال اس لشکر کے ساتھ بذات خود موجود تھا۔

انند پال اپنے باپ کی اس نصیحت کو بھول گیا تھا کہ محمود سے لڑائی میں کبھی پہل نہ کرنا۔ سلطان کا لشکر اس سرفروشی سے لڑا کہ دشمن کی فوج منتشر ہوگئی۔ انند پال نے بانسا پلٹتے دیکھا تو فرار ہوجانے ہی میں عافیت سمجھی۔ اسلامی لشکر اس کا تعاقب کرتے ہوئے دریائے چناب کے کنارے تک پہنچ گیا۔ بھاگتے بھاگتے انند پال کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ گھبرا کر کشمیر کے پہاڑوں میں گھس گیا۔

اب اس کا پیچھا کرنا مناسب نہیں تھا کیونکہ اصل مقصد ملتان پہنچنا تھا۔ محمود نے انند پال کی اس حرکت کو دل میں رکھا اور راستے کے اس روڑے کو ہٹا کر ملتان کی طرف بڑھا۔

داؤد نے جب دیکھا کہ ہندوستان کا سب سے بڑا راجا انند پال بھی محمود کا مقابلہ نہیں کر سکا ہے تو وہ مقابلے پر آئے بغیر قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔

محمود نے آگے بڑھ کر قلعے کا محاصرہ کر لیا۔

یہ محاصرہ ابھی جاری تھا کہ ایک بے چراغ رات میں حاکم ہرات ارسلان جاذب کی طرف سے ایک تیز رفتار قاصد سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس طرف سے کسی قاصد کا آنا غیر معمولی تھا۔ قاصد کی زبانی جو کچھ معلوم ہوا وہ بھی معمولی نہیں تھا۔ وہ ترکوں کی بے وفائی کا قصہ لے کر حاضر ہوا تھا۔

سلطان محمود اور ترکستان کے حکمراں ایلک خاں کے درمیان صرف خلوص و محبت کا رشتہ نہیں تھا بلکہ ایلک خاں محمود کا خسر بھی تھا۔

جب سلطان محمود ملتان کی طرف روانہ ہوا اور خراسان، لشکر سے خالی ہوگیا تو ایلک خان کے دل میں لالچ نے جگہ بنائی۔ اس نے خراسان فتح کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے اپنے سپہ سالار سیارش یگن کو ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ خراسان فتح کرنے کے لیے بھیج دیا۔

ہرات کے حاکم ارسلان جاذب نے جب یہ خبر سنی تو غزنی کی طرف روانہ ہوا تاکہ وہاں پہنچ کر دارالسلطنت کی حفاظت کرے لیکن اس وقت تک ایلک خاں خراسان پر قبضہ کر چکا تھا۔

ہرات سے آنے والا قاصد یہی خبر لے کر آیا تھا۔

یہ خبر سلطان محمود کے لیے معمولی نوعیت کی نہیں تھی۔ اس کا دارالخلافہ اس کے ہاتھ سے چلا گیا تھا۔ اس نے اعلان

www.pdfbooksfree.pk

کر دیا کہ وہ محاصرہ اٹھا کر غزنی چلا جائے گا لیکن اسی رات غیب سے ایک سامان مہیا ہوگیا۔ حاکم ملتان کی طرف سے ایک وفد معافی کی درخواست لے کر محمود کی خدمت میں آیا۔

حاکم ملتان نے اپنی خطاؤں کی معافی طلب کی تھی اور ہر سال دس ہزار اشرفیاں سلطان کی خدمت میں پیش کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

کوئی اور موقع ہوتا تو محمود اس شرط پر صلح کے لیے تیار نہ ہوتا لیکن وہ تو پہلے ہی محاصرہ اٹھانے کا اعلان کر چکا تھا۔ اس نے اس صلح کو آبرومند سمجھا۔

حاکم ملتان کو ان حالات کا علم نہیں تھا۔ اگر وہ ایک رات ٹھہر جاتا تو صلح کے پیغام کے بغیر ہی اسے محمود سے نجات مل جاتی۔

سلطان محمود نے غزنی پہنچ کر ایک زبردست فوج تیار کی اور بلخ کی طرف روانہ ہوا۔ یہاں ایلک خاں نے جعفر نیکن کو یہاں کا کوتوال مقرر کیا تھا۔ وہ بھلا کس طرح محمود کی آمد کی تاب لاتا۔ وہ بھاگ کر ''ترمذ'' چلا گیا۔

ایلک خان نے چین کے بادشاہ قدرخاں سے مدد طلب کی۔ اس کے پانچ ہزار سوار مدد کو آگئے۔ ایلک خاں کی ہمت بڑھ گئی۔ اس نے دریائے جیحوں کو پار کیا اور بلخ سے چار میل کے فاصلے پر محمود کے مقابلے کے لیے مقیم ہوگیا۔

ایلک خاں اپنے مخصوص غلاموں کا دستہ لے کر آگے بڑھا اور مردانگی کے جوہر دکھانے لگا۔ محمود نے حملے کی شدت دیکھی تو گھوڑے سے اتر کر اپنا سر، زمین پر رکھ دیا۔ کامیابی کی دعا کی اور پھر گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ اب اس کی تلوار بجلی کی طرح کوند رہی تھی۔ اسے لڑتے ہوئے دیکھ کر اس کی فوج میں بھی ایک نیا ولولہ پیدا ہوگیا۔

ترکوں کی فوج میں ایسی بدحواسی پھیلی کہ وہ اپنے سرداروں کو چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ ایلک خاں نے بڑی مشکل سے جان بچائی اور دریائے جیحوں کو پار کر کے اپنے ملک میں پہنچ کر دم لیا۔

ایلک خاں کو شکست دینے کے بعد محمود نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ ایلک خاں کا تعاقب کیا جائے۔ شدید سردی کے دن تھے۔ برف باری بھی شروع ہوگئی تھی اس لیے سرداروں نے پس وپیش کی۔

''حضور، سردی بہت ہے۔ فوج کا ایک بڑا حصہ اس موسم کو برداشت نہیں کر سکے گا۔ کئی ہلاکتیں ہو جائیں گی اور فوج میں بددلی پھیل جائے گی۔''

محمود کی فطرت میں سخت گیری اور ضد تھی۔ اس نے سرداروں کے مشورے کو اہمیت نہیں دی۔ چاروناچار سرداروں کو اس کا حکم ماننا پڑا اور بادشاہ کے ساتھ لشکری بھی ایلک خاں کے تعاقب کے لیے روانہ ہوئے۔ سردی ایسی تھی کہ ہاتھ پیروں نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا لیکن یہ سپاہی اپنے آقا کے حکم کی تعمیل میں چلے جا رہے تھے۔ محمود خود بھی اس سردی میں ان کے ساتھ تھا۔ بس یہی ایک ڈھارس تھی جوان سپاہیوں کو تازہ دم رکھے ہوئے تھی۔

اس سفر کی تیسری رات اس قدر شدید برفباری ہوئی کہ آگے چلنا دشوار ہوگیا۔ مجبوراً رکنا پڑا کہ برف گرنی بند ہو تو آگے چلا جائے۔

سلطان محمود کے لیے ایک بڑا خیمہ لگایا گیا۔ اس خیمے کو گرم رکھنے کے لیے انگیٹھیاں اتنی تعداد میں جلائی گئیں کہ خیمے میں حدت پیدا ہوگئی۔ محمود اور اس کے امیر جو اس خیمے میں موجود تھے انہوں نے اپنے گرم کپڑے اتار دیے، یہ معلوم ہوتا تھا جیسے سردیوں کا موسم رخصت ہوگیا ہو۔

اسی وقت ایک غلام کسی کام سے محمود کے سامنے آیا۔ اسے دیکھ کر محمود کو مذاق سوجھا، اس نے غلام کو اپنے قریب بلایا۔

''باہر جا کر سردی سے کہنا، تم کیوں اس قدر جان توڑ کوشش کر رہی ہو۔ ہمارا تو گرمی کے مارے برا حال ہے۔ تن کے کپڑے اتارنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔''

غلام بھی اس مذاق کو سمجھ رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے باہر گیا اور واپس آ کر عرض کیا۔

''حضور، سردی نے یہ جواب دیا ہے کہ اگر بادشاہ اور اس کے خاص ندیموں پر میرا زور نہیں چلتا تو کیا ہوا۔ میں سائیسوں اور دوسرے ملازمین کو آج کی رات اس قدر تنگ کروں گی کہ کل صبح بادشاہ اور اس کے امیر اپنے گھوڑوں کی تیمارداری خود اپنے ہاتھوں سے کریں گے۔''

بادشاہ نے غلام سے تفریحاً ایک بات کہی تھی لیکن غلام کے جواب سے اس پر ظاہر ہوگیا کہ وہ خود تو انگیٹھیوں کی حدت سے سردی بھگا رہا ہے، باہر اس کے ملازموں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ اس نے واپسی کا اعلان کر دیا۔

ان جان لیوا مہمات سے نمٹنے کے بعد اسے ہندوستان کے راجا انند پال کا خیال آیا جو بڑی تیزی سے محمود کو نیچا دکھانے کے لیے کوشش کر رہا تھا۔ محمود ابھی تک اس کی اس حرکت کو نہیں بھولا تھا کہ اس نے ملتان جاتے ہوئے محمود کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی تھیں۔

محمود نے اپنے سرداروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''رفیقو! ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ وہاں دولت بھی بے پناہ

ہے لیکن ہم ابھی اس ملک کے چوتھائی حصے پر بھی قابض نہیں ہو سکے ہیں۔ ہمیں بہت دور تک جانا ہے لیکن انند پال بار بار ہماری راہ میں آتا ہے۔ اس کی طاقت کو مٹانا بے حد ضروری ہے ورنہ ہم ملک ہندوستان میں آگے نہیں بڑھ سکتے۔''

اس نے ایک مرتبہ پھر لشکر جرار تیار کیا اور ہندوستان پر حملہ آور ہوگیا۔ یہ ہندوستان پر اس کا چھٹا حملہ تھا۔

محمود کی روانگی کا چرچا ہوا تو انند پال پریشان ہوگیا۔ محمود کی طرف سے وہ سخت خوفزدہ رہنے لگا تھا۔ اسے بار بار اپنے باپ جے پال کی یہ نصیحت یاد آتی تھی کہ محمود سے لڑائی میں کبھی پہل نہ کرنا۔ اس کا مطلب ہی یہ تھا کہ اس سے ٹکر نہ لینا۔ اس نصیحت کے باوجود وہ محمود سے ٹکرا بھی چکا تھا اور شکست بھی کھا چکا تھا۔ اب پھر وہ بلائے ناگہانی کی طرح اس سے ٹکرانے کے لیے اس کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔

انند پال نے مذہب کا واسطہ دے کر ہندو راجاؤں کو اس کے ساتھ مل کر محمود سے مقابلے کی دعوت دی۔

مسلمانوں سے مقابلہ کرنا ہندو دھرم میں ثواب اور ترقی درجات کا باعث تھا اس لیے اُجین، گوالیار، کالنجر، قنوج، دہلی، اجمیر اور دوسرے راجاؤں نے لشکر کے دستوں کے دستے پنجاب کی طرف بھیجنے شروع کر دیے۔ محمود کے مقابلے پر پورا ہندوستان امڈ آیا تھا۔

ٹڈی دل لشکر انند پال کی ماتحتی میں روانہ ہوا۔ اس لشکر نے پشاور کے قریب پہنچ کر محمود کا راستہ روک لیا۔

ایک تیر کے فاصلے پر دونوں فوجیں ایک دوسرے کے سامنے خیمہ زن تھیں اور اس انتظار میں تھیں کہ دیکھیں پہل کون کرتا ہے۔

ہندوؤں کے لشکر میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ مشہور تھا کہ عورتیں اپنے زیور بیچ بیچ کر اپنے شوہروں کے سفری اخراجات برداشت کر رہی ہیں اور انہیں محاذ جنگ پر بھیج رہی ہیں۔

محمود نے سرفروشی کا یہ عالم دیکھا تو اپنے لشکر کے گرد خندق کھودنے کا حکم دیا تاکہ ہندوؤں کا کسی طرف سے بس نہ چل سکے۔

اس تیاری کے بعد سلطان محمود نے آغاز جنگ میں پہل کی۔ سلطان کے حکم سے ایک ہزار تیر انداز آگے بڑھے اور دشمن پر تیر اندازی شروع کر دی۔

اس موقع پر کھکر قوم کے ہندوؤں نے دلیری کی انتہا کر دی۔ تقریباً تیس ہزار سپاہی ننگے سر اور ننگے پاؤں عین لڑائی کے دوران دونوں طرف سے خندق پار کر کے مسلمانوں کے لشکر میں داخل ہوگئے اور مسلمانوں پر ایسے ٹوٹ پڑے جیسے شیر اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے تین ہزار مسلمان سپاہی شہید ہوگئے۔ سلطان محمود اتنا پریشان ہوگیا تھا کہ لڑائی بند کر کے اپنی قیام گاہ پر واپس آنے کا ارادہ کر لیا تھا کہ اچانک ایک معجزہ ظہور میں آگیا۔ وہ ہاتھی جس پر انند پال بیٹھا تھا، اچانک بھڑک اٹھا اور خوفزدہ ہو کر میدان جنگ سے بھاگا۔

انند پال کے ہاتھی کو بھاگتے ہوئے دیکھ کر ہندو لشکری یہ سمجھے کہ مسلمانوں کی بہادری سے خوفزدہ ہو کر انند پال میدان جنگ چھوڑ بھاگا ہے، اس کی بزدلی کو تصور کر کے وہ لشکری بھی راہ فرار ڈھونڈنے لگے جو اس کی مدد کے لیے آئے تھے۔

محمود کے بڑے بڑے سردارانِ فوج ان بھاگنے والوں کے تعاقب میں روانہ ہوئے۔ دو دن اور دو رات تک ان ہندو فراریوں کا تعاقب کیا اور آٹھ ہزار ہندو تہ تیغ کر دیے گئے۔ تیس ہاتھی اور بے شمار مال واسباب لا کر محمود کے قدموں میں ڈھیر کر دیا۔

انند پال نے گجرات کا رخ کیا تھا۔ سلطان محمود نے سیدھا گجرات کا رخ کیا، اب انند پال پر محمود کا ایسا رعب طاری ہوا تھا کہ معمولی سی جھڑپ کے بعد ہی انند پال صلح کرنے پر مجبور ہوگیا۔ راجا نے تاوانِ جنگ کے علاوہ ہاتھیوں کا ایک دستہ بھی تحفے میں دیا۔

راجا انند پال ہندوستان کا سب سے بڑا راجا سمجھا جاتا تھا۔ اس کے خلاف کامیابی نے محمود کے حوصلے بڑھا دیے۔ اس نے اسلام کی اشاعت کا پکا ارادہ کر لیا۔ اس کے جاسوس ہندوستان کے بارے میں اسے مسلسل خبریں پہنچا رہے تھے۔ انہی کے زبانی اسے ''نگرکوٹ'' کے بارے میں معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ یہاں پہاڑ کی چوٹی پر ایک قلعہ بنایا گیا تھا جو ''قلعۂ بھیم'' کے نام سے مشہور تھا اور ہندوؤں کے نزدیک یہ قلعہ بتوں کا گڑھ تھا۔ گردوپیش کے تمام راجا اعلیٰ درجے کی اشیا بطور نذرانہ وہاں بھیجتے تھے اور ثواب کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ یہ عمل برسوں سے جاری تھا لہٰذا یہاں سونے چاندی، ہیرے جواہرات اور بیش قیمت موتیوں کا ایسا ذخیرہ ہوگیا تھا کہ بڑے سے بڑے بادشاہ کا خزانہ بھی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

اس قلعے کو چونکہ مندر کی حیثیت حاصل تھی اور یہ تصور کر لیا گیا تھا کہ ان مقدس بتوں کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا اس لیے یہ قلعہ سپاہیوں سے خالی تھا۔ بڑی تعداد میں مندر کے پجاری تھے جو اس قلعے کے مکیں تھے۔

www.pdfbooksfree.pk

سلطان محمود اس قلعے کے سامنے جا کر کھڑا ہوا تو برہمنوں اور مندر کے پجاریوں کو سخت حیرت ہوئی۔ اس مندر کو راج نیتی سے کیا تعلق۔ یہ تو عبادت گاہ ہے، مسلمان بادشاہ یہاں کیا کر رہا ہے۔ راستے میں کسی راجا نے اس کی مزاحمت کیوں نہیں کی؟ یہ سوال جیسے ہی ذہنوں میں آیا پنڈتوں پر سلطان کا رعب طاری ہوگیا۔ جب کسی راجا میں اتنی ہمت نہیں کہ محمود کو روک سکے تو ہم کس گنتی میں ہیں۔ تین دن بعد ان پنڈتوں نے قلعہ کا دروازہ کھول دیا اور محمود کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔

''اے مسلمانوں کے بادشاہ! ہم میں اتنی طاقت نہیں کہ تیرا مقابلہ کرسکیں۔ یہ کام تو راجاؤں کے کرنے کا تھا لیکن ایسا لگتا ہے وہ سب تجھ سے ڈرتے ہیں۔ ہم اپنے بتوں کے نام پر تجھ سے بھیک مانگتے ہیں۔ تو یہاں سے چلا جا۔''

''تم مجھے مسلمان بھی کہتے ہو اور بے جان مورتیوں کا واسطہ بھی دیتے ہو۔ تم جانتے ہو میں بار بار ہندوستان کیوں آتا ہوں؟''

''بھگوان جانے۔ ہم تو تم سے لڑنے کبھی نہیں گئے۔''

''تمہارے ایک راجا جے پال نے یہ جسارت کی تھی۔ وہ میری سرحدوں میں گھس آیا تھا۔ وہ اگر غالب آجاتا تو کوئی مسجد سلامت نہ چھوڑتا۔ تمہارے موجودہ راجاؤں میں اتنی ہمت نہیں کہ میرا راستہ روک سکیں۔ میرا خدا میری مدد کر رہا ہے لیکن تمہارے بت بے جان ہیں۔ تمہاری مدد نہیں کرسکتے۔ میں ہندوستان میں خدا کا دین پھیلانے آیا ہوں۔ تمہیں بھی دعوت دیتا ہوں کہ تم مسلمان ہوجاؤ۔''

''مہاراج! یہ ہم سے نہیں ہوگا۔ ہم تو تم سے یہ کہنے آئے تھے کہ ہمیں امان دے دو۔ ہماری جان بخش دو۔ ہم نے قلعے کے دروازے تمہارے لیے کھول دیے ہیں۔''

''ہمارے دین میں زبردستی نہیں ہے۔ میں تمہاری جاں بخشی کا وعدہ کرتا ہوں۔''

محمود اپنے چند خاص ندیموں کے ہمراہ قلعے میں داخل ہوا۔ ساٹھ لاکھ اشرفیاں، سات سو من سونے چاندی کے اوزار، دو سو من خالص سونا، دو ہزار من خالص چاندی اور بیس من انواع واقسام کے جواہرات۔ یہ تھی وہ دولت جو اس قلعے سے محمود کے ہاتھ لگی۔

یہ بے بہا دولت لے کر وہ غزنی روانہ ہوا۔ اس نے شہر سے باہر ایک مکان بنوایا۔ اس میں سونے اور چاندی کے تخت بچھوائے اور وہ تمام مال واسباب جو وہ نگرکوٹ سے لایا تھا ان تختوں پر قرینے سے سجا دیا۔ شہریوں کو عام دعوت تھی کہ وہ آئیں اور دولت کے اس ڈھیر کو اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کریں، کیا دیہاتی کیا شہری، لوگ جوق در جوق آرہے تھے اور اس نمائش کو دیکھ رہے تھے۔ ہر طرف ہندوستان میں پچھی دولت کے چرچے ہو رہے تھے۔

یہ نمائش تین دن جاری رہی۔ لوگ دیکھتے تھے اور تعجب کرتے تھے۔ اس دولت کا بیشتر حصہ محمود نے نیکوں اور مستحقین کو عطیہ کردیا اور بڑا حصہ شاہی خزانے میں داخل ہوگیا۔

اس عظیم الشان فتح کے بعد اس نے اپنی مملکت کو وسیع کرنے کے لیے ''غور'' پر حملہ کیا۔ حاکم غور دس ہزار سوار لے کر مقابلے کے لیے نکلا۔ دونوں لشکروں میں سخت معرکہ آرائی ہوئی۔ غوریوں کی جانبازی کا یہ عالم تھا کہ صبح سے دوپہر ہوگئی اور محمود ان سرفروش غوریوں کو ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹا سکا۔

محمود نے یہ عالم دیکھا تو حکم دیا۔ ''دشمن کو دھوکا دیا جائے۔''

سلطان کی فوج دشمن کو دھوکا دینے کے لیے میدان سے بھاگ نکلی۔ غوری اس جھانسے میں آگئے اور بھاگنے والی فوج کے تعاقب میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس تیزی سے بھاگے کہ خود اپنی کھودی ہوئی خندق پار کر گئے۔ اس طرح وہ نادانستگی میں کھلے میدان میں آگئے۔ محمود اسی وقت کے انتظار میں تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کی باگ پھیر دی۔ اشارہ ملتے ہی لشکر بھی پلٹ گیا اور غوریوں کو تلوار پر رکھ لیا۔ غوری لشکر گاجر مولی کی طرح کٹنے لگا۔

محمد بن غوری جانفشانی سے لڑ رہا تھا لیکن لشکر اس کا ساتھ چھوڑ گیا تو اس نے بھی میدان سے نکل جانا چاہا لیکن اس کی بدقسمتی کہ محمود کے ایک سپاہی کی نظر اس پر پڑ گئی۔ اس نے کمند پھینکی اور محمد بن غوری گھوڑے سے نیچے آگیا۔ لشکریوں نے اسے گرفتار کیا اور محمود کے سامنے لے آئے۔

محمود نے اسے دیکھ کر کہا۔ ''کیا میری اطاعت کا پیغام تم تک نہیں پہنچا تھا؟ پھر تم نے میری اطاعت کیوں نہیں کی؟''

''وہ تو میں اب بھی نہیں کرتا ورنہ تم سے جنگ کیوں کرتا۔''

''تم نے جنگ کرنے کا نتیجہ دیکھ لیا؟''

''شکست اور فتح دونوں جنگ کا حصہ ہوتی ہیں۔''

''میں تمہیں موت کی نیند سلا سکتا ہوں۔''

''یہ کام تو میں خود بھی کرسکتا ہوں۔'' اس نے کہا اور اپنی انگوٹھی اپنے ہونٹوں سے لگالی۔ اس انگوٹھی کا نگینہ غالباً زہر آلود تھا اور ایسا خطرناک زہر تھا کہ زبان پھیرتے ہی زہر نے اثر دکھایا۔ جتنی دیر میں کوئی کچھ سمجھتا۔ محمد بن غوری زمین پر گرا اور جان، جان آفریں کے سپرد کردی۔

علاقہ غور بھی سلطان محمود کے قبضے میں آگیا۔

ملتان سے ایک مرتبہ پھر سرکشی کی خبریں آرہی تھیں۔ ملتان کے حاکم نے مذہب کے ساتھ ساتھ اطاعت سے بھی منہ موڑ لیا تھا۔ محمود کے پہلے حملے کے وقت اس نے قرامطی عقائد سے توبہ کرلی تھی لیکن اب وہ پھر اپنے عقائد کی طرف لوٹ آیا تھا۔ محمود کے پیٹھ موڑتے ہی وہ سب قول وقرار بھول گیا تھا۔ اس کی شہ پاکر قرامطیوں نے ملتان کے مسلمانوں کو تنگ کرنا شروع کردیا تھا۔

محمود اسے (داؤد کو) سزا دینے کے لیے ایک مرتبہ پھر ملتان پہنچ گیا اور نہایت قہر وغضب کے عالم میں ملتان فتح کرلیا۔ بہت سے قرامطیوں اور کافروں کو موت کے گھاٹ اتارا اور داؤد کو گرفتار کرکے اپنے ساتھ غزنی لے گیا۔ ایک مدت بعد داؤد نے غزنی کے قلعے میں قید حیات سے نجات پائی۔

یہ محمود کا آٹھواں حملہ تھا جو اس نے ہندوستان پر کیا۔

اس کے امیر سات مرتبہ ہندوستان پر حملے کرچکے تھے۔ اب ان کا شوق جہاد کسی اور منزل کی تلاش میں تھا لیکن دور ونزدیک کوئی محمود کا مدمقابل نہیں تھا۔ سب اس کے مطیع ہوچکے تھے۔ ایک امیر نے پھر ہندوستان جانے کی صلاح پیش کی لیکن بات قہقہوں میں اڑ گئی۔

''ہم ہندوستان کو اتنی مرتبہ چیر پھاڑ چکے ہیں کہ بے چارے ہندوستان کے راجاؤں پر رحم آتا ہے۔''

''ابھی ہندوستان کی دولت ختم نہیں ہوگئی۔ اگر ہم پاؤں توڑ کر بیٹھ گئے تو گھاٹے میں رہیں گے۔'' ایک امیر نے کہا۔

''تو کیا ہم دولت کے لیے ان راجاؤں سے ٹکراتے ہیں؟''

سلطان محمود بڑی دلچسپی سے ان امیروں کے درمیان ہونے والی نوک جھوک کو سن رہا تھا کہ اسی وقت اس وفد نے باریابی کی اجازت چاہی جو ہندوستان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے گیا ہوا تھا۔ اس وفد کی قیادت محمود کا ایک امیر حسن میمندی کر رہا تھا۔ محمود نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ پورے وفد کو اندر بلایا جائے اس نے حسن میمندی کو اپنے حضور طلب کیا۔

''محترم امیر، ایسی کون سی انوکھی اور دلچسپ معلومات ہیں جو تم ہندوستان کی طرف سے لائے ہو؟''

''حضور، معلومات تو ایسی لایا ہوں کہ اسے اس خاکسار کی جانب سے سوغات سمجھیے گا۔''

''ایسی بات ہے تو ضرور سنائیے۔''

''ہندوستان میں ایک مقام تھانیسر ہے۔ اس شہر کی حیثیت ہندوؤں کے نزدیک ایسی ہے جیسی کہ مسلمانوں کے نزدیک کعبے کی۔ یہاں ایک بہت پرانا مندر ہے۔ اس میں بڑے بڑے بت رکھے ہوئے ہیں۔ سب سے بڑے بت کا نام ''جگ سوم'' ہے۔ اس بت کے بارے میں اہل ہنود کا ایمان ہے کہ اس کا وجود اس وقت ظہور میں آیا تھا جس وقت دنیا میں انسان پیدا ہوا تھا۔ اہل ہنود اس کی پرستش کرتے ہیں۔ حضور کے قدم ابھی تک اس سرزمین کی طرف نہیں گئے ہیں۔ اگر آپ اس بت کو توڑیں گے تو اسلام کی بڑی خدمت ہوگی۔ اتنے قدیم مندر میں مال ودولت بھی بے انتہا ہوگا جو غزنی کے خزانے کو بھر دے گا۔''

محمود نے حسن میمندی کو انعام واکرام دے کر رخصت کیا اور تھانیسر پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کردیں۔ ایک مرتبہ پھر غزنی میں شور مچا کہ محمود ہندوستان کی طرف روانہ ہونے والا ہے۔ پورے شہر میں جشن کی سی کیفیت تھی۔ محمود جب بھی ہندوستان کا قصد کرتا، خراسان میں خصوصاً خوشی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ اس خوشی میں مذہبی جذبہ بھی کارفرما ہوتا تھا اور یہ امید بھی کہ ہندوستان سے واپس آکر محمود، ضرورت مندوں کا منہ موتیوں سے بھر دے گا۔ اس کے امرا اور شعرا حضرات بھی انتظار کیا کرتے تھے کہ وہ کب ہندوستان کا رخ کرتا ہے۔

سلطان محمود تازہ دم لشکر کے ساتھ پنجاب کے علاقے میں پہنچا تو اسے راجا انند پال کا خیال آیا۔ اس کے تعاون سے تھانیسر تک پہنچنے میں بڑی آسانی ہوسکتی تھی۔ انند پال اور محمود کے درمیان ایک صلح نامہ طے ہوگیا تھا اس لیے اسے امید تھی کہ انند پال اس کے ساتھ تعاون ضرور کرے گا۔

سلطان نے ایک قاصد انند پال کے پاس بھیجا اور اس کو مطلع کیا۔

''اس بار میرا ارادہ تھانیسر پر حملہ کرنے کا ہے۔ مجھے پنجاب سے تھانیسر تک کا سفر طے کرنا ہے تم اپنے کچھ قابل اعتبار آدمی میرے ساتھ کردو تاکہ جو قصبہ تمہارا ہو وہ میری فوج کی دستبرد سے محفوظ رہے۔''

انند پال محمود سے خائف تو تھا لیکن ہندو بھی تو تھا۔ اسے اس خبر سے سخت دھچکا لگا کہ محمود تانیسر پر حملہ کرے گا اور وہاں کے بت خانوں کو توڑے گا۔ اس نے اپنے بھائی کو محمود کی خدمت میں بھیجا اور ایک خط اس کے نام دیا۔

اس خط میں لکھا تھا۔ ''میں آپ کی خدمت اور آپ

www.pdfbooksfree.pk

کے احکام کی تعمیل کے لیے ہر طرح سے حاضر ہوں لیکن اس قدر عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ تھانیسر کا مندر ہم ہندوؤں کی بہت بڑی عبادت گاہ ہے۔ اگر آپ کے مذہب میں بت شکنی ثواب حاصل کرنے کا ذریعہ ہے تو نگرکوٹ کے قلعے میں بتوں کو توڑ کر آپ اس مقصد کو پورا کر چکے ہیں۔

تھانیسر کے مندر کے سلسلے میں گزارش ہے کہ آپ اس کو تاخت وتاراج نہ کریں۔ اس مہربانی کے عوض آپ جو بھی طلب کریں گے، ادا کیا جائے گا۔ یہاں کی رعایا کو اپنا باج گزار بنا کر اپنے ملک واپس تشریف لے جائیں تو یہ بندۂ حقیر اپنی درخواست کی قبولیت کے شکریے کے طور پر ہر سال پچاس ہاتھی اور دیگر بیش قیمت اشیا ارسال کرے گا۔''

سلطان محمود نے ان باتوں کے جواب میں انند پال کو لکھا۔

''میں اس ارادے سے گھر سے نکلا ہوں کہ مذہب اسلام کی تبلیغ واشاعت کروں گا۔ ہمارے عظیم پیغمبر نے مذہب اسلام کی اشاعت کی تھی اور طاقت حاصل ہوتے ہی کعبہ میں رکھے بتوں کو مسمار کیا تھا۔ میرے پاس طاقت ہے پھر میں بت فروشی کیوں کروں، بت شکنی کیوں نہ کروں؟

جب دنیا سے بت پرستی کے رواج کو ختم کر دینا ہی ہمارا مقصد ہے تو پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ تھانیسر جیسے بت پرستی کے مرکز کو نظر انداز کر دیا جائے اور اس فتح کا ارادہ نہ کیا جائے۔''

انند پال، سلطان محمود کے اس جواب سے بہت مایوس ہوا لیکن اس کے مقابلے پر نہیں آسکتا تھا۔ اس نے اپنے علاقوں کو بچانے کے لیے اپنے آدمی محمود کے لشکر کے ہمراہ کر دیے اور انہیں ہدایت کر دی کہ پنجاب کی سرحد پار کراتے ہی واپس چلے آئیں۔

اس نے محمود کو الجھائے رکھنے کے لیے اپنے ملک کے تاجروں کو حکم دیا کہ وہ غلہ اور روغن وغیرہ لشکر سلطانی میں پہنچانے کا انتظام کریں۔

وہ چاہتا تھا کہ محمود ان اشیا کے حصول کی خاطر کچھ دنوں پنجاب ہی میں رکا رہے۔ محمود اس کی مہمان داری سے لطف اندوز ہونے لگا۔

انند پال نے ایک قاصد راجا دہلی کی طرف دوڑایا۔ اسے لکھ بھیجا کہ سلطان محمود ایک لشکر جرار لے کر آپ کی سلطنت کے مشہور مندر تھانیسر پر حملہ کرنے کے لیے بے چین ہے، پنجاب تک پہنچ چکا ہے، میں نے اسے حیلے بہانے سے پنجاب میں روک لیا ہے۔ اگر اس سیلاب کو نہ روکا گیا تو ہم سب اسی سیلاب میں بہہ جائیں گے۔ جتنی جلدی ہو تمام راجاؤں کو یکجا کر کے محمود کا مقابلہ کریں۔ آپ جب تک تھانیسر پہنچیں گے میں بھی آپ کی مدد کے لیے پہنچ جاؤں گا۔''

سلطان کے امیر پنجاب میں زیادہ قیام کے حق میں نہیں تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہندو راجا محمود کی آمد سے باخبر ہوں۔ بالآخر یہ بات محمود کی سمجھ میں آگئی۔ خود اسے بھی انند پال پر زیادہ بھروسا نہیں رہا تھا۔

انند پال اب بھی اسے روکنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس نے پڑاؤ اٹھا لیا۔ انند پال کے دو ہزار سوار اس کے ساتھ انند پال کی سرحد تک آئے۔

اس سے پہلے کہ راجا دہلی اس کے مقابلے پر آتا وہ تھانیسر پہنچ گیا۔ محمود کی ہیبت محمود سے پہلے پہنچ چکی تھی۔ شہر خالی پڑا تھا۔ محمود کے لشکر نے جی بھر کے غارت گری کا بازار گرم کیا۔ تمام بتوں کو پاش پاش کر دیا، سب سے بڑے بت ''جگ سوم'' کو غزنی بھجوا دیا اور حکم دیا کہ اس بت کو بیچ راستے میں ڈال دیا جائے تاکہ چلنے والوں کے پیروں کے نیچے پامال ہو کر رہ جائے۔

ایک مورخ کے بیان کے مطابق تھانیسر کے مندر سے بیش بہا دولت کے علاوہ ایک ایسا سرخ یاقوت بھی محمود کے ہاتھ لگا جس کا وزن 450 مثقال (ایک مثقال تقریباً 25 تولہ) تھا۔

کہا جاتا ہے اس فتح کے دوران وہ دو لاکھ لونڈیوں اور غلاموں کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ مورخین کا بیان ہے کہ اس سال غزنی میں اس قدر ہندوستانی صورتیں نظر آتی تھیں کہ غزنی بھی ہندوستان کا ایک شہر لگتا تھا۔

لشکر سلطانی کے ہر رکن کے پاس کئی کئی ہندوستانی لونڈیاں اور غلام تھے۔

سلطان نے 1013ء میں غرجستان کو فتح کر کے اس کے حاکم ''شار'' کو گرفتار کر لیا۔

اسی سال راجا انند پال کا انتقال ہو گیا۔ اس کا بیٹا (مختلف مورخوں نے اس کے مختلف نام لکھے ہیں) لاہور کا راجا بنا۔ سلطان محمود، انند پال سے صلح نامے کی لاج رکھ رہا تھا۔ اب وہ درمیان میں نہیں رہا تو اس نے ''بالنات'' کے مشہور قلعے ''نندونہ'' پر حملہ کر دیا۔ انند پال کا بیٹا اس حملے کی تاب نہ لا سکا۔ اس نے قلعہ چند سمجھ دار لوگوں کے حوالے کیا اور خود درۂ کشمیر میں جا کر چھپ گیا۔ محمود نے قلعے کا محاصرہ کر لیا اور دیواروں میں نقب لگانے کا حکم دیا۔

قلعہ اتنا مضبوط تھا کہ اس کام میں بہت دیر لگ گئی۔ محمود کی ان کوششوں سے بے خبر اہل قلعہ اس محاصرے سے عاجز آگئے اور ہتھیار ڈال دیے۔ محمود نے ان سب کو جان کی امان دی اور قلعے پر قبضہ کر کے اپنے ایک معتمدِ خاص کو قلعے کا حاکم مقرر کر کے خود درۂ کشمیر کی طرف روانہ ہوا۔ انند پال کے بیٹے نے اس کی آمد کی خبر سنی تو وہاں سے بھی بھاگ نکلا۔ محمود نے درے پر قبضہ کر لیا، اس کے ہاتھ بہت سا مال غنیمت آیا۔ بہت سے لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر آگے بڑھنے کے بجائے غزنی واپس چلے جانے میں عافیت سمجھی۔

یہ سلطان محمود کا ہندوستان پر دسواں حملہ تھا۔

اس کامیابی کے دو سال بعد یعنی 406ھ میں اسے کشمیر کی فتح کا خیال آیا۔ ایک مرتبہ پھر وہ غزنی سے نکلا اور ''لوہ کوٹ'' کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ یہ قلعہ اپنی بلندی اور مضبوطی کی وجہ سے مشہور تھا۔

قلعے کی مضبوطی نے محمود کے تمام ہتھیار کند کر دیے۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اور قلعہ سر ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا وہ یہ تاخیر بھی برداشت کر لیتا لیکن موسم کی شدت نے اس کے لشکریوں کے حوصلے پست کر دیے۔ برف باری شروع ہو گئی تھی اور وہ کھلے میدان میں پڑا تھا۔ اس نے لشکر کو ہلاکت میں ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔ محاصرہ اٹھانے کا حکم دیا اور غزنی کی طرف واپس چل دیا۔

کئی دن کا سفر طے کرنے کے بعد اچانک احساس ہوا کہ وہ غلط راستے پر آگیا ہے۔ اس نے لشکر کے ان لوگوں کو بلایا جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ ان راستوں سے بہ خوبی واقف ہیں۔ وہ بھی اس کے سامنے سر جھکا کے اعتراف کر رہے تھے کہ وہ راستہ بھٹک گئے ہیں۔

''ان علاقوں میں راستہ بھٹکنے کا مطلب جانتے ہو؟ کیا کبھی ہم ان بھول بھلیوں سے نکل سکیں گے؟ کیا ہمارے پاس اتنا غذائی سامان ہے کہ بھٹکتے رہیں اور بھوک سے مر نہ جائیں؟''

''ہم نے نقشوں کا خوب اچھی طرح مطالعہ کر لیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اب ہم جس طرف جا رہے ہیں وہ راستہ ہمیں یہاں سے باہر نکال لے جائے گا۔''

کارواں پھر چل پڑا لیکن شاید قدرت کو پھر امتحان مقصود تھا۔ چلتے چلتے وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ سارا جنگل پانی سے بھرا ہوا تھا۔ بہت سے لوگ اس پانی میں ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔

راستہ پھر بدلا گیا اور بڑی مشکل سے صحیح راستہ دریافت ہو سکا۔

ہندوستان میں محمود کی یہ پہلی ناکامی تھی۔

وہ بہت سے آدمیوں کو گنوا کر غزنی پہنچا تھا۔ اس کا دربار اس وقت سوگوار تھا۔ اس کے تخت کے دونوں جانب اس کے وفادار غلام ہاتھ باندھے، نظریں نیچی کیے کھڑے تھے۔ سامنے کی رو میں امرائے وقت کچھ شرمندہ کچھ افسردہ بیٹھے تھے۔ اس کا وفادار غلام ایاز اس کی پشت پر تھا۔ ان افراد کو سزا سنائی جا چکی تھی جو کشمیر سے واپسی میں لشکر کی رہنمائی کر رہے تھے اور جن کی وجہ سے لشکر غلط راستے پر چلا گیا تھا۔ اس لیے بھی ماحول پر سوگواری تھی۔ کچھ نہیں کھل رہا تھا کہ دربار کس لیے منعقد کیا گیا ہے کیونکہ ابھی تک محمود نے لب کشائی نہیں کی تھی۔ اس سناٹے میں کسی نے پتھر پھینکا۔

ابوالعباس مامون خوارزم شاہ کی جانب سے ایک قاصد دربار میں حاضر ہوا تھا۔ محمود نے اسے اپنے سامنے بلایا۔ یہ قاصد خوارزم شاہ کی جانب سے ایک خط لایا تھا جو اس نے محمود کی طرف بڑھا دیا۔ محمود نے تخت پر بیٹھے بیٹھے اس خط کو پڑھا اور خلاف توقع دربار ملتوی کر دیا۔

امرا میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ خط میں آخر ایسا کیا لکھا تھا کہ محمود دربار سے اٹھ گیا۔ بعد میں معلوم ہوا، اس خط میں درخواست کی گئی تھی کہ محمود اپنی بہن کی شادی خوارزم شاہ سے کر دے۔

محمود نے اس درخواست کو منظور کر لیا۔ خوارزم شاہ اب اس کا بہنوئی تھا۔ اس شادی کے سلسلے میں اسے خوارزم جانا پڑا۔ اس نے خوارزم شاہ کے دربار میں بڑی تعداد میں اہل علم ہستیوں کو دیکھا۔ محمود کا دربار بھی ایسی نامور ہستیوں سے بھرا پڑا تھا۔ کہا جاتا ہے وہ ان نامور ہستیوں پر چار لاکھ دینار سالانہ خرچ کیا کرتا تھا۔

سلطان خوارزم سے واپس آیا تو اس نے ایک خط خوارزم شاہ کے نام لکھا۔

''تمہارے دربار میں اتنے بے نظیر اہل علم وفن جمع ہیں، ان میں سے چند کو ہمارے دربار میں بھیج دو۔''

سلطان محمود کے پاس شیخ بوعلی سینا اور البیرونی کی شہرت کی خبریں پہنچ چکی تھیں جو اس وقت علم کے آسمان پر آفتاب بن کر چمک رہے تھے۔ سلطان کو معلوم تھا کہ یہ دونوں اس وقت خوارزم شاہ کے دربار میں موجود ہیں۔ اسی لیے اس نے یہ خط لکھا تھا۔ ممکن ہے ان دونوں کے نام بھی لکھ دیے ہوں۔

www.pdfbooksfree.pk

خوارزم شاہ نے یہ خط ان علما کو سنانے کے بعد کہا۔
''سلطان محمود کا یہ پیغام میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ میں آپ کو حکم دیتا ہوں کہ آپ غزنی جانے کو تیار ہو جائیں۔ اگر آپ وہاں جانے پر تیار نہیں تو پھر ایک ہی راستہ ہے کہ میری سلطنت چھوڑ کر کسی اور ملک چلے جائیں۔''

شاہ خوارزم کے دربار میں موجود علما ابن سہیل، ابن سینا اور دو چار نے سلطان کے دربار میں جانے سے انکار کر دیا اور ایران چلے گئے۔ البیرونی ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کرے۔

ابھی یہ معاملہ چل ہی رہا تھا کہ محمود کو اطلاع ملی کہ کچھ باغیوں نے فتنہ وفساد پیدا کر کے خوارزم شاہ کو قتل کر دیا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی وہ غزنی سے بلخ پہنچا اور وہاں سے خوارزم کی طرف روانہ ہوا۔ وہ خوارزم کی سرحد کے قریبی علاقے حضر بند تک پہنچ کر رک گیا اور ایک امیر محمد طائی نامی کو لشکر کے ساتھ آگے روانہ کیا۔

یہ لشکر آگے جا کر ایک مقام پر صبح کی نماز ادا کر رہا تھا کہ خوارزم کے سپہ سالار خمار تاش اور اس کے لشکریوں نے کمیں گاہوں سے نکل کر حملہ کر دیا۔ حملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ غزنوی لشکر کے بہت سے سپاہی مارے گئے۔

محمود اپنے غلامانِ خاص کے ہمراہ پیچھے چلا آ رہا تھا۔ خمار تاش اس سے بے خبر تھا، اسے تو ہوش اس وقت آیا جب محمود بالکل قریب پہنچ گیا، اتنی دیر میں غزنوی لشکر بھی بہت سا نقصان اٹھا کر سنبھل چکا تھا۔ خمار تاش نے فرار ہونے کی کوشش کی لیکن گرفتار ہوا۔ اس کے لشکریوں نے مقابلہ کیا لیکن شکست فاش ہوئی۔ محمود خوارزم میں داخل ہو گیا۔

سلطان نے باغیوں کا قلع قمع کرنے کے لیے تلوار بے نیام کر لی۔ جس پر بھی بغاوت میں شامل ہونے کا شبہ ہوا اسے قتل کرا دیا گیا۔

کچھ لوگ قید ہو کر اس کے سامنے لائے گئے۔ ان میں ابوریحان البیرونی بھی تھا۔ اس کے قتل کا بھی حکم جاری ہوا۔ شاید اس لیے کہ اس نے سلطان کے حکم پر غزنی آنے سے انکار کر دیا تھا یا پھر وہ اسے پہچانا نہیں تھا۔

البیرونی اس کے سامنے آیا اور نہایت بے خوفی سے مخاطب ہوا۔

''اے بادشاہ! میں علم نجوم میں اپنے وقت کا امام ابوریحان البیرونی ہوں۔ سلاطین ایسے باکمال شخص سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ تو نے اگر مجھے قتل کرا دیا تو ایسے شخص کے طور پر یاد رکھا جائے گا جسے علم وفن کی قدر نہیں تھی۔''

بادشاہ اس کی تقریر سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ پھر وہ اسے اپنے ساتھ غزنی لے آیا اور اسے اپنے ندیمانِ خاص میں شامل کیا اور ایسی پرورش کی کہ البیرونی کو کسی اور دربار کی حاجت ہی نہیں رہی۔ وہ اپنی رحلت تک اسی دربار سے وابستہ رہا۔ اسی بادشاہ کی بدولت اسے ہندوستان میں قیام اور تحقیق کا موقع ملا۔ اسی قیام کی یادگار البیرونی کی تصنیف ''کتاب الہند'' ہے۔

⊕⊕⊕

سردیوں کا موسم گزر چکا تھا۔ موسم بہار کی آمد آمد تھی۔ سبزے نے زمین کو دلہن بنا دیا تھا۔ محمود کے فوجی تھکن اتار چکے تھے کہ محمود کے شوق جہاد نے کروٹ لی۔ اس مرتبہ اس نے قنوج جانے کا ارادہ کیا۔ اس کے پاس اس وقت ایک لاکھ کا لشکر تھا۔ اس کی روانگی کی خبر سن کر ترکستان اور خراسان وغیرہ سے بیس ہزار دیگر مسلمان آ گئے جو جہاد کی نیت لے کر گھر سے نکلے تھے۔

کوئی غیر ہندوستانی اب تک قنوج پر حملہ آور نہیں ہو سکا تھا۔ محمود پہلا شخص تھا جو اس عظیم لشکر کے ساتھ قنوج کے خطرناک راستے پر رواں دواں تھا۔ وہ سات ہولناک دریاؤں کو پار کر کے تین مہینے کی مدت میں قنوج ... کی سرحد پر پہنچا۔ راستے کی دشواریاں کیا کم تھیں، قلعے کو دیکھا تو محمود کو کہنا پڑا کہ یہ قلعہ اپنی بلندی اور مضبوطی کے اعتبار سے بے مثال ہے۔

محمود کا یہ سوچنا بجا تھا کہ ایسے مضبوط قلعے کو کس طرح سر کیا جائے گا۔ یہ بات بھی سمجھ میں آ رہی تھی کہ اب تک کسی حملہ آور نے اس طرف کا رخ کیوں نہیں کیا۔

قنوج کے راجا کا نام ''کورا'' تھا جو نہایت زبردست فرماں روا تھا لیکن جب اس نے قلعے کی فصیلوں سے انسانوں کا سمندر دیکھا تو وہ خائف ہو گیا۔ قلعے کا دروازہ کھلا اور راجا کورا کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اپنے بیٹوں اور درباریوں کے ساتھ قلعے سے باہر آ گیا۔ سلطان محمود کی خدمت میں پہنچ کر اطاعت کا اظہار کیا۔

ایک مورخ کا بیان ہے کہ ''کورا'' مشرف بہ اسلام بھی ہو گیا تھا۔

محمود نے قنوج کو اپنا باجگزار بنایا اور تین روز راجا کورا کی میزبانی کا لطف اٹھانے کے بعد قلعۂ میرٹ (برن) کی طرف بڑھا۔ یہاں کا راجا ہردت قلعے کو چند قابل اعتبار درباریوں کے سپرد کر کے خود کسی جنگل کی طرف نکل گیا۔ اہل قلعہ کو کیا پڑی تھی کہ مقابلہ کرتے۔ انہوں نے دس لاکھ درہم اور تیس ہاتھی محمود کی خدمت میں پیش کیے اور جان کی امان

www.pdfbooksfree.pk

طلب کی۔

سلطان وہاں سے قلعہ ''مہاون'' پہنچا۔ یہ قلعہ متھرا کے قریب تھا۔ دریائے جمنا قریب ہی بہتا تھا۔ حاکم قلعہ ہاتھی پر سوار ہوا اور چاہتا تھا کہ دریا پار کر جائے۔ سلطان کے لشکریوں نے اس کا پیچھا کیا۔ اس نے جب دیکھا کہ نہ آگے بڑھ سکتا ہے نہ پیچھے ہٹ سکتا ہے تو اس نے اپنا خنجر اپنے گلے پر چلا دیا۔

قلعہ فتح ہوگیا۔ پچاسی کوہ پیکر ہاتھی اور بے انتہا مال غنیمت لشکر اسلام کے ہاتھ آیا۔

یہاں سے متھرا شہر تک جانا مشکل نہیں تھا۔ محمود نے سن رکھا تھا کہ متھرا نام کا شہر ہندوؤں کے نزدیک نہایت مقدس ہے اور ''کرشن'' کی جنم بھومی سمجھا جاتا ہے۔

اس شہر میں مندروں کی بہتات تھی اور اتنی دولت اور نادر اشیا جمع تھیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ سلطان کے دبدبے کا یہ عالم تھا کہ جب سلطان اس شہر میں پہنچا تو کوئی شخص بھی جنگ کے لیے نہیں نکلا۔ یہ شہر راجا دہلی کے زیر نگیں تھا۔ وہ بھی ڈر کے مارے مقابلے پر نہیں آیا۔ محمود کسی روک ٹوک کے بغیر متھرا پر قابض ہوگیا۔ اس کے لشکریوں نے جی کھول کر اس شہر کو تاراج کیا۔ بہت سے بت خانوں کو توڑا اور جلایا۔

متھرا کی عمارتیں ایسی شاندار تھیں کہ خود محمود انہیں دیکھ کر حیران ہوا۔ اس کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے جو اس نے غزنی کے بعض امیروں کو لکھا تھا۔

''اس شہر میں ایک ہزار بلند ترین محل ہیں جن میں سے زیادہ تر سنگ مرمر کے بنے ہوئے ہیں اور مندر تو اتنی تعداد میں ہیں کہ میں ان کو توڑتے توڑتے تھک گیا ہوں۔''

مورخین کا بیان ہے کہ بے شمار مال غنیمت کے علاوہ پانچ سونے کے بنے ہوئے بت بھی تھے جن کی آنکھوں میں یاقوت جڑے ہوئے تھے۔ ان کی قیمت پچاس ہزار زرسرخ تجویز کی گئی تھی۔ ان بتوں میں سے ایک بت میں ارزنی یاقوت کا بھی ایک ٹکڑا جڑا ہوا تھا جس کا وزن چار سو مثقال تھا جب یہ بت پاش پاش کیا گیا تو اٹھانوے ہزار تین سو مثقال سونا اس میں سے برآمد ہوا۔ ان پانچ سونے کے بتوں کے علاوہ سو بت اور تھے۔ یہ سب کے سب چاندی کے بنے ہوئے تھے۔ ان بتوں کو توڑ کر جو چاندی حاصل کی گئی وہ اتنی تھی کہ سو اونٹوں پر لادی گئی۔

اس بت شکنی کے بعد متھرا کو آگ لگا دی گئی۔

یہ ہندوستان پر محمود کا تیرھواں حملہ تھا۔ اس حملے میں اس نے پے در پے سات آٹھ اہم مقامات فتح کیے۔ محمود کی ہیبت ایسی طاری ہوئی تھی کہ کسی جگہ بھی اسے مزاحمت کا سامنا نہیں ہوا حتیٰ کہ متھرا جیسے مقدس مقام کو بچانے کے لیے بھی اس کے مقابلے پر کوئی نہیں آیا۔

وہ متھرا کے بعد اردگرد کے قلعوں کو فتح کر چکا تو اس نے قریب ہی کے ایک مغرور اور سرکش راجا جندرائے سے دو دو ہاتھ کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ بھی مقابلے کی تاب نہ لا سکا اور اس اہل وعیال پہاڑوں میں جا چھپا۔ راجا کے پاس ایک نہایت ہی طاقتور اور کوہ پیکر ہاتھی تھا جو پورے ہندوستان میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ محمود نے اس ہاتھی کو خریدنے کی بار بار کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ جندرائے کے فرار کے بعد وہ ہاتھی اتفاق سے ایک رات بغیر فیل بان اپنے تھان سے بھاگا اور محمود کے خیمے کے پردے کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔ محمود کے چوب دار اس کے قریب جاتے ہوئے ڈر رہے تھے۔ ان چوبداروں نے آخر ہمت کی اور ہاتھی کو پکڑ لیا۔ وہ ایسا خاموش کھڑا تھا جیسے ان چوبداروں کا پالتو ہو۔

یہ ہاتھی چونکہ کسی محنت اور معاوضے کے بغیر محمود کے پاس چلا آیا تھا لہٰذا محمود نے اس کا نام ''خداداد'' رکھا اور اسے لے کر غزنی چلا آیا۔

غزنی پہنچ کر مال واسباب کی فہرست بنائی گئی تو معلوم ہوا اس سفر میں بیس ہزار اشرفیاں، کئی لاکھ روپے، پچاس ہزار لونڈی غلام، تین سو پچاس ہاتھی اور دوسری بیش قیمت اشیا حاصل ہوئی ہیں اور یہ بھی نعمت خداوندی تھی کہ اسے کسی جگہ بھی مقابلہ کرنا نہیں پڑا تھا۔ اپنا ایک آدمی گنوائے بغیر اتنی دولت لے آیا تھا۔ اس نعمت کے شکریہ کے طور پر اس نے غزنی میں ایک شاندار مسجد تعمیر کی۔ یہ پوری عمارت سنگ مرمر کی تھی اور دیگر بیش قیمت پتھر اس عمارت میں لگائے گئے۔

جب یہ مسجد تیار ہوگئی تو اسے خوب صورت قندیلوں سے بقعہ نور بنایا گیا۔ اس مسجد کا نام ''عروس فلک'' تھا۔

اس مسجد کے ساتھ ہی محمود نے ایک عالی شان مدرسے کی بنیاد ڈالی۔ مدرسے کے کتب خانے میں نایاب کتب جمع کیں، مسجد اور مدرسے کے اخراجات کے لیے کئی دیہات وقف کر دیے۔

محمود کے اس شوق نے دیگر امرا کی بھی رہبری کی۔ انہوں نے بھی بادشاہ کی تقلید میں مسجدیں، درس گاہیں اور مدارس قائم کیے۔ غزنی عروس البلاد بن گیا۔

ان کاموں سے نمٹنے کے بعد سلطان محمود نے ایک ''فتح نامہ'' جس میں اس کی تمام فتوحات کی تفصیل درج تھی،

خلیفۂ بغداد کی خدمت میں ارسال کیا۔

خلیفۂ بغداد نے محفل آراستہ کی اور یہ فتح نامہ بلند آواز سے پڑھ کر لوگوں کو سنایا گیا۔ ہر طرف سے سلطان محمود کی ہمت وجرأت پر آفرین کی صدائیں بلند ہوئیں۔ کہنے والوں نے یہ آواز بلند کہا کہ عرب، عجم، روم اور شام میں جو کارنامے صحابۂ کرام نے سرانجام دیے وہی ہندوستان میں سلطان محمود کی ذات سے ظہور میں آئے۔

سلطان محمود کو ہندوستان کی طرف گئے دو سال ہوگئے تھے کہ ایک وحشت ناک خبر نے اسے بے چین کر دیا۔ محمود نے جب قنوج پر حملہ کیا تھا تو وہاں کا راجا کورا نہ صرف اس کا اطاعت گزار ہوگیا، بلکہ اسلام بھی قبول کر لیا تھا۔ ہندو راجا اس کے اس فعل پر اس سے سخت نالاں تھے۔ محمود جیسے ہی متھرا وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد غزنی واپس آیا۔ ان راجاؤں نے ''کورا'' کے خلاف محاذ بنا لیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ کالنجر کے راجا نند پال نے قنوج پر حملہ کر دیا اور سلطان محمود کی اطاعت قبول کرنے کی پاداش میں راجا کورا کو قتل کر دیا۔

محمود نے راجا کورا کا انتقام لینے کے لیے اپنے چودھویں حملے کی کوششیں شروع کر دیں اور ایک کثیر لشکر فراہم کر کے ہندوستان کی طرف روانہ ہوا۔

جنگلوں اور گھاٹیوں کو عبور کرتا ہوا یہ لشکر دریائے جمنا کے کنارے پہنچ کر رک گیا یا اسے رکنا پڑا کیونکہ دریا کا پانی بہت چڑھا ہوا تھا اور دوسری طرف راجا انند پال کا بیٹا جو محمود سے کئی بار شکست کھا چکا تھا وہ اپنے لشکر کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ کالنجر کے راجا نند پال کی مدد کے لیے آیا تھا۔ دریا کے ساتھ ساتھ محمود کی راہ میں وہ بھی حائل ہوگیا تھا۔ اب کالنجر کے راجا سے پہلے انند پال کے بیٹے سے نمٹنا ضروری تھا لیکن دریا کا بہاؤ کہہ رہا تھا خبردار! آگے مت بڑھنا۔ لشکری آگے بڑھتے تھے اور خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ جاتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ سلطان کے غلاموں نے جن کی تعداد ساٹھ تھی آپس میں فیصلہ کیا کہ سلطان کے علم میں لائے بغیر وہ دریا پار کر جائیں اور ہندوؤں کے لشکر پر شب خون ماریں۔ محمود چونکہ دریا پار کرنے کو منع کر چکا تھا اس لیے ان میں سے کسی نے محمود سے اپنے عزائم کا ذکر نہیں کیا۔

جوش جہاد اتنا بڑھا ہوا تھا کہ ان غلاموں میں سے کسی نے بھی اپنی جان کی پروا نہیں کی اور رات کے وقت مشکیزوں کے ذریعے دریا میں اتر گئے۔

ہندو لشکر یہ سوچ کر بے فکر تھا کہ مسلمان اس وقت دریا پار کرنے سے ہچکچا رہے ہیں۔ وہ ہتھیار اتار کر مزے کی نیند سو رہے تھے۔

یہ ساٹھ غلام دریا کے پار ہوئے اور ہندوؤں کے لشکر میں گھس گئے۔ ہندو اس وقت نہتے تھے، گاجر مولی کی طرح کٹنے لگے۔ لشکر میں شور مچ گیا کہ محمود کا لشکر آگیا۔ سیکڑوں قتل ہوگئے اور باقی بھاگ کھڑے ہوئے۔

دن نکل آیا تھا اور ان غلاموں کی اتنی ہمت ہوگئی تھی کہ قریب کے ایک شہر میں گھس گئے اور خوب جی کھول کر شہر کو لوٹا۔

صبح جب محمود پر حقیقتِ حال روشن ہوئی تو اس کے لشکریوں کو غیرت آئی۔ انہوں نے محمود سے اجازت طلب کی کہ وہ بھی دریا پار کر لیں۔ یہ بھی خدا کی قدرت تھی کہ ساحل پر جا کر دیکھا تو دریا اتر چکا تھا۔ محمود کے لشکر نے بہ آسانی دریا عبور کر لیا۔

صرف ساٹھ غلاموں نے ایک بڑے لشکر کو تتر بتر کر دیا تھا۔

راستے کا پتھر ہٹ گیا تھا۔ محمود نے یہاں سے کالنجر کا رخ کیا۔ کہتے ہیں چھتیس ہزار سوار، ایک لاکھ سے زیادہ پیادے اور تین سو چالیس ہاتھی اس کے لشکر میں شامل تھے۔

محمود نے ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر اس کے لشکر کو دیکھا تو اپنے آنے پر پشیمان ہوا۔ پھر اپنی پیشانی زمین پر رکھ کر خدا تعالیٰ کے حضور میں فتح وظفر کی التجا کی۔

اس دعا کی تاثیر تھی کہ اسی رات نند کے دل میں محمود کا ایسا خوف طاری ہوا کہ اپنا تمام مال واسباب چھوڑ کر میدان جنگ سے بھاگ نکلا۔

سلطان دوسرے دن یہ خبر پا کر سوار ہوا اور کمین گاہوں کو اچھی طرح دیکھا۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ اس کے ساتھ کوئی دھوکا نہیں ہوا ہے تو اس نے تاخت وتاراج کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مسلمانوں کے ہاتھ بے انتہا مال غنیمت آیا۔ نند کے لشکر کے پانچ سو ہاتھی بھی اس کے ہاتھ آئے۔

سلطان فتح ونصرت کے پرچم لہراتا ہوا غزنی واپس چلا گیا۔

اس مہم کے بعد ہی محمود کو احساس ہوگیا تھا کہ پنجاب کو زیر نگیں لانا بہت ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر دور دراز کی مہمات خطرے سے خالی نہیں تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کالنجر کے راجا کا تعاقب نہیں کر سکا تھا۔ اسے احساس ہوگیا تھا کہ اگر اسے پشت کی جانب سے خطرہ نہ ہو تو وہ بے خطر

www.pdfbooksfree.pk

ہو کر آگے بڑھ سکتا ہے۔ اگر لاہور اس کے قبضے میں آجائے تو وہ بار بار غزنی سے آنے کی زحمت سے بھی بچ جائے گا۔ چنانچہ اس نے ولایتِ نندا کا ارادہ کیا۔ اس کے دل میں یہ کانٹا بھی چبھ رہا تھا کہ انند پال کے بیٹے نے جو اس وقت لاہور کا راجا تھا، راجا کانجر کی مدد کی تھی اور محمود کی راہ میں مزاحم ہوا تھا۔ اس کا بدلہ بھی لینا تھا۔

لاہور پہنچ کر اس نے اپنی فوج کو متعدد حصوں میں تقسیم کر کے شہر کے مختلف حصوں میں غارت گری کے لیے روانہ کیا۔

لاہور کے راجا میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ سلطان محمود کے لشکر کا مقابلہ کرتا لہٰذا وہ اجمیر کی طرف بھاگ گیا۔

سلطان نے لاہور پر بہ آسانی قبضہ کر لیا اور ایک قابل اعتماد امیر کے سپرد کر کے پنجاب کے دوسرے مقبوضات کی حکومتیں بھی قابل اور دیانتدار عاملوں کے سپرد کیں۔

لاہور میں اس نے ایک بڑا لشکر بھی متعین کیا۔ اپنے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کیا اور مطمئن ہو کر غزنی واپس چلا گیا۔

راجا کانجر سے بدلہ لینا ابھی باقی تھا جو اس کے ہاتھ سے بچ نکلا تھا۔ اب پنجاب زیر نگیں ہو چکا تھا لہٰذا بے فکر ہو کر اس سے لڑا بھی جا سکتا تھا اس کا پیچھا بھی کیا جا سکتا تھا۔

ایک سال بعد ہی وہ ایک مرتبہ پھر ہندوستان میں تھا۔ یہ اس کا پندرھواں حملہ تھا۔

اسے کالنجر جانا تھا لیکن جب وہ قلعۂ گوالیار کے قریب پہنچا تو اس کی طمع نے اس کو قلعے کا محاصرہ کرنے پر مجبور کر دیا۔

محاصرے کو ابھی چار دن ہی گزرے تھے کہ قلعے کے راجا نے اس شرط پر صلح کی درخواست پیش کی کہ وہ محمود کی خدمت میں 35 ہاتھی پیش کرے گا۔ محمود نے اس کی درخواست قبول کی اور ہاتھیوں کا نذرانہ وصول کر کے کالنجر کی طرف روانہ ہو گیا۔

کالنجر کا قلعہ پختگی و استحکام میں اپنی مثال نہیں رکھتا تھا۔ محمود جب پہلی مرتبہ یہاں آیا تھا تو راجا نندا قلعے سے باہر آیا تھا اور پھر محمود سے مقابلہ کیے بغیر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ محمود نے یہاں قیام کرنا مناسب نہیں سمجھا لیکن اب وہ اسی ارادے سے آیا تھا۔ اب وہ نندا کو بھی بھاگنے کا موقع دینا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا اس نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔

محاصرے کو ایک مدت گزر گئی تو نندا نے اپنا ایلچی بھیجا اور تین سو ہاتھیوں کی پیشکش کر کے امان چاہی، محمود نے اس پیش کش کو قبول کر لیا۔

نندا نے شرط پوری کی لیکن چالاکی یہ کی کہ تین سو ہاتھی فیل بانوں کے بغیر قلعے سے باہر نکال دیے۔ تین سو ہاتھی ہجوم کر کے جنگل میں نکل آئیں تو اچھے اچھوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے۔ نندا بھی یہی دلچسپ تماشا دیکھنا چاہتا تھا کہ محمود کے لشکری کس طرح ان ہاتھیوں کو قابو کرتے ہیں۔

محمود نے اپنے ترک لشکریوں کو حکم دیا کہ وہ ان ہاتھیوں کو پکڑ کر ان پر سوار ہو جائیں۔ اس کے لشکریوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور بہادری کے ساتھ ان ہاتھیوں پر قابو پا لیا۔

راجا نندا نے اس بہادری کی تعریف میں، ہندی زبان میں ایک شعر لکھ کر محمود کی خدمت میں بھیجا، محمود ہندی نہیں جانتا تھا لیکن اس کے ساتھ ایسے شعرا سفر کر رہے تھے جو ہندی زبان سے واقف تھے اور ہندی شاعری کے اسرار و رموز کو جانتے تھے۔ محمود نے اس شعر کو ان صاحبان علم کو دکھایا اور ان سے ان کی رائے طلب کی۔ ان سب نے دل کھول کر اس کی تعریف کی۔

اس شعر کی خوبی و لطافت کے صلے میں محمود نے نندا کے پاس پندرہ قلعوں کا فرمان بھیجا جن میں کالنجر کا قلعہ بھی شامل تھا۔

راجا نندا نے بھی حق ادا کر دیا۔ بیش قیمت جواہرات اور بہت سے نادر تحفے محمود کی خدمت میں پیش کیے، سلطان محمود راجا سے کسی قسم کا تعرض کیے بغیر اپنے دارالسلطنت غزنی واپس چلا گیا۔

سلطان محمود ان دنوں خراسان میں تھا کہ اس کے دل میں شیخ ابوالحسن خرقانی سے ملاقات کا شوق ہوا۔ اس نے سلسلۂ نقشبندی کے ان بزرگ کی شہرت بھی سنی تھی اور یہ بھی سنا تھا کہ یہ بزرگ عمائدین و بادشاہان سے گریزاں رہتے ہیں۔ اس کے باوجود اس نے ملاقات کی نیت کی اور خرقان پہنچ گیا جہاں شیخ ابوالحسن تشریف فرما تھے۔ محمود نے اپنا ایک قاصد ان بزرگ کی خدمت میں بھیجا۔ اس قاصد کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ کیا کہنا ہے۔

''شیخ سے کہنا، بادشاہ آپ سے ملنے کے لیے غزنی سے چل کر یہاں آیا ہے۔ اب اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ آپ بھی خانقاہ سے باہر نکل کر آئیں اور مجھ سے ملاقات کریں۔''

محمود نے مزید یہ بھی کہا۔ ''وہ اگر خانقاہ سے باہر نکلنے سے انکار کریں تو انہیں یہ فرمان خداوندی سنا دینا۔ ''اے ایمان والو! اطاعت کرو خدا کی اور اطاعت کرو رسول ﷺ کی اور ان لوگوں کی جو تم پر حاکم ہیں۔''

قاصد یہ پیغام لے کر حضرت شیخ کی خدمت میں پہنچا۔

''حضور، بادشاہِ وقت امین الملک، یمین الدولہ سلطان محمود غزنوی اس وقت خرقان میں موجود ہیں اور آپ سے ملاقات کے متمنی ہیں۔ وہ غزنی سے چل کر یہاں تک آئے ہیں تو آپ کے بھی اخلاق کا تقاضا ہے کہ آپ ان سے ملاقات کے لیے جائیں۔''

''بادشاہ سے کہنا، مجھے اس خدمت سے معذور سمجھا جائے۔ میں خانقاہ سے نکل کر نہیں آ سکتا۔''

''حضرت، حکم خداوندی تو یہ ہے کہ اطاعت کرو خدا کی اور رسول ﷺ کی اور ان لوگوں کی جو تم پر حاکم ہیں۔''

''بہت خوب! تم نے یہ آیت مجھے سنائی اور میں نے سنی۔ اب تم محمود سے جا کر کہو کہ میں اب تک اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اس حد تک مستغرق ہوں کہ رسولؐ کی اطاعت کے مرتبے پر نہ پہنچنے کی بڑی ندامت ہے۔ بھلا حاکم کی اطاعت کی طرف کیسے متوجہ ہو سکتا ہوں؟''

قاصد واپس چلا گیا اور اس نے شیخ صاحب کا جواب سلطان تک پہنچا دیا۔ سلطان یہ جواب سن کر اتنا روپا کہ ہچکی بندھ گئی۔

''شیخ ابوالحسن واقعی مردِ حق آگاہ ہیں۔ اگر وہ نہیں آئے تو ہم خود ان سے ملاقات کے لیے جائیں گے۔''

محمود نے اس حالت میں جانا پسند کیا کہ خود ایاز کا لباس پہنا اور اپنے کپڑے ایاز کو پہنائے اور دس کنیزوں کو غلاموں کے کپڑے پہنا کر اپنے ساتھ لے لیا۔

جب یہ لوگ شیخ کی خدمت میں پہنچے تو شیخ نے سلام کا جواب دینے پر اکتفا کیا، بادشاہ کے احترام میں اٹھ کر کھڑے نہ ہوئے۔ محمود کی طرف مطلق توجہ نہ کی جس نے ایاز کے کپڑے پہنے ہوئے تھے بلکہ ایاز کی طرف ملتفت ہوئے جو اس وقت بادشاہ نظر آ رہا تھا۔ اس سے کچھ کہنے کو تھے کہ محمود بول اٹھا۔

''اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ نہ تو بادشاہ کی تعظیم کے لیے اٹھ کر کھڑے ہوئے نہ اس کی طرف توجہ کی، کیا فقر کے جال کی یہی کائنات ہے کہ بادشاہ کو اس طرح نظر انداز کیا جائے؟''

شیخ ابوالحسن نے فرمایا۔ ''ہاں جال تو یہی ہے لیکن تو سامنے آ، کیونکہ تو خود اس جال کا سب سے بڑا شکار ہے۔''

محمود نے بھانپ لیا کہ شیخ اپنے کشف سے حقیقت تک پہنچ گئے ہیں تو وہ بڑے ادب سے شیخ کے سامنے بیٹھ گیا اور ان سے کہا۔ ''مجھ سے کچھ فرمایئے۔''

شیخ نے فرمایا۔ ''غلاموں کے لباس میں بیٹھی ہوئی ان نامحرموں کو محفل سے باہر کر دو۔''

محمود نے ان کنیزوں کو وہاں سے اٹھا دیا پھر شیخ سے مخاطب ہوا۔ ''حضرت بایزید بسطامیؒ کی کوئی حکایت مجھے سنایئے۔''

شیخ صاحب نے بایزید بسطامیؒ کا یہ قول سنایا۔ ''جس نے مجھے دیکھ لیا وہ ظلم و ستم کی تمام برائیوں سے محفوظ ہو گیا۔''

محمود معترض ہوا۔ ''یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کیا بایزیدؒ کا مرتبہ حضرت محمد ﷺ کے مرتبے سے بھی زیادہ ہے، نبی کریم ﷺ کے دیکھنے والوں میں بھی سبھی اچھے نہیں تھے۔ ابوجہل اور ابولہب ویسے ہی کافر رہے تو پھر بایزید کے دیکھنے والوں میں ہر ظالم کس طرح اچھا ہو سکتا ہے؟''

شیخ صاحب نے قدرے خفگی سے کہا۔ ''اے محمود، تو اپنی بساط سے بڑھ کر باتیں نہ کر۔ ادب کو ملحوظ رکھ۔ بادشاہ بنارہ، ولایت کی دنیا میں قدم نہ رکھ۔ جان لے کہ حضرت محمد ﷺ کو خلفائے راشدین اور چند دیگر صحابہؓ کے کسی اور نے نہیں دیکھا۔ دیکھنا اسے نہیں کہتے کہ نظر بھر کر کسی کو دیکھ لیا جائے۔ قرآن نے خود کہہ دیا۔ ''اور تم دیکھتے ہوا یسے لوگوں کو وہ نظر کرتے ہیں تمہاری طرف حالانکہ حقیقت میں وہ تم کو نہیں دیکھتے۔''

''حضرت مجھے کوئی نصیحت کیجیے۔''

''تجھے چاہیے کہ چار چیزیں اختیار کرے۔ پرہیزگاری، نماز باجماعت، سخاوت اور شفقت۔''

''میرے حق میں دعا فرمایئے۔''

''جا تیری عاقبت محمود ہو۔''

اس کے بعد محمود نے اشرفیوں کی ایک تھیلی شیخ کی خدمت میں پیش کی، شیخ نے اسے ہاتھ نہیں لگایا اور محمود کے سامنے جو کی ایک روٹی رکھ دی اور اصرار کیا کہ وہ اسے کھائے۔

محمود نے اسے چبانے کی کوشش کی لیکن روٹی اتنی سخت تھی کہ دانتوں سے کٹتی ہی نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے کٹی تو حلق سے نیچے نہ اتر سکی۔

شیخ نے فرمایا۔ ''کیا یہ روٹی تمہارے گلے میں اٹکتی ہے۔''

''جی ہاں، کچھ یہی ماجرا ہے۔''

''جس طرح یہ سوکھی روٹی تمہارے گلے میں نہیں اترتی اسی طرح یہ اشرفیوں کی تھیلی ہمارے گلے سے نیچے نہیں اترتی۔ اسے ہمارے سامنے سے اٹھاؤ۔''

محمود نے اشرفیوں کی تھیلی ان کے سامنے سے ہٹا دی

www.pdfbooksfree.pk

اور شیخ صاحب سے کوئی چیز بہ طور یادگار طلب کی۔ انہوں نے اپنا ایک کرتہ دے کر رخصت کیا۔

محمود رخصت ہونے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہوا تو شیخ صاحب نے اس کی تعظیم کی اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

''حضرت، جب میں آپ کے پاس آیا تھا تو آپ نے میری بالکل پروا نہیں کی تھی لیکن اب آپ میرے لیے اٹھ کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟''

شیخ نے جواب دیا۔ ''جس وقت تم میرے پاس آئے تھے بادشاہت کے غرور میں مبتلا تھے اور میرا امتحان لینے کی نیت سے آئے تھے، لیکن اب تم عاجزی کے ساتھ واپس جا رہے ہو۔''

محمود نے دستِ شیخ کو بوسہ دیا اور خانقاہ سے باہر نکل آیا۔

سلطان محمود پے در پے حملوں کے بعد شمالی ہند کا پورا علاقہ فتح کر چکا تھا۔ اس کے اپنے علاقوں میں بھی بندوبست اتنا مضبوط تھا کہ کسی کو بغاوت کے ارادے سے سر اٹھانے کی جرأت نہیں تھی۔ بے فکری ہی بے فکری تھی، دور دور تک کوئی مدمقابل نظر نہ آتا تھا۔ محمود کی جنگجو طبیعت فکر مند تھی کہ اب کس طرف جایا جائے، کس معرکے میں الجھا جائے۔ وہ اپنی فکر مندی اپنے امیروں پر کئی مرتبہ ظاہر کر چکا تھا۔

اس وقت بھی وہ اپنے امیروں سے مخاطب تھا۔

''آپ کے خیال میں اب ایسا کون سا مقام ہے جس کے مال و زر سے غزنی کے خزانے بھرے جا سکتے ہیں؟''

اراکینِ دولت میں سے کسی نے ایک ملک کا نام لیا، کسی نے دوسرے کا۔ محمود ایک ایک کی رائے کو غور سے سن رہا تھا لیکن دل ہی دل میں ایک ایک کی تردید بھی کرتا جا رہا تھا۔ اتنے میں ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا جس پر سب کو حیرت ہوئی تھی۔ ایک نورانی شکل صورت کے بزرگ اچانک مجلس میں حاضر ہو گئے۔ ان بزرگ کا تعلق نہ تو اراکین دولت سے تھا اور نہ اس سے پہلے انہیں کسی نے دیکھا تھا۔ یہ بھی باعث حیرت تھا کہ ان بزرگ کو کسی چوبدار، کسی پہرے دار نے نہیں روکا تھا، نہ ان کے آنے کی اطلاع دی گئی تھی۔ اراکین میں سے بعض نے ان سے ان کے بارے میں پوچھنا چاہا تھا لیکن محمود نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو روک دیا تھا۔

یہ بھی عجیب بات تھی کہ وہ بزرگ اس موضوع سے واقف تھے جو ان کے آنے سے پہلے زیر بحث تھا۔ اس لیے انہوں نے آتے ہی اپنی رائے کا اظہار کر ڈالا۔

''آپ لوگ کیوں جھگڑتے ہیں، میری رائے تو یہی ہے کہ ہندوستان پھر ہندوستان ہے۔''

''بزرگوار، ہندوستان میں جو کچھ تھا وہ ہم غزنی میں لا چکے۔'' محمود نے کہا۔

''وہاں اب بھی اتنی دولت ہے جس کا آپ لوگ اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔''

''آپ کا اشارہ ہندوستان کے کس علاقے کی طرف ہے؟''

''امیر محترم! گجرات کے نزدیک جہاں شمالی بحیرۂ عرب کی ایک شاخ گزرتی ہے ایک مشہور شہر سومنات ہے۔ یہاں ہندوؤں کا ایک عبادت خانہ ہے۔ اس عبادت خانے یعنی مندر میں ایک عظیم الشان بت ہے جسے لوگ سومنات کے نام سے پکارتے ہیں جس کے لفظی معنی ''چاند دیوتا'' ہیں۔ اس بت کے بارے میں ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں چند غیر مسلم ایک بہت بڑا بت خانہ کعبہ سے ہندوستان لائے تھے۔ اس بت کا نام سومنات تھا۔ اسے اس جگہ نصب کیا گیا لہٰذا اس مقام کا نام بھی اس بت کے نام پر رکھا گیا۔ بعض کتابوں میں یہ بھی ہے کہ یہ بت سری کرشن کے زمانے سے تمام برہمنوں کا معبود ہے اور برہمنوں کے قول کے مطابق سری کرشن نے اس جگہ دنیا سے روپوشی اختیار کی تھی یعنی ان کا دھیانت ہوا تھا۔''

(آج کل یہ شہر بندر دیو میں ہے اور اہلِ فرنگ کے قبضے میں ہے)

''بزرگ محترم! آپ نے تو بڑی دلچسپ حکایت بیان کی۔'' محمود نے کہا۔ ''اس کے بارے میں اگر کچھ اور معلوم ہو تو وہ بھی فرمایئے۔''

''امیر محترم! آگے بھی سنیے۔ جس مکان میں ''سومنات'' ہے وہاں باہر کی روشنی کا دخل نہیں۔ جواہرات اور الماس اس کثرت سے دیواروں میں جڑے ہیں کہ ان کی جگمگاہٹ سے اندھیرے کا گزر نہیں ہوتا۔ راتیں بھی دن کی طرح چمکتی ہیں۔ ایک بھاری سونے کی زنجیر ہے کہ اس میں گھنٹے ہر گھڑی میں لٹک رہے ہیں۔ عبادت کے وقت اس زنجیر کو ہلایا جاتا ہے تو ایسا شور بلند ہوتا ہے کہ پورا شہر گونج اٹھتا ہے۔ ہزار ہا سال سے راجا اور پرجا اس بت کے شیدائی ہیں اس لیے اس بت پر جو چڑھاوے چڑھائے جاتے رہتے ہیں اس کا کوئی حساب نہیں۔ ایک اور دلچسپ بات بتاؤں۔'' ان بزرگ نے کہا۔ ''ہندوستان والوں کا عقیدہ ہے کہ جب کسی انسان کی موت واقع ہوتی ہے تو اس کی روح ''سومنات'' کی خدمت میں حاضر ہوتی ہے اور سومنات دیوتا ہر روح کو اس کے اعمال اور کردار کے مطابق نیا جسم عطا کرتا ہے۔ اسی لیے

ہر ہندو سومنات کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اس کی موت کے بعد سومنات اس کی روح کو اچھا جسم عطا کرے۔''

اس بزرگ نے یہ بھی بتایا۔ ''گنگا وہاں سے چھ کوس کے فاصلے پر ہے مگر ہر روز تازہ گنگا جل اس دیوتا کے اشنان کے لیے لایا جاتا ہے۔

دو ہزار برہمن وہاں کے پجاری ہیں، تین سو کنواری لڑکیاں اور اتنے ہی گویے ہیں جو بھجن گاتے ہیں اور لڑکیاں اپنے رقص سے سومنات دیوتا اور پجاریوں کے دلوں کو لبھاتی ہیں۔

ان سب کے اخراجات کے لیے دو ہزار سے زیادہ گاؤں وقف ہیں۔''

بزرگ کی باتیں تھیں کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہی تھیں اور محمود ارادہ کر چکا تھا کہ عنقریب اس مہم پر روانہ ہوگا۔ اس کے لیے دو باتیں اہم تھیں۔ اس بت کو توڑنا ضروری ہے کہ بت شکنی ہی اس کا شیوہ تھا اور وہاں مال و دولت کی فراوانی ہے۔

''بزرگ، یہ بتایئے کہ اگر میں وہاں کے لیے روانہ ہونے لگوں تو اس سفر کے لیے مجھے کیا خاص اہتمام کرنا چاہیے؟''

''جہاں تک میرا خیال ہے وہاں آپ کو کوئی بڑی جنگ لڑنی نہیں پڑے گی البتہ سفر بہت دشوار ہوگا۔ ریگستان اور چٹیل میدان ہیں جہاں کوسوں تک پانی نہیں۔ میدانوں میں گھاس نہیں۔ زندہ رہنے کے لیے جو کچھ لے جا سکتے ہیں لے جائیں، آگے آپ خود سمجھ دار ہیں۔''

''بزرگوار! آپ یہ تو بتایئے کہ کون ہیں اور میری مجلس تک آپ کی رسائی کیسے ہوئی؟'' محمود نے ان بزرگ سے پوچھا۔

ابھی وہ بزرگ شخص کوئی جواب دے نہیں پائے تھے کہ چوب دار نے امیر احسن کی آمد کی اطلاع دی جو ترکستان سے کچھ خبریں لے کر آیا تھا اور محمود سے ملاقات کا متمنی تھا۔ محمود نے یہ سوچ کر کہ اجنبی بزرگ کہاں جا رہے ہیں یہیں تو بیٹھے ہیں جو کچھ پوچھنا ہے بعد میں پوچھ لوں گا، امیر احسن کو طلب کر لیا۔ امیر احسن آئے تو دیگر علما ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ خود محمود کی نظریں ان بزرگ کی طرف سے ہٹ گئیں۔

امیر احسن جب ترکستان کے حالات سے آگاہ کر چکا تو محمود کی آنکھوں نے ان بزرگ کو تلاش کیا۔ وہ اپنی نشست پر موجود نہیں تھے۔ جس طرح اچانک آئے تھے اسی طرح اچانک غائب ہو گئے تھے۔ محمود نے امرا سے دریافت کیا۔ وہ سب بھی بے خبر تھے۔ کسی نے بھی انہیں اپنی جگہ سے اٹھتے اور جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

''کیا وہ کوئی فرشتہ تھا جو ہمیں ہندوستان کے حالات بتانے آیا تھا؟'' محمود نے استفسار کیا۔ کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا البتہ ایک امیر اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور دست بستہ عرض کیا۔ ''امیر محترم! یہ شخص یقیناً کوئی جاسوس تھا جو ہندوستان کی طرف سے بھیجا گیا تھا۔ ہندو راجاؤں نے ہمیں پھانسنے کے لیے جال بچھایا ہے۔ وہ ہمیں ایک ایسے مقام کا پتا بتا گیا ہے جو صحرا اور ریگستان ہے۔ مقصد یہی ہوگا کہ سلطانی لشکر وہاں بھوکا پیاسا مر جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہندو لشکر وہاں چھپا بیٹھا ہو اور ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سومنات شہر میں پتھروں کے بتوں کے سوا کچھ نہ ہو۔ وہاں کا مال و زر پہلے ہی نکال لیا گیا ہو اور ہمیں دھوکے سے بلایا جا رہا ہو۔''

''یہ کیسا جاسوس تھا کہ نہ اسے کسی نے جاتے ہوئے دیکھا نہ آتے ہوئے۔ میرے خیال میں تو یہ کوئی صاحبِ کرامت بزرگ تھے یا کوئی فرشتہ جو ہمیں یہ بتانے آیا تھا کہ ہندوستان میں ایک مقام اب بھی ایسا ہے جسے ایک بت شکن مردِ مجاہد کی ضرورت ہے۔'' محمود نے خوش اعتقادی سے کہا۔

''ہندوستان میں جادو کا بہت زور ہے۔ یہ شخص کوئی ہندو جادوگر بھی ہو سکتا ہے۔ جو جادو کے زور سے آیا اور اسی طاقت سے چلا گیا۔''

محمود بھی سوچ میں پڑ گیا کہ اپنی رائے کو فوقیت دے یا امرا کے شبہات کو قبول کرے۔ پھر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس قصے کو یہیں چھوڑ دیا جائے اور ان خبروں کے خاتمے کا بندوبست کرے جو ترکستان کی طرف سے آئی تھیں۔ اسے خبر ملی کہ بلخ کا کوتوال علی تگین ماوراءالنہر کے باشندوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہا ہے۔ لوگ محمود کے نام کی دہائی دے رہے ہیں۔ علی تگین، محمود ہی کا مقرر کردہ ہے اور اسی کے احکام کی پاسداری نہیں کر رہا ہے۔

محمود نے فوج کو مرتب کیا اور بلخ کی طرف روانہ ہوا۔

اس کی فوج نے جیسے ہی دریائے جیحوں پار کیا ماوراءالنہر کا ہر سردار استقبال کے لیے آیا اور اپنی حیثیت کے مطابق نذریں گزرائیں۔ یوسف قدر خاں بھی جو تمام ترکستان کا بادشاہ تھا، محمود سے ملاقات کے لیے آیا۔ کئی روز تک جشن مسرت منایا گیا اور مہمانداری ہوئی۔ دونوں حکمران گلے مل کر رخصت ہوئے۔

علی تگین کو جب محمود کی آمد کا علم ہوا تو وہ خوف زدہ ہوا اور اپنا ملک چھوڑ کر بھاگ گیا۔ محمود نے اپنے چند با اعتبار لوگوں

www.pdfbooksfree.pk

کو اس کے تعاقب میں روانہ کیا۔ بھاگ کر جاتا کہاں پکڑا گیا۔ سلطان محمود نے اسے پابہ زنجیر کر کے ہندوستان کے قلعوں میں سے کسی قلعے میں بھیج دیا اور خود غزنی چلا آیا۔

غزنی سے بلخ تک کے سفر میں وہ مسلسل اپنے دربار میں آنے والے بزرگ اور ہندوستان کے بارے میں ان کی فراہم کردہ معلومات کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اس نے اب یہ سوچنا چھوڑ دیا تھا کہ وہ بزرگ کون تھے۔ اسے تو صرف یہ یاد رہ گیا تھا کہ کاٹھیاواڑ کے قریب سومنات کا مندر ہے جس میں ایک بڑا بت ہے اور جو اپنی حیثیت میں ان سب بتوں سے بڑا اور مقدس ہے جنہیں وہ اب تک پاش پاش کر چکا ہے۔

❁❁❁

شمالی ہند میں محمود کے حملوں کا شور مچا ہوا تھا لیکن جنوبی ہند کے راجا یہ سوچ کر مطمئن تھے کہ دوری کے سبب محمود اس طرف کا رخ نہیں کرے گا۔ لیکن اب یہ خبریں بھی آنے لگی تھیں کہ محمود کی دلیری یہ راستہ بھی دیکھنے والی ہے۔ ان راجاؤں نے جوتشیوں کو بلایا کہ کنڈلی نکال کر بتائیں کہ محمود کے ارادے کیا ہیں۔

ان جوتشیوں نے حساب لگا کر تصدیق کر دی کہ اس مرتبہ محمود کے لشکر کا رخ جنوبی ہند کی طرف ہوگا۔ راجا اجمیر کے دربار کا جوتشی اپنی پوتھی سنبھالے راجا کی خدمت میں حاضر ہوا۔

''مہاراج! اگر آپ اپنے نزدیک سے سب کو ہٹا دیں تو میں ایک اہم بات آپ کو بتاؤں۔''

''یہ سب اپنے ہی لوگ ہیں۔ ان سے کیا چھپانا۔''

''مہاراج، میری دی ہوئی خبر سے ہلچل مچنے کا ڈر ہے۔ یہ خبر عام نہ ہو تو اچھا ہے۔''

راجا نے تمام آدمیوں کو اپنے پاس سے ہٹا دیا تو جوتشی بولا۔

''مہاراج! میرا حساب کبھی غلط نہیں کہتا۔ میں اجمیر کی سرحدوں کے آس پاس مسلمانوں کے لشکر کو منڈلاتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔''

''خوب اچھی طرح غور کر لے۔ تو جو کہہ رہا ہے کیا وہی ٹھیک ہے؟''

''خوب اچھی طرح غور کر چکا۔ اجمیر کے بھاگوں میں یہی ہے۔''

''کیا محمود اجمیر پر حملہ کر دے گا؟''

''میرا حساب یہاں آ کر خاموش ہو جاتا ہے، پر نتو یہ طے ہے کہ وہ اس طرف آئے گا ضرور۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے دیوتا اسے حملہ کرنے سے روک دیں یا محمود خود ہی ٹل جائے کیونکہ اس کی منزل کوئی اور ہے۔ میرا حساب یہی کہتا ہے۔ اس خبر کو پھیلنے سے روکیں ورنہ شہر میں بھگدڑ مچ جائے گی۔''

راجا پر گھبراہٹ طاری تھی، اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ جوتشی کی بات کا یقین کرے۔ اس نے چند اور جوتشیوں کو بلایا کہ شاید وہ کوئی اور بات کریں یا اس کا کوئی توڑ بتائیں۔ درجن بھر جوتشی اسی وقت حاضر ہو گئے۔ انہوں نے بھی حساب کتاب لگا کر پہلے جوتشی کی تصدیق کی بلکہ ان میں سے ایک نے تو یہ بھی کہہ دیا کہ بڑی ہاہا کار مچے گی۔ محمود حملہ کرے گا۔

یہ سنتے ہی راجا اس قدر حواس باختہ ہوا کہ اپنی ملکہ کو فوج کے حوالے کر کے خود قلعے سے فرار ہو گیا۔ یہ بات کہیں چھپنے والی تھی۔ اس کے درباریوں کو معلوم ہوا تو وہ بھی ایک ایک کر کے بھاگنے لگے۔

مندروں میں بھی بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ پنڈت اور پجاری سر جوڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ بتوں کے آگے ڈنڈوت کر رہے تھے۔ پرارتھنا کر رہے تھے کہ محمود یہاں آنے سے پہلے ہی غارت ہو جائے۔

اجمیر کے بڑے مندر میں بڑا پجاری اپنی دیوداسیوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ دو دن پہلے وہ اپنا ایک آدمی صحرا کی طرف یہ جاننے کے لیے بھیج چکا تھا کہ محمود کے لشکر کے آثار نظر آ رہے ہیں یا نہیں۔ دور دور تک کسی لشکر کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ یہ خبر اطمینان کا باعث تھی لیکن پجاریوں کی گھبراہٹ دور نہیں ہو رہی تھی۔ ان میں سے بہت سے تھے جو مندر چھوڑ کر جانا چاہتے تھے۔

ایک پنڈت نے تجویز دی۔ ''ہم سب کو چاہیے کہ قلعے میں پناہ لے لیں۔ جتنی دیوداسیاں ہیں وہ مندر کی دیکھ بھال کے لیے مندر ہی میں رہیں۔ مندر کی گھنٹی بجانے والا بھی تو کوئی ہو۔''

''ہم دیوداسیوں کی زندگی اتنی سستی نہیں کہ ہم یہاں رہ کر محمود کے سپاہیوں کا انتظار کرتے رہیں۔''

''میں نے تو یہ تجویز اس لیے دی تھی کہ مسلمانوں کے لیے مشہور ہے کہ وہ عورتوں اور بچوں کی جان نہیں لیتے۔ وہ تم دیوداسیوں کو کچھ نہیں کہیں گے۔''

''جب راجا ہی ہمیں چھوڑ کر چلا گیا تو ہم خطرہ مول کیوں لے لیں۔''

''وہ بھی اپنی ملکہ کو چھوڑ کر گیا ہے۔ ہم بھی تم داسیوں کو بھگوان کے سپرد کر کے قلعے میں پناہ لے لیتے ہیں۔''

پنڈتوں کے درمیان بہت دیر تک بحث ہوتی رہی۔ آخر بڑے پجاری نے یہ کہہ کر فیصلہ کیا۔ ''میرا جینا مرنا تو اسی مندر میں ہے۔ تم سب چلے جاؤ۔ مندر کی دیکھ بھال کے

لیے میں یہاں موجود رہوں گا۔ جو داسی میرے ساتھ رہنا چاہے وہ میرے ساتھ رہ لے۔''

کئی داسیوں کو غیرت آئی اور انہوں نے گرو کے ساتھ رہنا منظور کر لیا۔ باقی سب قلعے میں پناہ گزیں ہو گئیں۔ اس رات کے بعد سے ہر رات اجمیر میں ایسی سنسان اور اندھیری تھی جیسے محمود کی فوج ابھی غارت گری کر کے گئی ہو حالانکہ محمود کے لشکر کا ابھی دور دور تک پتا نہیں تھا۔

یہی حال یہاں سے کاٹھیاواڑ تک ہر شہر کا تھا۔

❁❁❁

سلطان اس سے پہلے پندرہ مرتبہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں حملہ آور ہو چکا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ہندوستان کے کسی راجا میں اب اس سے مقابلہ کرنے کی سکت نہیں لیکن پھر بھی اس کے دل میں اندیشے سر اٹھا رہے تھے۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اس سے پہلے وہ کسی ایسی خطرناک مہم پر روانہ نہیں ہوا ہوگا۔ وہ غیر معمولی تیاریاں کر رہا تھا۔

اس نے اپنا خاص لشکر تیار کیا اور دیگر تیس ہزار سپاہیوں کو ساتھ لیا جو ترکستان وغیرہ سے جہاد کے لیے آئے تھے۔

سلطان محمود اس نڈی دل کو لے کر اڑا اور ملتان تک آ گیا۔ اڑتا ہوا غبار سومنات تک جا رہا تھا۔ خبر پہنچ چکی تھی کہ محمود ملتان پہنچ گیا ہے۔

''ہمارے معبود اسے یہاں تک نہیں پہنچنے دیں گے۔'' ایک پجاری نے نعرہ بلند کیا لیکن اس کی آواز کی لرزش صاف بتا رہی تھی کہ وہ خوف زدہ ہے۔

سلطان کو بتایا گیا تھا کہ آگے راستے میں بے آب و گیاہ جنگل ہے اور ریگستان سے گزرنا ہے۔ غذائی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اس نے بیس ہزار اونٹوں پر غلہ اور پانی لاد لیا اور لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔

کئی دن تک گھنے جنگلوں، لق و دق میدانوں، اونچے نیچے ٹیلوں کو سمیٹتا ہوا وہ اجمیر کی سرحد میں جا پہنچا۔ شہریوں نے سن تو رکھا تھا کہ محمود کا لشکر آنے والا ہے لیکن بہت سوں کو یقین نہیں آیا تھا۔ اسی لیے وہ ابھی تک شہر میں موجود تھے۔ اب جو محمود کو بجلی بن کر گرتے دیکھا تو خرمن بچانے کی فکر ہوئی۔ کیا خبر وہ کب شہر میں داخل ہو اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دے۔ شہریوں نے مال و زر وہیں چھوڑا۔ جتنا ساتھ لے سکتے تھے ساتھ لیا، گھروں کو منہ تکتے چھوڑا اور دیکھتے دیکھتے شہر خالی ہو گیا۔ پورا شہر ویران ہو گیا، گھپ اندھیرا تھا۔ کوئی چراغ جلانے والا بھی نہیں تھا۔

بڑے مندر کی ایک کوٹھڑی میں ایک دیا روشن تھا۔ بڑا پجاری ننگ دھڑنگ صرف ایک لنگوٹ باندھے زمین پر اوندھا پڑا تھا۔ کچھ داسیاں اس کا بدن دبا رہی تھیں، کچھ ان سے دور گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھیں۔

''اس وقت شیو دیوتا مدد کو کیوں نہیں آتے؟'' ایک لڑکی نے کہا۔

''یہ مدد نہیں تو کیا ہے۔ مسلمانوں کا لشکر شہر سے باہر آ کر رک گیا ہے۔ اب تک شہر میں داخل نہیں ہو سکا ہے۔'' دوسری نے کہا۔

''ذرا سوچو، اگر وہ اندر آ گئے تو کیا ہوگا۔ کیا ہماری عزتیں لٹنے سے بچ جائیں گی؟''

''سنا ہے مسلمان، عورتوں کی عزتیں پامال نہیں کرتے۔''

''کیوں، کیا وہ انسان نہیں ہوتے، مرد نہیں ہوتے؟''

''ان کے سردار نے انہیں یہی سکھایا ہے۔ لونڈی باندی بنا کر ساتھ لے جاتے ہیں۔ پھر سنا ہے مسلمان بنا کر شادی کر لیتے ہیں۔''

ایک داسی اوشا جس کی عمر سترہ اٹھارہ سال ہوگی، اس مندر میں دو مہینے پہلے ہی آئی تھی، شادی کا نام سن کر آگے کھسک آئی۔

''دیدی، تم کیا کہہ رہی تھیں۔ مسلمان بنا کر شادی کر لیتے ہیں؟''

''ہاں، یہی سنا ہے۔''

''اگر وہ یہاں آ گئے تو بڑے پجاری کو تو نہیں چھوڑیں گے۔''

''کیا خبر چھوڑ بھی دیں۔ اتنا بوڑھا جو ہو گیا ہے۔''

''مندر میں رکھے بتوں کو تو ضرور توڑیں گے یہ مسلمان۔''

''ہاں ضرور توڑ دیں گے۔ یہی کرنے تو نکلے ہیں۔''

اوشا دیوی ان باتوں میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہی تھی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولی۔

''یہ مسلمان ہوتے کیسے ہیں؟''

سب داسیاں ایک ساتھ ہنس پڑیں۔

''ہماری طرح انسان ہی ہوتے ہیں۔ دیوتاؤں کی بددعا میں ہیں اسی لیے مسلمان کہلاتے ہیں۔''

اس کے بعد شاید کوئی بات کہنے کو نہیں رہ گئی تھی۔ سب خاموش ہو گئی تھیں۔ پھر ایک طرف سے آواز آئی۔

''مندر کا بڑا دروازہ اچھی طرح بند کر دیا ہے؟''

گرو کی کوٹھری سے چار داسیاں باہر نکلیں۔ انہوں نے اندھیرے میں اوشا کو پکارا۔ ''گرو جی تمہیں اندر بلا

www.pdfbooksfree.pk

رہے ہیں۔'' اوشا بے دلی سے اٹھی اور گرو کی کوٹھری کی طرف جانے لگی۔

''کوٹھری اندر سے اچھی طرح بند کر لینا۔'' سب لڑکیوں نے ایک ساتھ کہا اور ہنس پڑیں۔

''آؤ، اوشا آؤ۔ تمہیں آئے دو مہینے ہو گئے اور میں نے تم سے کوئی خدمت ہی نہیں لی۔ اب آخری چند راتیں ہیں، کیا خبر مسلمان یہاں کب چڑھ دوڑیں۔ کیا تم اپنے پاپ نہیں دھلواؤ گی؟''

اوشا خاموش تھی، کیا کہتی، اس کے اندر داخل ہوتے ہی گرو نے چراغ بھی بجھا دیا تھا۔ اوشا نے اندھیرا ٹٹول کر دیکھا۔ گرو کے بدن پر کپڑے نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

اندھیرے میں گرو کی آواز پھر نکلی۔ ''اوشا، میرے قریب آ کر لیٹ جاؤ تاکہ میں تمہیں ''جاپ'' کراؤں۔''

اوشا اتنی دیر میں سوچ چکی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔

''آپ نے اوشا کو بلایا تھا؟''

''ہاں وہی جو دو مہینے پہلے یہاں آئی تھی۔ اس نے ابھی تک بھینٹ نہیں دی ہے۔''

''لیکن میں تو مدھر ہوں۔''

''تجھے یہاں کس نے بھیج دیا۔ چل جا کر اوشا کو بھیج، سے نکلا جا رہا ہے۔''

''مہاراج! ابھی گئی۔''

اوشا نے بڑی ہوشیاری سے گرو کو چکما دے دیا تھا۔ اندھیرے میں وہ دوسرے دروازے سے نکلی اور مندر کے صحن میں آ گئی۔ یہاں سے مندر کا بڑا دروازہ دور نہیں تھا۔ وہ دبے پاؤں بلی کی چال چلتے ہوئے دروازے تک آ گئی۔ دروازہ کھولا اور باہر نکل آئی۔ گلیوں میں مندر سے بھی زیادہ اندھیرا تھا۔ اندھیرے میں چلنا اسے دشوار ہو رہا تھا لیکن یہ اطمینان تھا کہ اسے دیکھنے والا کوئی نہیں۔ وہ چلتی رہی۔ کبھی دوڑنے لگتی پھر چلنے لگتی یہاں تک کہ شہر سے باہر نکل آئی۔ اسے اپنی قوم کی بزدلی پر غصہ آ رہا تھا۔ شہر کے دروازے خالی پڑے ہیں، وہاں کوئی پہرے دار تک نہیں تھا۔ کسی نے اسے نہیں روکا۔

ہوا بہت تیز چلنے لگی تھی۔ اس ہوا کے ذریعے جانوروں کی خوشبو اس تک پہنچنے لگی تھی۔ اسے اندازہ ہوا کہ سلطان کا لشکر یہیں کہیں قریب ہے۔ اسی وقت چار گھڑسوار اس کے قریب سے تیزی سے گزر گئے لیکن کچھ دور جا کر چاروں سوار پلٹے اور اس کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔

''اے لڑکی! تو کون ہے اور اس وقت یہاں اس ویرانے میں کیا کر رہی ہے؟''

''تم لوگ مسلمان ہو؟''

''ہاں ہم مسلمان ہیں مگر تو ہمارے سوال کا جواب دے۔ اس ویرانے میں تو کس ارادے سے نکلی ہے؟''

''میرا نام اوشا ہے۔ میں مسلمانوں کے لشکر میں جانے کے لیے نکلی ہوں۔''

''کس لیے؟''

''میں تمہارے سردار کو غیرت دلانے آئی ہوں۔ شہر کے باہر آ کر رک گیا ہے شہر میں کیوں نہیں آتا۔ یہاں کے مندروں میں عورتوں کی عزتیں لوٹی جاتی ہیں۔ تمہارا سردار ان کی مدد کو کیوں نہیں آتا؟''

''تم ہندو ہو کر یہ بات کیوں کہہ رہی ہو؟''

''اس لیے کہ میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں۔''

اوشا نے ان چاروں کو لاجواب کر دیا تھا۔ وہ چاروں اوشا کو چھوڑ کر ایک طرف چلے گئے اور آپس میں مشورہ کرنے لگے۔

''علی خاں، اس لڑکی کے بارے میں تم کیا کہتے ہو۔ یہ ہمیں بے وقوف بنا رہی ہے یا سچی ہے؟''

''اکیلی لڑکی ہمیں کیا بے وقوف بنائے گی۔''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کسی نے جاسوسی کے لیے اسے بھیجا ہو۔''

''جاسوسی کے لیے بھیجا ہوا'' جعفر نگین نے نقل اتارتے ہوئے کہا۔ ''شہر میں ہے کون جو اسے بھیجے گا۔''

''قلعے میں چھپی ہوئی فوج کی جاسوس بھی تو ہو سکتی ہے۔''

''یہ سب تو معلوم کر لیا جائے گا۔ یہ بتاؤ اس لڑکی کا کیا کریں؟''

''کرنا کیا ہے۔ اسے امیر کے سامنے پیش کیے دیتے ہیں۔ وہ جو فیصلہ کریں۔''

یہ سوار محمود کے دو امیر علی خاں اور جعفر نگین تھے جو اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ گشت کے لیے نکلے تھے کہ اس لڑکی سے ملاقات ہو گئی۔

ان ساتھیوں میں سے ایک تیر انداز عبدالرحمٰن تھا۔ اس کی عمر تیس سال کے قریب ہو گی۔ یہ نوجوان اوشا کو دیکھتے ہی اس پر فریفتہ ہو گیا تھا اور دل و جان سے چاہتا تھا کہ یہ لڑکی لشکر میں پہنچا دی جائے اور پھر موقع دیکھ کر اسے محمود سے مانگ لے۔ اس لیے وہ شد و مد سے اصرار کر رہا تھا کہ اوشا کو لشکر میں لے جایا جائے۔

یہ چاروں مشورہ کرنے کے بعد اوشا کے پاس

آئے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ گھوڑے دو تھے، سوار پانچ ہو گئے تھے۔ ان میں ایک لڑکی بھی تھی، طے یہ ہوا کہ ایک گھوڑا اور منگایا جائے۔ عبدالرحمٰن، علی خاں کے گھوڑے پر سوار ہوا اور لشکر سے ایک گھوڑا لے آیا۔ اوشا اکیلی گھوڑے پر نہیں بیٹھ سکتی تھی اس لیے طے ہوا کہ اوشا، عبدالرحمٰن کے ساتھ بیٹھے گی۔ علی خاں اپنے گھوڑے پر سوار ہو گئے۔

عبدالرحمٰن یہی چاہتا تھا۔ اس کی تو مراد پوری ہو گئی۔

''میرا نام عبدالرحمٰن ہے۔'' عبدالرحمٰن نے گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم میرا نام یاد رکھو گی؟''

''میں تمہارا نام کیسے بھول سکتی ہوں۔ تم تو مجھے لشکر میں لے جا رہے ہو۔''

''میں تم سے شادی کروں گا۔ تم انکار تو نہیں کر دو گی؟''

''میں نے یہی سنا تھا کہ مسلمان شادی کر لیتے ہیں۔ پاپ نہیں کرتے۔''

''بس اب خاموش ہو جاؤ۔ وہ دیکھو مشعلوں کی روشنی نظر آ رہی ہے، ہم لشکر کے قریب پہنچ گئے ہیں۔''

اوشا نے کبھی کوئی لشکر نہیں دیکھا تھا۔ جہاں تک اس کی نظر جا رہی تھی گھوڑے اور اونٹ بندھے نظر آ رہے تھے۔ دور تک خیموں کا شہر آباد تھا۔

''اتنے لوگ تو اجمیر میں بھی نہیں جتنے یہاں ہیں۔'' اس نے دل میں سوچا۔ عبدالرحمٰن کہہ چکا تھا کہ خاموش رہے اس لیے وہ خاموش رہی۔

گھوڑے سے اترتے ہی علی خاں نے اوشا کو گھوڑے سے اترنے کا حکم دیا۔ پھر اسے یاد آیا کہ وہ ایک لڑکی ہے اور گھوڑے پر شاید پہلی مرتبہ بیٹھی ہو، کس طرح اترے گی۔

عبدالرحمٰن نے اوشا کا پاؤں رکاب میں رکھا۔ اوشا اترنے لگی تو عبدالرحمٰن نے اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر نیچے اتار لیا۔

''عبدالرحمٰن، تمہیں یہ خیال نہیں کہ یہ لڑکی تمہارے لیے نامحرم ہے؟'' علی خاں نے تادیبی انداز میں استفسار کیا۔

''یا امیر، اس وقت مجبوری تھی۔ قریب میں کوئی اونچی جگہ نہیں تھی۔''

علی خاں اور جعفر نگین، اوشا کو لے کر محمود کے خیمے کی طرف چل دیے۔ انہوں نے اپنے گھوڑے اس جگہ روکے تھے جہاں سے محمود کا خیمہ قریب تھا۔

دروازے پر کھڑے پہرے داروں نے دونوں امیروں سے زیادہ اس لڑکی کو دیکھا جو ان کے ساتھ تھی۔ پھر ان میں سے ایک محمود کو خبر کرنے کے لیے اندر چلا گیا۔ محمود کو چونکہ معلوم تھا کہ یہ دونوں امیر گشت پر نکلے ہیں اس لیے وہ یہی سمجھا ہو گا کہ کوئی اہم خبر لے کر آئے ہوں گے ورنہ اس ناوقت کیوں آتے۔ اس نے فوراً طلب کر لیا لیکن جب اس نے ایک لڑکی کو ان کے ساتھ دیکھا تو اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

''کون ہے یہ لڑکی؟''

''سلطان معظم۔ آپ اس سے خود پوچھ لیں۔''

سلطان معظم کے الفاظ پر اوشا نے چونک کر دیکھا۔ درمیانے قد کا ایک آدمی اس کے سامنے تھا۔ اس کے چہرے پر چیچک کے داغ نمایاں تھے۔ نقش جاذب نظر نہیں تھے لیکن چہرے پر نامعلوم سی دلکشی تھی۔ اس دلکشی کے باوجود ایسا رعب تھا کہ اوشا کھڑے کھڑے کانپ گئی۔ خصوصاً اس کی آنکھیں کہ جیسے آنکھ بھر کر دیکھ لے، اس کا کلیجا کانپنے لگے۔ اس وقت وہ جنگی لباس میں نہیں تھا لیکن اس کا سینہ ابھرا ہوا تھا جو بتا رہا تھا کہ وہ مضبوط جسم کا مالک ہے۔ وہ جس کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اس پر اتنے ہیرے جڑے ہوئے تھے کہ چراغ روشن کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے باوجود خیمے میں شمعیں اور مشعلیں روشن تھیں۔ یہیں اوشا نے ایک اور حسین و جمیل آدمی کو دیکھا جس کی زلفیں اس کے شانوں پر تھیں۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا جیسے چاند کے اردگرد سیاہ بادل ہوں۔ یہ اسے بہت بعد میں جا کر معلوم ہوا کہ یہ سلطان کا غلام ایاز ہے۔

محمود کے اشارے پر دونوں امرا خیمے سے باہر چلے۔ صرف ایاز رہ گیا۔

محمود نے اوشا سے پوچھا۔ ''تمہیں یہاں کون لے کر آیا ہے؟''

''یہی دونوں جو ابھی یہاں سے گئے ہیں۔''

''زبردستی لے آئے ہیں؟''

''رام رام، زبردستی کیوں لاتے۔ میں اپنی مرضی سے آئی ہوں۔''

''کیوں آئی ہو؟''

''یہ پوچھنے کہ مندر میں بت پڑے ہیں اور تم انہیں توڑنے نہیں پہنچے۔''

''تو کیسی ہندو ہے کہ اپنے بتوں کو توڑنے کی خود دعوت دے رہی ہے۔ سچ بتا تیری یہ کیسی چال ہے۔ وہ کون سا جال ہے جس میں تو ہمیں پھانسنا چاہتی ہے؟''

''سلطان، میرا نام اوشا ہے۔ میرے ماں باپ نے

www.pdfbooksfree.pk

مجھے داسی بنا کر اجمیر کے بڑے مندر میں چھوڑ دیا تھا۔ مندروں کے پجاری ان داسیوں سے اپنی ہوس پوری کرتے ہیں۔ جن بتوں کو وہ اپنا دیوتا کہتے ہیں انہی کے چرنوں میں ان داسیوں کی عزتیں لوٹی جاتی ہیں۔ میں اب تک پلید ہاتھوں سے بچی ہوئی تھی لیکن آج بڑے پجاری نے مجھ پر نیت خراب کی اور مجھے اپنے پاس بلایا۔ وہ کہہ رہا تھا، مسلمانوں کا راجا آ گیا ہے، کیا خبر وہ مندروں کا کیا حال کرے۔ اس سے پہلے کہ مسلمان آ جائیں میں اسے اپنی بھینٹ دوں اور اس کے کہنے کے مطابق میں اپنے پاپ دھولوں۔ میں کسی نہ کسی طرح بچ کر نکل آئی۔ اس خیال سے آئی تھی کہ آپ کے پاس آ کر ان پجاریوں کی پول کھولوں گی اور التجا کروں گی کہ میری جیسی اور لڑکیوں کو ان پجاریوں کے چنگل سے بچالو۔''

''تمہارے ساتھ اور کتنی لڑکیاں ہیں وہاں؟''

''تھیں تو تین سو مگر اب وہ قلعے میں پناہ لے چکی ہیں۔ مندر میں تو اب بیس پچیس سے زیادہ نہیں رہ گئیں۔ یہ تو ایک مندر کا حال ہے۔ شہر میں اور بھی کئی مندر ہیں۔ میں نے تو سنا ہے آپ جہاں جاتے ہیں مندروں کو توڑ پھوڑ دیتے ہیں پر ابھی تک تو آپ شہر میں داخل ہی نہیں ہوئے۔ وہاں پجاری یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ ہمارے دیوتاؤں نے آپ کو روک دیا ہے۔ کیا یہ بات سچ ہے؟''

''میں نے سنا ہے تم مسلمان ہونا چاہتی ہو؟''

''آپ نے ٹھیک سنا ہے اور میں نے سنا ہے آپ لوگ مسلمان کر کے شادی کرا دیتے ہیں۔''

''تم نے ٹھیک سنا ہے۔ ابھی تمہارے لیے غسل کا بندوبست ہو..... جاتا ہے۔ اس کے بعد تمہیں مسلمان کیا جائے گا۔''

''آپ کے ساتھ عورتیں نہیں ہیں جن کے پاس میں جا کر بیٹھ جاؤں۔''

''ہم اپنی عورتیں میدان جنگ میں لے کر نہیں نکلتے۔ ویسے تم فکر مت کرو، کچھ خدمت گار عورتیں ہیں جو تمہارا خیال رکھیں گی۔''

یہ پہلا موقع تھا جب محمود اپنے لشکر میں کچھ لونڈیوں کو بھی لے آیا تھا۔ اوشا کو ان کے حوالے کر دیا گیا۔

باتوں باتوں میں رات گزر گئی تھی، اب فجر کی اذان کا وقت ہو گیا تھا۔ محمود نے نماز ادا کی۔ اوشا کو بھی تیار کر دیا گیا تھا۔ مولوی صاحب آ گئے اور اوشا نے کلمہ طیبہ پڑھ کر اسلام قبول کر لیا۔ اس کا اسلامی نام خدیجہ رکھا گیا۔

اس لڑکی کی داستان سن کر سلطان محمود کو محمد بن قاسم کی یاد آ گئی جو کچھ عورتوں کی فریاد پر دیارِ عرب سے سندھ آ گیا تھا اور راجا داہر سے ٹکرا تھی۔ اس نے سوچا، کیا میں چند گز کے فاصلے پر ہوتے ہوئے اس لڑکی کی مدد کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس نے اپنے لشکر کو حکم دے دیا کہ شہر میں لوٹ مار کرو، مندروں کو مسمار کر دو۔ جتنی عورتیں ملیں انہیں لونڈی بنا کر لشکر میں لے آؤ۔ لشکر کے سپاہی خوش ہو گئے کہ انہیں مالِ غنیمت سمیٹنے کا موقع ملے گا۔

جب ایک دستہ فوج کا شہر جانے کے لیے روانہ ہو گیا تو محمود نے امیر علی خاں کو بلایا اور حکم دیا کہ کسی کو اس لڑکی کے ساتھ اجمیر بھیجو تاکہ وہ اس مندر کی نشاندہی کرے جہاں سے وہ آئی تھی۔ وہاں کی تمام داسیوں کو لے آؤ اور وہاں کے بڑے پجاری کو قتل کر دو۔

یہ اتفاق ہی تھا کہ علی خاں نے اس کام کے لیے عبدالرحمن کو موزوں سمجھا۔ اوشا کو گھڑسواری نہیں آتی تھی اس لیے اس مرتبہ بھی اسے عبدالرحمن کے ساتھ ایک ہی گھوڑے پر بیٹھنا پڑا۔

عبدالرحمن اسے لے کر اجمیر میں داخل ہوا۔ شہر سنسان پڑا تھا۔ صرف محمود کے سپاہی تھے جو ہر طرف لوٹ مار مچا رہے تھے۔ اوشا راستہ بتا رہی تھی اور عبدالرحمن گھوڑے کو دلکی چال سے چلاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ بڑی سڑک سے دائیں طرف مڑ کر وہ ایک کنویں کے پاس سے گزرا۔ پھر ایک عمارت آ گئی۔ یہی بڑا مندر تھا۔

''تم اس کنویں کے پیچھے چھپ جاؤ، میں اپنے سپاہیوں کو بلا کر لاتا ہوں۔'' عبدالرحمن گیا اور کچھ سپاہیوں کو اپنے ساتھ لے آیا۔

''ٹھہرو، میں دروازہ کھلواتی ہوں۔'' اوشا نے کہا اور دروازے پر لگی لوہے کی زنجیر کو زور زور سے بجانے لگی۔

کچھ دیر بعد کوئی عورت اندر سے بولی۔ ''کون ہے، کون دروازہ بجا رہا ہے؟''

''میں اوشا دیوی ہوں۔ جلدی دروازہ کھولو۔''

''تو باہر کیسے گئی؟''

''یہ میں اندر آ کر بتاؤں گی۔ اس وقت تو بس دروازہ کھول دو۔''

دروازہ کھلتے ہی پہلے اوشا اندر گئی اور اس کے پیچھے محمود کے سپاہی۔ اوشا نے عبدالرحمن کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر مہا گرو کی کوٹھری میں پہنچ گئی۔ عبدالرحمن باہر کھڑا تھا۔

''گرو، تم نے کل رات کو مجھے بلایا تھا نا۔''

''ہاں، مگر تم اب آئی ہو۔''

''کیوں، کیا اب بھینٹ نہیں ہو سکتی؟''

''کیوں نہیں ہو سکتی، دروازہ بند کر اور ادھر آ کر لیٹ جا۔''

''ٹھہرو، میں دروازہ بند کرتی ہوں۔''

وہ دروازہ بند کرنے کے بہانے گئی اور عبدالرحمن کو اندر بلا لیا۔ گرو کی نظر جیسے ہی عبدالرحمن پر پڑی وہ رام رام کر کے اٹھ بیٹھا۔ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ عبدالرحمن کی تلوار نے اسے خاموش کر دیا۔

سپاہی تمام بتوں کو توڑ پھوڑ چکے تھے۔

اس مندر سے پچیس داسیاں ملی تھیں جنہیں عبدالرحمن پیدل چلاتا ہوا لشکر تک لے آیا۔

جو سپاہی شہر میں لوٹ مار کے لیے گئے ہوئے تھے شام تک وہ بھی لوٹ آئے۔

اجمیر کا قلعہ ایک پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا محمود کو دعوت مبارزت دے رہا تھا۔ محمود کو یہ بھی معلوم تھا کہ راجا کی فوج اسی قلعے میں ہے۔ پنڈتوں اور داسیوں نے بھی اسی قلعے میں پناہ لے رکھی ہے لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس مضبوط قلعے کو فتح کرنے میں کئی مہینے بھی لگ سکتے ہیں، ارادہ تو سومنات فتح کرنے کا ہے، اجمیر میں کیوں وقت ضائع کیا جائے۔ ہاں اگر مزاحمت ہوتی تو بات الگ تھی۔ اس نے اعلان کر دیا کہ ایک رات اور تھکن اتار لو، کل صبح صبح سومنات کی طرف روانگی ڈال دی جائے گی۔

مغرب کی اذان ہو چکی تھی کہ نماز کے بعد عبدالرحمن نے علی خاں کے خیمے پر حاضری دی۔ وہ امیر علی خاں کے لشکر سے وابستہ تھا اس لیے وہ انہی سے یہ بات کہہ سکتا تھا۔

''امیر، آپ کو وہ لڑکی یاد ہے جو ہمیں گشت کے دوران اجمیر کے قریب ملی تھی؟''

''اس واقعے کو کیا دو سو سال گزر گئے، جو میں نے بھلا دیا ہوگا۔''

''وہ میرے گھوڑے پر بیٹھ کر یہاں تک آئی تھی اور پھر میرے ہی گھوڑے پر بیٹھ کر شہر کی تاراجی کے لیے گئی تھی۔''

''منع کر دوں گا، آئندہ نہ جائے۔''

''امیر محترم! میں اس سے شادی کا خواہاں ہوں۔''

''بس..... ایک دن کی رفاقت میں تم نے یہ فیصلہ کر لیا؟''

''مجھے لگتا ہے میں ایک سو سال سے اس کے ساتھ ہوں۔''

''تمہیں معلوم ہے مالِ غنیمت میں آنے والی لڑکیوں کا فیصلہ خود سلطان محترم کرتے ہیں۔''

''میں یہی چاہتا ہوں، آپ سلطان تک میری یہ درخواست پہنچا دیں۔ سومنات کا معرکہ قریب ہے۔ کیا خبر کون جان سے جاتا ہے کون رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں شادی کی یہ رسم آج ہی ادا کر دی جائے۔''

''تمہارا مطلب ہے میں سلطان سے اجازت لے آؤں؟''

''جی امیر، میں یہی چاہتا ہوں۔''

''اچھا مجھے بھی نہیں لگتا کہ نیک کام میں دیر کی جائے۔ میں کچھ کرتا ہوں۔''

انہیں خود جانا نہیں پڑا، محمود نے انہیں خود ہی طلب کر لیا تھا۔ ضروری باتوں کے بعد انہوں نے اوشا اور عبدالرحمن کا تذکرہ بھی چھیڑ دیا۔ انہیں امید نہیں تھی کہ محمود اتنی جلدی تیار ہو جائے گا۔

''وہ لڑکی ہمیں بہت معصوم لگی تھی۔ اس نے کہیں سے سن لیا تھا کہ مسلمان جن عورتوں کو اٹھاتے ہیں ان سے شادی کر لیتے ہیں، ہم نے اسی وقت سوچ لیا تھا کہ مسلمانوں کے بارے میں اس کا یہ خیال صحیح ثابت کر دیں گے۔ کسی سے اس کی شادی کرا دیں گے۔ اب تم نے خود ہی عبدالرحمن کا نام پیش کر دیا۔ یہ شادی ابھی ہو جانی چاہیے کیونکہ کل صبح ہم سومنات کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔''

''خدیجہ اٹھو، دلہن بنو، تمہارا ڈولا اٹھنے والا ہے۔''

اگر یہ شادی غرنی میں ہوئی ہوتی تو نہ جانے کیسے کیسے انتظامات ہوتے۔ اس جنگل میں وہ انتظامات کیسے ہو سکتے تھے۔ پھر بھی اوشا کی قسمت اچھی تھی، لوٹ مار کے سامان میں دلہن کا ایک جوڑا بھی ہاتھ لگا تھا۔ عبدالرحمن نے وہ جوڑا لا کر دے دیا۔ لونڈیوں باندیوں نے اپنے زیورات کے صندوقچے کھولے۔ یہ زیور اوشا کو پہنا دیے گئے۔ باہر ایک رتھ تیار کھڑا تھا، دولہا دلہن اس رتھ میں سوار ہو گئے۔ فاصلہ کچھ زیادہ نہیں تھا۔ اس رتھ نے فاصلہ طے کیا اور شاہی خیمے کے سامنے پہنچا دیا۔ کنیزوں نے سہارا دے کر اسے نیچے اتارا اور گل پاشی کے بجائے کہ پھول میسر نہ تھے، سونے کے سکے نچھاور کر کے اسے محمود کے سامنے پہنچا دیا گیا۔ عبدالرحمن اس کے ساتھ تھا۔

کچھ شرم، کچھ رعب شاہی۔ اوشا تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ایک لونڈی نے چپکے سے کہا۔ ''بادشاہ کو سلام کرو۔'' اوشا منہ سے کچھ نہ بول سکی۔ ہاتھوں کی کٹوری بنائی اور ماتھے تک لے گئی۔

www.pdfbooksfree.pk

محمود نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ اور عبدالرحمن ایک کارچوبی تخت پر بیٹھ گئے۔ اوشا دل ہی دل میں سوچ رہی تھی، کتنی جلدی وہ ذرے سے آفتاب بن گئی ہے۔ یہ مسلمان لوگ کتنے اچھے ہیں۔

مولوی صاحب تشریف لے آئے تھے۔ محمود کے سامنے ان دونوں کا نکاح ہوگیا۔ محمود اپنی جگہ سے اٹھا اور ایک قیمتی ہار اوشا کے گلے میں ڈال دیا۔

ان دونوں کو ایک خیمے میں پہنچا دیا گیا۔

صبح اوشا کی آنکھ کھلی تو عبدالرحمن اپنے بستر پر نہیں تھا۔ باہر عجیب قسم کا شور ہو رہا تھا جیسے لوگ بھاگ دوڑ رہے ہوں۔ اس نے خیمے کے پردے سے باہر جھانکا۔ خیمے اکھاڑے جا رہے تھے۔ کچھ لوگ گھوڑوں پر سوار ہو کر روانہ ہو رہے تھے۔ وہ گھبرا گئی، کیا یہ لوگ مجھے چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ عبدالرحمن تو شاید جا بھی چکا ہے۔ اچانک اسے عبدالرحمن آتا دکھائی دیا۔ اس وقت وہ کوئی دوسرا ہی عبدالرحمن تھا۔ سر سے پاؤں تک لوہے میں ڈوبا ہوا، گھوڑے پر سوار، کمر سے تلوار بندھی ہوئی، کندھے پر ترکش جس میں تیر تھے۔ وہ پردہ چھوڑ کر بستر پر آ بیٹھی۔

عبدالرحمن اندر داخل ہوا۔ ”جلدی سے غسل کر کے کپڑے تبدیل کر لو۔ لشکر روانہ ہونے والا ہے۔“

”ہم یہاں سے کہاں جائیں گے؟“

”یہ بتانے کا حکم نہیں ہے۔“

”آپ کو معلوم ہے؟“

”مجھے تو معلوم ہے۔“

”پھر مجھے بتانے میں کیا حرج ہے؟“

”اس سفر کو خفیہ رکھا جا رہا ہے۔“

”مجھے بتا کر بھی خفیہ ہی رہے گا۔ بس مجھے یہ خوشی ہوگی کہ آپ مجھ پر اعتبار کرتے ہیں۔“

”تم نے سومنات کے مندر کا نام سنا ہے؟“

”ہاں، سنا ہے بلکہ وہاں کے بارے میں بہت سی باتیں بھی جانتی ہوں، ہندوؤں کے بھگوان سری کرشن اسی مقام سے غائب ہوئے تھے۔“

”یہ سب باتیں ہمیں بھی معلوم ہیں۔ اب تو ہم اس شہر کو فتح کرنے جا رہے ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے اب سومنات کا بت ہندوستان میں نہیں رہے گا۔“

”ہاں ہم مسلمان بت پرستی نہیں کرتے۔ بتوں کو توڑنا ہمارے مذہب میں ثواب کا درجہ رکھتا ہے لہٰذا اب اس بت کے بھی صرف ٹکڑے بچیں گے۔“

”آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں کہ ”ہمارے مذہب میں“ اب تو میں بھی مسلمان ہوں۔ مجھے بھی خوشی ہے کہ میں بت شکنی کی اس جنگ میں آپ کے ساتھ ہوں۔“

خدیجہ (اوشا) غسل کر کے تیار ہوگئی۔ دوسری عورتوں کے ساتھ اسے بھی رتھ میں سوار کرا دیا گیا۔ عبدالرحمن گھوڑے پر سوار اپنے دستے کے ساتھ تھا لیکن کبھی کبھی اس رتھ کے اردگرد بھی چکر لگا لیتا تھا۔

لشکر نے سامان سفر باندھا اور روانہ ہوگیا۔

راستے میں محمود کو چند اور قلعے ملے۔ اگرچہ ان قلعوں میں بہادر سپاہی بھی تھے اور سامان جنگ کی بھی فراوانی تھی لیکن محمود کے سر پر خدا کی رحمت تھی کہ ان قلعوں میں بسنے والوں کو یہ جرأت ہی نہ ہوسکی کہ اس کے سامنے آتے۔ جنگ کرنے کے بجائے محمود کے خوف سے اپنے قلعے محمود کے سپرد کر دیے۔

ان قلعوں سے فراغت کے بعد محمود نہروالا پہنچا جسے پٹن گجرات بھی کہا جاتا ہے۔ پورا شہر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ اسلامی لشکر کے خوف سے یہاں کے باشندے شہر خالی کر کے جا چکے تھے۔ محمود نے حکم دیا کہ شہر سے جتنا غلہ حاصل کر سکتے ہو لے لو۔ لشکر نے ایک ایک گھر میں جا کر دیکھا اور ذخیروں کا غلہ ہتھیا لیا۔ لشکر نے تیزی کے ساتھ سفر طے کیا اور سومنات پہنچ گیا۔

قلعہ سومنات نہایت بلندی پر تھا اور دریا کا پانی قلعے کی فصیل تک پہنچا ہوا تھا۔ محمود کے آنے کی خبر پہنچتے ہی اہل سومنات قلعے کی دیوار پر آ گئے اور چلا چلا کر کہنے لگے۔

”ہمارا معبود سومنات خود تم کو یہاں کھینچ لایا ہے تاکہ جو مندر اور شوالے تم اب تک برباد کر چکے ہو اس کی تم کو یہاں سزا دی جائے۔ تم اپنی فوج اور لشکر کے گھمنڈ میں یہاں تک چلے آئے مگر اب ہمارا پرماتما تم میں سے ایک کو بھی یہاں سے زندہ واپس نہیں جانے دے گا۔“

یہ باتیں محمود تک بھی پہنچا دی گئیں۔ اس نے بڑی بے فکری سے کہا۔

”تم بھی اپنی بات ان تک پہنچا دو۔ ان سے کہو ہمارا خدا تمہارے پرماتما سے بڑا ہے۔ اس کا مظاہرہ کل دیکھنا جب تمہارا سومنات اوندھے منہ زمین پر پڑا ہوگا۔“

دوسرے دن سلطان محمود نے قلعے کی دیواروں پر تیروں کی بارش کا حکم دے دیا۔ تیر اندازوں کا دستہ مستعدی سے دیوار کے نیچے پہنچا اور اوپر کی طرف تیر برسانا شروع

کر دیے۔ عبدالرحمن چونکہ اس دستے میں شامل تھا اس لیے وہ بھی تیر برسانے والوں میں شامل تھا۔ اس کی دیوانگی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ چونکہ ذاتی طور پر سلطان کا احسان مند تھا اس لیے بڑھ چڑھ کر حملے کر رہا تھا۔ اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر اتنا آگے بڑھ گیا تھا کہ اس کا کوئی نشانہ خالی نہیں جا رہا تھا۔ نہ جانے کتنے ہندو اس نے جہنم واصل کیے۔ اس کے سامنے خدیجہ (اوشا) کی صورت گھوم رہی تھی جو ایسے ہی میں کسی مندر سے بھاگ کر اس کے پاس آئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا، نہ جانے کتنی اوشائیں اس مندر میں ہوں گی جنہیں نجات دلانا اس کا فرض ہے۔

تیروں کی بارش اتنی شدید تھی کہ اہل قلعہ ششدر رہ گئے۔ ادھر سے بھی آتش بازی کے بان (آگ کے گولے) اور تیر برسائے جا رہے تھے۔ ہر چند وہ بلندی پر تھے لیکن انہیں شدید نقصان اٹھانا پڑ رہا تھا۔ پھر وہ اتنے بوکھلائے کہ دیوار سے قلعے کے اندر اتر گئے اور مندر میں پہنچ کر سومنات کے بت سے لپٹ گئے۔

”ان مسلمانوں نے ہندوستان بھر کے مندروں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ اب ان کی ہمتیں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ انہوں نے اے دیوتا تمہاری طرف میلی آنکھ سے دیکھا ہے۔ ہم انہیں روکنے کا پورا بندوبست کر رہے ہیں لیکن جب تک تمہاری آشیرباد ہمیں حاصل نہیں ہوگی ہماری جیت نہیں ہوسکتی۔ ان مسلمانوں کا منہ کالا کروانہیں سومنات سے چلتا کرو۔“

دو داسیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ سومنات دیوتا کو منانے کے لیے اس کے سامنے رقص کریں۔ یہ رقص رات بھر جاری رہے۔ جب دو تھک جائیں تو دوسری دو ان کی جگہ لے لیں۔

ادھر یہ ہو رہا تھا دوسری طرف مسلمان بہت سی سیڑھیاں لگا کر قلعے کے ایک حصے پر چڑھ گئے۔ نعرۂ تکبیر کی آوازوں سے قلعہ گونج اٹھا۔ اس وقت تک رات ہو چکی تھی اس لیے مناسب نہیں سمجھا گیا کہ قلعے کے اندر داخل ہوا جائے۔

اسلامی لشکر اپنی قیام گاہ کی طرف واپس آ گیا۔

مندر میں عبادت ہوتی رہی۔ اسلامی لشکر سرنیاز جھکائے فتح کی دعائیں مانگتا رہا۔

دوسرے دن جب آفتاب طلوع ہوا اور ذرا دن چڑھا تو محمود غزنوی سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق گھوڑے پر سوار جھنڈا اٹھائے میدان جنگ میں آ کھڑا ہوا۔

ہندوؤں نے بھی فصیل پر مورچے بنا لیے۔ جنگ کا بگل بجا اور دونوں طرف سے تیر برسائے جانے لگے۔ ان تیروں کی آڑ میں محمود اپنے خاص دستے کو لے کر آگے بڑھنے لگا۔

اس کثرت سے تیر برس رہے تھے کہ ہندوؤں نے بھاری جانی نقصان اٹھانے کے بعد فصیل چھوڑ دی۔ جس کو جہاں جگہ ملی وہ وہاں چھپ گیا۔ پنڈت اور پروہت سومنات کے آگے دعائیں مانگ رہے تھے۔

مسلمانوں نے فصیل صاف دیکھی تو سیڑھیاں لگا کر اوپر چڑھ گئے۔ نعرۂ تکبیر کی آوازوں سے قلعہ گونج رہا تھا۔ ان نعروں نے غصے کی آگ کو ایسا بھڑکایا کہ تلواریں سونت کر اندر آنے والے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے، دونوں طرف سے شمشیر زنی کے جوہر دکھائے جانے لگے۔ راجپوتوں نے ایسی بہادری دکھائی کہ مسلمان لشکر کے پاؤں اکھڑنے لگے۔ اس پر مستزاد یہ ہوا کہ اندھیرا پھیلنے لگا۔ تلواریں جہاں تھیں وہیں رک گئیں۔ اندھیرے نے دونوں لشکروں کے درمیان حد فاصل کھینچ دی۔

دونوں لشکر اپنے اپنے مقام پر واپس آ گئے۔

دونوں طرف سناٹے کا عالم تھا۔ قلعہ والے قلعہ بند بیٹھے تھے۔ محمود سنسان جنگل میں پڑا تھا۔ دو دن کی زور آزمائی نے محمود کو نا امید کر دیا تھا۔ یہ اندیشہ بھی تھا کہ جیسے جیسے وقت گزرے گا کہیں نہ کہیں سے کمک آ جائے گی۔ یہ اندیشہ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ قلعہ والوں نے ٹھاکروں اور راجاؤں کے پاس قاصد دوڑا دیے تھے کہ دھرم کی حفاظت کے لیے جلدی آؤ اور مسلمانوں کو کاٹ کر رکھ دو۔

آدھی رات ادھر آدھی ادھر ہو چکی تھی۔ محمود کچھ دیر کے لیے سویا تھا کہ آنکھ کھل گئی۔ یہ کوئی وقت نہیں تھا لیکن صبح سر پر کھڑی تھی۔ اس نے سرداران لشکر کو بلوا بھیجا۔

محمود ان سے مخاطب ہوا۔ ”جس طرح ممکن ہو اس لڑائی کا فیصلہ کرنا چاہیے۔ جس قدر دیر ہوگی دشمن پر ہماری ہیبت کم ہو جائے گی۔ یہ امکان بھی رہے گا کہ دشمن کو کمک ملتی رہے۔ ہم ہزاروں میل دور بیٹھے ہیں، ہمیں کوئی کمک نہیں پہنچا سکتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہمارے لشکر میں بھی بے دلی پھیلے گی۔ اب تک ہماری فوج بہ آسانی فتح کی عادی ہوگئی ہے جبکہ اسے سومنات میں مزاحمت کا سامنا ہے۔ ہمیں کل ہر حال میں قلعہ فتح کرنا ہے۔“

لشکر میں بھی صورت حال اس سے مختلف نہیں تھی۔ کچھ جاگ رہے تھے کچھ سو رہے تھے۔ جو جاگ رہے تھے سخت ہراساں تھے، گھروں سے ہزاروں میل دور تھے۔ بال بچوں

www.pdfbooksfree.pk

کی یادستا رہی تھی۔ بعض تو یہ بھی کہہ رہے تھے کہ اگر لوٹ مار کا لالچ نہ ہوتا تو کیوں اس مصیبت میں گرفتار ہوتے۔

امرا نے حکم ملتے ہی فیصلہ کن جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ پورے لشکر کی ترتیب ہوئی۔ ڈیرے ڈیرے میں حکم پہنچ گیا کہ صبح نور کے تڑکے قلعے پر دھاوا ہوگا۔

ادھر شہنشاہ مشرق نے تخت افلاک کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا ادھر شہنشاہ غزنی نے اسلحہ جسم پر سجاتے ہی سواری کا حکم دیا۔

صبح کی روشنی نمودار ہوئی، جنگ کا پھریرا بلند ہوا۔

قلعے میں بھی تمام رات آنکھوں میں کٹی تھی۔ پجاری، راجپوت، برہمن دھاوے کا غل سن کر گھبرا گئے۔ پہلے تو سب مندر کی طرف دوڑے۔ بت سے لپٹ کر زاروقطار روتے تھے اور فتح کی دعائیں مانگتے تھے۔ کسی نے خبر دی کہ مسلمانوں نے سیڑھیاں لگالی ہیں۔ قلعہ خطرے میں ہے۔ وہ لشکر جو قلعے کے آس پاس جمع تھے اہل قلعہ کی مدد کے لیے مسلمانوں کے مقابلے پر آگئے۔

محمود نے اپنی فوج کے ایک بڑے حصے کو قلعے کے محاصرے سے واپس بلایا اور اسے ساتھ لے کر اس بیرونی لشکر سے نبرد آزما ہوا۔ زبردست معرکہ آرائی ہوئی۔ میدان جنگ میں خون کی ندیاں بہنے لگیں۔

سومناتی بڑی تعداد میں قتل ہو رہے تھے لیکن مذہبی جذبہ اس قدر غالب تھا کہ ایک لمحے کو پیچھے ہٹنا گوارا نہیں تھا۔ ایک مرتا تھا تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا تھا کہ لو اب مجھے مارو۔

جنگ اپنی گرمی پر تھی کہ ایک طرف سے غبار اٹھتا نظر آیا۔ تجربہ کار محمود نے بھانپ لیا کہ کوئی راجا ہے جو اپنے لشکر کے ساتھ اہل قلعہ کی مدد کو آپہنچا ہے۔ اس نے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی اور ایک ہرکارہ غبار کی جانب دوڑایا کہ پتا کرو، یہ کیسا لشکر ہے۔

ہرکارہ دوڑا اور واپس آکر خبر سنا دی کہ واشلیم نامی راجا اپنے لشکر کے ساتھ بس پہنچنے ہی والا ہے۔

''خبردار! لشکر میں یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو۔''

محمود نے ایک دستہ ساتھ لیا اور آنے والے سے مقابلے کے لیے روانہ ہوگیا۔ اس کی فوج اہل قلعہ سے مصروف جنگ تھی۔ کسی نے دیکھا بھی نہیں کہ محمود دائیں طرف کو ہٹتے ہٹتے کس طرف غائب ہوگیا۔

محمود نے آنے والے راجا کو راستے ہی میں جالیا۔ اسے پیغام بھیجا۔

''ہماری تم سے کوئی دشمنی نہیں۔ اگر پھر بھی تم ہم سے لڑنا چاہتے ہو تو ہم سومنات سے فارغ ہولیں، اس کے بعد دو دو ہاتھ کرلینا۔''

ادھر سے جواب آیا۔ ''قلعہ والے اور ہم جدا جدا نہیں۔ ان کے دشمن ہمارے دشمن ہیں۔ ہم ان کی مدد کو آئے ہیں۔ ہماری بھی تم سے کوئی دشمنی نہیں، تم قلعے کا محاصرہ ختم کر کے چلے جاؤ، ہم بھی واپس چلے جائیں گے۔''

اب جنگ کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے فوج کے ایک بڑے حصے کو قلعے کے محاصرہ سے واپس بلالیا اور اس بیرونی لشکر سے دفاع کے لیے نبرد آزما ہوگیا۔ زبردست لڑائی ہوئی۔ میدان جنگ میں خون کی ندیاں بہنے لگیں، تیر و تفنگ سے موت کے پیام وسلام ہونے لگے۔

ایک طرف سے پھر ویسا ہی غبار اٹھا۔ ایک لشکر اور آگیا تھا۔ معلوم ہوا نہر والا کارا جا ''پرم دیو'' ہے جو اپنے ہم مذہبوں کی مدد کو آپہنچا ہے۔ اس لشکر کو دیکھ کر ترکوں اور افغانوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ خود محمود بھی ایسا کبھی نہیں گھبرایا تھا جیسا اس وقت گھبرا گیا تھا۔ اس نے فوراً قلعہ والی فوج کو پیغام بھیجا کہ قلعہ کا پیچھا چھوڑو اور ہماری خبر لو۔

اسے صاف نظر آرہا تھا کہ اس کے لشکر میں بددلی کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ وہ گھوڑے سے کود اور ایک گوشے میں جا کر حضرت شیخ ابوالحسن خرقانی کی مقدس عبا کو ہاتھ میں لیا اور سجدے میں گر گیا۔ گریہ وزاری کرتا رہا اور دعائے فتح مانگتا رہا۔

یہ وہی کرتہ تھا کہ جب اس نے خرقان میں شیخ ابوالحسن سے ملاقات کی تھی اور شیخ نے نشانی کے طور پر اپنا کرتہ دیا تھا۔ اس وقت سے لے کر اب تک محمود اس کرتے کو سفر میں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اس وقت وہ اسی کرتے کا واسطہ دے کر دعا بر لب تھا۔

دعا سے فارغ ہونے کے بعد وہ چیخ چیخ کر اپنے لشکر کو مخاطب کر رہا تھا۔

''یاد رکھو، اگر ہم بھاگے تو خراسان و ترکستان تک نہیں پہنچ سکیں گے، راستے ہی میں قتل کر دیے جائیں گے۔ بھاگ کر مرنے سے بہتر ہے کہ میدان جنگ میں کام آجاؤ۔ خدا دیکھ رہا ہے کہ ہم اس کے دین کے لیے سینہ سپر ہیں، وہ ہماری ضرور مدد کرے گا۔ اٹھو اور اپنے دست و بازو پر اعتماد کرو، غازی ہو یا شہید۔ میں نے ابوالحسن خرقانی کا واسطہ دے کر دعا کی ہے۔ تمہیں ضرور فتح ملے گی۔''

وہ گھوڑا دوڑاتا کبھی ایک طرف نکل جاتا اور یہ پیغام پہنچاتا جاتا، کبھی دوسری طرف نکل جاتا۔ اس کی آواز

پورے میدان میں گونج رہی تھی۔

اس تقریر نے ایسا اثر کیا کہ جھکی ہوئی کمریں تن گئیں۔ یک جان اور بے خوف ہو کر ایسا حملہ کیا کہ پانچ ہزار کی نفری کا دم بھر میں صفایا کر دیا۔ دشمن کی صفوں میں ہلچل مچ گئی۔ ان کے پاؤں اکھڑ گئے، سپاہی اور پجاری جن کی تعداد چار ہزار تھی، اپنی جان بچا کر دریا کی طرف بھاگے اور کشتیوں میں بیٹھ کر جزیرۂ سراندیپ کی طرف روانہ ہوئے، محمود نے پہلے ہی ان فراریوں کا انتظام کر رکھا تھا اور کشتیوں میں مسلمان لشکر کے چھوٹے چھوٹے دستے بٹھا کر ان کشتیوں کو دریا میں چھوڑ رکھا تھا لہٰذا جس وقت ہندو کشتیوں میں بیٹھ کر جزیرۂ سراندیپ کی طرف روانہ ہوئے، اسی وقت مسلمانوں نے ان پر حملہ کر دیا اور دشمن کی کشتیوں کو غرق کر دیا۔

مدد کو آنے والے کچھ لشکری خشکی کے راستے بھاگ نکلے۔ مسلمانوں نے ان کا بھی دور تک تعاقب کیا لیکن اصل مقصد ان کا تعاقب نہیں تھا لہٰذا لوٹ آئے۔

اس فتح کو دیکھ کر قلعہ والوں کی رہی سہی آس ٹوٹ گئی۔

جب ہندوؤں کی طرف سے پوری طرح اطمینان ہوگیا تو سلطان محمود اپنے بیٹوں اور امرا کو ساتھ لے کر قلعے کے اندر داخل ہوگیا۔ ایک اندرونی راستہ بت خانے کی طرف جاتا تھا۔ وہ بت خانے میں پہنچا۔ اس عظیم الشان بت خانے کو دیکھ کر اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ مندر کی چھت چھپن ستونوں پر قائم تھی اور ہر ستون سنگ مرمر کا تھا اور جواہرات سے مرصع تھا، عین درمیان میں سونے کی جڑاؤ زنجیر لٹکی تھی۔ اس میں ایک سونے کا چراغ دن رات جلتا تھا۔ پتا نہیں کب سے روشن تھا جسے آج مسلمانوں کے ہاتھوں گل ہونا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ یہاں گانے بجانے والی عورتوں کی تعداد تقریباً پانچ سو تھی اور مرد سازندے تین سو کے قریب تھے۔ تقریباً تین سو حجام پجاریوں کے سر اور ڈاڑھیاں مونڈنے کے لیے وہاں موجود رہتے تھے۔ ہندوستان کے راجے، مہاراجے اپنی کنواری لڑکیوں کو سومنات کی خدمت کے لیے بھیج دیتے تھے۔

محمود نے بت خانے کی وسعت اور سج دھج دیکھنے کے بعد نظر ڈالی تو دروازے کے سامنے سومنات رکھا نظر آیا۔ اس بت کی لمبائی پانچ گز تھی جس میں دو گز زمین کے اندر اور تین گز اوپر تھا۔ یہ بت پتھر کا بنا ہوا تھا۔

مندر کا بڑا پجاری ہاتھ جوڑ کر محمود کے سامنے آیا۔

''اگر بادشاہ سلامت ہمارے بت کو نہ توڑیں تو ہم اس کے بدلے منہ مانگی دولت دینے کو تیار ہیں۔''

محمود نے غصے میں بھرا جواب دیا۔ ''اگر میں اس بت کے بدلے میں دولت وصول کروں تو بت فروش کہلاؤں گا، میں تاریخ میں بت شکن کے نام سے زندہ رہنا چاہتا ہوں اس لیے میں اس بت کو ضرور توڑوں گا۔''

محمود کے ہاتھ میں اس وقت ''گرز'' تھا۔ اس گرز سے اس نے کاری ضرب لگائی۔ اس بت کا منہ ٹوٹ گیا۔ یہ بت کھوکھلا تھا۔ دوسری ضرب نے اس کا نچلا دھڑ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

محمود کی نیک نیتی اس وقت رنگ لائی جب اس بت کے پیٹ سے ان گنت اور بیش قیمت جواہر اور اعلیٰ درجے کے موتی نکلے۔ ان سب جواہرات کی قیمت برہمنوں کی پیش کردہ رقم سے سوگنا زیادہ تھی۔

محمود نے حکم دیا کہ اس بت میں سے پتھر کے دو ٹکڑے کاٹ کر الگ کیے جائیں اور غزنی بھجوائے جائیں۔ ان میں سے ایک ٹکڑا جامع مسجد کے دروازے پر اور دوسرا ایوانِ سلطنت کے صحن میں رکھا جائے۔ اس کے علاوہ سومنات کے بت سے دو اور ٹکڑے الگ کر کے مکہ اور مدینہ بھیجے گئے تاکہ انہیں عام راستے میں رکھ دیا جائے اور لوگ انہیں دیکھ کر سلطان محمود کی جرأت و ہمت کی داد دیں۔

بت کو توڑنے سے قبل معززین سلطنت (محمود کے امرا) نے بھی یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ برہمنوں کی درخواست قبول کرلی جائے اور اس کے عوض منہ مانگی رقم وصول کرلی جائے۔ بت کو توڑ ڈالنے سے نہ تو بت پرستی کی رسم اس شہر سے مٹ سکتی ہے اور نہ ہمیں کوئی فائدہ ہوگا۔ اگر ہم معاوضے میں کوئی رقم وصول کرلیں گے تو اس سے غریب مسلمانوں کا فائدہ ہوگا۔

اگر محمود اس وقت ان کی بات مان لیتا تو تاریخ اسے بت فروش کے نام سے یاد کرتی، بت شکن کوئی نہ کہتا۔

لفظ سومنات کی حقیقت کیا ہے؟ تمام مورخین متفق ہیں کہ ''سومنات'' اس مخصوص بت کا نام تھا جسے ہندوستان کے تمام باشندے بتوں کا سردار مانتے ہیں۔

حضرت شیخ فریدالدین عطار کے قول کی رو سے یہ دو لفظوں کا مرکب ہے ''سوم'' اور ''نات'' سوم مندر کا نام ہے اور نات بت کا۔

مورخ فرشتہ کا قول ہے کہ ''سوم'' اس راجا کا نام ہے جس نے یہ بت بنایا اور ''نات'' اس بت کا نام۔ کثرت

www.pdfbooksfree.pk

استعمال سے یہ دونوں لفظ آپس میں مل کر سومنات ہو گئے بلکہ یہاں تک ہوا کہ اس شہر کا نام ہی سومنات ہو گیا۔ نات کے معنی ہندی زبان میں بزرگ یا بڑے کے ہیں۔

جب بھی سورج گہن یا چاند گہن ہوتا تھا تو اس مندر میں تقریباً دو لاکھ تیس ہزار آدمی جمع ہوتے تھے۔ ان میں سے بڑی تعداد دور دراز کے علاقے کے لوگوں کی ہوتی تھی جو مرادیں مانگنے اور نذریں چڑھانے آتے تھے۔ ہندوستان کے راجا اس مندر کے اخراجات کے لیے وقتاً فوقتاً گاؤں اور قصبے وقف کرتے رہتے تھے۔ جس وقت سلطان محمود نے اس پر حملہ کیا تھا اس وقت تقریباً دو ہزار قصبوں کی آمدنی اس کے اخراجات کے لیے وقف تھی۔

دو ہزار برہمن پوجا پاٹ کے لیے ہر وقت موجود رہتے تھے۔

مصنف تاریخ فرشتہ کا بیان ہے۔ ''اس مندر سے سلطان محمود کو جو اعلیٰ درجے کے جواہرات اور سونا چاندی ہاتھ لگا وہ اس قدر زیادہ تھا کہ اس کا دسواں حصہ بھی اس سے پہلے کسی بادشاہ کے خزانے میں جمع نہ ہوا ہوگا۔''

تاریخ ''زین المآثر'' میں لکھا ہے کہ مندر کی وہ مخصوص جگہ جہاں ''سومنات'' رکھا ہوا تھا بالکل تاریک تھی اور وہاں جو روشنی پھیلی ہوئی تھی وہ دراصل اعلیٰ درجے کے جواہرات کی شعاعیں تھیں۔ یہ جواہرات مندر کی قندیلوں میں جڑے ہوئے تھے۔

اسی تاریخ میں بیان کیا گیا ہے کہ سومنات کے خزانے سے سونے چاندی کے چھوٹے چھوٹے بت اتنی بڑی تعداد میں برآمد ہوئے کہ ان کی قیمت کا اندازہ تقریباً ناممکن ہے۔

❁❁❁

جب سلطان محمود سومنات کی غارت گری سے فارغ ہو چکا اور اس کے اراکین سلطنت نے انتظامات سنبھال لیے تو محمود کو نہروالا کے راجا پرم دیو کا خیال آیا۔ یہ وہی راجا تھا جس نے سومنات کی مدد کے لیے لشکر روانہ کیا تھا اور دو تین ہزار مسلمان شہید کر دیے تھے۔ اس سے انتقام لینا ضروری تھا ورنہ محمود کے غزنی روانہ ہوتے ہی وہ پھر سر اٹھا سکتا تھا۔

راجا پرم دیو کو بھی خدشہ تھا کہ محمود اس سے انتقام لینے ضرور آئے گا اس لیے وہ نہروالا چھوڑ کر ''کندھ'' کے قلعے میں پناہ گزیں ہو گیا تھا۔ سومنات سے ''کندھ'' کا فاصلہ چالیس کوس تھا۔ محمود نے اس فاصلے کو گھوڑوں کی ''سموں'' سے باندھا اور کندھ جا پہنچا۔

جب مسلمانوں کا لشکر ''کندھ'' کے قلعے کے قریب پہنچا تو وہاں ایک بہت بڑی خندق نظر آئی۔ یہ خندق قلعے کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئی تھی۔ اس خندق میں پانی بھرا ہوا تھا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ خندق کی گہرائی کتنی ہے۔ خندق کو پار کر کے ہی قلعے تک پہنچا جا سکتا تھا لیکن خندق کو پار کرنا ناممکن نظر آ رہا تھا۔ آخر غوطہ خور اتارے گئے کہ گہرائی کا پتا لگائیں اور کوئی ایسی جگہ تلاش کریں جہاں گہرائی نسبتاً کم ہو۔ خندق کی گہرائی اتنی تھی کہ تھاہ نہیں ملتی تھی۔ سارے غوطہ خور زمین کو ہاتھ لگائے بغیر ہی واپس آ گئے۔ پھر ایک غوطہ خور نے ایک ایسی جگہ کا پتا چلا لیا جہاں گہرائی اتنی تھی کہ خندق پار کی جا سکتی تھی۔

اس کے باوجود محمود اپنے لشکریوں کی جان خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ سامنے قلعے کی دیواریں چمک رہی تھیں اور وہ بے بس خندق کے اس طرف کھڑا تھا۔

محمود کے ارادوں میں جو چیز مانع تھی وہ یہ تھی کہ غوطہ خوروں نے یہ انتباہ کیا تھا کہ اگر خندق عبور کرتے ہوئے پانی میں ہلچل پیدا ہوئی تو پورا لشکر تباہ ہو جائے گا۔

اس بحث و تمحیص میں کئی دن گزر گئے تھے۔ اس کے امرائے سلطنت بھی دو حصوں میں بٹ گئے تھے، کچھ کا خیال تھا کہ خطرہ مول لے لیا جائے، کچھ کہتے تھے یہ کوئی ایسی لازمی مہم نہیں واپس چلا جائے۔ محمود اس خیال سے قطعی متفق نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یا تو ہم یہاں تک آئے نہ ہوتے۔ جب آ گئے ہیں تو واپس جانا نامردی ہے۔ دشمن کو ہنسنے کا موقع ملے گا۔

اس نے اعلان کیا کہ وہ قرآن کریم سے استخارہ کرے گا، اگر اجازت مل گئی تو پھر سب کو اس کے ساتھ خندق پار کرنا ہوگی۔

قرآن کریم سے استخارہ کیا اور اجازت ملنے پر خدا کی ذات بابرکات پر بھروسا کر کے اس نے اپنے امیروں اور لشکریوں کے ہمراہ اپنا گھوڑا پانی میں ڈال دیا۔

یہ لشکر خدا کی رحمت سے صحیح سلامت پار اتر گیا۔

خندق پار کرنے کی دیر تھی۔ پرم دیو یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سوچا جو قوم اس عظیم الشان خندق کو پار کر سکتی ہے اس سے وہ کتنی دیر لڑ سکے گا۔ جو وہ سوچے بیٹھے تھا، اس پر عمل کر گزرا۔ اس نے بھیس بدلا اور مسلمانوں کی نظروں سے بچ بچا کر فرار ہو گیا۔

راجا پریم دیو کے فرار ہوتے ہی اہل قلعہ نے دروازے کھول دیے اور مسلمان اندر داخل ہو گئے۔ اندر

جا کر عقدہ کھلا کہ راجا یہاں سے بھی فرار ہو چکا ہے۔ پرم دیو کے خزانے کے سوا محمود کو کچھ نہ مل سکا۔

سلطان محمود نے قلعہ کندھ کو فتح کرنے کے بعد نہروالا کا رخ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ راجا پرم دیو کندھ سے بھاگ کر یہاں آیا ہوگا لیکن یہاں محمود کی راہ میں حائل ہونے والا کوئی بھی نہیں تھا۔

راجا تو اسے نہ مل سکا لیکن نہروالا کی شادابی اور خوب صورتی نے محمود کو خرید لیا۔ ایسا سرسبز علاقہ اس نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ دولت کی فراوانی تھی۔ جلد ہی اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہاں خالص سونے کی کانیں ہیں۔ چند روز رہ کر اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہاں کی آب و ہوا بہترین ہے۔

چند دن کے قیام کے بعد وہ ان خطوط پر سوچنے لگا کہ وہ اس علاقے کو اپنی سلطنت کا مرکزی مقام بنا لے اور غزنی کی حکومت سلطان مسعود کے حوالے کر دے۔ جب یہ خیال اچھی طرح اس کے دل میں راسخ ہو گیا تو اس نے چند امیروں کے سامنے اس کا تذکرہ کیا۔ ان امیروں کے ذریعے یہ بات دوسرے امیروں تک پہنچی۔ انہیں فکر ہوئی کہ اگر سلطان اس فیصلے پر عمل کر بیٹھا تو غزنی دیکھنا انہیں کبھی نصیب نہ ہوگا۔ وہ ہمیشہ کے لیے ہندوستان کے ہو کر رہ جائیں گے۔ یہ پہلا موقع تھا جب محمود کے امیروں نے اس سے اختلاف کیا تھا۔

ایک روز سلطان اپنی مجلس میں بیٹھا تھا کہ اس نے یہ تذکرہ سب کے سامنے چھیڑ دیا۔

''نہروالا کی شادابی، یہاں کے باشندوں کا حسن و جمال، محل وقوع وغیرہ کو دیکھ کر مجھے یہ خیال آتا ہے کہ میں اسے اپنی مملکت کا دارالسلطنت بنا لوں اور غزنی شہزادہ مسعود کے حوالے کر دوں۔ آپ لوگ کیا کہتے ہیں؟''

اب تک امرا نے یہ باتیں صرف سنی تھیں مگر اب محمود خود ان سے کہہ رہا تھا۔ نہ صرف کہہ رہا تھا بلکہ ان کی رائے بھی طلب کر رہا تھا۔ اب خاموش رہنا بعید از مصلحت تھا۔ ان میں سے ہر ایک نے مخالفت کی۔ اس مخالفت کا لب لباب یہ تھا۔

''ہم نے خراسان کو ایک عرصہ بعد خس و خاشاک سے پاک کیا ہے اور اس گراں قدر جواہر پر بہت سی جانیں قربان کی ہیں لہٰذا ان قربانیوں کے پیش نظر اس ہر دلعزیز شہر کو چھوڑ کر گجرات کو دارالسلطنت بنانا دور اندیشی نہیں۔''

سلطان اس کے بعد بھی کوشش کرتا رہا کہ اراکین

www.pdfbooksfree.pk

دولت کسی طرح اس کی بات مان لیں لیکن کوئی اس کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ ان سب کو غزنی چھوڑے دو سال ہو چکے تھے۔ ہر فرد چاہتا تھا کہ جلد از جلد غزنی چلا جائے۔ اب تو یہ باتیں بھی محمود کے کانوں میں پڑنے لگی تھیں کہ بہت سے لوگ فرار ہو کر غزنی جانے کو تیار بیٹھے ہیں۔

محمود کو بالآخر اپنا یہ ارادہ منسوخ کرنا پڑا۔

روانگی سے قبل اسے ایک ایسے آدمی کی تلاش ہوئی جسے یہاں کا حکمراں بنا کر وہ غزنی چلا جائے اور یہ حکمراں اسے سالانہ خراج ادا کرتا رہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہوا تھا کہ اس کا اپنا کوئی امیر یہاں کا حکمراں بننے کو تیار نہیں تھا۔

اس سلسلے میں سلطان نے سومنات کے شہریوں سے بھی مشورہ کیا۔ ان معزز شہریوں نے ایک شخص کی نشاندہی کی جو شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور محمود کے خوف سے برہمن کا روپ بدل کر عبادت میں مشغول رہتا ہے۔ وہ چونکہ راجا کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے اس لیے نہروالا کے لوگوں کے لیے قابل قبول بھی ہوگا۔ اس کا نام دابشلیم مرتاض ہے۔

محمود نے حکم دیا کہ اس شخص کو پیش کیا جائے۔

وہ شخص عبادت خانے میں برہمن بنا بیٹھا تھا کہ کچھ لوگ اسے بلانے کے لیے پہنچ گئے۔ مرتاض کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ وہ یہی سمجھا ہوگا کہ بھانڈا پھوٹ گیا اور اب اسے اس جرم میں قتل کر دیا جائے گا کہ وہ راجا نہروالا کا رشتہ دار ہے۔ اس نے محمود کے دربار میں آتے ہی اپنی صفائی پیش کرنی شروع کر دی۔

''اے مسلمانوں کے بادشاہ، میں راجا کا قریبی رشتہ دار ضرور ہوں لیکن اس کا ساتھی نہیں ہوں اور نہ اس ملک پر کسی قسم کا دعویٰ رکھتا ہوں۔ آپ کے خلاف بھی نہیں ہوں۔ ایک کونے میں بیٹھا عبادت کر رہا ہوں، پھر مجھے کیوں قتل کرتے ہو تم کہو تو میں یہاں سے کہیں دور چلا جاؤں۔''

''یہ تجھ سے کس نے کہہ دیا کہ میں نے تجھے قتل کرنے کے لیے بلایا ہے۔''

''پھر تمہیں مجھ سے کیا کام۔''

''ہم اس ملک پر حکومت کرنے نہیں آئے ہیں۔ دو سال ہوئے اپنا گھر بار چھوڑ کر یہاں بیٹھے ہیں۔ اب ہمیں یہاں سے رخصت ہونا ہے۔ میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ تمہیں یہاں کا حکمراں بناؤں۔ تم مجھے سالانہ خراج ادا کرتے رہو گے تو میں تمہارے معاملات میں دخل اندازی نہیں کروں گا۔''

وہ شخص کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ''مجھے یہ پیشکش قبول ہے۔ میں آپ کا ہمیشہ وفادار رہوں گا لیکن چلتے چلتے آپ میرا ایک کام کر دیں۔''

اس نے بتایا کہ اس کا ایک ہم قوم فلاں ملک کا راجا اس کا جانی دشمن ہے۔ وہ محمود کے جاتے ہی نہروالا پر حملہ کر دے گا اگر محمود اس کی شرارتوں سے اسے مطمئن کر دے تو خراج سے دگنی رقم شاہی خزانے میں جمع کرائے گا۔

محمود نے اس کے دشمن کے ملک پر حملہ کیا اور اسے گرفتار کر کے مرتاض کے پاس لے آیا۔

''تیرا دشمن تیرے سامنے ہے۔ چاہے تو اسے قتل کرا دے تاکہ تو ہمیشہ کے لیے اس کی شرارتوں سے محفوظ ہو جائے۔'' محمود نے نئے حکمران مرتاض سے کہا۔

''ہمارے مذہب میں کسی بادشاہ کو قتل کرنا جائز نہیں۔'' مرتاض نے بتایا۔ ''ہمارے ہاں یہ دستور ہے کہ جب ایک راجا دوسرے راجا کو شکست دے کر گرفتار کر لیتا ہے تو فاتح اپنے تخت کے نیچے ایک کوٹھری بنوا کر مفتوح راجا کو اس میں قید کر دیتا ہے۔ اس کوٹھری کا کوئی دروازہ نہیں ہوتا، دیوار میں ایک سوراخ کر دیا جاتا ہے۔ اس کے ذریعے اسے روٹی پانی فراہم کر دیا جاتا ہے۔ یہ قید اس وقت تک رہتی ہے جب تک فاتح کا انتقال نہ ہو جائے۔''

''جو تمہاری رسم ہے اسے پورا کرو، یہ تمہارے اختیار میں ہے اسے قید کر دو۔''

''مجھے خدشہ ہے کہ آپ کے چلے جانے کے بعد اس کے ہمدرد علم بغاوت بلند کریں گے اور اسے چھڑا کر لے جائیں گے۔ میری حکومت کی بنیادیں ابھی اتنی مضبوط نہیں کہ میں اس قیدی کی حفاظت کر سکوں۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ اسے میرے پاس چھوڑنے کے بجائے اپنے ساتھ لے جائیں۔ جب میری حکومت کی بنیادیں مضبوط ہو جائیں گی تو میں اسے اپنے پاس بلا لوں گا۔''

سلطان نے اس کی یہ درخواست بھی قبول کر لی۔

اب محمود کو واپسی کا سفر درپیش تھا۔ وہ پورے ڈھائی سال کے بعد اپنے وطن غزنی لوٹ رہا تھا۔ عین موقعے پر اسے یہ اطلاع ملی کہ راجا پرم دیو اور راجا اجمیر نے ایک لشکر جرار تیار کر لیا ہے اور گھات لگا کر بیٹھے ہوئے ہیں کہ واپسی میں اس پر حملہ کریں۔ محمود اس وقت کسی جنگ میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ارادہ کیا کہ وہ راستہ بدل کر سندھ کے جنگلوں سے گزرتا ہوا ملتان کی طرف نکل جائے گا۔

یہ راستہ چونکہ اس کے لیے اجنبی تھا اس لیے اس نے ایک ہندو راہبر کی خدمات لیں جس کا دعویٰ تھا کہ وہ اس راستے سے بخوبی واقف ہے۔

لشکر نے سامان سفر باندھا۔ ہزاروں گھوڑوں اور سیکڑوں اونٹوں پر مشتمل یہ قافلہ روانگی کے لیے تیار تھا۔ ہندو رہبر کو ایک مرتبہ پھر محمود نے اپنے سامنے بلایا اور اس سے سفر کے لیے ضروری انتظامات کے بارے میں بات کی، رہبر نے بتایا کہ پانی ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

''جس راستے سے میں آپ کو لے جا رہا ہوں وہاں پانی کی بہتات ہے اور پھر چونکہ جنگل کے درمیان سے ہو کر گزرنا ہے اس لیے سفر زیادہ طویل بھی نہیں ہوگا۔ بس اتنا پانی ساتھ لے لیں کہ اگر کسی جگہ پانی نہ ملے تو ضرورت پوری ہو جائے۔''

محمود نے اس کی بات مان لی اور چند اونٹوں پر بہ قدر ضرورت پانی ساتھ لے لیا۔ ایک دن اور ایک رات یہ قافلہ میدانی سفر کے بعد جنگل میں داخل ہو گیا۔ جنگل ایسا گھنا تھا کہ دن میں اندھیرا رہتا تھا۔ رہبر نے کہا تھا کہ زیادہ سے زیادہ دو دن بعد ہم اس جنگل سے نکل جائیں گے۔ اس کی بات اس حد تک درست بھی تھی کہ جنگل میں پانی میسر تھا۔

دو دن گزرے پھر تیسرا دن ہوا، پھر چوتھا دن آ گیا۔ اب دور دور تک پانی بھی نظر نہیں آ رہا تھا اور جنگل تھا کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

ساتھ لائے ہوئے پانی کا ذخیرہ ختم ہو گیا تھا۔

وہ ایک ایسے جنگل میں داخل ہو چکے تھے جہاں سپاہیوں کو ایک دن اور ایک رات پانی کا ایک قطرہ بھی میسر نہ ہو سکا۔ ہر طرف بے چینی تھی۔ گلے خشک ہو گئے تھے، موت قریب نظر آنے لگی تھی۔ اب لوگوں کو شک ہونے لگا تھا کہ رہبر نے جان بوجھ کر انہیں بھٹکا دیا ہے۔

محمود نے یہ عالم دیکھ کر اس ہندو رہبر سے پوچھا۔ ''تو نے رہبری کا وعدہ کیا تھا لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تو خود راستہ بھول گیا ہے۔ آخر تو لشکر کو کس طرف لے جا رہا ہے۔''

''کیا آپ اب بھی نہیں سمجھے کہ میں لشکر کو کس طرف لے جا رہا ہوں؟''

''اب میں سمجھ گیا ہوں کہ تو نے ہمیں بھٹکا دیا ہے۔ اپنی جان کی خیر چاہتا ہے تو ہمیں ٹھیک راستے پر لے چل۔''

''اگر ٹھیک راستے پر لانا ہوتا تو یہاں لاتا ہی کیوں۔ جو کام بڑے بڑے راجا نہ کر سکے وہ میں نے کر دکھایا۔ اب اگر تم اپنی تمام دولت بھی مجھے دو تو بھی صحیح راستہ نہیں دکھاؤں گا۔''

''تجھے مجھ سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔''

''میں سومنات کے جاں نثاروں میں سے ہوں۔ میں آپ کی فوج کو جان بوجھ کر اس جنگل میں لایا ہوں جہاں پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں۔ سومنات کو برباد کرنے والے اس جنگل میں تباہ ہو جائیں گے۔ اب آپ مجھے قتل بھی کرا دیں تو بھی اس جنگل سے کبھی نہیں نکل سکیں گے۔''

محمود اتنے طیش میں تھا کہ اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ رہبر کو قتل کرا دے گا تو وہ آخری سہارا بھی ختم ہو جائے گا جو اسے اس جنگل سے نکالنے میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ اس نے اس ہندو رہبر کو قتل کرا دیا۔

اسی رات کو محمود اپنے لشکر سے الگ ہو کر ایک گوشے میں آیا اور سر نیاز کو خاک پر رکھ کر خداوند تعالیٰ سے دعا مانگی کہ وہ مسلمانوں کو جلد از جلد اس بلائے ناگہانی سے نجات دے۔

رات ابھی تھوڑی گزری تھی کہ شمال کی جانب ایک روشنی نظر آئی۔ یہ عجیب بات تھی، اس تاریک جنگل میں روشنی کیسی!

سلطان محمود نے اس روشنی کو غیبی اشارہ سمجھا اور اس نے لشکر کو کوچ کا حکم دیا۔

''جس طرف روشنی دکھائی دے رہی تھی اسی طرف چلتے رہو۔''

یہ لشکر تمام رات چلتا رہا آخر کار صبح کے وقت وہ ایک ندی کے کنارے پہنچ گئے۔ ایک دن اور ایک رات کا پیاسا لشکر پانی پر ٹوٹ پڑا، خوب سیر ہو کر پانی پیا۔

اس مصیبت سے نجات ملی تو لشکریوں کی جان میں جان آئی اور محمود نے کامیاب و کامران غزنی میں قدم رکھا۔ اس کے آنے کی دھوم مچی تو قادر باللہ خلیفہ بغداد نے اس کے نام تہنیتی خط لکھا اور خراسان، ہندوستان، نیم روز اور خوارزم کے جھنڈے بھیجے جس کا مطلب یہ تھا کہ اب وہ ان علاقوں کا بلاشرکت غیرے مالک ہے۔ اس کے بیٹوں اور بھائیوں کے لیے اس خط میں خطابات بھی لکھے تھے۔ سلطان محمود کو کہف الدولہ والاسلام کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔

اس خط میں یہ صراحت بھی کی گئی تھی کہ تو جس کو اپنا ولی عہد مقرر کرے گا ہم بھی اس کو قبول کریں گے۔ محمود اس وقت تخت میں تھا جب اسے یہ خط ملا۔ اس نے اسی وقت تمام مفتوحہ ممالک میں ان خطابات کا اعلان کرا دیا۔

اسی سال سلطان نے ہندوستان پر اپنا آخری اور سترہواں حملہ کیا۔ یہ حملہ ہندوستان کے جاٹوں کو سزا دینے کے لیے تھا۔

جب سلطان سومنات کی فتح کے بعد اپنے وطن لوٹ رہا تھا تو اس قوم نے سلطانی لشکر کو روکنے کی کوشش کی تھی اور مسلمانوں کو بہت تکلیف پہنچائی تھی۔ اس وقت وہ تھکا ہارا

www.pdfbooksfree.pk

اور جلدی میں تھا لیکن اب اس قوم سے بدلہ لینا ضروری ہوگیا تھا ورنہ سلطان کا رعب اس پر سے جاتا رہتا۔

یہ قوم کوہِ جودی کے دامن میں دریا کے کنارے آباد تھی۔

سلطان نے فوج کشی کا اعلان کیا تو لوگ جوق در جوق اس کے پاس جمع ہونے لگے۔ اس کے ساتھ جانے کا مطلب مالِ غنیمت کی فراوانی تھی لہٰذا اسے لشکر جمع کرنے میں کبھی دِقت نہیں ہوئی۔

وہ منزلیں طے کرتا ہوا ملتان پہنچا۔ اس نے یہاں پہنچ کر چودہ سو کشتیاں بنانے کا حکم دیا۔ کاریگروں کو بتا دیا کہ کشتیاں اس طرح بنائی جائیں کہ ہر کشتی میں تین سلاخیں نصب کی جائیں۔ ایک سلاخ کشتی کے سامنے کی طرف اور دوسری کشتی کے دونوں اطراف لگا دی جائیں۔ کاریگر حیران تھے کہ ان خاص کشتیوں کو بنوانے کا مقصد کیا ہے۔ یہ سلاخیں آخر کس مقصد کے لیے لگائی گئی ہیں۔

جب یہ کشتیاں تیار ہوگئیں اور دریا میں اتار دی گئیں تو سلطانی حکم سے ہر کشتی میں بیس آدمی بٹھائے گئے۔ یہ آدمی تیر کمان سے مسلح تھے اور کشتیوں میں بارود رکھا گیا تھا۔ یہ اس زمانے کی بحری جنگ تھی۔

یہ چودہ سو کشتیاں ایک ساتھ دریا میں آگے کی طرف چلیں۔

جاٹوں کو اس لشکر کی آمد کی خبر مل چکی تھی لہٰذا انہوں نے بھی مقابلے کی تیاری کی۔ اپنے بال بچوں کو جزیروں میں بھیج دیا اور خود تنہا مقابلے پر آئے۔ وہ بھی کشتیوں میں سوار تھے، ہر کشتی میں مسلح دستہ بیٹھا ہوا تھا۔

دونوں فوجیں دریا میں ایک دوسرے کے سامنے آئیں۔ سلطان کی حکمت عملی کا راز اب کھلا کہ اس نے کشتی میں سلاخیں کیوں لگوائی تھیں۔ جاٹوں کی جو کشتی بھی مسلمانوں کی کشتی کے سامنے آتی، آہنی سلاخوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہوجاتی۔ جاٹ حیران ہو رہے تھے کہ مسلمانوں کی کشتیوں میں آخر ایسی کیا بات ہے کہ ہماری جو کشتی بھی ان کے قریب پہنچتی ہے غرق ہوجاتی ہے۔ اسی حیرانی میں ان کی ہر کشتی ایک ایک کر کے ڈوب گئی۔ جو لوگ ڈوبنے سے بچ گئے اور دریا میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے دیکھے گئے، انہیں مسلمانوں نے اپنی تلواروں سے ختم کر دیا۔

ان سب کو ختم کرنے کے بعد مسلمانوں کا لشکر دشمن کے پس ماندگان کی طرف روانہ ہوا اور ان سب کو قید کرلیا اور ہنکاتا ہوا غزنی لے آیا۔

یہ 417 ہجری 1026 عیسوی کا سال تھا۔

داشلیم مرتاض جس کو محمود نہر والا کی حکمرانی پر چھوڑ آیا تھا اور اس کے دشمن قیدی کو ساتھ لے آیا تھا، اپنی حکومت کی بنیادیں مضبوط کر چکا تھا۔ اس نے اپنا اپلی محمود کی خدمت میں روانہ کیا اور تقاضا کیا کہ اس کا دشمن قیدی اس کے حوالے کر دیا جائے تاکہ اپنی رسم کے مطابق اسے اپنے تخت کے نیچے تنگ و تاریک کوٹھری میں قید کرے جو اس مقصد کے لیے تیار کرلی گئی ہے۔

سلطان نے اس قیدی کو ایلچیوں کے حوالے کر دیا۔ وہ اسے لے کر سومنات کی طرف روانہ ہوگئے۔ جب یہ سومنات کی حدود میں پہنچے تو انہوں نے مرتاض کو اپنی آمد کی خبر دی۔ مرتاض اپنے قیدی کے استقبال کے لیے شہر سے باہر نکلا۔ اس نے ایک طشت اور لوٹا بھی ساتھ لے لیا تاکہ وہ دستور کے مطابق ان چیزوں کو قیدی کے سر پر رکھ کر اسے اپنے گھوڑے کے ساتھ بھگاتا ہوا لائے اور اسی حالت میں اسے قید خانے تک پہنچا دے۔ وہ کیا سوچ رہا تھا اور اس کی قسمت کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ اس کا لشکر اس کے ساتھ تھا کہ مرتاض ایک جگہ رک گیا اور سیر و شکار میں مصروف ہوگیا۔ مرتاض شکار کا بہت شائق تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنے شوق پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔

شکار کی تلاش میں وہ دور تک چلا گیا تھا۔ دھوپ کی شدت سے تھک کر ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گیا۔ پھر وہ وہیں زمین پر لیٹ گیا اور سرخ رنگ کا ایک رومال اپنے چہرے پر ڈال لیا۔ اسی وقت اس کی قسمت اس کے خلاف پانسا پھینک رہی تھی۔ ایک سخت چنگل پرندے نے سرخ رومال کو گوشت کا ٹکڑا سمجھا اور نیچے اتر کر اس زور کا جھپٹا مارا کہ پرندے کے ناخن مرتاض کی آنکھوں میں گھس گئے اور اس کی دونوں آنکھیں زائل ہوگئیں۔ مرتاض کی چیخوں نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے سپاہی وہاں پہنچ گئے۔ دیکھا تو عالم ہی دوسرا تھا۔

ان لوگوں میں یہ رواج تھا کہ کسی ایسے شخص کو راجا تسلیم نہیں کیا جاتا تھا جس کے جسم کے کسی حصے میں بھی کوئی نقص ہو۔ اس کے لشکر میں ہنگامہ برپا ہوگیا۔ ہر شخص نے مرتاض کی اطاعت سے انکار کر دیا۔

اتنی دیر میں قیدی کو بھی وہاں لے آیا گیا جہاں مرتاض اس سانحے سے دوچار ہوا تھا۔ یہ قیدی چونکہ مرتاض ہی کے خاندان کا تھا لہٰذا اس کے علاوہ کوئی اور اس سلطنت کا مستحق نہیں تھا۔ اس لیے اس قیدی کو حکمرانی کے لیے منتخب

کرلیا گیا۔

خدا کی قدرت کہ چند لمحوں میں کیا سے کیا ہوگیا۔ جو لوٹا اور طشت مرتاض اپنے قیدی کے لیے لایا تھا، خود اس کے سر پر رکھا گیا اور قیدیوں کی طرح اسے گھوڑے کے ساتھ دوڑاتے ہوئے لایا گیا اور جو کوٹھری اس نے قیدی کے لیے تیار کرائی تھی وہی اب اس کا ٹھکانا بن گئی۔ وہ روتا ہوا اس کوٹھری میں داخل ہوگیا اور قیدی تخت پر بیٹھ گیا۔

قیدی نے تخت پر بیٹھتے ہی محمود کو لکھ بھیجا کہ اسے محمود اپنا باجگزار نہ سمجھے۔ وہ خود مختار راجا ہے اس لیے خراج ادا کرنے سے معذرت کرتا ہے۔

یہ ایسی کھلی بغاوت تھی کہ محمود اسے برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ ممکن ہے محمود کا اٹھارہواں حملہ بھی تاریخ کی زینت بن جاتا لیکن محمود ان دنوں سلجوقیوں سے معرکہ آرائی میں مصروف تھا۔

سلطان محمود نے طوس کے حکمراں ارسلان کو باد آورد کے علاقے پر لشکر کشی کرنے کا حکم دیا۔ اس لشکر کشی کا مقصد یہ تھا کہ ترکمانی سلجوقیوں کو تباہ کر دیا جائے کیونکہ وہ باد آورد کے گرد و نواح میں ہنگامے پیدا کر رہے ہیں۔

امیر طوس نے زبردست معرکہ آرائیاں کیں لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ اس نے مایوس ہوکر سلطان محمود کو لکھا کہ ترکمانی سلجوقی اس کے بس کے نہیں ہیں۔ بادشاہ بذات خود ان پر حملہ کرے۔ محمود نے اس مشورے پر دھیان دیا اور لشکر لے کر دشمن کے سر پر پہنچ گیا۔ غزنوی لشکر نے بہادری کے جوہر دکھائے اور ایک طویل معرکے کے بعد ترکمانیوں کو ایسا منتشر کیا کہ وہ پھر کبھی سر نہ اٹھا سکے۔

سلجوقیوں نے عراق کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا تھا اس لیے محمود نے ملک ''رے'' کی طرف کوچ کیا اور وہاں کے دفینے اور خزانے قبضے میں کر لیے جو وہاں کے حکمرانوں نے برسوں سے جمع کر رکھے تھے۔ سلجوقیوں کا عمل دخل عراق پر سے بھی ختم ہوگیا۔ یہاں محمود نے ان ملحدوں اور قرمطیوں کو قتل کیا جو اس ملک میں آباد تھے اور جن کے عقائد اسلام کے خلاف تھے۔

رے اور اصفہان کی حکومت اس نے اپنے بیٹے امیر مسعود کے سپرد کی اور خود غزنی واپس آگیا۔

محمود کے خزانے میں آدھے ہندوستان کے جواہر، رے اور اصفہان کے خزانے اس طرح جمع ہوگئے تھے کہ کسی بادشاہ کے خزانے میں نہ ہوں گے۔ اسے بجا طور پر یہ فخر تھا کہ اس کا باپ آلِ سامان کا غلام تھا اور آج اس کے بیٹے (سلطان محمود) نے اتنی دولت جمع کر لی ہے کہ آلِ سامان کے خزانے میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہ رہا ہوگا۔

ایک دن اس فخر نے زیادہ شور مچایا تو اس نے چند عقل مندوں سے سوال کیا۔

''آلِ سامان نے اپنے عہد حکومت میں کس قدر جواہرات جمع کیے تھے؟''

سامانی خاندان کا ایک فرد جو وہاں بیٹھا تھا، اس نے جواب دیا۔ ''امیر نوح سامانی کے عہد میں 7 رطل اعلیٰ جواہرات شاہی خزانے میں جمع تھے۔''

محمود نے خوش ہوکر کہا۔ ''خداوند تعالیٰ نے مجھے 100 رطل سے بھی زیادہ بیش قیمت جواہرات دیے ہیں۔''

یہ تمام دولت اس نے مختلف معرکوں میں حاصل کی تھی اور یقیناً اس میں زیادہ حصہ ہندوستان سے لوٹی ہوئی دولت کا تھا۔

طبقاتِ ناصری میں ہے کہ سلطان محمود کو تین باتوں میں شک تھا۔ اس مشہور حدیث پر یقین نہیں تھا کہ ''علما کے وارث انبیا ہیں۔'' قیامت کے آنے میں بھی شک تھا۔ اس کے علاوہ اسے اس میں بھی شبہ تھا کہ وہ سبکتگین کا بیٹا ہے۔

یہ شکوک اسے بے چین رکھا کرتے تھے خصوصاً یہ خیال کہ وہ سبکتگین کا بیٹا نہیں ہے۔ عمر کے آخری دنوں میں اس کے یہ تینوں شکوک اچانک رفع ہوگئے۔

ایک رات وہ اپنی قیام گاہ سے نکل کر پیدل ہی کسی طرف چل رہا تھا۔ فراش شمع دان لے کر آگے آگے چل رہا تھا۔ راستے میں ایک ایسا طالب علم اسے ملا جو اپنا سبق یاد کر رہا تھا۔ اس طالب علم کے پاس جلانے کے لیے روغن نہیں تھا۔ وہ پڑھتے پڑھتے کچھ بھول جاتا تو ایک نیے کے چراغ کے پاس آکر اپنی کتاب پڑھ لیتا۔ محمود کو اس طالب علم کی حالت پر بڑا ترس آیا۔ اس نے وہ شمع دان جو اس کے فراش نے اٹھا رکھا تھا اس طالب علم کو دے دیا۔

جس رات کا یہ واقعہ ہے اسی رات کو اسے حضرت محمد ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی۔ آپ ﷺ فرما رہے تھے ''اے ناصر الدین سبکتگین کے بیٹے! خدا تعالیٰ تجھ کو ویسی ہی عزت دے جیسی تو نے میرے ایک وارث کی قدر کی ہے۔''

آنحضرت ﷺ کے اس فرمان نے محمود کو اس کے تینوں سوالوں کے جواب دے دیے۔ اسے ناصر الدین سبکتگین کا بیٹا کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا یعنی یہ بتا دیا گیا کہ تو سبکتگین ہی کا بیٹا ہے۔ اس طالب علم کو حضور ﷺ نے اپنا وارث کہا اور یہ بھی کہا کہ خدا تعالیٰ تجھ کو ویسی ہی عزت دے جیسی تو نے میرے

www.pdfbooksfree.pk

وارث کی قدر کی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ قیامت ضرور آئے گی اور ہر شخص خدا تعالیٰ کے روبرو پیش ہوگا۔

سلطان کے تینوں شکوک رفع ہو گئے۔

ترکمان سلجوقیوں سے جنگ کرنے کے بعد وہ غزنی واپس آیا تو بیمار پڑ گیا۔ اطبا نے ملیریا تجویز کیا اور اس کا علاج کرنے لگے لیکن یہ کیسا ملیریا تھا کہ بخار اترنے کا نام نہ لیتا تھا۔ اس بخار نے اسے اتنا نحیف کر دیا کہ دو قدم چلنا بھی دشوار تھا۔ کئی مہینے بعد طبیعت سنبھلی تو اسے سومنات کا خیال آیا۔ نہروالا کے راجا نے خراج دینا بند کر دیا تھا۔ اسے سبق سکھانا ضروری تھا۔ اس دور دراز کے سفر پر وہ کسی امیر کو نہیں بھیج سکتا تھا اور خود میں اتنی طاقت نہ پاتا تھا۔ اس نے تیاری کا ارادہ کیا لیکن اس انتظار میں کچھ دن کے لیے ٹھہر گیا کہ بدن میں کچھ طاقت اور آجائے۔

اس انتظار میں وہ ایک مرتبہ پھر بیمار پڑ گیا۔ اطبا دوائیں تجویز کرتے تھے لیکن بخار ٹوٹنے کا نام نہیں لیتا تھا۔

وہ اسے معمولی بخار سمجھ رہا تھا۔ اس کے مسیحا بھی شاید اس اصل بات کرنے سے گریزاں تھے۔ پھر ایک روز ایک حکیم نے اس پر یہ راز کھول دیا۔ وہ دق (ٹی بی) کے مرض میں مبتلا تھا لیکن اس کے مسیحا نے اسے امید دلائی تھی کہ اس مرض کا علاج ممکن ہے۔ علاج ہوتا رہا مگر مرض بڑھتا چلا گیا۔ اس نے حکیم کو ہدایت کر دی تھی کہ اس کی اس بیماری کا کسی کو علم نہ ہونے پائے۔ وہ خود کو تندرست و توانا ظاہر کرتا رہا کہ سلطنت کے کاموں میں بگاڑ پیدا نہ ہو۔

پورا سال گزر گیا تھا، وہ کسی معرکے کے لیے روانہ نہیں ہوا تھا۔ یہ اس کے حق میں غیر معمولی بات تھی لیکن وہ یہ کہہ کر اپنے وزیروں کو مطمئن کرتا رہا کہ اب کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو اس کے مقابلے پر آئے۔ غزنی سے ہندوستان تک اس کی حکومت ہے۔ اب کیا ضرورت ہے کہ خلق خدا کا خون بہایا جائے۔ حدودِ سلطنت اتنی بڑھ گئی ہیں کہ سلطنت کے مناسب انتظام ہی میں وقت گزارنا چاہیے۔ کبھی یہ کہہ کر لوگوں کو مطمئن کر دیا کرتا تھا کہ سلطنت کی بنیادیں ذرا اور مضبوط کرلوں اس کے بعد جہاد کے لیے نکلوں گا۔

اس عرصے میں وہ اپنا زیادہ وقت اپنے درباری شعرا کی صحبتوں میں گزارتا رہا۔ علم فقہ پر ایک کتاب بھی تحریر کی۔ غزنی میں نئی نئی عمارتوں کی تعمیر کی طرف متوجہ ہوا۔ اکثر تعمیراتی کاموں کی نگرانی خود کرتا تھا تاکہ لوگ اس کی طرف سے ناامید نہ ہو جائیں۔ وہ اپنی صحت کی طرف سے لوگوں کو دھوکا دیتا رہا۔

وہ آب و ہوا کی تبدیلی اور لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہنے کے لیے بلخ چلا گیا۔ آب و ہوا کی تبدیلی نے بھی اس کی صحت پر کوئی اچھا اثر نہیں ڈالا وہ پھر غزنی واپس چلا آیا۔ اب وہ اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ اس کی بیماری کا حال سب پر کھل گیا۔

اگر کوئی اور بادشاہ ہوتا تو اس کی بیماری کو دیکھ کر ملک میں بغاوتیں عام ہو جاتیں لیکن اس کا دبدبہ ایسا تھا کہ اس بیماری کے باوجود کسی کو جرأت نہیں تھی کہ اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا۔

ایک روز وہ محل میں تھا کہ اسے ایک عجیب بات سوجھی۔ اس نے حکم دیا کہ اس کے خزانے اور قیمتی مال اس کے محل کے سامنے ڈھیر کر دیے جائیں۔ وہ انہیں دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے کارندوں نے تمام دولت میدان میں سجا دی، جواہرات کی چمک سے صحن خانہ دمک رہا تھا۔ محمود نے ان گراں قیمت جواہر پاروں پر حسرت کی نظر ڈالی اور پھر دہاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اسے نظر آرہا تھا کہ وہ ان خزانوں کو چھوڑ کر دنیا سے چلا جائے گا۔

تھوڑی دیر بعد انہیں پھر خزانے میں جمع کرا دیا۔

اس کے دوسرے روز اس نے محافے میں بیٹھ کر میدان کی سیر کی۔ اس کے حکم کے مطابق شاہی ملازموں نے گھوڑے، اونٹ، ہاتھی اور دوسرے جانور جو اس کی ملکیت تھے، اس کے سامنے پیش کیے۔ ان جانوروں کو دیکھ کر وہ کچھ دیر کے لیے ماضی میں چلا گیا۔ کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر رونے لگا اور اسی حالت میں اپنے محل میں واپس آ گیا۔

کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ محل میں جا کر بستر پر لیٹا اور پھر نہیں اٹھا۔

جمعرات کے روز 23 ویں ربیع الثانی 421 ہجری کو اس کا انتقال ہو گیا۔

انتقال کے وقت اس کی عمر 63 سال تھی۔

ماخذات

طبقات ناصری، ترجمہ احمد علی خاں شوق۔ تاریخ فرشتہ۔ محمد قاسم فرشتہ۔ طبقات اکبری، خواجہ نظام۔ آئینہ حقیقت نما۔ اکبر شاہ خاں۔ تاریخ ہندوستان، مولوی ذکاءاللہ

منتقم مزاج

کاشف زبیر

لہو صرف رگوں میں ہی گردش نہیں کرتا زمین پر ناحق بکھرتا ہے تو قاتلوں کے پاؤں زمین سے اکھاڑ دیتا ہے۔ کچھ ایسا ہی طوفان اس کی خاموشی میں بھی چھپا تھا۔ جس کی آمد نے قلبی کیفیات میں ایسی ہلچل مچائی کہ کسی کی دنیا اجڑ گئی اور کسی کے خوابوں نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔

آسیب میں چھپے سانپوں کی بدلتی کروٹوں کا احوال

شام کا وقت تھا اور ڈوبتے سورج کی کرنوں میں وہ خستہ حال فارم کے سامنے کھڑا تھا۔ ٹوٹی ہوئی باڑھ، جھولتا ہوا سال خوردہ لکڑی کا مین گیٹ، فارم کے کناروں پر لگے، بے ہنگم بڑھ جانے یا سوکھ جانے والے درخت تھے۔ فارم کی پوری زمین لمبی گھاس، خودرو پودوں اور جھاڑیوں سے بھر گئی تھی۔ داخلی دروازے کے دائیں طرف دو منزلہ مکان تھا۔ مکان کی حالت بھی باقی فارم سے مختلف نہیں تھی۔ برسوں سے رنگ و روغن اور مرمت سے محروم مکان

www.pdfbooksfree.pk

اس وقت تباہ حالت میں تھا۔ سامنے والے لان میں اتنی لمبی گھاس اُگ آئی تھی کہ اس میں بچیں اور جھولے بھی چھپ گئے تھے صرف ان کی لمبی زنجیریں اور فولادی پائپ جن سے زنجیریں لٹک رہی تھیں، دور سے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ کچھ دیر کھڑا ہچکچاتا رہا جیسے سوچ رہا ہو کہ اندر جائے یا نہ جائے۔ پھر اس نے لکڑی کا گیٹ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ مکان تک جانے کے لیے لمبی گھاس میں ایک چھوٹا سا راستہ بنا ہوا تھا جو پیدل چلنے سے بن گیا تھا۔ وہ برآمدے تک پہنچا۔ وہاں بوڑھا گریم جیکسن ہیکنگ چیئر پر بیٹھا جھول رہا تھا، اس کی عمر تقریباً ستر برس تھی اور اس کی کھلی آنکھوں پر آجانے والی سفیدی بتا رہی تھی کہ وہ نابینا ہے۔ کرسی ہلنے سے فرش کے تختے آواز پیدا کر رہے تھے۔ وہ بہت دبے قدموں وہاں تک آیا تھا لیکن جیسے ہی اس نے برآمدے کے پہلے تختے پر قدم رکھا، اس نے چرچرا کر گریم کو خبردار کر دیا اور وہ چونک کر سیدھا ہو گیا۔

"کون ہے؟" بوڑھے گریم نے سامنے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ "بولو کون ہو تم؟"

نووارد سیڑھی چڑھ کر گریم جیکسن کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "گرینڈ پا۔"

گریم بے قراری سے کھڑا ہو گیا۔ "کون... کون... بریڈ... تم بریڈ ہو؟"

"ہاں گرینڈ پا۔" اس نے جواب دیا تو گریم نے دونوں بازو وا کر دیے تھے اور وہ اس کے کھلے بازوؤں میں سما گیا۔ گریم دیکھنے میں صحت مند لگتا تھا لیکن درحقیقت وہ بہت کمزور تھا۔ نووارد کو اس کے سینے کی ہڈیاں محسوس ہوئی تھیں۔ وہ اس کا چہرہ ٹٹول رہا تھا پھر وہ رونے لگا۔

"بریڈ... میرے بچے۔" وہ اسے چوم رہا تھا اور آنسوؤں سے اس کا چہرہ دھو رہا تھا۔ بریڈ جیکسن ساکت کھڑا تھا، اس کی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ اس کے جسم پر بہت خستہ حال اور پرانا لباس تھا۔ سر کے بال بے ہنگم بڑھے ہوئے تھے اور چہرہ یوں سُتا ہوا تھا جیسے اسے عرصے سے ڈھنگ کی زندگی بسر کرنے کا موقع نہ ملا ہو۔ گریم نے خاصی دیر بعد گلوگیر لہجے میں کہا۔ "تم کہاں چلے گئے تھے؟" بریڈ نے گریم کو واپس کرسی پر بٹھایا۔ لیکن اس نے بریڈ کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔ "تم بولتے کیوں نہیں؟"

"دربدر پھرتا رہا ہوں۔" اس نے تھکے لہجے میں کہا۔ "نہ جانے کتنی جگہوں پر رہا اب تو یاد بھی نہیں ہے۔"

بوڑھا گریم دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن اس نے بریڈ کا چہرہ اور جسم ٹٹول کر اندازہ کر لیا تھا کہ اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ "میرے بچے، لگتا ہے تم نے بہت سخت وقت دیکھا ہے۔"

"ہاں، لیکن آپ کو کیا ہوا..... آپ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔"

"جس پودے کا کوئی رکھوالا نہ ہو وہ بھی مرجھا جاتا ہے، میں تو پھر بھی انسان ہوں۔" گریم نے سرد آہ بھری۔

"لگتا ہے کوئی آپ کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے۔"

گریم جیکسن نے جلدی سے تردید کی۔ "نہیں، نہیں ہمارے پڑوسی بہت اچھے ہیں۔ وہ میری دیکھ بھال کرتے ہیں۔ میٹ مجھے ناشتا کراتا ہے اور کپڑے بدلواتا ہے۔ میٹ یاد ہے نا..... تمہارے بچپن کا ساتھی ہوتا تھا۔"

بریڈ نے سر ہلایا لیکن پھر اسے خیال آیا کہ دادا تو دیکھ ہی نہیں سکتا اُس نے کہا۔ "مجھے سب یاد ہے۔"

"لیکن تم شرمین کے بارے میں نہیں جانتے ہو گے۔ اس کا خاندان دس سال پہلے ہمارے پڑوس میں آباد ہوا تھا، شرمین کے شوہر نے ایڈم کی زمین خرید لی تھی۔ تمہیں یاد ہو گا اس کے سارے بچے شہر جا کر آباد ہو گئے تھے۔ شرمین شام کے وقت مجھے کھانا کھلانے آتی ہے۔ باقی اپنی دیکھ بھال میں خود کر لیتا ہوں۔"

"آپ کی آنکھیں...؟"

"آٹھ سال پہلے موتیا ہوا تھا۔ میں نے آپریشن سے انکار کر دیا، رفتہ رفتہ موتیا نے بینائی ختم کر دی۔ میرے بچے تمہارے جانے کے بعد میرا دل ہر چیز سے ہٹ گیا تھا، مجھے تو جینے کی آرزو بھی نہیں رہی تھی لیکن موت بھی نہیں آئی۔"

"گرینڈ پا۔" بریڈ نے ذرا جھک کر کہا۔ "اب میں آ گیا ہوں میں سب سنبھال لوں گا۔"

"اندر چلو میرے بچے۔" گریم نے مسرت سے کہا۔ "میرے پاس سو سال پرانی وہسکی کی آدھی بوتل رکھی ہے، آج ہم اس سے تمہاری واپسی کا جشن منائیں گے۔"

گریم اور وہ اندر آئے۔ مکان کی حالت اندر بھی اچھی نہیں تھی۔ ہر چیز گرد سے اٹی ہوئی تھی۔ گریم نے ایک کیبنٹ سے وہسکی کی بوتل اور دو گلاس نکالے۔ مکان میں اس کی نقل و حرکت محدود تھی اس لیے وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہے؟ پوتے کی واپسی کی خوشی نے اسے بے قابو کر دیا تھا۔ وہ بریڈ کو بتا رہا تھا کہ بارہ سال پہلے جب وہ گھر سے گیا تھا تو اس کے بعد اس پر کیا گزری۔ وہ

اکیلا اتنا بڑا فارم نہیں دیکھ سکتا تھا۔ حکومت کی طرف سے اسے سوشل سیکیورٹی کی جو رقم ملتی تھی اس کے گزارے کے لیے وہی کافی تھی۔ پھر اس کی آنکھوں میں تکلیف شروع ہوئی اور اس نے قصبے والوں کے اصرار کے باوجود موتیے کا علاج کرانے سے انکار کر دیا اور انجام کار وہ دیکھنے سے معذور ہو چکا تھا۔

بیل بجی تو بریڈ باہر آیا۔ ایک خوش شکل اور جوان عورت کھڑی تھی، اس نے ایک ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ بریڈ کو دیکھ کر وہ ٹھٹکی۔ "تم... کون ہو؟ میں مسٹر جیکسن کے لیے ڈنر لائی ہوں۔"

"اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔" بریڈ نے نرمی سے کہا۔ "میں بریڈ جیکسن ہوں۔"

"مسٹر جیکسن کے پوتے؟" عورت مسرت سے بولی اور اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "میں شرمین ہوں، تم سے مل کر خوشی ہوئی۔"

"مجھے بھی خوشی ہوئی۔" بریڈ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے نوٹ کیا کہ شرمین کے ہاتھ میں شادی کی انگوٹھی نہیں تھی اور نہ اس نے شوہر کے حوالے سے اپنا تعارف کرایا تھا۔

"ٹھیک ہے، اب شاید اس کی ضرورت نہ پڑے۔" شرمین نے کہا۔ "لیکن آج میں لے آئی ہوں اور اتفاق سے یہ اچھا خاصا ہے، امید ہے تم دونوں دادا پوتے کے لیے کافی ہو گا۔"

بریڈ نے اس کا شکریہ ادا کر کے ٹرے لے لی اور اندر آنے کی دعوت دی لیکن شرمین نے کہا۔ "میرے بچے بھوک سے بے تاب ہو رہے ہیں ان کے لیے ڈنر لگانا ہے۔"

بریڈ اندر آیا اور اس نے ٹرے کچن کی میز پر رکھ دی۔ کھانے میں بھنا ہوا بیف اور ساتھ میں انڈوں اور سبزی سے بنا ہوا گرما گرم سوپ تھا۔ گریم اتنا خوش تھا کہ اس کی بھوک اڑ گئی تھی لیکن بریڈ اسے اصرار کر کے کھلاتا رہا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کی صحت بہت گری ہوئی تھی۔ پھر اسے نیند آنے لگی اور اس نے دادا سے اجازت چاہی۔ "میں اب سوؤں گا۔"

"میں واقعی بوڑھا ہو گیا ہوں، مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ تم کتنے تھکے ہوئے ہو۔ ایسا کرو آج میرے کمرے میں سو جاؤ کل تمہیں اپنا کمرا ٹھیک کرنا ہے۔"

"ہاں کل مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔" بریڈ نے کہا۔

اگلی صبح جب میٹ، گریم جیکسن کے لیے ناشتا لایا تو وہ بھی بریڈ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ اس سے لپٹ گیا اور گرم جوشی سے بولا۔ "بدمعاش، مجھے امید نہیں تھی کہ پھر تمہیں دیکھ سکوں گا۔ تم بہت بدل گئے ہو۔"

"ہاں میں نے بہت مشکلات دیکھی ہیں اور مشکلات آدمی کو بدل دیتی ہیں۔"

"مجھے امید نہیں تھی کہ تم واپس آؤ گے۔" میٹ نے کہا تو بریڈ کو اس کا لہجہ معنی خیز لگا تھا۔ "خیر اب تم آ گئے ہو۔"

شرمین نے کسی کو نہیں بتایا تھا لیکن میٹ نے بریڈ کی آمد کی خبر پورے ہاگ ٹاؤن میں پھیلا دی تھی۔ شام تک بہت سارے لوگ بریڈ سے ملنے کے لیے آتے رہے۔ بارہ سال پہلے بریڈ صرف اٹھارہ برس کا تھا جب وہ یہاں سے گیا تھا۔ ان بارہ سالوں میں بہت ساری تبدیلیاں آئی تھیں۔ اکثر نوجوان بہتر مستقبل کی تلاش میں بڑے شہروں کی طرف چلے گئے تھے۔ بہت سارے بوڑھے فوت ہو چکے تھے اور بہت سارے ادھیڑ عمر اب بوڑھے ہو چکے تھے۔ بچے جوان ہو گئے تھے۔ ان میں سے بیشتر بریڈ کے لیے اجنبی تھے لیکن بہت سارے لوگوں کو اس نے پہچان لیا تھا۔ ملنے والوں کا رش ایک دو دن رہا اور اس کے بعد سب معمول پر آنے لگا۔ ان سے فرصت ملی تو بریڈ نے سب سے پہلے مکان پر توجہ دی۔ اس نے تمام ناکارہ سامان اور فرنیچر نکال کر باہر لان میں ڈھیر کر دیا۔ اس کے بعد مکان کی صفائی شروع کر دی۔ میٹ اور شرمین اس کی مدد کے لیے آئے تھے لیکن اس نے نرمی سے منع کر دیا۔

"میں کام اپنی مرضی سے کر رہا ہوں اس لیے تمہاری مدد بے سود ہو گی۔ ممکن ہے جب تمہارے پاس وقت ہو تو میرا کام کرنے کا موڈ نہ ہو۔"

"ٹھیک ہے جب تک تم مکان سیٹ نہیں کر لیتے صبح اور شام کا کھانا میری طرف سے ہو گا۔" شرمین نے پیشکش کی۔

"نہیں تمہیں زحمت ہو گی۔" بریڈ نے پھر انکار کر دیا۔ "مجھے کھانا بنانا آتا ہے اور دو آدمیوں کا کھانا بنانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے، میں تم دونوں کا شکر گزار ہوں کہ تم نے میری غیر موجودگی میں گرینڈ پا کا خیال رکھا۔"

"پڑوسی ہونے کے ناتے یہ ہمارا فرض تھا۔" شرمین نے کہا۔

"اور میرا دوست ہونے کے ناتے۔" میٹ آنکھ مار کر بولا۔ "تم ذرا مکان کے کام سے فارغ ہو جاؤ پھر رات کو کہیں چلنے کا پروگرام بناتے ہیں۔"

شرمین نے اسے گھورا۔ "میں تمہاری بیوی کو بتاؤں گی کہ تم کیا پروگرام بنا رہے ہو۔"

www.pdfbooksfree.pk

بریڈ مسکراتے ہوئے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ ان چند دنوں میں اس کے حلیے میں بھی خاصا فرق آیا تھا، اس کی صحت بہتر ہوگئی تھی اور چہرے پر تازگی آگئی تھی۔ اس نے پرانے ہی لیکن صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے۔ فی الحال اس نے نئے کپڑے لینے سے گریز کیا تھا۔ گریم جیکسن بھی پوتے کے آنے کے بعد جیسے پھر سے جی اٹھا تھا۔ اب وہ بہت خوش نظر آتا تھا۔ پہلے سارا دن برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھا رہتا تھا، اب برآمدے سے اتر کر تھوڑی بہت چہل قدمی بھی کرلیتا تھا۔ ایک ہفتے کے اندر بریڈ نے مکان کو اندر سے پوری طرح صاف ستھرا کر لیا تھا۔ اس کے بعد اس نے پورے گھر میں پالش اور رنگ کا ارادہ کیا۔ گریم جیکسن کے پاس رقم موجود تھی۔ یہ برسوں سے جمع ہوتی آئی تھی اور اس کا خرچ نہ ہونے کے برابر تھا۔ ایک مہینے میں نہ صرف مکان پالش اور رنگ کے مراحل سے گزر کر بہترین حالت میں آگیا تھا بلکہ اس کے سامنے والے لان سے سارا جھاڑ جھنکاڑ بھی غائب ہوگیا تھا۔

بریڈ نے جلانے کے قابل ساری لکڑی اٹھا کر عقب میں موجود شیڈ تلے رکھ دی۔ اس نے ناکارہ فرنیچر بھی توڑ کر لکڑی نکال لی تھی جو سردیوں میں جلانے کے کام آتی۔ لان کی گھاس اور پودے کاٹ کر اس نے فارم کی زمین پر پھیلا دیے تھے۔ وہ روز فارم کے کچھ حصے کی گھاس اور جھاڑیاں پودے کاٹ کر وہیں ڈال دیتا تھا۔ جب تک وہ مکان سے فارغ ہوا، اس نے فارم کی ساری گھاس اور جھاڑیاں بھی کاٹ دی تھیں۔ اس نے مکان پر سفید رنگ کیا تھا۔ بریڈ برآمدے کی سیڑھی کا ٹوٹ جانے والا ایک تختہ بدل رہا تھا کہ میٹ آگیا۔ اس نے حیرت سے آنکھیں گھمائیں۔

"تمہیں یاد ہے جب تم یہاں سے گئے تھے تو تمہیں دیوار میں کیل بھی صحیح سے ٹھونکنی نہیں آتی تھی اور اب تم نہایت مہارت اور صفائی سے یہ سارے کام کر رہے ہو۔"

"میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔" بریڈ نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

"آج شام کو بار چلنے کا ارادہ ہے؟"

"کیوں نہیں۔"

اپنی آمد کے بعد جب بریڈ کو پہلی بار فرصت ملی تو وہ میٹ کے ساتھ مقامی بار میں گیا۔ وہاں بہت سارے نئے لوگوں سے ملاقات ہوئی تھی۔

اس دوران میں بریڈ نے اپنے بال مختصر کر لیے تھے۔ جب یہاں آیا تھا تو اس کی شیو کئی دن کی بڑھی ہوئی تھی، اب وہ روز شیو کرنے لگا تھا۔ اس کی صحت بھی کہیں بہتر ہوگئی تھی۔ جب وہ آیا تھا تو اپنی اصل عمر سے بڑا لگ رہا تھا لیکن اب وہ عمر کے مطابق ہی لگ رہا تھا۔ دوسروں سے علیک سلیک کر کے میٹ اور وہ ایک الگ میز پر آبیٹھے تھے۔

"تم نے مجھے حیران کر دیا ہے۔"

میٹ کی اس بات پر بریڈ چونکا۔ "وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ تم اب وہ کام کر رہے ہو جن کی تم نوجوانی میں بھی توقع نہیں تھی تم محنت سے بھاگتے تھے اسی وجہ سے تو گھر سے بھاگے تھے کہ تم کھیتوں میں کام نہیں کرنا چاہتے تھے۔"

"وہ میری حماقت تھی۔" بریڈ نے بیئر کا گھونٹ لے کر کہا۔ "اس کی مجھے قیمت ادا کرنی پڑی۔ میں نے بہت ساری جگہوں پر رہائش رکھی اور کمانے کے لیے مجھے بہت سارے کام کرنے پڑے۔ یہ سب میں نے اسی سے سیکھا ہے۔ اب مجھے محنت کرنی آگئی ہے اور کام کرنا بھی۔"

"اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

بریڈ نے شانے اچکائے۔ "میرے پاس اور کیا چوائس ہے، میں فارم پر کام کروں گا۔"

میٹ کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ "میرا بھی یہی خیال ہے۔ تمہارے پاس دس ہیکٹر زبہترین زمین ہے اور برسوں سے ایسے ہی پڑے رہنے کی وجہ سے اس کی زرخیزی بھی آس پاس کی زمینوں سے کہیں بہتر ہے۔ اگر تم اسے کاشت کرو گے تو کہیں زیادہ کما سکتے ہو۔"

بریڈ نے سر ہلایا۔ "ایک دو ہفتے میں اس طرف بھی توجہ دوں گا۔"

"اس سلسلے میں میری کسی مدد کی ضرورت ہو تو ضرور کہنا۔"

"شاید مجھے آلات کے سلسلے میں تمہاری مدد کی ضرورت ہوگی۔"

میٹ خود بھی کسان تھا لیکن اس کے پاس صرف پانچ ہیکٹر زمین تھی۔ اس کے باپ کے پاس بہت ساری زمین تھی لیکن جب وہ مرا تو اس کی زمین تین بیٹوں میں بٹ گئی اور میٹ کے حصے میں پانچ ہیکٹر زمین آئی تھی۔ میٹ کے پاس ٹریکٹر اور دوسری فارم مشینری سمیت تمام ضروری آلات تھے۔ گریم جیکسن کے فارم پر اب کچھ نہیں تھا۔ کچھ مشینری اور آلات چور لے گئے تھے اور کچھ پڑے پڑے ناکارہ ہوگئے تھے۔ اسے زمین آباد کرنے کے لیے مشینری اور آلات کی ضرورت تھی لیکن اس کے پاس اتنی رقم نہیں تھی

کہ وہ ان کی خریداری کر سکتا۔ میٹ نے فراخ دلی سے اسے پیش کش کر دی تھی، وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔

جون کے آخری دنوں میں گرمی خاصی بڑھ گئی تھی۔ اس دن ہوا الٹی چل رہی تھی۔ بریڈ نے درختوں اور مکان کے آس پاس سے جھاڑیاں اور گھاس بالکل صاف کر دی تھی۔ اس نے سوکھ جانے والی ان جھاڑیوں اور گھاس کو آگ لگا دی۔ چند گھنٹوں میں سب گھاس جل کر راکھ بن گئی تھی۔ بریڈ نے میٹ سے موٹر پمپ اور اسپرنکلرز لے لیے تھے۔ جب آگ بجھ گئی تو اس نے موٹر پمپ بور کے پائپ سے جوڑا اور زمین کو پانی سے تر کر دیا۔ شروع میں گرم زمین سے بھاپ کے بادل اٹھے تھے لیکن جلد ہی زمین ٹھنڈی ہوگئی اور اس نے پانی جذب کر لیا۔ اگلے دن بریڈ نے میٹ کا ٹریکٹر لیا اور پورے فارم کی زمین پر ہل چلا کر اسے ایک جیسی صورت میں لے آیا۔ راکھ اچھی طرح زمین میں مل گئی تھی اور اس نے زمین کو مزید زرخیز کر دیا تھا۔ دوپہر تک اس نے اچھی خاصی زمین ہموار کر لی تھی اور پھر ستانے کے لیے رکا تھا کہ شرمین چلی آئی۔ اس نے تعریفی نظروں سے فارم کی حالت دیکھی۔

"تم نے کچھ ہی دنوں میں بہت کچھ کر لیا ہے۔"

"ہاں، مجھے گزرے دنوں کی تلافی بھی تو کرنی ہے۔" بریڈ نے درخت کے نیچے رکھے آئس بکس سے اس کے اور اپنے لیے کولڈ ڈرنک کے ٹن نکالے۔

"شکر ہے اس جگہ کی صورت نکل آئی ورنہ پہلے اجاڑ تھی۔"

"کچھ عرصے بعد یہاں آلو، چقندر، گاجر اور دوسری سبزیوں کے پودے لگے ہوں گے۔"

"تم مکئی نہیں لگاؤ گے؟"

"نہیں، سبزیوں میں زیادہ بچت ہے۔"

"لیکن اس میں محنت بھی بہت ہوتی ہے۔"

بریڈ مسکرایا۔ "میں محنت کر سکتا ہوں۔"

"پھر بھی تمہیں مزدوروں کی ضرورت پڑے گی۔ خیر یہ دوسری بات ہے، میں یہ کہنے آئی ہوں کہ آج ڈنر تم میرے گھر کرو گے۔"

بریڈ کو اب تک شرمین کے گھر جانے کا موقع نہیں ملا تھا حالانکہ وہ برابر میں ہی رہتی تھی۔ "میں ضرور آؤں گا۔"

شام تک اس نے ٹریکٹر صاف کر کے میٹ کو واپس کر دیا تھا۔ اس نے نہا دھو کر اپنا ایک بہترین لباس نکالا۔ واپس آنے کے بعد اس نے چند نئے جوڑے خریدے تھے لیکن وہ زیادہ فضول خرچی سے گریز کر رہا تھا کیونکہ ابھی فارم پر سبزیاں کاشت کرنے کے لیے اسے خاصی رقم کی ضرورت پڑنی۔ وہ اس کے لیے رقم بچا رہا تھا۔ شام کو جاتے ہوئے وہ اپنے ساتھ ان کے لیے تحفہ بھی لے گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شرمین کے ساتھ اس کا شوہر بھی موجود ہوگا لیکن شرمین نے اکیلے ہی اس کا استقبال کیا تھا۔ اس کے بچے لاؤنج میں ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ بریڈ نے آہستہ سے کہا۔ "تمہارا شوہر موجود نہیں ہے، کیا وہ کہیں گیا ہوا ہے؟"

شرمین نے چور نظروں سے لاؤنج میں موجود بچوں کی طرف دیکھا اور سرگوشی میں بولی۔ "نہیں، میں اس سے طلاق لے چکی ہوں۔"

"اوہ۔" بریڈ نے صرف اتنا ہی کہا تھا۔ شرمین نے پہلے بچوں سے اس کا تعارف کرایا اور دونوں لڑکوں نے بادل ناخواستہ ٹی وی کے آگے سے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا اور فوراً ہی دوبارہ ٹی وی کے آگے براجمان ہوگئے۔ شرمین اسے کچن میں لے آئی۔ اس کا کچن خاصا بڑا اور شاندار قسم کا تھا۔ بریڈ اس کے ہاتھ کے بنے کئی قسم کے کھانے کھا چکا تھا، اس کا خیال تھا شرمین ان عورتوں میں سے ہے جن کے ہاتھ میں قدرتی لذت ہوتی ہے۔ اس دن بھی اس نے بڑا شاندار قسم کا ڈنر بنایا تھا۔ ڈنر کے بعد وہ باہر لان میں کرسیوں پر آ بیٹھے کیونکہ اندر خاصی گرمی تھی۔

"میں نے لوگوں سے تمہارے بارے میں جو سنا تھا تمہیں اس سے خاصا مختلف پایا ہے۔"

"تم نے کیا سنا تھا؟"

"یہی کہ تم ایک لاابالی اور خود میں مگن رہنے والے نوجوان تھے اور تمہیں اپنے گرینڈ پا کی بالکل پروا نہیں تھی جنہوں نے تمہاری پرورش کی تھی۔ تمہیں تعلیم سے بھی دلچسپی نہیں تھی اور تم نے بہ مشکل ہی اسکول کی سند حاصل کی۔ تم زمین پر کام کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اور اسی وجہ سے گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔"

"یہ سب درست ہے۔"

"لیکن اب تم بالکل بدل گئے ہو۔"

"وقت اور حالات آدمی کو بدل دیتے ہیں۔" بریڈ نے سرسری سے انداز میں کہا۔ "مجھ میں بھی تبدیلی آئی ہے، اب میں اٹھارہ سال کا نوجوان نہیں رہا ہوں، تیس سال کا تجربے کار مرد بن گیا ہوں۔"

"مسز جیکسن تمہارے واپس آنے سے بہت خوش ہیں، ان کی حالت بدل گئی ہے اور صحت بھی بہت اچھی ہوگئی ہے۔"

www.pdfbooksfree.pk

بریڈ نے سر ہلایا۔ ”پہلی فصل کے بعد میں انہیں آنکھوں کے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤں گا۔ فی الحال ان کی میڈیکل انشورنس ختم ہوگئی ہے۔“

”میرا تو خیال ہے کہ بہت دیر ہوگئی ہے۔“ شرمین نے مایوسی سے کہا۔ ”ایک بار میں بھی ایک ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھی اس نے بتایا کہ موتیا نے بینائی کو مکمل طور پر ختم کر دیا ہے۔“

”پھر بھی امید تو باقی ہے۔“ بریڈ نے کہا۔ ”میں اپنا اطمینان ضرور کروں گا۔“

”یہ اچھا ہوا کہ تم واپس آ گئے اور مسٹر جیکسن کی دیکھ بھال اچھے طریقے سے ہو رہی ہے۔“

”میرا ان کے سوا اس دنیا میں اور کوئی نہیں ہے۔“

شرمین نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”جب تمہیں اس بات کا احساس ہے تو تم انہیں چھوڑ کر ہی کیوں گئے تھے؟“

”یہ احساس اس وقت نہیں تھا، اس وقت تو گرینڈ پا ٹھیک تھے اور خود اپنی دیکھ بھال کر سکتے تھے۔“

”یعنی یہ احساس تمہیں واپسی کے بعد ہوا ہے؟“ شرمین بولی۔

”ہاں، جب میں واپس آیا اور میں نے پہلی بار گرینڈ پا کی حالت دیکھی تب مجھے احساس ہوا کہ میں نے انہیں چھوڑ کر کتنی بڑی غلطی کی ہے۔“

”مجھے احساس ہے کہ میں مسٹر جیکسن کی زیادہ دیکھ بھال نہیں کر سکی۔“

شرمین اپنے فارم پر دو ملازموں کی مدد سے کام کرتی تھی۔ ”تمہاری اپنے شوہر سے کب علیحدگی ہوئی؟“

”اس واقعے کو چھ سال ہو چکے ہیں۔“

اگلا سوال کرتے ہوئے بریڈ ہچکچایا لیکن اس نے پوچھ ہی لیا۔ ”اگر تم برا نہ مانو تو میں علیحدگی کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟“

شرمین ہنسی۔ ”اس میں برا ماننے والی کون سی بات ہے۔ سارا باگ ٹاؤن جانتا ہے۔ کولن ایک حرافہ کے چنگل میں پھنس گیا تھا اور اسی وجہ سے ہمارے درمیان علیحدگی ہوئی۔ میں نے بھی عدالت کی مدد سے اسے کنگال کر کے چھوڑا۔ اس کی زمین، بینک بیلنس اور اس کی ہر چیز حاصل کر لی۔ وہ اس حرافہ کے ساتھ یہاں سے چلا گیا تھا لیکن مجھے یقین ہے بعد میں اس نے بھی کولن کو لات مار دی ہوگی۔“

بریڈ مسکرایا۔ ”لگتا ہے تمہیں اپنے سابق شوہر سے زیادہ اس عورت پر غصہ ہے۔“

”ہاں، اس سے ملنے سے پہلے کولن ایک اچھا شوہر اور باپ تھا لیکن اسے دیکھتے ہی وہ بیوی بچوں کو فراموش بیٹھا۔ بہرحال یہ بات اب ماضی کا حصہ بن چکی ہے۔ میں اپنی زندگی سے بہت خوش ہوں، مجھے روزگار کے لیے کہیں دھکے نہیں کھانے پڑتے، کسی باس کی خوشامد نہیں کرنی پڑتی اور میں بچوں پر بھی نظر رکھتی ہوں۔“

شرمین کا فارم بریڈ کے فارم سے کچھ ہی بڑا تھا اور اس نے اسے بہت اچھی طرح رکھا تھا۔ بریڈ کا اندازہ تھا کہ وہ یہاں سے سال میں کم سے کم دو لاکھ ڈالرز ضرور کماتی ہو گی۔ وہ گھر واپس آیا تو گریم جیکسن برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔ بریڈ نے خفگی سے کہا۔ ”گرینڈ پا! آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں؟“

”ہاں برخوردار۔“ وہ چہک کر بولا۔ ”شرمین اچھی لڑکی ہے۔“

”ہاں لیکن وہ صرف پڑوسن ہے۔“ بریڈ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔

”لیکن تمہیں اس بارے میں سوچنا چاہیے۔“ گریم جیکسن نے مشورہ دیا۔ ”میں نے آخری بار آٹھ سال پہلے اسے دیکھا تھا اس وقت وہ بہت جوان اور خوب صورت ہوتی تھی۔“

”وہ اب بھی جوان اور خوب صورت ہے لیکن ساتھ ہی وہ دو عدد دس اور آٹھ سال کے لڑکوں کی ماں بھی ہے۔“ بریڈ نے یاد دلایا۔ ”اس لیے میں فی الحال کسی کے بارے میں کچھ نہیں سوچنا چاہتا۔ میری پہلی ترجیح یہ فارم ہے اور اس کے بعد میں آپ کی آنکھیں ٹھیک کرانے کی کوشش کروں گا۔“

”میں ایسے بھی خوش ہوں، میں نے جتنی دنیا دیکھنی تھی دیکھ لی۔ تمہارے آنے کے بعد مجھے اور کسی چیز کی خواہش نہیں ہے۔“

”لیکن یہ میری خواہش ہے۔“ بریڈ نے کہا اور گریم جیکسن کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔ ”چلیں بستر پر، کل صبح جلدی اٹھیے گا کیونکہ مجھے بیج لینے کے لیے منڈی جانا ہے۔“

گریم جیکسن نے اندر جاتے ہوئے اسے مشورہ دیا۔ ”بیج کے لیے ہارٹلے کے پاس جانا۔ وہ تو مر گیا ہے لیکن اس کے بیٹے یہی کام کر رہے ہیں اور ان کے بیج ذرا مہنگے لیکن سب سے معیاری ہوتے ہیں۔“

”میرا بھی یہی ارادہ ہے۔“ بریڈ نے کہا۔ ”ساتھ ہی مجھے مٹی کا ٹیسٹ بھی کرانا ہے۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے، یہ اس علاقے کی سب سے اچھی مٹی ہے۔“ اس نے فخر سے کہا۔ ”تم دیکھنا یہ سونا اگلے گی۔“

گریم جیکسن کا کہنا درست ثابت ہوا تھا۔ بریڈ نے مٹی کا ٹیسٹ کرایا تو اس میں تمام ضروری عناصر معمول سے زیادہ ہی پائے گئے تھے۔ کسی عنصر کی کمی نہیں تھی۔ گریم جیکسن کے بیج لے کر آیا۔ اس نے شرمین کی مدد سے دو مزدور حاصل کر لیے تھے اور ان کے ساتھ بیجوں کی بوائی میں لگ گیا۔ گھاس پھونس اور جھاڑیاں جلانے کی وجہ سے زمین فی الحال کیڑے مکوڑوں اور غیر ضروری پودوں سے بالکل پاک ہوگئی تھی اس لیے ابھی کسی اسپرے کی ضرورت نہیں تھی۔ کھاد کی ضرورت بھی بعد میں پڑتی۔ وہ روز تقریباً پون ہیکٹر زمین پر بوائی کرتے تھے۔ پندرہ دن میں بوائی کا کام مکمل ہوگیا۔ یہاں پانی زمین میں تیس سے چالیس فٹ کی گہرائی میں تھا۔ بریڈ نے ایک اچھی کمپنی سے بور مزید گہرا کروایا۔ اس نے اتنے پائپ اور اسپرنکلرز لے لیے جو ایک دن میں دو ہیکٹر زرقبے کو پانی دے سکتے تھے۔ اسپرنکلرز پانی ہوا میں فوارے کی طرح اچھال کر دیتے ہیں جس سے پانی میں آکسیجن اور نائٹروجن کی مقدار بڑھ جاتی ہے اور یہ فصل کے لیے بہتر ہوتا ہے۔

مکان کے عقبی شیڈ میں ایک پندرہ سال پرانا فورڈ منی ٹرک ناکارہ کھڑا تھا۔ آٹھ سال سے اسے استعمال بھی نہیں کیا گیا تھا۔ بوائی سے فارغ ہو کر اس نے ٹرک کی طرف توجہ دی کیونکہ اب تک تو کام چل رہا تھا لیکن جب سبزی تیار ہو جاتی تو اسے منڈی تک پہنچانے کے لیے اپنی ٹرانسپورٹ لازمی تھی، ورنہ دوسری صورت میں بہت بڑی رقم کرائے کی مد میں دینا پڑتی۔ میٹ کو کسی حد تک انجن کا کام آتا تھا۔ سب سے پہلے بریڈ نے ٹرک کی صفائی کی اس کی ناکارہ ہو جانے والی اشیا اتار دیں اور پھر ریگ مال سے رگڑ کر اس کے چیس اور اوپری جگہوں پر لگ جانے والا زنگ اتارنے لگا۔ اسے مکمل طور پر صاف کر کے اس نے میٹ کی مدد سے انجن کھولا اور میٹ نے انجن کھول کر اس کی صفائی کی جن پرزوں کو بدلنے کی ضرورت تھی ان کو بدل دیا اور انجن دوبارہ بند کر کے ٹرک میں فٹ کر دیا۔ انجن ٹھیک ہو گیا تھا۔ بریڈ کئی دن آزمائشی طور پر چلاتا رہا اور جب رنگ پوری ہو گئی تو اس نے ٹرک رنگ و آرائش کے لیے ایک مقامی ورکشاپ میں دیدیا۔ ایک ہفتے بعد ٹرک رنگ روغن اور آرائش کے بعد واپس آیا تو لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ وہی ٹرک تھا جو اسکریپ کی صورت اختیار کر گیا تھا۔

شرمین نے اس سے کہا تھا کہ بوائی کے بعد دوسرے کاموں کے لیے مزدور لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ چھوٹے موٹے کاموں کے لیے وہ اس کے ملازم مستعار لے لیا کرے۔ خود شرمین کی زمین پر مکئی اور سورج مکھی کی فصل لگی تھی۔ اس لیے بس دیکھ بھال کا معمولی سا کام تھا اور اس کے ملازم عام طور سے فارغ ہوتے تھے۔ جب بریڈ زمین کو پانی دیتا تو انہیں بلا لیا کرتا تھا کیونکہ اسپرنکلرز سنبھالنے کے لیے دو تین افراد کی ضرورت پڑتی تھی، اکیلے آدمی کے لیے یہ کام خاصا مشکل تھا۔ ہفتے میں ایک بار پانی کافی ہوتا تھا۔ وہ روزانہ دو ہیکٹر زرقبے کو پانی دیتا تھا اس کے بعد دو دن فارغ ملتے تھے جن میں وہ دوسرے کام نمٹاتا تھا۔ فارم کے کناروں پر لگے درخت بھی توجہ چاہتے تھے۔

بریڈ نے سوکھ جانے والے درخت نکال کر ان کی جگہ نئے یوکلپٹس لگائے اور جو بہت بڑھ گئے تھے ان کو کاٹ چھانٹ کر چھوٹا کر دیا۔ فارم کے چاروں طرف لگی لکڑی کی باڑھ خستہ حال ہو رہی تھی اور اسے بدلنے کی ضرورت تھی لیکن فی الحال بریڈ کے پاس نہ تو اتنا وقت تھا اور نہ اتنی رقم کہ وہ اسے بدل سکے اس لیے اس نے جو درخت نکالے تھے ان سے لکڑی حاصل کر کے باڑھ کی مرمت کر دی۔ ایک مسئلہ اور تھا۔ مکان کو گرم کرنے والا نظام برسوں سے استعمال نہ ہونے سے تقریباً ناکارہ ہو گیا تھا اور یہاں اکتوبر کے آخر میں موسم اتنا سرد ہو جاتا تھا کہ لازمی گرمائش اور پانی گرم کرنے کی ضرورت پڑتی تھی۔ اسے حیرت تھی کہ گریم جیکسن کس طرح سردیاں گزارتا تھا۔ بریڈ وقت نکال کر اس کی صفائی بھی کرتا رہتا تھا اور پھر اس نے بعض پائپ اور چیزیں بھی تبدیل کیں۔ جلانے کے لیے لکڑی کی کمی نہیں تھی پیچھے شیڈ میں اس کا ڈھیر لگا ہوا تھا پھر ناکارہ فرنیچر بھی کافی نکلا تھا۔

مشکلات آ رہی تھیں لیکن بریڈ درست سمت میں بڑھ رہا تھا اسے امید تھی کہ آنے والے دنوں میں اس کے بہت سارے مسائل حل ہو جائیں گے، جب اس کے پاس فصل کی رقم آئے گی۔ وہ اسی لیے اتنی محنت کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ گریم جیکسن پر بھی پوری توجہ دے رہا تھا۔ اس کی خوراک، اس کا آرام اور اس کی صفائی ستھرائی ہر چیز کا خیال رکھتا تھا۔ بریڈ کی کوششوں سے اس کی صحت اور حالت بہت اچھی نظر آنے لگی تھی۔ وہ خود باقاعدگی سے اس کی شیو بناتا تھا۔ اس کے سر پر دو ہفتے بعد موٹی مشین پھیرتا تھا۔ ہر دوسرے دن اسے خود نہلاتا تھا اور روز کپڑے بدلواتا۔ اپنے لیے بریڈ نے صرف فرش پر ایک گدا بچھا رکھا

www.pdfbooksfree.pk

تھا لیکن گریم جیکسن کے لیے وہ دوسرا بیڈ لایا تھا۔ گھر میں اب بہت کم فرنیچر رہ گیا تھا۔

ایک مہینے بعد فارم کی خشک اور بھوری زمین سبز رنگ سے چھپ گئی تھی اور پودے فٹ بھر سے زیادہ اونچے ہو گئے تھے۔ زمین کی زرخیزی سے مکمل فائدہ اٹھانے کے لیے بریڈ نے پودے بھی پاس پاس لگائے تھے اس طرح وہ زیادہ فصل حاصل کر سکتا تھا۔ اگست میں بارشیں شروع ہو گئی تھیں اور اب اسے پودوں کو پانی بھی نہیں دینا پڑ رہا تھا لیکن اسے نکاسی کا خیال رکھنا پڑتا تھا کیونکہ جمع ہونے والا پانی پودوں کو خراب کر سکتا تھا۔ اس لیے شدید بارش میں بھی وہ سارا دن فارم میں گھومتا رہتا تھا اور جہاں اسے پانی رکتا نظر آتا وہ اس کی نکاسی کا راستہ بنا دیتا۔ بارش کا موسم ستمبر تک جاری رہتا اس لیے اس کی یہ محنت آنے والے مہینے تک جاری رہتی۔ ایک دو بار وہ بیمار ہوا لیکن اس حالت میں بھی کام کرتا رہا تھا۔

اس مصروفیت میں اس کے پاس اتنا وقت نہیں بچتا تھا کہ وہ کسی سے ملے یا کہیں تفریح کے لیے جائے۔ بس شرمین اور میٹ سے ملاقات ہو جاتی تھی وہ بھی کئی دن بعد بس کچھ دیر کے لیے، اس دن کے بعد شرمین نے اسے ایک بار پھر ڈنر پر بلایا تھا لیکن اس نے معذرت کر لی، اس نے شرمین سے کہا۔ ''اب میری باری ہے اور میں نے سوچا ہے ہم کہیں باہر چلیں گے لیکن اس کے لیے کچھ عرصے انتظار کرنا ہوگا۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' شرمین نے جلدی سے کہا۔ ''میں نے اس لیے تو تمہیں ڈنر پر نہیں بلایا تھا۔''

''میں جانتا ہوں لیکن مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے کہ ہر بار تم ہی سب کرو۔''

بریڈ اپنے اور گریم جیکسن کے لیے گھر میں ہی سب بنا لیتا تھا۔ ناشتا سادہ ہوتا تھا دودھ، ڈبل روٹی اور ابلے ہوئے انڈے کے ساتھ کافی۔ دوپہر کے لیے وہ سینڈوچز بنا لیتا تھا اور رات کو گوشت کی کوئی ڈش بنا لیتا۔ ان کا گزارا ہو جاتا تھا۔ ٹرک بن کر آ گیا تو وہ گریم جیکسن کو گھمانے پھرانے بھی لے جاتا۔ گریم جیکسن پوتے کی اس خدمت گزاری سے بہت خوش تھا اور اب اس کی بھی خواہش تھی کہ اس کی آنکھیں ٹھیک ہو جائیں، ساتھ ہی وہ اکثر بریڈ پر زور دیتا کہ وہ شرمین کے بارے میں سوچے۔ وہ اچھی عورت تھی لیکن بریڈ اسے ٹال جاتا تھا۔ شاید وہ شرمین کے بچوں کی وجہ سے ہچکچا رہا تھا کیونکہ وہ اسے قطعی لفٹ نہیں کراتے تھے۔ اول تو وہ گھر سے باہر کم آتے تھے اور اگر کبھی بریڈ سے ان کا سامنا ہو جاتا تو وہ اسے نظر انداز کر دیتے تھے۔ ماں ساتھ ہوتی تو مجبوراً ہیلو ہائے کر لیا کرتے تھے۔ ان کے رویے سے بریڈ کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ اسے پسند نہیں کرتے، دوسری طرف شرمین اس سے بے تکلف تھی لیکن اس کے انداز میں بھی پسندیدگی کی جھلک نظر نہیں آتی تھی۔

ستمبر کے آخر تک بارشیں تھم گئی تھیں اور بریڈ کی سبزیاں تیاری کے مرحلے تک آ گئی تھیں۔ پودے پوری طرح بڑے ہو چکے تھے اور اسے امید تھی کہ اکتوبر کے وسط تک سبزی پک جائے گی اور سب سے پہلے اس کی سبزی ہی منڈی تک پہنچے گی اس لیے اسے سب سے اچھی قیمت ملے گی۔ شرمین نے مکئی کی فصل سے بھٹوں کی چنائی شروع کرا دی تھی۔ اس کے دونوں ملازم روز بھٹے اتار کر بوریوں میں بھر کر منڈی لے جا رہے تھے۔ بریڈ کو فرصت ملتی تو وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتا۔ اس طرح وہ شرمین کے احسان کا بدلہ بھی اتار رہا تھا جو اس نے ضرورت کے وقت اپنے ملازم بھیج کر کیا تھا۔ ملازم بھی خوش تھے کہ ان کا بوجھ ہلکا ہو رہا تھا کیونکہ فصل اتارنے کے دنوں میں ایک لمحے کی فرصت بھی مشکل سے ملتی تھی۔ بریڈ فکر مند تھا سبزی نکالنے کے لیے کہیں زیادہ محنت کی ضرورت تھی اور اس کے پاس اب اتنی رقم نہیں رہی تھی کہ زیادہ مزدور حاصل کر سکے اور اگر وہ کم افراد کے ساتھ سبزی نکالتا تو وہ تاخیر سے منڈی تک پہنچتی اور اس کی قیمت گر جاتی جبکہ مزدوروں کو معاوضہ اتنا ہی دینا پڑتا۔ اس مسئلے کا ایک حل تو شرمین کے ملازموں کی صورت میں تھا۔ شرمین نے اس سے کہا کہ جب مکئی کی فصل اتر جائے تو وہ اپنے ملازموں کو اس کی طرف بھیج دے گی سورج مکھی کی فصل تقریباً ایک ہفتے بعد اترے گی اور اس ایک ہفتے میں بریڈ ملازموں سے کام لے سکتا تھا۔

اس کے باوجود بریڈ کو دو افراد مزید درکار تھے۔ چار آدمی مل کر روز ایک ہیکٹر سے سبزی اتار سکتے تھے۔ بریڈ کا کام سبزی کو منڈی تک پہنچانا تھا۔ اس نے میٹ سے بات کی لیکن میٹ ان دنوں خود اپنی زمین پر مصروف ہوتا۔ مجبوراً بریڈ کو مہنگے داموں دو مزدور حاصل کرنا پڑے۔ اس نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ ان کا معاوضہ کام ختم ہونے کے دو دن کے اندر ادا کر دے گا۔ خوش قسمتی سے وہ مان گئے۔ چودہ اکتوبر کے دن بریڈ نے پہلی آزمائشی سبزی نکال کر دیکھی۔ وہ بہترین انداز میں تیار تھی۔ اگلے دن سورج نکلتے ہی اس نے سبزی نکالنے کا کام شروع کر دیا۔ اس کے ٹرک میں ڈھائی ٹن کی گنجائش تھی اور ایک ہیکٹر سے تقریباً بارہ تیرہ ٹن سبزی

نکل رہی تھی، اس کا مطلب تھا اسے دن بھر میں منڈی کے پانچ چکر لگانے تھے۔ پہلا دن تھا اور منڈی میں تاجر تیار بیٹھے تھے اس لیے بریڈ کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس نے سب سے زیادہ دام لگانے والے سے سودا کر لیا۔ لیکن اس نے اگلے دن کا سودا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا امکان تھا کہ اگلے دن قیمت بڑھ جاتی بس یہی ایک ہفتہ تھا جس میں وہ اپنی پسند کی قیمت حاصل کر سکتا تھا اس کے بعد دوسرے کسانوں کی فصل آنا شروع ہو جاتی تو قیمت خود بہ خود گر جاتی۔

آنے والے دس دن بریڈ پاگلوں کی طرح لگا رہا تھا وہ صبح چھ بجے اٹھ جاتا اور جب آخری چکر لگا کر واپس آتا تو عام طور سے رات کے نو دس بج چکے ہوتے تھے۔ آخری چکر میں وہ حساب کتاب کرتا اور رقم وصول کرتا تھا۔ یہ رقم وہ منڈی میں رات تک کھلے رہنے والے بینک میں جمع کر دیتا تھا۔ اس کے پاس ڈرائیونگ لائسنس یا سوشل سیکیورٹی کارڈ نہیں تھا اس لیے منڈی کے ایک تاجر کی ضمانت پر اس کا اکاؤنٹ کھلا تھا۔ منڈی سے باہر ہزاروں ڈالرز کی رقم لے کر نکلنا خطرے سے خالی نہیں تھا جبکہ اس کے پاس اپنی حفاظت کے لیے کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا۔ اس لیے وہ صرف اتنی رقم لاتا جو اگلے دن مزدوروں کی تنخواہ کے لیے کافی ہو۔ دس دن میں ساری سبزی اتر کر منڈی جا چکی تھی اور فارم خالی ہو گیا تھا اور وہاں صرف پودوں کے بچ جانے والے حصے پڑے تھے۔ بریڈ کا ارادہ تھا کہ جب یہ خشک ہو جائیں گے تو انہیں جلا کر زمین میں ملا دے گا، اس سے زمین کی زرخیزی واپس آ جائے گی لیکن میٹ نے اس سے اپنے جانوروں کے لیے یہ پودے مانگ لیے تو بریڈ نے اسے دے دیے۔ اس کے اکاؤنٹ میں ایک لاکھ ڈالرز سے زیادہ رقم آ چکی تھی اور یہ رقم تمام اخراجات نکال کر تھی۔ گریم جیکسن یہ سن کر خوش ہوا تھا۔

''میرے بچے، تم نے محنت کی ہے اور یہ اس کا صلہ ہے۔''

''آپ کل تیار رہیے گا میں نے ایک ڈاکٹر سے اپائنٹ منٹ لے لیا تھا وہ کل آپ کی آنکھوں کا معائنہ کرے گا۔''

''تم کہتے ہو تو میں چلتا ہوں ورنہ میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

ڈاکٹر نے بینائی کی مکمل بحالی کا امکان مسترد کر دیا تھا لیکن اس نے کہا۔ ''ایک مختصر آپریشن سے یہ اس قابل ہو جائیں گے کہ روشنی اور تاریکی میں فرق محسوس کر سکیں۔''

ڈاکٹر نے آنکھوں میں ڈالنے اور کھانے کے لیے کچھ دوائیاں دیں اور ایک ہفتے بعد بلایا تھا۔ گریم جیکسن کو گھر چھوڑ کر بریڈ، شرمین کے پاس پہنچا۔ وہ اب سورج مکھی کی فصل اتروا رہی تھی اور اس میں زیادہ آدمیوں کی ضرورت تھی اس لیے بریڈ کے فارم پر کام کرنے والے اب اس کے فارم پر کام کر رہے تھے۔ شرمین نگرانی کر رہی تھی۔ اس نے گرم جوشی سے بریڈ کا استقبال کیا۔ ''مبارک ہو، تمہاری فصل بہت اچھی ہوئی ہے۔''

''شکریہ، تمہاری فصل بھی اچھی ہوئی ہے۔'' بریڈ نے جواب دیا اور فارم کا جائزہ لیا۔ ''میرا خیال ہے کل تک یہ کام نمٹ جائے گا۔''

''ہاں کل تک سب صاف ہو جائے گا۔'' شرمین بولی۔ ''اس کے بعد پودوں کی چھنٹائی کا کام ہوگا وہ میں دو دن کا وقفہ دے کر کراؤں گی۔''

''میٹ نے تم سے بچے ہوئے پودے نہیں مانگے؟''

''مانگے تھے لیکن میں نے انکار کر دیا۔ میرا ارادہ انہیں جلا کر زمین میں ملانے کا ہے، سنا ہے تم نے دیدیے ہیں۔''

''ہاں مجھے انکار کرتے ہوئے اچھا نہیں لگا اس نے بھی میرا بہت ساتھ دیا ہے۔''

''لیکن اس سے ہوشیار رہنا، وہ بہت عیار آدمی ہے کسی کی کمزوری بھانپ جائے تو اس سے فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کرتا ہے۔''

''تم فکر مت کرو، میری ایسی کوئی کمزوری نہیں ہے۔'' بریڈ نے کہا۔ ''ویک اینڈ کے ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''خیال تو اچھا ہے اور میں فارغ بھی ہوں گی۔''

''باؤنٹی چلیں، سنا ہے وہاں کا کھانا اور ماحول بہت اچھا ہوتا ہے۔''

شرمین خوش ہو گئی۔ ''کیوں نہیں، مجھے خود وہاں کا کھانا اچھا لگتا ہے۔''

''بس تو طے ہے، میں شام چھ بجے تمہیں لینے آؤں گا۔''

''اتنی جلدی؟''

''ہاں، میں کچھ وقت تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔''

چھ سے رات گیارہ بجے تک کا وقت بریڈ نے بہت اچھا گزارا تھا۔ اس نے شرمین کے ساتھ کھانے اور ماحول دونوں کو انجوائے کیا تھا۔ ڈنر سے فارغ ہو کر وہ ہوٹل کے بار میں آئے۔ باتوں کے دوران اچانک شرمین نے اس کی کنپٹی کے زخم کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ چوٹ کیسے لگی؟

www.pdfbooksfree.pk

میں نے تمہاری پرانی تصویریں دیکھی ہیں ان میں تو یہ نشان نہیں تھا۔"

"ہاں یہ چوٹ بعد میں لگی۔" بریڈ نے زخم کا نشان سہلایا۔ "کیا یہ برا لگ رہا ہے؟"

"نہیں اس کے برعکس مجھے اچھا لگ رہا ہے، میرے خیال میں مردوں میں عورتوں کی طرح خوب صورتی اور نزاکت نہیں ہونی چاہیے اور ایسے نشان مردوں کی خوب صورتی ہوتے ہیں۔"

بریڈ مسکرایا۔ "خالص دیہاتی خیال ہے تمہارا، شہروں میں تو اب عورتیں نازک مردوں کو پسند کرنے لگی ہیں۔"

"تم شہر میں بھی رہے ہو؟"

"بہت عرصے تک، بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ میں نے زیادہ عرصہ شہر میں ہی گزارا ہے۔"

شرمین اس کے بارے میں اور جاننا چاہ رہی تھی لیکن بریڈ نے موضوع بدل دیا۔ رات گیارہ بجے وہ واپس آئے تو شرمین فارم کے سامنے ہی اس کے ٹرک سے اتر گئی۔

"اتنے اچھے ڈنر اور کمپنی کا شکریہ۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" بریڈ نے جواب دیا۔ "پھر ملیں گے۔"

وہ اپنے فارم میں داخل ہوا۔ اس کا ارادہ اب کوئی چھوٹی گاڑی لینے کا تھا جسے عام استعمال میں رکھ سکے۔ ٹرک صرف فارم کے کاموں کے لیے مخصوص ہو جاتا۔ اس نے ٹرک روکا۔ نیچے اترا اور ٹھٹک گیا۔ لان کی کرسی پر ایک سایا موجود تھا۔ بریڈ محتاط انداز میں اس کی طرف بڑھا اور قریب جانے پر اس کے تنے اعصاب نرم پڑ گئے۔ وہ میٹ تھا۔ "تم اس وقت...؟ خیریت ہے نا؟"

"ہاں سب خیریت ہے۔" میٹ کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ "میں نے سوچا تمہیں ذرا انجوائے کرنے دوں اس کے بعد تم سے ملاقات کروں۔"

"کیسی ملاقات؟" بریڈ سنجیدہ ہو گیا۔ "تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟"

"انجان مت بنو، تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔ اگر تم میری زبان سے سننا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے۔ بات صرف اتنی ہے مسٹر کہ تم اصل بریڈ جیکسن نہیں ہو۔"

بریڈ چونکا نہیں تھا، اس نے سکون سے میٹ کی بات سنی اور بولا۔ "ٹھیک ہے میں بریڈ نہیں ہوں تو پھر کون ہوں؟"

"میں نہیں جانتا۔" میٹ نے شانے اچکائے۔

"لیکن میں ایک بات جانتا ہوں کہ تم بریڈ جیکسن نہیں ہو ہاں تمہاری صورت اس سے ملتی ہے۔"

بریڈ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ "یہ تمہارا خیال ہے۔"

"یہ خیال نہیں حقیقت ہے۔"

"لیکن اس کا کوئی ثبوت بھی تو ہوگا کہ میں اصل بریڈ جیکسن نہیں ہوں۔ ثبوت کے بغیر تمہاری بات کون مانے گا؟"

"تمہارا گرینڈ پا۔" میٹ نے عیاری سے کہا۔ "اور شرمین جس سے تم شادی کے خواب دیکھ رہے ہو۔"

"یہ تمہاری دوسری غلط فہمی ہے۔" بریڈ نے کہا۔ "بہرحال میں تمہاری بکواس سن رہا ہوں اس لیے بولتے رہو۔"

"میں بکواس کر رہا ہوں اس کے باوجود تم سچائی سے انکار نہیں کر سکتے۔"

"میرا خیال ہے تم مطلب کی بات پر آجاؤ۔ اس طرح رات کے وقت آکر تم مجھے بے نقاب کرنا نہیں چاہ رہے ہو۔"

میٹ ہنسا تو اس کے انداز میں ڈھٹائی تھی۔ "تم نے ٹھیک پہچانا، مجھے تمہیں بے نقاب کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے بشرطیکہ تم مجھے پچاس ہزار ڈالرز ادا کر دو۔"

بریڈ نے چونک کر اسے دیکھا۔ "تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں، میرا دماغ ٹھیک ہے۔" میٹ نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ "لیکن کل تک مجھے پچاس ہزار ڈالرز نہ ملے تو میرا دماغ ٹھیک نہیں رہے گا۔"

میٹ اسے دھمکی دے کر رخصت ہو گیا۔ بریڈ اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا پھر وہ گھر میں آگیا۔ گریم جیکسن اپنے کمرے میں سکون سے سو رہا تھا۔ بریڈ نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر اپنے کمرے میں آگیا۔ اگلے روز وہ صبح ناشتے کے بعد گھر سے نکلا اور تقریباً دو گھنٹے بعد واپس آیا۔ جیسے ہی اس کا ٹرک فارم کے اندر داخل ہوا میٹ بھی... آن پہنچا اس نے بریڈ کے نیچے اترتے ہی کہا۔ "مجھے امید ہے تم پچاس ہزار ڈالرز لے آئے ہو۔"

اسی لمحے ایک سیاہ تقریباً نئے ماڈل کی فورڈ وین فارم میں داخل ہوئی اور اس سے ایک نوجوان اترا۔ اس نے چابی بریڈ کو دی اور بولا۔ "اب مجھے اجازت ہے؟"

"ایک منٹ رکو میں تمہیں ہائی وے تک چھوڑ آتا ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے، آدھا کلومیٹر راستہ تو ہے میں پانچ منٹ میں پہنچ جاؤں گا اور پھر کوئی نہ کوئی لفٹ دینے والا مل جائے گا۔"

بریڈ نے اسے بیس ڈالرز کا ایک نوٹ دیا تو وہ خوش ہو کر رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد بریڈ نے میٹ کی طرف دیکھا اور سرد لہجے میں بولا۔ "میں یہ گاڑی اور یہ ہتھیار لینے گیا تھا۔" اس نے اندر سے ایک نئی شاٹ گن اور نیا پستول نکالا۔

میٹ کا رنگ اڑ گیا وہ جلدی سے پیچھے ہٹا۔ "اگر تم مجھے دھمکی دے رہے ہو تو یہ اچھی بات نہیں ہے۔"

"میں تمہیں دھمکی نہیں دے رہا، تمہارا مطالبہ مسترد کر رہا ہوں۔ اب تم جا سکتے ہو۔" بریڈ نے کہا۔

"میں تمہیں برباد کر دوں گا۔"

بریڈ نے شاٹ گن شانے سے لگائی اور اس کی نال کا رخ میٹ کی طرف کیا تو وہ تیزی سے چل پڑا۔ گریم جیکسن برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ بریڈ کی آہٹ سن کر اس نے پوچھا۔ "بریڈ واپس آگئے؟"

"ہاں گرینڈ پا اور میں کچھ چیزیں لایا ہوں۔"

"کیا لائے ہو؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

بریڈ نے اسے ہتھیار پکڑائے۔ ایک زمانے میں خود گریم جیکسن نے بھی ہتھیار رکھے تھے۔ پھر وہ اسے گاڑی تک لایا اور گریم جیکسن نے گاڑی ٹٹول کر دیکھی تو اس کے چہرے کی مسرت دیکھنے والی تھی۔ بریڈ نے اس کی خوشی محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "کیا خیال ہے گرینڈ پا، ڈرائیونگ کریں گے؟"

"ڈرائیونگ۔" گریم جیکسن نے حیرت سے کہا۔ "وہ کیسے؟"

"آیئے میرے ساتھ۔" بریڈ نے اسے ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھایا اور خود اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔ گریم جیکسن ڈرائیونگ بھولا نہیں تھا کسی قدر دقت سے اس نے وین فارم سے نکالی۔ اسٹیئرنگ بریڈ بھی سنبھال رہا تھا۔ ہائی وے پر آکر گریم جیکسن آسانی سے ڈرائیو کرنے لگا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ واپس آئے تو دادا پوتے دونوں بے حد خوش تھے۔ گریم نے اسے سینے سے لگایا۔ "آج تم نے مجھے سرپرائز دیا ہے۔ میں نے کتنے عرصے بعد ڈرائیو کی ہے۔"

"اگر آپ کہیں تو میں آپ کو روز اسی طرح ڈرائیو پر لے جا سکتا ہوں۔" بریڈ اسے برآمدے تک لایا۔

"نہیں، بس کبھی کبھی اور یہ بھی تفریح ہو گی لیکن میری اصل خوشی تم ہو میرے بچے! میں چاہتا ہوں تم شادی کر لو تاکہ مرتے وقت مجھے اطمینان رہے کہ تم اکیلے نہیں ہو۔ تم ایک بار شرمین سے بات تو کر کے دیکھو۔"

اس نے بے دلی سے کہا۔ "اگر آپ کہتے ہیں تو میں شرمین سے بات کر کے دیکھتا ہوں لیکن اس کے بچے...؟"

"اس کے بچوں کی فکر مت کرو، آج کل کے بچے ایسے ہی ہوتے ہیں ابھی تم ان کے لیے اجنبی ہو لیکن کل ان کی ماں سے شادی کرو گے تو جلد یا بدیر وہ تمہیں قبول کر لیں گے۔"

"میں سوچوں گا۔" اس نے گریم جیکسن کو ٹالنے والے انداز میں کہا۔

☆☆☆

اکتوبر کے آخری دن تھے اور موسم سرد ہو چلا تھا۔ نومبر کے پہلے ہفتے میں ٹینسی کی ریاست میں برف باری کا آغاز ہو جاتا اور پھر کہیں مارچ کے وسط میں جا کر برف پگھلنا شروع ہوتی تھی۔ مارچ کے آخر میں وہ سبزیوں کی بوائی کر سکتا تھا جو جولائی کے پہلے ہفتے میں تیار ہو جاتی۔ اس

خوشخبری

طلسماتی انگوٹھی ایک عظیم تحفہ ہے۔ ہم نے سورۂ یاسین کے نقش پر فیروزہ یمنی، عقیق، یکھراج، لاجورد، نیلم، زمرد، یاقوت پتھروں سے تیار کی ہے۔ انشاء اللہ جو بھی یہ طلسماتی انگوٹھی پہنے گا اس کے تمام بگڑے کام بن جائیں گے۔ مالی حالات خوب سے خوب تر اور قرضے سے نجات مل جائے گی۔ پسندیدہ رشتے میں کامیابی، میاں بیوی میں محبت، ہر قسم کی بندش ختم، رات کو تکیے کے نیچے رکھنے سے لاٹری کا نمبر، جادو کس نے کیا، کاروبار میں فائدہ ہوگا یا نقصان معلوم ہو جائے گا۔ آفیسر اپنی طرف مائل، نافرمان اولاد نیک، میاں کی عدم توجہ، جج یا حاکم کے غلط فیصلے سے بچاؤ، مکان، فلیٹ یا دکان کسی قابض سے چھڑانا، معدے میں زخم، دل کے امراض، شوگر، یرقان، جسم میں مردوعورت کی اندرونی بیماری، مردانہ کمزوری، ناراض کو راضی کرنے یہ سب کچھ اس انگوٹھی کی بدولت ہوگا۔ یاد رکھو سورۂ یاسین قرآن پاک کا دل ہے۔

رابطہ: صوفی علی مراد

0333-3092826,021-32446647

M-20A الرحمان ٹریڈ سینٹر بالمقابل سندھ مدرسہ کراچی

www.pdfbooksfree.pk

طرح وہ سال میں دو بار فصل حاصل کر سکتا تھا۔ وہ گریم جیکسن سے اس بارے میں تبادلۂ خیال کرتا رہا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے میٹ کی دھمکی کی کوئی پروا نہ ہو۔ دو تین دن وہ دوسرے کاموں میں مصروف رہا۔ اس نے تہ خانے میں لگا بوائلر اور ہیٹنگ کا نظام درست کر لیا تھا۔ بھٹی میں لکڑی ڈال کر اسے چلا دیا تھا۔ یہ بھٹی نہ صرف گھر کو گرم رکھتی تھی بلکہ گرم پانی کی ضرورت بھی پوری کرتی تھی۔ اس نے گھر میں نیا فرنیچر ڈلوایا تھا۔ نشست گاہ کو نئے سرے سے آراستہ کیا تھا۔ کچن کے لیے نئی ڈائننگ میز اور کرسیاں لایا تھا۔ اپنے اور گریم کے بیڈ روم کے لیے فرنیچر اور نیا سامان لایا تھا۔ گریم جیکسن کو موسیقی کا شوق تھا، اس کے لیے ایک آسانی سے استعمال ہونے والا سی ڈی پلیئر اور اس کی پسندیدہ موسیقی کی سی ڈیز لایا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میٹ کی بات اور دھمکی کو اس نے اپنے ذہن سے بالکل نکال دیا ہو۔

نومبر کے آغاز میں اس نے پہلی برف باری سے پہلے فارم کی باڑھ کی ازسرِنو تعمیر شروع کر دی تھی۔ اس کام کے لیے اس نے ایک مزدور بھی حاصل کر لیا تھا۔ کئی ٹرک بھر کر لکڑی کے مضبوط تختے فارم پر آئے تھے۔ ہفتے بھر کے اندر بریڈ نے پرانی باڑھ نکال کر نئی باڑھ لگا دی تھی۔ باڑھ کی تکمیل کے فوراً بعد اس پر پینٹ کا کام شروع کر دیا اور دو دن میں یہ کام بھی نمٹ گیا۔ پرانی باڑھ کی لکڑی کے ٹکڑے کر کے انہیں سردیوں میں جلانے کے لیے شیڈ میں محفوظ کر لیا۔ جب کام مکمل ہوا تو اسے خیال آیا کہ اس رات کے ڈنر کے بعد سے اس کی شرمین سے ملاقات نہیں ہوئی، اسے فرصت نہیں ملی تھی لیکن شرمین نے بھی اس دوران میں اس سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ شرمین کے فارم پر پہنچا تو شرمین مکان کے سامنے ہی اپنی گاڑی کی صفائی کر رہی تھی۔

''ہیلو۔''

''ہیلو۔'' شرمین نے جواب دیا لیکن اس کا لہجہ سرد تھا۔ بریڈ نے چونک کر اسے دیکھا مگر شرمین اس کی طرف دیکھنے کے بجائے اپنے کام میں مگن رہی۔ بریڈ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔

''میرا خیال ہے تم مصروف ہو۔''

''ہاں۔'' شرمین نے پہلی بار اس کی طرف دیکھا۔ ''اور آئندہ بھی مصروف رہوں گی۔''

بریڈ سمجھ گیا تھا، اس نے گہری سانس لی۔ ''کیا میٹ نے تم سے کچھ کہا ہے؟''

''کیا اس نے غلط کہا ہے؟''

''اس کی بات چھوڑو یہ بتاؤ کیا میں تمہیں دھوکے باز لگتا ہوں جو کسی اور کی شخصیت اختیار کر سکتا ہوں؟''

شرمین کے تاثرات میں ذرا نرمی آئی۔ ''نہیں، میں اب تک نہیں سمجھ سکی ہوں لیکن میٹ نے ایسا کیوں کہا ہے؟''

''اگر میں بریڈ نہیں ہوں تو اس کے پاس اس کا کوئی ثبوت ہوگا کیا اس نے تم سے ثبوت کے ساتھ بات کی ہے؟''

شرمین ہچکچائی۔ ''نہیں، اس نے ثبوت تو کوئی نہیں بتایا ہے لیکن وہ یقین سے کہہ رہا ہے۔''

''اور تم نے یقین کر لیا۔'' بریڈ نے تلخی سے کہا۔

''بریڈ، وہ تمہارا بچپن کا دوست ہے آخر وہ تمہارے خلاف ایسی بات کیوں کر رہا ہے؟''

''اس نے مجھ سے بھی کہا تھا اور راز کی قیمت پچاس ہزار ڈالرز مانگی تھی لیکن میں نے انکار کر دیا تو وہ انتقامی کارروائی پر اتر آیا ہے۔''

''وہ لالچی ہے، لیکن اتنا بڑا جھوٹ کیسے بول سکتا ہے؟'' شرمین کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

''کیونکہ جھوٹ بولنے کے لیے ایک ذرا سی زبان ہلانی پڑتی ہے۔'' بریڈ نے کہا اور واپس جانے کے لیے مڑ گیا۔ شرمین اسے جاتے دیکھتی رہی لیکن اس نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اپنے فارم کے گیٹ کے پاس پہنچا تو اسے کچھ ہی دور میٹ دکھائی دیا۔ وہ فاتحانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ بریڈ اس کی طرف بڑھا تو وہ محتاط ہو گیا اور عیاری سے بولا۔

''مل آئے شرمین سے؟''

''تم نے اس سے بکواس کی ہے۔''

''ابھی میں نے صرف شرمین سے کی ہے اگر میں نے تمہارے گرینڈ پا یا پولیس سے یہ بکواس کر دی تو تم سوچ سکتے ہو کہ تم کہاں ہو گے۔ پھر تمہیں پولیس کے سامنے ثابت کرنا پڑے گا کہ تم اصل بریڈ ہو اور یہ بات تم کسی صورت ثابت نہیں کر سکتے۔''

''کیوں نہیں ثابت کر سکتا؟''

''اس لیے کہ اصل بریڈ جیکسن مر چکا ہے۔'' میٹ نے انکشاف کرنے والے انداز میں کہا۔

''یہ بات تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''اسے چھوڑو لیکن ضرورت پڑی تو میں پولیس کی رہنمائی کر سکتا ہوں، مجھے معلوم ہے اصل بریڈ جیکسن کی لاش کہاں ہے۔''

وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ ''تم یہ سب پچاس ہزار ڈالرز

www.pdfbooksfree.pk

کے لیے کر رہے ہو؟"

"ہاں، تم سوچو صرف پچاس ہزار ڈالرز دے کر تم مزے سے بریڈ جیکسن بنے رہ سکتے ہو۔"

"اور جو تم شرمین سے کہہ چکے ہو۔"

"میں ہی دوبارہ اس سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے سنجیدگی سے مذاق کیا تھا۔" میٹ نے ڈھٹائی سے کہا۔

"ایک بار میں تمہیں پچاس ہزار ڈالرز دیدوں گا تو اس کے بعد تم دوبارہ مجھ سے رقم کا مطالبہ کرو گے اور میں تمہارا مطالبہ پورا کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

"میں یقین دلاتا ہوں کہ میں دوبارہ تم سے کوئی مطالبہ نہیں کروں گا۔"

"ٹھیک ہے مجھے کچھ سوچنے کی مہلت دو۔ اس کے بعد میں تمہیں حتمی جواب دوں گا۔"

"او کے، تم دو دن سوچ سکتے ہو۔" میٹ نے خبردار کرنے والے انداز میں کہا۔ "لیکن اس کے بعد تمہیں ایک فیصلہ کر لینا ہوگا۔ مجھے امید ہے تم ایسا فیصلہ کرو گے جو ہم دونوں کے لیے بہتر ہو۔"

میٹ کے جانے کے بعد بریڈ فارم کے احاطے میں داخل ہوا تھا کہ ٹھٹک گیا کیونکہ قریب ہی گریم جیکسن کھڑا تھا۔ وہ گیٹ کے پاس ہی تھا اور شاید اس نے میٹ اور بریڈ کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی تھی۔ کم سے کم اس کے چہرے کے تاثرات سے ایسا ہی لگ رہا تھا۔ آہٹ سن کر اس نے کہا۔ "کون... بریڈ؟"

"جی گرینڈ پا۔"

"یہ میٹ کیا بکواس کر رہا تھا تم اسے پچاس ہزار ڈالرز دے کر کس طرح بریڈ جیکسن بن سکتے ہو؟"

"گرینڈ پا۔" بریڈ نے نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑا۔ "اگر آپ نے کچھ سن لیا ہے تو اس پر اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ میٹ بکواس ہی کر رہا تھا۔"

گریم جیکسن نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور تند لہجے میں بولا۔ "تب تم نے اسے پچاس ہزار ڈالرز دینے کی بات کیوں کی؟"

"گرینڈ پا پلیز، مجھ پر اعتماد کریں، میٹ کسی غلط فہمی کا شکار ہے اور میں جلد اس کی غلط فہمی دور کر دوں گا۔"

وہ گریم جیکسن کو اندر لے آیا، اس نے دیکھا بوڑھے آدمی کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ اس نے گریم جیکسن کو کرسی پر بٹھایا اور اندر چلا گیا۔ کرسی پر جھولتے گریم جیکسن کو احساس بھی نہیں تھا کہ اس کے آنسو چہرے پر گر رہے ہیں۔ شاید وہ خود سے سوال کر رہا تھا کہ بریڈ اس کا پوتا ہے یا نہیں؟ بریڈ کے آنے سے اسے جیسے پھر سے زندگی مل گئی تھی۔ کیا اس سے یہ زندگی چھن جائے گی؟

☆☆☆

بریڈ نے میٹ کے سامنے پچاس ہزار ڈالرز کے نوٹ ایک بنڈل میں بندھے رکھے۔ اس نے بے تابی سے بنڈل کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن بریڈ نے بنڈل واپس کھینچ لیا۔ "نہیں دوست، سودا اس طرح نہیں ہوگا۔"

"پھر کس طرح ہوگا؟" میٹ کا منہ بن گیا۔

"مجھے ٹھوس ضمانت چاہیے کہ تم آئندہ مجھے بلیک میل نہیں کرو گے۔"

"یہ ضمانت میں کس طرح دے سکتا ہوں؟"

"تم آسانی سے ضمانت دے سکتے ہو۔"

"کس طرح؟"

"بریڈ جیکسن کی لاش کہاں ہے۔ اس جگہ کی نشان دہی کر دو، اس طرح مجھے اطمینان ہو جائے گا کہ آئندہ تم مجھے کبھی بلیک میل نہیں کر سکو گے۔"

میٹ سوچ میں پڑ گیا۔ "تم لاش کا کیا کرو گے، اب تو وہاں ہڈیاں رہ گئی ہوں گی۔"

"لیکن ان ہڈیوں سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ وہ کس کی ہیں۔ نہیں دوست، میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ اگر تمہیں پچاس ہزار ڈالرز چاہئیں تو لاش میرے حوالے کرنا ہوگی میں ان ہڈیوں کو کہیں اور دفن کر دوں گا جہاں کوئی ان کا سراغ نہیں لگا سکے گا۔"

میٹ سوچ میں پڑ گیا، اس کی نظریں رقم پر بھی مرکوز تھیں۔ وہ ہچکچا رہا تھا کہ بریڈ کا مطالبہ پورا کرے یا نہ کرے۔ بریڈ نے اس کی کشمکش محسوس کر لی تھی، اس نے کہا۔ "اگر تم نے میرا مطالبہ نہ مانا تو میں بلیک میل ہونے کے بجائے فرار کو ترجیح دوں گا۔ میرے پاس رقم ہے۔ تم یا پولیس کوئی مجھے تلاش نہیں کر سکے گا اور تمہیں ایک ڈالر بھی نہیں ملے گا۔"

اس دھمکی نے میٹ کو فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے سر ہلا دیا۔ "مجھے منظور ہے..... لیکن میں آج رات تمہیں لے جا کر دکھا سکوں گا۔"

بریڈ نے کہا۔ "مجھے منظور ہے لیکن یاد رکھنا، دھوکے کی کوشش مت کرنا۔"

"کیا مطلب..... میں کیا دھوکا دوں گا؟"

"یہی کہ مجھے غلط ہڈیاں پکڑا دو۔"

"فکر مت کرو، میں گورکن نہیں ہوں جو کہیں سے ہڈیاں لا کر تمہیں پکڑا دوں گا، میں تمہیں بریڈ جیکسن کی قبر پر لے جاؤں گا جو ایک جنگل میں ہے اور تم اس کی حالت سے خود اندازہ کر لو گے کہ وہ کب سے وہاں دفن ہے۔"

"رات کس وقت چلنا ہوگا؟"

"بارہ بجے کے بعد۔" میٹ نے کہا۔ یہ ساری گفتگو میٹ کے فارم کے احاطے میں ہو رہی تھی۔

بریڈ واپس گھر آیا اور ڈنر کی تیاری میں لگ گیا۔ باہر موسم سرمئی ہو رہا تھا اور صاف لگ رہا تھا آج کسی وقت سرما کی پہلی برف باری شروع ہو جائے گی۔ شام ہوتے ہی آسمان سے برف گرنے لگی تھی۔ ڈنر کے بعد بریڈ، گریم جیکسن کو اس کے کمرے میں لے گیا اور اسے لٹانے لگا تو اس نے بریڈ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "میرے بچے، مجھے صرف ایک بات کا جواب دیدو، اس کے بعد تم مجھے قتل کرنا چاہو گے تب بھی مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔ مجھے صرف یہ بتا دو کہ تم میرے پوتے ہو یا نہیں؟"

"گرینڈ پا میں آپ کا پوتا ہوں۔" اس نے پختہ لہجے میں کہا۔

گریم جیکسن نے گہرا سانس لیا۔ "مجھے یقین ہے میرے بچے، میٹ ایک جھوٹا اور سازشی آدمی ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں گرینڈ پا، آج کے بعد اس کا منہ بند ہو جائے گا۔"

"ہاں وہ جھوٹا ہے۔" گریم جیکسن نے یوں زیر لب کہا جیسے خود کو یقین دلا رہا ہو۔ بریڈ لائٹ بند کر کے اس کے کمرے سے نکل گیا۔ بارہ بجے کے قریب وہ تیار ہو کر نیچے آیا اور خاموشی سے گیٹ کھول کر باہر نکل آیا۔ برف باری ہو کر رک چکی تھی اور اب تیز کاٹ دار ہوا چل رہی تھی۔ میٹ کچھ دیر بعد اپنے فارم سے اپنی گاڑی میں نکلا۔ اس نے بریڈ کے قریب گاڑی روکی۔ وہ بیٹھ گیا اور میٹ نے گاڑی آگے بڑھا دی، ہائی وے پر آنے کے بعد اس نے شمال کا رخ کیا۔ یہاں فارمز ختم ہونے کے بعد جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ میٹ نے پوچھا۔

"تم رقم لائے ہو؟"

بریڈ نے اسے رقم کا بنڈل دکھایا اور پھر جیب سے پستول نکال کر دکھایا۔ "خیال رہے میرے پاس یہ بھی ہے اس لیے کوئی دھوکا کرنے کی کوشش مت کرنا۔"

"مجھے دھوکا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" میٹ بولا۔ "ویسے اپنے بارے میں کیا خیال ہے، تم ایک بوڑھے

علاج

ایک عورت نے اپنی سہیلی سے سر درد کی شکایت کی تو سہیلی نے مشورہ دیا۔ "جب میرے سر میں درد ہوتا ہے تو میرا شوہر بڑے پیار سے میرا سر دباتا ہے اور اتنی محبت کا اظہار کرتا ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے درد غائب ہو جاتا ہے۔ میرے خیال میں تم بھی یہ نسخہ آزما کر دیکھو۔"

"ہاں ہاں ضرور..... تمہارا شوہر کب تک گھر آئے گا؟" عورت نے اشتیاق سے پوچھا۔

مرسلہ: ساجدہ راجہ، ہندواں سرگودھا

غیر شادی شدہ

نیویارک کے ایک ہوٹل میں ہوٹل کا سراغ رساں ایک کمرے میں داخل ہوا۔ جہاں ایک نوجوان جوڑا مقیم تھا، اس نے جوڑے پر الزام لگایا کہ وہ غیر شادی شدہ ہیں اور ان کا ہوٹل ایسے جوڑوں کے قیام کی اجازت نہیں دیتا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو تم.....؟" لڑکی غصے سے چلائی۔ "تم مجھے غیر شادی شدہ کہہ رہے ہو؟ اگر میرا شوہر یہاں موجود ہوتا تو تمہارے دانت توڑ دیتا۔"

مرسلہ: ساجدہ راجہ، ہندواں سرگودھا

آؤ مسکرائیں ساحل کے سنگ

☆ چاقو دیکھ کر بچے نے کہا۔ "یہ آری کا بچہ ہے جس کے ابھی دانت نہیں نکلے۔"

☆ فون کی گھنٹی بجی خوب صورت حسینا فون کی طرف لپکی مگر اس سے پہلے ننھے مجاہد نے ریسیور اٹھا لیا دوسری طرف کی بات سن کر بولا۔ "آپ نے غلط نمبر ملایا ہے میں کسی خوب صورت بہن کا بھائی نہیں۔"

☆ بیوی۔ "میں مر جاؤں گی تو تمہیں مجھ جیسی بیوی نہیں ملے گی۔"

☆ شوہر۔ "مگر میں تمہارے جیسی تلاش ہی کیوں کروں گا۔"

☆ بائیک آہستہ چلائیں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔

شوہر بولا۔ "تم بھی میری طرح آنکھیں بند کر لو۔"

انتخاب: مقبول عاشق، خوشاب

www.pdfbooksfree.pk

اور معذور آدمی کے ساتھ کیا کر رہے ہو؟"

"کیا مطلب؟"

میٹ ہنسا۔ "میں نے دیکھا تھا تم اسے ڈرائیو کرا رہے تھے اب وہ کسی حادثے میں مر جائے تو یہ زمین اور سب کچھ کس کا ہوگا۔"

"تم بکواس کرنے کے بجائے ڈرائیو کرو۔" بریڈ نے سرد لہجے میں کہا۔ میٹ ہنسا جیسے اسے چڑا رہا ہو۔ پچاس ہزار ڈالرز ملنے کے خیال سے ہی اس میں ایک ترنگ سی آ گئی تھی۔ ہاگ ٹاؤن سے تقریباً دس کلومیٹرز کے بعد اس نے اپنی گاڑی ہائی وے سے جنگل کی طرف جانے والے راستے پر موڑ دی تھی۔ کچے راستے پر ہچکولے کھاتی گاڑی تقریباً ایک کلومیٹر کے بعد رک گئی۔ یہاں ایک خاصی بڑی چٹان تھی جسے چاروں طرف سے بلند درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ جیسے ہی میٹ نے انجن بند کیا، بریڈ نے پستول نکال لیا۔ میٹ گھبرا گیا۔

"یہ کیا... تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو۔ یاد رکھو میں نے یہ سب ایک جگہ لکھ کر رکھا ہے اور مجھے کچھ ہو گیا تو پولیس تمہیں گرفتار کر لے گی۔"

"میرا تمہیں قتل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں صرف اپنا اطمینان چاہتا ہوں، اب نیچے اترو۔"

وہ نیچے اتر آئے، میٹ کھدائی کے آلات ساتھ لایا تھا۔ اس نے آلات سنبھالے اور چٹان کے ایک طرف کچی زمین کھودنے لگا۔ بریڈ پستول لے کر اس کے سر پر موجود تھا۔ میٹ پریشان تھا اسے خوف تھا کہ کہیں وہ اسے گولی نہ مار دے۔ تقریباً چار فٹ کی کھدائی کے بعد بیلچہ ایک بوری سے ٹکرایا۔ میٹ نے اس کے آس پاس سے مٹی صاف کی اور پھر بوری کھینچ کر نکال لی۔ اس میں لاش دفنائی گئی تھی لیکن اب صرف ہڈیاں رہ گئی تھیں اس لیے وہ بہت ہلکی ہو رہی تھی۔ میٹ نے ہانپتے ہوئے بوری زمین پر پٹخ دی اور بولا۔ "اس میں ہے اصل بریڈ جیکسن کی لاش یا اس کی ہڈیاں۔"

"اسے کھولو۔" بریڈ نے حکم دیا تو میٹ نے بادل نا خواستہ بوری کھولی جس سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ وہ بوری کھولتے ہی جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ بریڈ نے ٹارچ کی روشنی بوری میں ڈالی، اس میں ٹوٹ پھوٹ جانے والا ڈھانچا موجود تھا۔

"اب میرے پچاس ہزار ڈالرز دو۔" میٹ نے مطالبہ کیا۔

"ضرور..... لیکن پہلے میں یہ معلوم کرنا چاہوں گا کہ اصل بریڈ جیکسن کی لاش یہاں کیسے آئی اور اس کی موت کیسے واقع ہوئی تھی؟"

میٹ بوکھلا گیا، اسے بلیک میل کرنے کے چکر میں وہ یہ بھول گیا تھا کہ اسے لاش کے بارے میں وضاحت کرنی پڑے گی۔ اس نے تھوک نگل کر کہا۔ "تمہیں اس سے کیا، تمہیں بریڈ جیکسن کی لاش درکار تھی۔ وہ میں نے دیدی اب تم جہاں چاہے اسے دفن کر دو اور مجھے پچاس ہزار ڈالرز دو۔"

"یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "پہلے میں جاننا چاہوں گا کہ اس کی موت کیسے واقع ہوئی تھی۔ دیکھو یہ راز ہم دونوں کا ہوگا اس لیے تمہیں بتا دینا چاہیے۔"

میٹ نے سوچا اور پھر سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے میں تمہیں بتا رہا ہوں۔ میرا بریڈ سے جھگڑا ہوا تھا اور لڑائی کے دوران اسے چوٹ لگ گئی اور وہ مر گیا۔ میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا لیکن میں کیا کر سکتا تھا اگر پولیس کو اطلاع دیتا تو میں ہی گرفتار ہو جاتا۔ اس لیے میں نے لاش خاموشی سے لا کر یہاں دفن کر دی اور مشہور یہ کر دیا کہ بریڈ جیکسن گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ کیونکہ میں اس کا سب سے قریبی دوست تھا اس لیے اس کے گرینڈ پا سمیت سب نے میری بات پر یقین کر لیا۔ اس دنیا میں صرف میں جانتا ہوں کہ بریڈ مر چکا ہے اس لیے جب تم بریڈ بن کر آئے تو میں پہلے دن سے جانتا تھا کہ تم دھوکے باز ہو لیکن میں انتظار کر رہا تھا کہ تم کیا کرتے ہو؟"

"تم اس لیے انتظار کر رہے تھے کہ تم شروع دن سے مجھے بلیک میل کرنا چاہتے تھے۔ پولیس کے حوالے کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، الٹا یہ سوال سامنے آتا کہ تم مجھے اتنے یقین سے جعلی بریڈ کیسے کہہ رہے ہو؟"

میٹ نے دانت نکالے۔ "ٹھیک کہا تم نے ہم دونوں ایک دوسرے پر انحصار کرنے پر مجبور ہیں۔ تم میرا راز رکھو اور میں تمہارا راز رکھوں گا۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔" بریڈ نے کہا اور بلند آواز سے بولا۔ "شیرف، تم آ سکتے ہو، تم نے میٹ کا اعتراف جرم تو سن لیا ہوگا۔"

جب چاروں طرف سے پولیس نے یلغار کی اور میٹ کو ہتھکڑیاں لگیں تو اس کی حالت غیر ہو گئی تھی، اس نے چلا کر کہا۔ "یہ شخص بھی مجرم ہے، یہ نقلی بریڈ جیکسن ہے اسے بھی گرفتار کرو۔"

لیکن مقامی شیرف اس سے ہاتھ ملا رہا تھا۔ "مسٹر فریڈ، ہم تمہارے شکر گزار ہیں تمہاری وجہ سے اتنے پرانے جرم کا سراغ ملا ہے اور اب مجرم کو سزا ملے گی۔"

میٹ آخری لمحے تک شور مچاتا رہا لیکن کسی نے اس کے شور پر توجہ نہیں دی تھی۔ اگلی صبح وہ گریم جیکسن کو ناشتا کرا رہا تھا کہ شرمین آ گئی۔ اس نے آتے ہی کہا۔ "یہ میں کیا سن رہی ہوں، کیا یہ سب سچ ہے؟"

"ہاں یہ سچ ہے۔"

"تم بریڈ جیکسن نہیں ہو؟"

"ہاں میں بریڈ جیکسن نہیں ہوں۔"

گریم جیکسن کے ہاتھ سے کافی کا مگ چھوٹ گیا، وہ کانپتی آواز میں بولا۔ "لیکن تم نے تو کہا تھا کہ تم میرے پوتے ہو؟"

"یہ درست ہے گرینڈ پا! میں فریڈ جیکسن ہوں۔ جب ماما اور پاپا الگ ہوئے تو مجھے ماما نے لے لیا تھا اور بریڈ آپ اور پاپا سے اٹیچ تھا اس لیے وہ یہاں رہ گیا۔ ماما مجھے لے کر ٹیکساس چلی گئی تھیں۔ مجھے یہاں کا نہیں پتا تھا لیکن اتفاق سے ایک دن ماما کے کاغذات میں یہاں کا پتا نکل آیا اور میں نے خط لکھا۔ بریڈ نے اس کا جواب دیا۔ اسے بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کا کوئی بھائی بھی ہے۔"

گریم جیکسن رو رہا تھا۔ "ہاں، میں نے اور تمہارے باپ نے اسے نہیں بتایا تھا۔"

"مجھے پا کر وہ بہت خوش تھا لیکن اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس کی صحبت ٹھیک نہیں تھی۔ اس کا دوست میٹ اسے اکساتا تھا کہ وہ اپنے دادا کی رقم چرائے اس کے بعد وہ دونوں شہر بھاگ جائیں گے مگر بریڈ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ برا سہی لیکن گرینڈ پا سے بہت محبت کرتا تھا۔ پھر اچانک اس کے خط آنا بند ہو گئے اور میں نے اسے جو خط لکھے وہ واپس آ گئے۔"

"بریڈ کے غائب ہونے کے صدمے سے میں بہت بیمار ہو گیا تھا اور کئی مہینے اسپتال میں داخل رہا تھا۔" گریم جیکسن نے کہا۔ "اس دوران میں مکان خالی پڑا رہا تھا۔"

"ان دنوں میں تعلیم حاصل کر رہا تھا، کالج میں داخلہ لیا تھا۔ گریجویشن کے بعد میں نے پولیس جوائن کر لی تھی۔ یہ چھ سال پہلے کی بات ہے۔ جب تک ماما زندہ رہیں میں کوشش کے باوجود یہاں نہیں آ سکا۔ پھر ایک سال پہلے ماما کا گردے کے مرض میں انتقال ہو گیا۔ تب میں یہاں آیا اور مجھے پتا چلا کہ میرے خاندان پر کیا گزری ہے۔ میں نے بریڈ کے بارے میں انکوائری کی۔ مجھے محسوس ہوا کہ بریڈ کی گم شدگی کے پیچھے کوئی جرم ہے۔ ورنہ وہ گھر سے بھاگتا تب بھی مجھ سے تو رابطہ کر سکتا تھا لیکن وہ سرے سے غائب ہو گیا تھا اس لیے میں نے بریڈ بن کر یہاں آنے کا فیصلہ کیا۔ ہم دونوں بھائیوں کی شکلیں بھی ملتی تھیں اس لیے کسی کو شک نہیں ہوا۔"

گریم جیکسن سمجھ گیا تھا کہ بریڈ کو کوئی حادثہ پیش آ گیا تھا، اس نے دل مضبوط کر کے پوچھا۔ "فریڈ، اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

فریڈ نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "سوری گرینڈ پا، بریڈ کو میٹ نے مار دیا تھا اور پھر اس کی لاش جنگل میں لے جا کر دفن کر دی تھی۔ پولیس نے اسے گرفتار کر لیا ہے اور بریڈ کی لاش بھی مل گئی ہے۔"

گریم جیکسن نے فریڈ کا ہاتھ تھاما اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

☆☆☆

ہاگ ٹاؤن کے قبرستان میں بریڈ جیکسن کی تدفین کے بعد وہ واپس آئے تو شرمین بھی ان کے ساتھ تھی۔ گریم جیکسن کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، اسے اس کے کمرے میں پہنچا کر فریڈ واپس نشست گاہ میں آیا تو شرمین نے اس سے پوچھا۔ "اب تمہارا کیا ارادہ ہے، تم واپس چلے جاؤ گے؟"

"نہیں، گرینڈ پا کو اس حالت میں چھوڑ کر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہیں مستقل دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔ میں انہیں ساتھ بھی نہیں لے جا سکتا۔ ایک تو وہ شہر کے عادی نہیں ہیں، دوسرے وہاں میں آٹھ سے بارہ گھنٹے گھر سے باہر رہوں گا تو ان کی دیکھ بھال کون کرے گا؟"

"تم یہیں فارم پر کام کرو گے، ویسے تمہارے انداز سے لگتا ہے کہ تم یہی کام کرتے آئے ہو؟"

"یہ درست ہے، ٹیکساس میں ہم جہاں تھے وہاں میں نے کالج تک ایک فارم میں کام کیا تھا اس لیے مجھے سب معلوم ہے۔"

"تمہاری ملازمت کا کیا ہوگا؟"

"میں استعفیٰ دے رہا ہوں۔"

شرمین خوش ہو گئی تھی۔ "یہاں رہ جانے کی بس یہی وجہ ہے؟"

فریڈ نے پُر خیال نظروں سے شرمین کی طرف دیکھا۔ "ہاں ایک وجہ اور بھی ہے لیکن کچھ بچوں کا مسئلہ ہے۔"

شرمین کا چہرہ سرخ ہو گیا، اس نے جھینپ کر کہا۔ "تم بچوں کی فکر مت کرو انہیں ہینڈل کیا جا سکتا ہے۔"

www.pdfbooksfree.pk

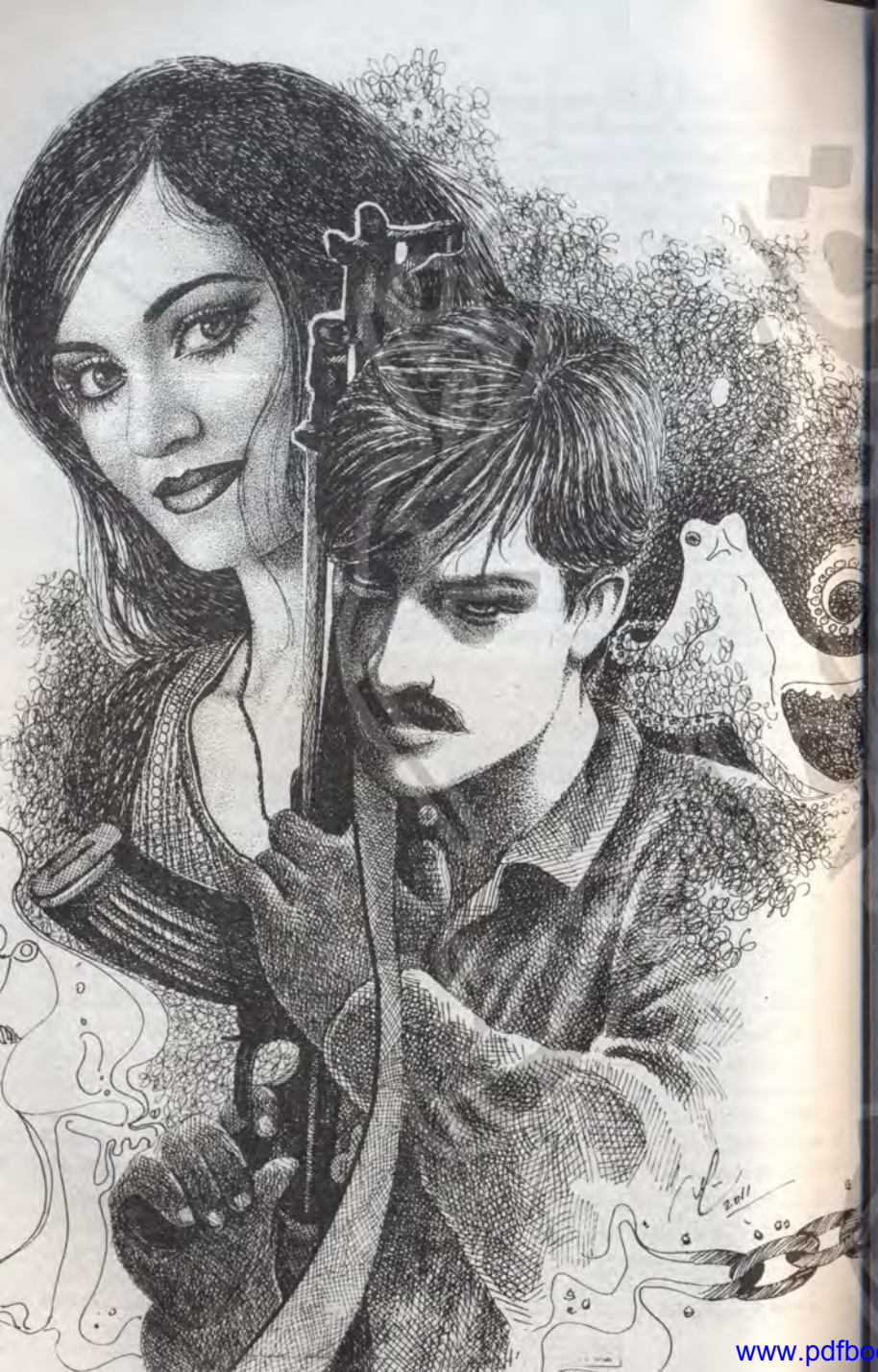

امراراور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد طویل سلسلہ

کشکول

انوار صدیقی

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج تھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش ربا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیراثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی پھوار اس کے دل میں گل وگلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ سازیوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

کشکول کی داستان لیاقت حسین کے گرد گھومتی ہے جس کا تعلق نوشہرہ کے شہر جہانگیرہ سے تھا، اس کے باپ سردار سرفراز خان نے اپنی پگ کبھی جھکنے نہیں دی تھی، شادی کے معاملے میں بھی اس نے لیاقت حسین کا رشتہ اس لڑکی سے کرنا چاہا جہاں اس نے زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین نے جو مذہبی تعلیم کے زیور سے آراستہ تھا۔ باپ کے سامنے زبان نہیں کھولی۔ اس نے فرحین نامی لڑکی کو زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین کی ماں کو بھی فرحین کا رکھ رکھاؤ پسند تھا چنانچہ لیاقت حسین نے ماں کی دعائیں لیں، فرحین سے شادی کے بعد شہر آ گیا جہاں اس نے اپنے دوست گل خان کی کچی بستی میں رہنا پسند کیا جو قدیم قبرستان سے متصل تھی۔ فرحین نے ایک رات قبرستان میں ایک سیاہ فام دراز قد شخص پرتاب بھوجن کو برہنہ حالت میں کوئی پراسرار عمل کرتے دیکھا تو وہ خوفزدہ ہو گئی۔ دوسرے دن لیاقت حسین کو فرحین کی نشاندہی والی قبر سے ایک نیبو ملا جس میں سفلی کے گندے عمل والی جان لیوا سوئیاں پیوست تھیں۔ لیاقت حسین نے گل خان کے منع کرنے کے باوجود خدا کا نام لے کر نیبو سے سوئیاں نکال کر پھینک دیں۔ گل خان لیاقت حسین کو ایک بزرگ کے پاس لے جاتا ہے لیکن وہاں تک ان کی رسائی نہیں ہوتی۔ گل خان واپسی کے لیے رکشا لینے جاتا ہے تو جب ایک نابینا شخص سے لیاقت حسین کی ملاقات ہوتی ہے۔ نابینا کے اصرار پر لیاقت حسین جب دوبارہ بزرگ کی چھولداری کی سمت جاتا ہے تو نہ کوئی ان دونوں کو دیکھتا ہے نہ روکتا ہے۔ نابینا خود چھولداری کے باہر رک کر لیاقت حسین کو اندر جانے کو کہتا ہے جہاں ایک بزرگ ہستی آنکھیں بند کیے استغراق میں محو تھی۔ بزرگ ہاتھ کے اشارے سے لیاقت حسین کو بلاتا ہے۔ ایک چٹکی خاک اٹھا کر لیاقت حسین کے منہ میں ڈال دیتا ہے۔ بعد میں نابینا لیاقت حسین کو سخت تاکید کرتا ہے کہ وہ خاک کی اس چٹکی کا ذکر بھی زبان پر نہ لائے یہ ہدایت دے کر نابینا نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ خاک کی وہ چٹکی خداوند کریم کا کرشمہ ثابت ہوتی ہے۔ لیاقت حسین کو ہر آنے والے خطرے کا احساس لاشعوری طور پر ہو جاتا ہے۔ اسی کیفیت میں وہ اس کا توڑ بھی تلاش کر لیتا ہے لیکن شعوری طور پر وہ بات اسے یاد نہیں رہتی۔ لیاقت حسین جس بستی میں رہتا تھا وہاں ایک دومنزلہ مکان میں آگ کے شعلے بھڑکتے ہیں تو کوئی اندر جانے کی ہمت نہیں کرتا جہاں ایک ضعیف عورت موجود تھی۔ اس کے قریبی عزیز دار بھی مایوسی کے عالم سے دوچار تھے جب لیاقت حسین اس موقع پر اللہ کا نام لے کر اندر جاتا ہے اور بوڑھی عورت کو زندہ وسلامت نکال لاتا ہے۔ اسی عورت کے بیٹے کے ذریعے لیاقت حسین کی رسائی سیٹھ عثمان تک ہوتی ہے جہاں اسے بطور ڈرائیور ملازمت رکھ لیا جاتا ہے۔ سیٹھ عثمان اور ان کی اہلیہ راحیلہ بیگم سلجھے ہوئے ہمدرد لوگ تھے۔ سیٹھ عثمان کاروباری شخص تھا۔ کاروباری میدان میں شیخ حامد بہ ظاہر سب کا دوست تھا لیکن وہ اندرونی طور پر مافیا کا مقامی سرغنہ اور انڈر ورلڈ کا ایک خطرناک فرد تھا جو پولیس کو مطلوب خطرناک مجرموں کی پشت پناہی کر کے ان کو اپنے اشاروں پر چلاتا تھا۔ شیخ حامد کا خاص آدمی "بلیک ٹائیگر" تھا۔ وہ بھی اسی پاس ورڈ پر ہر حکم کی تعمیل کرتا تھا لیکن براہ راست وہ بھی شیخ حامد کی اصلیت سے ناواقف تھا۔ شیخ حامد کے مخالفین میں سرفہرست میڈم روبی تھی جو اس سے اپنے شوہر خالد ریاض کی موت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے میڈم روبی نے بھی انڈر ورلڈ کی تنظیم سے تین خطرناک افراد ڈوما، لوچن اور سیام فام ہاشم کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ ان افراد کو سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے احکامات دیے جاتے تھے۔ افضل خان شیخ حامد کا ملازم اور خاص آدمی تھا جو ہر کام میں آگے آگے رہتا تھا۔ وہ اپنے دفتر کی ایک ساتھی شبنم کو پسند

www.pdfbooksfree.pk

کرتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ شبنم بھی اندرونی طور پر میڈم روبی سے گٹھ جوڑ کر چکی ہے۔ وہ بھی شیخ حامد سے اپنی مرحوم ماں کا قرض چکانے کی خاطر موقع کی تلاش میں تھی۔ شیخ حامد اپنے کارندوں کے ذریعہ میڈم روبی کو اغوا کرا کے اس کی مخرب اخلاق تصویریں حاصل کرنے کی پلاننگ کرتا ہے۔ لیاقت حسین کی بیوی فرحین کو بھی اغوا کراتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوتیں ہر موقع پر اس کے آڑے آجاتی ہیں۔ ان ہی ریشہ دوانیوں میں افضل خان بھی زیرعتاب آجاتا ہے۔ شبنم اسے شیخ حامد کے اشارے پر اپنے فلیٹ پر لے آتی ہے۔ بعد میں وہ شبنم کے کہنے پر ایک اور بڑے تاجر رستم علی آغا خانی اور اس کی بیوی کی قابل اعتراض تصاویر ریوالور کی نوک پر حاصل کرلیتا ہے۔ ایماندار آئی جی علیم احمد کے ریٹائر ہونے کے بعد اس کی جگہ آغا منظور احمد نیا آئی جی مقرر ہوتا ہے۔ وہ بھی شیخ حامد کے اوپر تک تعلقات ہونے کے سبب اس کا راستہ کاٹنے کی حماقت نہیں کرتا۔ ایک ڈی ایس پی سراج سے جو شیخ حامد کو خوش فہمی کا شکار ہونے کا موقع دینے کی خاطر کچھ رقم اس کے اصرار پر لے لیتا ہے لیکن اسے فوراً ہی آئی جی علیم احمد کے حوالے کردیتا ہے۔ سراج ایماندار اور فرض شناس آفیسر ہے۔ ایک نئے ایس پی اورنگ زیب کے آجانے کے بعد اس کے ہاتھ اور مضبوط ہوجاتے ہیں۔ چونکہ اورنگ زیب کے بھی کچھ تعلقات مرکز سے تھے اس لیے وہ کسی کے دباؤ میں نہیں آتا۔ اسی بنا پر اس کی اور شیخ حامد کی ٹھن جاتی ہے۔ اسی دوران شیخ حامد کی بیوی صبا بیگم جو شوہر کی عیاشیوں سے تنگ آچکی تھی خودکشی کرلیتی ہے۔ وہ شیخ حامد کے بارے میں بہت ساری اہم باتوں کو تحریری شکل دے کر سراج کو آخری بار فون کرتی ہے تاکہ وہ اس کی تحریر کو لے جائے۔ سراج وہ تحریر حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے لیکن شیخ حامد کو مرنے والی کے موبائل سے اس بات کا علم ہوجاتا ہے کہ اس نے مرنے سے پیشتر آخری کال سراج کو کی تھی۔ سراج کو قابو کرنے کی خاطر وہ اس کی بیوی الماس کو اغوا کرالیتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوت بروقت سراج ہی کے ذریعے الماس کو رسوائی سے بچالیتی ہے۔ ایس پی اورنگ زیب صبا بیگم کی خودکشی کی تفتیش شروع کرتا ہے۔ انسپکٹر دانش جس کے پاس صبا بیگم کی اہم فائل تھی وہ سراج کو بھی اس سے آگاہ کردیتا ہے۔ مگر شیخ حامد کو اس کی اطلاع اپنے زرخرید ڈی ایس پی لودھی سے ملتی ہے۔ وہ اس پورے تھانے کو دانش سمیت آگ لگوادیتا ہے۔ لودھی معمولی زخمی ہونے کے باوجود اسپتال میں داخل ہوجاتا ہے۔ سیٹھ عثمان حالات سے دور اور محفوظ رہنے کی خاطر اپنی رہائش کے قریب دوسری کوٹھی خرید کر اپنا ہیڈ آفس بنالیتا ہے۔ اسی کوٹھی کی انیکسی میں لیاقت حسین اور فرحین بھی رہائش اختیار کرتے ہیں۔ شیخ حامد ایک موقع پر لیاقت حسین کو بھی اغوا کرالیتا ہے۔ اس موقع پر لیاقت حسین کا ہم شکل (ہمزاد) لیاقت حسین کو نکل جانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ پرتاب بھوشن جو سفلی کا ماہر تھا، اپنے نیبو والے عمل کی ناکامی کے بعد لیاقت حسین کو مار ڈالنے کی خاطر برابر اپنی شیطانی قوتوں سے کام لیتا ہے مگر رحمانی قوتیں اسے کامیاب نہیں ہونے دیتیں پھر بھی وہ باز آنے کو تیار نہیں ہوتا۔ دریں اثنا میڈم روبی سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے سیاہ فام ہاشم اور جہانگیر بٹ عرف جگا کو شیخ حامد کی رہائش گاہ پر حملہ کرنے کا حکم دیتی ہے جس سے شیخ حامد اور چراغ پا ہوجاتا ہے۔ اسی دوران وہ اپنی ذاتی سیکریٹری کنول سے شادی کرکے اس کو پوش علاقے کے ایک بنگلے میں رکھتا ہے۔ بعد میں شیخ حامد کو پے در پے دو جھٹکے لگتے ہیں۔ ایک طرف ایس پی اورنگ زیب تھانے میں آگ لگنے کی واردات میں ملوث پاکر لودھی کو معطل کرادیتا ہے۔ دوسری جانب میڈم روبی کے ایجنٹ ہاشم اور ڈوما شیخ حامد کے اہم ترین آدمی "بلیک ٹائیگر" کو گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ سراج جو لیاقت حسین کی ماورائی قوتوں کا بذات خود تماشا دیکھ چکا تھا، کچھ دنوں کے لیے سیٹھ عثمان (جو سراج کا کلاس فیلو بھی رہ چکا تھا) سے اس کی خدمات حاصل کرلیتا ہے، اب اورنگ زیب، سراج اور لیاقت حسین مل جل کر شیخ حامد کو گھیرنے کی پلاننگ کرتے ہیں۔ دوسری جانب جہانگیر بٹ عرف جگا اپنے سابق پڑوسی اور پولیس کے ریٹائرڈ ہیڈ کانسٹیبل امداد علی سے ملاقات کرتا ہے جس نے جگا کو کسی جرم کی سزا بھگتنے کے بعد غلط راستہ اختیار کرنے کے بجائے فرنیچر کا کاروبار کرنے کی خاطر رقم فراہم کی تھی۔ سیاہ فام ہاشم کو سیون اسٹار کی جانب سے بگ باس کو ختم کرنے کی اجازت مل جاتی ہے لیکن ایک غلطی کی وجہ سے اسے خودکشی کرنی پڑتی ہے۔ اسی دوران رستم علی آغا خانی کو فون پر دھمکی ملتی ہے جسے اس کا لڑکا دارا سن لیتا ہے۔ دارا اپنے دوست سابق میجر عاطف کو حالات سے باخبر کردیتا ہے۔ اورنگ زیب اور سراج اسپتال سے ملازمہ گلابو کی خودکشی کی تفتیش کرکے واپس لوٹ رہے تھے جب لیاقت حسین اچانک گاڑی کا رخ پھیر دیتا ہے۔ وہ ایسا نہ کرتا تو سب موت کے منہ میں چلے جاتے۔ لیاقت حسین کی بروقت کارروائی سے کسی قسم کا جانی نقصان نہیں ہوا البتہ سراج معمولی زخمی ہوا۔ دوسری جانب شیخ حامد کی کنول سے شادی کی سہاگ رات کی ساری کارروائی مووی کیمرے کے ذریعے محفوظ کرلی گئی تھی۔ لیاقت حسین فرحین کے رشتے دار کی موت کی خبر سن کر اسے گاؤں بھیج دیتا ہے۔ دوسری جانب جگا اور اپنے سرپرست امداد علی کے پاس پہنچ کر اسے صورت حال سے آگاہ کرتا ہے امداد علی اسے فی الحال صبر کی تلقین کرتا ہے۔ شبنم اور افضل خان کے فلیٹ سے شبنم کو اغوا کرلیا جاتا ہے۔ شیخ حامد کی کوٹھی پر حملہ ہوتا ہے جس پر وہ چراغ پا ہوتا ہے اور پولیس کے سربراہ کو سخت سست سناتا ہے اورنگزیب ملزمان کو گرفتار کرکے سخت پوچھ گچھ کرتا ہے جس کے نتیجے میں کئی انکشافات سامنے آتے ہیں خاص طور پر یہ کہ وہ جگا کا آدمی ہے اور اس نے یہ کارروائی کسی بیوہ کے کہنے پر کی تھی۔ جبکہ سراج کی بیوی الماس کے اغوا کی کوشش ناکام بنانے کی کوشش میں پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کرلیتی ہے اور اس پر تشدد کیا جاتا ہے۔ ایس پی اورنگزیب اینڈ کمپنی شیخ حامد کے خلاف گھیرا تنگ کرتی ہے، شبنم کے اغوا کا ڈراما بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا، اورنگزیب نے شبنم سے مل کر اسے اعتماد میں لیا اور وہ ان کا ساتھ دینے پر راضی ہوگئی۔ دوسری جانب شیخ حامد کے ایجنٹ نے اسے الماس کے اغوا میں لیاقت حسین کے سبب ناکامی کی اطلاع دی اور بتایا کہ پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کرکے لے گئی ہے جہاں ایس پی اورنگزیب نے اس کارروائی کو ڈکیتی کی واردات کا رنگ دے کر رپورٹ بنائی ہے۔ گاؤں سے فرحین نے فون پر اطلاع دی کہ شاہ پری کے ذریعے اسے معلوم ہوا ہے کہ لیاقت کے باپ کی کسی سیٹھ سے کاروباری بدمزگی ہوئی ہے، لیاقت حسین جان گیا کہ سیٹھ عثمان سے ہی معاملہ ہوا ہے لہٰذا اس نے ان سے مل کر اپنی اصلیت ظاہر کرتے ہوئے گلے شکوے دور کرادیے۔ واپسی پر لیاقت پر قاتلانہ حملے کی ناکامی پر بچ جانے والے زخمی حملہ آور کو اپنی تحویل میں لے کر تمام کارروائی پر اپنے قابل اعتماد افسر کو ہدایت دیں حملہ آور سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق بلیک ٹائیگر کے بعد نمبر ٹو کے کوڈ سے کام کرنے والے۔ ایجنٹ کی بنیادی حیثیت تھی جو انڈر ورلڈ میں اسلم ڈنکا کے نام سے جانا جاتا تھا۔ شیخ حامد کے رہائشی گاہ پر لوچن اور ڈوما نے حملہ کرکے اسے تباہ کردیا تھا۔ اسی حملے کے دوران ڈوما مارا گیا جبکہ لوچن کو ایس پی اورنگزیب نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس کے تین اہم بندوں کی لاشیں بھی طابوت میں بند اس کی حویلی کے سامنے ڈال دی گئی تھیں اور کنول نے فون کرکے کسی اجنبی کی دھمکی آمیز کال کی اطلاع دی تھی۔ شیخ حامد سخت طیش کے عالم میں ڈی آئی جی آغا منظور سے جواب طلبی کرتا ہے اور ایس پی اورنگزیب کے رویے کی شکایت مرکزی وزیر داخلہ سے کرتا ہے اس پر اورنگزیب معذرت کرکے اسے کچھ دن کی مہلت طلب کرتا ہے اور ناکامی کی صورت میں شیخ حامد کو فیصلے کا اختیار دیتا ہے۔ دوسری جانب لیاقت حسین کو سیٹھ عثمان اپنے آفس کا سپروائزر بنا کر اس کی تنخواہ میں اضافہ کردیتا ہے لیاقت اپنی خوشی میں فرحین کو یاد کرتا ہے، اور اسی دوران پلید پرتاب بھوشن اپنے عمل کے ذریعے پجارن مدھو کو فرحین کے روپ میں لیاقت حسین کے پاس بھیجتا ہے لیکن یہاں بھی غیبی طاقت

اسے بچالیتی ہے۔ جبکہ ثریا کے مشورے پر میڈم آغا منظور کے دل میں اپنے متعلق جذبات کے تحت اس سے ملاقات کا اہتمام کرتی ہے۔ یہ ملاقات ان دونوں کے مابین رشتے کو آمادگی پر منتج ہوئی۔ لیاقت حسین اپنے باپ سے معافی کا خواست گار ہوا اور اس کے باپ نے اسے معاف کردیا۔ دوسری جانب افضل خان غیر معمولی حالات میں دوسری جگہ منتقل کردیا جاتا ہے اور اورنگزیب اس کی پاداش میں شبنم پر الزام لگا کر اسے بگ باس کے حوالے کرنے کا عندیہ دیتا ہے جو کہ اس کی ایک چال بھی ہوسکتی ہے۔ افضل خان اور شبنم دوبارہ بگ باس کی تحویل میں چلے گئے۔ افضل خان، اسلم ڈنکا کی زیرنگرانی بگ باس کے احکامات کا پابند تھا یہاں اس سے جگا کو اس کے سرپرست امداد علی کے ذریعے پھانسنے کا کام لیا گیا۔ کیونکہ جگا کے نام سے بگ باس کو چند تصویریں موصول ہوئی تھیں جن میں اس کے کنول کے ساتھ سہاگ رات کے مناظر واضح تھے۔ دوسری جانب لوچن کی ملاقات زخمی قیدی سے کرائی گئی جہاں اس نے اسے دیال سنگھ عرف وشنو کے طور پر شناخت کرلیا۔ لیاقت حسین گاؤں سے فرحین کو واپس لے آیا، اس کی ماں نے اسے حفاظت کے لیے ایک تعویز دیا جبکہ میڈم روبی شیخ حامد کے انجام میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے بے چین تھی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ایس پی اورنگ زیب خلافِ توقع بہت اچھے موڈ میں نظر آرہا تھا۔

شام کی چائے اس نے سراج اور الماس کے ساتھ ہی پی تھی پھر وہ سب ڈرائنگ روم میں آگئے جہاں گپ شپ جاری رہی۔ گفتگو کے دوران مختلف ٹیلی فون بھی آتے رہے، باتوں کا سلسلہ بھی جاری رہا، ساڑھے آٹھ بجے اورنگ زیب نے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو الماس نے کہا۔

"اب کھانے کا وقت ہوگیا تو ہمارے ساتھ ہی دال روٹی کھالیں۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا لیکن جب سراج نے تکلفاً بھی اظہار نہیں کیا تو میں نے سوچا کہ کسی ہوٹل میں جا کر کھالوں۔"

"میں آپ کی اس شکایت کا برا نہیں مانوں گا اس لیے کہ یہ شعبہ الماس کا ہے۔" سراج نے مسکرا کر کہا۔ "میں روک لیتا اور آپ کے جانے کے بعد الماس برا مناتیں تو اپنا گزارا بھی......"

"پلیز سراج۔" الماس نے شوہر کو تیز نظروں سے گھورا۔ "بھائی اورنگ زیب کے لیے اس قسم کی کوئی بات کبھی مذاق میں بھی نہ کہیے گا۔"

"یہ مذاق میں نہیں سنجیدگی سے مجھے ٹالنا چاہتا تھا۔" اورنگ زیب نے الماس کو اکسانے کی کوشش کی تو سراج نے الماس کو گھور کر اٹھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے...... پھر، آپ دونوں گھر میں ڈنر سے شوق فرمائیں۔ میں کسی بھٹیار خانے سے پیٹ بھر کر آجاتا ہوں۔"

اورنگ زیب نے سراج کا ہاتھ تھام کر دوبارہ اپنے قریب بٹھالیا۔ رات کا کھانا بھی سب نے ایک ساتھ کھایا پھر اورنگ زیب نے الماس سے فرمائش کی۔ "آپ اگر میرے لیے بلیک کافی بنادیں تو مہربانی ہوگی۔"

"کیا رات بھی یہیں گزارنے کا ارادہ ہے؟" اس بار سراج نے اورنگ زیب کو ہاتھ سے اشارہ کرکے الماس کو چھیڑنے کی کوشش کی لیکن وہ مسکراتی ہوئی اٹھ کر کافی بنانے چلی گئی تو سراج نے سنجیدگی سے اورنگ زیب سے کہا۔ "اگر میرا خیال غلط نہیں ہے تو آج آپ نے کسی خاص مشن کی تیاری پہلے سے طے کر رکھی ہے؟"

"میں تمہاری ذہانت کی تعریف پہلے بھی کرچکا ہوں۔" اورنگ زیب نے دستی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ "ساڑھے دس بجے ایک ضروری کال آنے کے بعد تم بھی اس مشن میں میرے ساتھ شریک ہوگے اور پھر...... ہوسکتا ہے کہ آج کی رات ہمیں ایک منٹ کے لیے بھی آرام کا موقع نہ ملے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ کافی پینے کے بعد میں بھی کیل کانٹے سے لیس ہوجاؤں۔"

اورنگ زیب نے اثبات میں گردن کو جنبش دی، الماس کافی لے آئی تو پھر ان کے درمیان اِدھر اُدھر کی باتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا، الماس اور اورنگ زیب ایک ہی صوفے پر بیٹھے تھے۔ سراج دوسرے پر تھا۔ گفتگو کے دوران بھی وہ اورنگ زیب کی مشن والی بات کے سلسلے میں مختلف پہلوؤں پر غور کررہا تھا جب اورنگ زیب نے پہلی بار سنجیدگی سے الماس سے کہا تھا۔

"الماس...... کیا میں امید رکھوں کہ تم میرے لیے ہمیشہ کامیابی کی دعائیں کرتی رہوگی......؟"

"اس وقت آپ کو اچانک اس حوالے کی ضرورت کیسے پیش آگئی؟"

"ہوسکتا ہے آج کی رات میرے اور سراج دونوں کے لیے زندگی کا ایک موڑ ثابت ہو۔ میں اور سراج ساڑھے دس بجے کے بعد ایک بہت ہی خاص اور اہم مشن پر روانہ ہوں گے۔ نہیں، تم سراج کو مشکوک نظروں سے نہ دیکھو، ابھی تک سراج کو بھی اس بات کا علم نہیں ہے کہ میں نے شام سے تمہارے گھر کیوں ڈیرا جما رکھا ہے۔"

www.pdfbooksfree.pk

''کیا آکٹوپس کے سلسلے میں کوئی مہم درپیش ہے......؟'' الماس نے سنبھل کر پوچھا۔

''ہاں...... لیکن آج کی رات ہمارے لیے پہلی سیڑھی ہوگی۔ کامیابی کی صورت میں ہمارا جال آکٹوپس کے گرد اور مضبوط ہوجائے گا۔''

''خدا آپ دونوں کو اس خون آشام درندے کے خلاف کامیابی نصیب کرے جس نے نہ جانے کتنے شریف لوگوں کی زندگی کا سکون غارت کر رکھا ہے۔''

''پروگرام کیا ہے......؟'' سراج نے پہلو بدل کر دریافت کیا۔

''تم تیاری کر کے آجاؤ۔ قبل از وقت کچھ کہنا مناسب نہیں ہوگا۔''

سراج تیزی سے اٹھ کر اپنی خواب گاہ میں چلا گیا، اس کی واپسی میں بہ مشکل پندرہ منٹ لگے تھے، اورنگ زیب اور الماس باتوں میں مصروف تھے جب ساڑھے دس بجے اورنگ زیب کے مخصوص موبائل پر سگنل موصول ہوا۔ اس نے نمبر دیکھتے ہوئے موبائل آن کر کے کان سے لگاتے ہوئے سوال کیا۔

''کیا اطلاع ہے......؟''

''میں نے جگا کو پورے پروگرام سے مطلع کر دیا ہے، وہ آپ کے حکم پر جان بھی دینے کو آمادہ ہے۔''

''دوسرے فریق کو بھی صورت حال سے آگاہ کر دیا ہے یا نہیں؟'' اورنگ زیب نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''مزاحمت ضرور کی جائے لیکن اس حد تک بھی نہیں کہ کچھ زندگیاں بلاوجہ کام آجائیں۔''

''بات اس کی سمجھ میں مشکل سے آئی ہے لیکن اس نے بھی آمادگی ظاہر کر دی ہے......! قربانی کے بکرے کے بارے میں گھر کے بھیدی کو وقت کا کوئی اندازہ نہیں ہے ویسے امکانات یہی ہیں کہ وہ آج ہی سرخرو ہونے کی کوشش کرے گا۔''

''او۔ کے! میں تم سے دوبارہ خود رابطہ کروں گا لیکن ون منٹ...... ایمرجنسی کی صورت میں تم بھی مجھے کال کر سکتے ہو...... ٹھیک ہے، وش یو گڈ لک......''

اورنگ زیب نے موبائل آف کر کے سراج کو اٹھنے کا اشارہ کیا پھر الماس سے بڑی اپنایت سے بولا۔

''آج کی مہم میں قبل از وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن تم سراج کی طرف سے پریشان نہ ہونا...... سراج کی زندگی مجھے اپنے سے زیادہ عزیز ہے اور...... ہمیشہ رہے گی۔''

''میں آپ دونوں کے حق میں کامیابی کی دعا کروں گی۔'' الماس نے سراج کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''خدا آپ دونوں کو اس موذی کے خلاف کامیابیاں نصیب کرے۔''

اورنگ زیب اور سراج باہر آکر گاڑی میں بیٹھ گئے، الماس ان کو رخصت کرنے باہر تک آئی تھی۔ گاڑی رہائش گاہ کے احاطے سے باہر نکل کر کھلی سڑک پر آئی تو سراج نے پوچھا۔

''کیا اس اہم مہم میں ہمارے علاوہ ہمارے محکمے کے اور بھی لوگ شامل ہوں گے؟''

''نہیں...... مگر میری درخواست پر کچھ محکموں کے اعلیٰ افسروں کی طرف سے مخصوص ہدایت مل چکی ہے۔'' اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں نے جو پروگرام مرتب کیا ہے اس میں پولیس محکمے کا ہم دونوں کے علاوہ کوئی اور فرد شریک نہیں ہوگا۔''

''لیکن بعد میں تو......''

''اس کی فکر مت کرو...... میں نے موجودہ معاملات میں اپنے مخصوص ذرائع سے وزیراعظم تک کو بریفنگ کرا دی ہے۔''

''آئی۔ سی۔'' سراج نے کسمسا کر کہا پھر دبی زبان میں پوچھا۔ ''اس وقت ہم کہاں چل رہے ہیں؟''

''تم نے امداد علی کے بارے میں ضرور سن رکھا ہوگا۔'' اورنگ زیب نے عقبی آئینے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''کچھ لوگ اسے اغوا کرنے کی کوشش کریں گے۔ اگر وہ کامیاب ہوگئے تو پھر آج وہ امداد علی کے ذریعے جگا کے ٹھکانے پر حملہ کر کے اسے بھی یرغمال بنانے سے دریغ نہیں کریں گے۔ امداد علی کے انکار کی صورت میں اسے زندگی سے بھی محروم کیا جا سکتا ہے۔''

''یہ سب شیخ حامد کے اشارے پر ہوگا؟'' سراج نے چونک کر سوال کیا۔

''یو آر رائٹ لیکن فکر مت کرو......'' اورنگ زیب نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں نے جو جال بنا ہے وہ آکٹوپس کی توقع کے خلاف ہی ثابت ہوگا۔ کامیابی کی صورت میں تمہیں تمہارے بہت سارے سوالات کا جواب بھی مل جائے گا۔ خاص طور پر ان باتوں کا جو میرے علم میں تھیں لیکن میں نے مصلحتاً تمہیں بھی قبل از وقت نہیں بتائیں۔''

سراج نے کوئی شکوہ نہیں کیا لیکن ابھی تک یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آسکی تھی کہ وہ کس مہم پر جا رہے ہیں۔ فوری

طور پر اس نے کوئی دوسرا سوال نہیں کیا اور ذاتی طور پر ذہنی جمناسٹک کرنے میں مصروف رہا...... وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا، اورنگ زیب کسی تعاقب کا بہ غور جائزہ لیتا ہوا شہر کے مختلف راستوں پر گاڑی دوڑا رہا تھا جب گیارہ بج کر پینتالیس منٹ پر اس کو دوسری کال موصول ہوئی، اس بار اس نے موبائل آن کرنے کے ساتھ ہی اس کا اسپیکر بھی آن کر دیا تھا۔ سراج پوری طرح متوجہ ہوگیا۔

''کیا خبر ہے......؟''

''امداد علی نے تھوڑی سی مزاحمت کے بعد قربانی کے بکرے کی برتری تسلیم کر لی ہے۔ دو افراد معمولی زخمی ہوئے ہیں۔'' دوسری جانب سے ایک مانوس آواز ابھری جسے سراج پہلے بھی ایک دو موقعوں پر سن چکا تھا۔

''اب ان کا رخ کدھر ہے......؟'' اورنگ زیب نے سوال کیا۔

''میرا خیال ہے کہ اب امداد علی کے ذریعے جگا کو باہر آکر ملاقات کرنے پر رضامند کیا جائے گا۔''

''کیا جگا آسانی سے امداد کی بات مان لے گا......؟''

''میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا...... ہوسکتا ہے کہ امداد علی نے پہلے سے جگا کو بھی چوکنا کر دیا ہو...... ایسی صورت میں وہ اپنی کچھار سے تنہا باہر نکلنے کی غلطی بھی نہیں کرے گا۔ اس کے کچھ جانباز دور رہ کر کسی صورت حال سے نمٹنے کے لیے بھی تیار ہوں گے۔''

''ون منٹ...... کیا قربانی کا بکرا تنہا اس مہم کو سر کر رہا ہے......؟'' اورنگ زیب نے سرسراتے لہجے میں سوال کیا۔

''بہ ظاہر ایسا ہی لگتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ لوگ اس کی لاعلمی میں اس کا تعاقب بھی کر رہے ہوں۔ ہمارے دشمن نے کئی محاذ خفیہ طور پر بنا رکھے ہوں گے۔ قربانی کا بکرا ناکامی کی صورت میں جہنم رسید بھی کیا جا سکتا ہے۔''

''میں سمجھ رہا ہوں...... تم ان کی صحیح لوکیشن بتاؤ......''

جواب میں دوسری جانب سے لائن منقطع کر دی گئی۔ اورنگ زیب اور سراج دونوں ہی چونکے تھے لیکن انہیں زیادہ دیر پریشان نہیں ہونا پڑا۔ پانچ منٹ بعد موبائل پر دوبارہ سگنل ملا تو اورنگ زیب نے محتاط لہجے میں سوال کیا۔

''تم نے لائن کیوں کاٹ دی تھی؟''

''درست صورت حال معلوم کرنے کی خاطر میں نے استاد سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے مجھے یقین دلایا ہے کہ آپ کی خاطر وہ جان کی بازی لگانے پر بھی آمادہ ہے۔ وہ دس منٹ بعد تنہا ایک خیراتی ادارے کی ایمبولینس میں نکل کر ساحلی علاقے کی طرف جائے گا۔ امداد علی سے اس نے اسپاٹ نمبر فائیو پر ملنے کو کہا ہے۔''

''اسپاٹ کی وضاحت کرو۔''

''بلیک سی اسنیک بار......''

''فائن......'' اورنگ زیب نے موبائل آن کر کے گاڑی کا رخ تبدیل کیا پھر ایک منٹ بعد ہی وہ مخبر کی اطلاع کو اپنے مخصوص لوگوں...... کو منتقل کرتے ہوئے ضروری ہدایت دے رہا تھا۔ ''جب تک میری جانب سے کوئی خاص سگنل نہ ملے کسی ایکشن کی غلطی نہ کی جائے۔ ایمرجنسی کی صورت میں کوئی بھی قدم اٹھایا جائے لیکن اس بات کا خیال رہے کہ ان تینوں میں سے کوئی مرنے نہ پائے۔''

کال ختم ہوئی تو سراج نے دبی زبان میں کہا۔ ''امداد علی اور جگا کا علم مجھے ہو چکا ہے۔ کیا آپ قربانی کے بکرے کو بھی ڈی کوڈ کرنا مناسب سمجھیں گے؟''

''افضل خان......''

''نہیں......'' سراج نے حیرت سے پوچھا۔ ''آپ اس قدر یقین سے کس طرح کہہ رہے ہیں؟''

''اس لیے کہ وہ ہوٹل سے مقابلے کے بعد فرار ہو کر یا اغوا کر کے جہاں بھی گیا یا لے جایا گیا میری نظروں سے زیادہ دور نہیں تھا۔''

''اوہ...... اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ پھر......''

سراج کا جملہ مکمل نہ ہوسکا۔ اورنگ زیب کی گاڑی جو اس وقت ساحلی علاقے پر واقع بلیک سی اسنیک بار سے بہ مشکل دو فرلانگ کے فاصلے پر تھی اچانک سڑک پر نشے میں دھت کسی شرابی کی طرح توازن کھو کر لہرانے لگی، اس کا سبب وہ دھماکا تھا جو پچھلا ایک ٹائر برسٹ ہونے کے بعد ہوا تھا، اورنگ زیب نے اسٹیئرنگ کنٹرول کرتے ہوئے بریک پر دباؤ ڈال کر سراج کو چھلانگ لگانے کی ہدایت کی پھر وہ بھی دروازہ کھول کر دوسری طرف قلابازی کھاتا ہوا سنبھل گیا، دونوں نے اپنے اپنے سرکاری پستول نکال لیے لیکن فائرنگ کرنے والے اپنا کام کر کے نکل چکے تھے۔ دور دور تک پچھلے راستے پر کوئی گاڑی یا مشتبہ افراد نظر نہیں آئے۔ البتہ سراج بڑی برق رفتاری سے کرولنگ کرتا ہوا، اس کے قریب آچکا تھا۔

''آپ خیریت سے تو ہیں؟''

''ہاں لیکن وہ باسٹرڈ اپنا کام کر کے نکل گئے جنہوں نے بڑی مہارت سے کسی خاموش رائفل سے میری گاڑی کے ایک نئے ٹائر کا ستیاناس کر دیا۔'' اپنا جملہ مکمل کرتے

www.pdfbooksfree.pk

ہوئے اس نے تیزی سے موبائل پر کسی کے نمبر پنچ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس سے پیشتر ہی ایک سگنل ملا تو اس نے نمبر دیکھ کر کال ریسیو کر لی۔

"آپ اس وقت کہاں ہیں؟" اورنگ زیب نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"اپنے قریب ہی سمجھیں۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہم نے آپ کی گاڑی پر حملہ کرنے والوں کو روکنے کی کوشش کی تھی لیکن انہوں نے اندھا دھند فائر کھول دیا۔ جواب فوری دیا گیا تو وہ جو تعداد میں دو تھے ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے، میں نے ان کی لاش روانہ کر دی ہے لیکن حادثے کی اطلاع کسی کو نہیں دی۔"

"اچھا کیا....." اورنگ زیب نے کہا۔ "آپ کیا میرے لیے کچھ کریں گے....."

"ایک منٹ انتظار کریں..... ہماری ایک بلیک وین آپ تک پہنچ جائے گی۔" دوسری سمت سے لائن منقطع کر دی گئی۔ ایک منٹ بعد بلیک وین بھی نظر آ گئی۔ اورنگ زیب نے وین ڈرائیو کرنے والے کو پچھلی نشست پر بھیج کر بڑی سرعت سے اسٹیئرنگ سیٹ سنبھال لی، سراج نے بھی دوسری جانب سے بیٹھنے میں پھرتی کا مظاہرہ کیا۔

اس وقت ساحلی علاقہ تقریباً سنسان ہی تھا، دس بجے کے بعد چونکہ تمام کاروبار بند کر دینے کا حکم نافذ تھا اس لیے خاصے فاصلوں پر ایک دو گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ مطلوبہ اسنیک بار کے باہر بھی کوئی گاڑی موجود نہیں تھی، اورنگ زیب نے وین تقریباً چالیس فٹ دور لے جا کر روکی پھر سراج کے ساتھ نیچے اتر آیا، ان کی نظریں اس وقت مطلوبہ اسنیک بار پر مرکوز تھیں۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ جن لوگوں نے ہمارا راستہ کھوٹا کرنے کی کوشش کی ہے، ان کے دوسرے ساتھیوں نے افضل خان اور ہمارے دوسرے مطلوبہ آدمی کو بھی درمیان ہی سے اٹھا لیا ہو.....؟"

"نہیں..... ایسا ہوتا گا تو کمانڈوز اب تک مجھے اطلاع کر چکے ہوتے۔" اورنگ زیب نے بڑے یقین سے کہا اور اس کا ثبوت بھی اس وقت دور سے آنے والی کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس سے مل گیا جو مطلوبہ اسنیک بار ہی کی طرف آ رہی تھی۔ اورنگ زیب اور سراج نے وین کی آڑ لے کر ایسی پوزیشن سنبھال لی جہاں سے وہ آنے والی گاڑی پر نظر رکھ سکتے تھے۔ ان کی توقع کے عین مطابق وہ گاڑی جو گرے کلر کی ایک ہائی روف تھی، اسنیک بار کے قریب آ کر رک گئی۔ ہیڈ لائٹس بھی بجھا دی گئیں لیکن باہر کوئی نہیں نکلا۔

"جلد بازی میں کوئی قدم مت اٹھانا۔" اورنگ زیب نے پستول کے دستے پر اپنی گرفت جماتے ہوئے کہا۔ "خیراتی ادارے کی ایمبولینس آنے کے بعد ہی اصل صورت حال واضح ہو گی۔"

"آپ کے ملٹری کمانڈوز اس وقت کہاں ہوں گے؟"

"زیادہ دور نہیں ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دو نے پہلے ہی سے کہیں پوزیشن بھی سنبھال رکھی ہو۔"

تین چار منٹ اور گزر گئے۔ گرے کلر کی ہائی روف سے کوئی باہر نہیں نکلا پھر سراج اور اورنگ زیب کو وہ خیراتی ادارے کی ایمبولینس بھی نظر آ گئی جو تیزی سے فاصلہ طے کرتی ہوئی ہائی روف کے قریب آ کر رکی تھی، اس کے رکتے ہی ڈرائیو کرنے والا نکل کر باہر آ گیا، دوسرے ہی پل ہائی روف سے بھی ایک شخص نیچے اترا۔ دونوں آپس میں بغل گیر ہوئے، ان کی گرم جوشی کا اظہار ابھی جاری تھا کہ ہائی روف سے ایک تیسرا شخص اترا جس نے ہاتھ میں کوئی آتشیں اسلحہ پکڑ رکھا تھا۔ اس نے دونوں بغل گیر دوستوں کو مخاطب کر کے سرسراتے لہجے میں ایک کو للکارتے ہوئے بڑے فاتحانہ انداز میں کہا تھا۔

"جگا..... تم جتنی آسانی سے اپنے بل سے نکل کر باہر آ گئے ہو، اب اتنی آسانی سے واپس نہیں جا سکو گے۔"

بغل گیر ہونے والے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے پھر جگا نے حیرت سے اپنے پاس کھڑے ہوئے ساتھی سے کہا۔ "امداد علی..... تم میرے لیے کبھی آستین کے سانپ سے زیادہ خطرناک ثابت ہو گے؟ یہ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔"

"اطمینان سے سوچ لینا جگا، فی الحال اگر زندگی عزیز ہے تو خاموشی سے جیب سے اپنا اسلحہ نکال کر یہیں پھینک دو۔ اس کے بعد تمہاری آستین کا سانپ جس کا زہر میں پہلے ہی نکال چکا ہوں تمہارے ہاتھ پشت پر باندھنے میں کوئی تکلف نہ کرے گا۔ پھر تم دونوں گاڑی کی پشت پر بیٹھ کر آرام سے شکوے شکایت کرتے رہنا..... مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

"اور اگر جگا تمہاری بات ماننے سے انکار کر دے تو.....؟" جگا نے سرسراتے لہجے میں سوال کیا۔

"فی الحال ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں میرے یار۔" امداد علی نے شکستہ خوردہ لہجے میں جگا کو سمجھانے کی

کوشش کی۔ "افضل خان اگر تنہا ہوتا تو میں بھی دو دو ہاتھ کر کے بازی پلٹ سکتا تھا لیکن جس نے اس کی پچھاڑی پر ہاتھ رکھا ہوا ہے اس کے دوسرے شکاری کتے بھی کہیں آس پاس موجود ہوں گے..... میں نے ایویں ہی ہتھیار نہیں ڈال دیے تھے۔"

"وہ تمہاری مرضی تھی....." جگا کے لہجے میں چنگاریاں چٹخنے لگیں۔ "میں مر جاؤں گا لیکن کسی ولد الحرام کے سامنے قیدی بن کر نہیں پیش ہوں گا۔"

"تمہاری مرضی....." افضل خاں نے جو اس وقت میک اپ میں تھا سرد اور سفاک لہجے میں جواب دیا۔ "تمہاری اکڑی ہوئی لاش بھی میرے لیے بہت کافی ہو گی، بگ باس نے صرف جگا کو ساتھ لانے کا حکم دیا تھا..... زندہ یا مردہ کی بات طے نہیں کی تھی....."

"اس خواب کی تعبیر تمہیں بہت مہنگی پڑے گی افضل خاں۔" جگا نے چمک کر کہا۔ "میں یہاں تنہا نہیں آیا تھا، میرے ساتھ....."

اسی لمحے کچھ دور سے گولیوں کی تڑتڑاہٹ کی آواز ابھری، اورنگ زیب نے کسی فوری فیصلے کے تحت افضل خاں کے پاؤں کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ اس کا نشانہ خالی نہیں گیا، افضل خان کے ہاتھ میں جو آتشیں اسلحہ تھا وہ نکل گیا اس کے ساتھ ہی وہ خود بھی لڑکھڑاتا ہوا زمین پر بوس ہو گیا، جگا اور امداد علی بھی اس افتاد سے بوکھلا کر زمین پر لیٹ گئے۔ اورنگ زیب، سراج کو ساتھ آنے کا اشارہ کرتا ہوا تیزی سے دوڑ کر افضل خان کے سر پر پہنچ گیا جو غالباً بے ہوش ہو گیا تھا، اس کے داہنے گھٹنے سے خون ابل رہا تھا۔

گولیوں کے تبادلے سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ قریب ہی کہیں دو پارٹیاں آپس میں ٹکرا گئی تھیں، اورنگ زیب کے اشارے پر امداد علی اور جگا، افضل خان کو اٹھا کر بلیک وین میں لے آئے، وین کا کمانڈو کسی سے موبائل پر بات کر رہا تھا۔ اس نے فون ختم کر کے اورنگ زیب سے کہا۔

"سر..... آپ وین لے کر دوسرے راستے سے نکل جائیں۔ اوپر سے یہی حکم ملا ہے۔"

"فائرنگ کس کے درمیان ہو رہی ہے.....؟" اورنگ زیب نے دریافت کیا۔

"ہمارے ساتھیوں نے دو مشکوک گاڑیوں کو روکنے کا اشارہ کیا تھا لیکن انہوں نے جواب میں فائر کھول دیے۔ ہمارے ساتھی انہیں گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

جگا اور امداد علی نے افضل خان کو اٹھا کر پچھلی طرف ڈالا پھر خود بھی وین میں بیٹھ گئے تو اورنگ زیب نے جگا اور امداد علی کو مخاطب کر کے کہا۔ "تم سے جو وعدہ کیا گیا ہے وہ پورا بھی کیا جائے گا۔"

"ہم آپ کے خادم ہیں جناب۔" جگا نے بڑے ادب سے جواب دیا۔ "آپ کے لیے جان بھی حاضر ہے۔"

اورنگ زیب نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر گاڑی اسٹارٹ کی اور واپسی کے لیے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ راستے میں اس نے اپنے ڈی آئی جی کے نمبر ملا کر مائیک آن کر دیا

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل فون نمبر

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

ثمر عباس
03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبرز پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

www.pdfbooksfree.pk

ساتھ ہی سراج کو اشارے سے خاموش رہنے کو کہا۔

''ہیلو..... ہیلو..... کم آن مسٹر اورنگ زیب۔ آئی ایم اٹینڈنگ یو..... ہیلو..... ہیلو.....''

ایک لمحے بعد دوسری جانب سے آواز آنی بند ہوگئی تو سراج نے حیرت سے دریافت کیا۔

''اس کال کا کیا مطلب سمجھوں؟''

''میں رات تمہارے گھر پر تھا جب کسی نے ساحلی علاقے پر ہونے والی فائرنگ کی اطلاع دی، میں تمہارے ساتھ اپنی گاڑی پر آیا تو گھات لگائے کچھ دشمنوں نے ہمارے اوپر بھی فائرنگ کی..... ہم خدا کی مہربانی سے بچ گئے، محض ایک ٹائر کی قربانی دینی پڑی۔ اسی افراتفری میں، میں نے ڈی آئی جی صاحب کے نمبر ملائے تھے لیکن قریب کچھ آہٹیں سن کر گفتگو سے پرہیز ہی کیا تھا۔'' اورنگ زیب نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میری گاڑی کل صبح سے پہلے واپس نہیں آسکے گی۔ ساحلی علاقے پر اپنی موجودگی کا کوئی جواز تو پیش کرنا ہوگا۔''

''اور جو تین مہمان ہمارے ساتھ ہیں ان کے بارے میں کیا کہانی بیان کرنی ہوگی؟'' سراج نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ ایک خاص وقت تک ملٹری انٹیلی جنس کی تحویل میں مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوں گے۔ اس لیے ان کے بارے میں بھول ہی جاؤ۔'' اورنگ زیب نے بائیں آنکھ جھپک کر کہا تو سراج نے اسے اس انداز میں دیکھا جیسے وہ کسی پیچیدہ معمے کو حل کرنے کی کوشش میں الجھ گیا ہو۔

شیخ حامد کی حالت اس وقت قابل دید ہی تھی جب اس نے صبح کے ناشتے کے بعد ٹی وی کھولا تھا۔ خبروں میں اس ہنگامے کے بارے میں طویل کوریج دی گئی جو گزشتہ رات ساحلی علاقے پر پیش آیا تھا۔ خبر پڑھنے والے کے استفسار پر اس کے نمائندے نے بتایا تھا کہ ''ساحلی علاقے کے علاوہ رہائشی علاقے کی ایک ذیلی سڑک پر سے بھی ایک لاش دریافت کی گئی ہے جس کے بارے میں یہ خیال کیا جارہا ہے کہ فرار ہوتے وقت وہ یا تو خود گاڑی سے گرا ہوگا یا پھر اس کے ساتھیوں نے اس کے مرنے کا یقین ہوجانے کے بعد کفن دفن کی علت سے بچنے کی خاطر اسے ازخود لاوارث چھوڑ دیا۔'' مزید وضاحت پر اس نے کہا تھا کہ ''مقامی تھانے کے افسران اس حادثے کے بارے میں کوئی بیان دینے سے گریز کررہے ہیں دوسری ایجنسیاں بھی اس حقیقت سے لاعلمی کا اظہار کررہی ہیں جبکہ ایک اندازے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ دو پارٹیوں کے درمیان کھل کر فائرنگ کا تبادلہ کیا گیا پھر وہ دونوں ہی جائے وقوعہ سے اس طرح چھومنتر ہوگئیں کہ کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔'' نمائندے نے ایک اور سوال کے جواب میں یہ بھی کہا کہ ''ساحلی پر واقع ایک اسٹیک بار سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر سینئر ایس پی اورنگ زیب کی ذاتی استعمال کی گاڑی بھی ملی تھی جس کا ایک ٹائر پھٹ گیا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں مطلوبہ ایس پی سے بھی رابطہ قائم کرنے کی متعدد کوشش کی لیکن سینئر ایس پی نے بھی کوئی تفصیل نہیں بتائی، ان کا ایک ہی جواب تھا کہ انہوں نے اپنے متعلقہ افسران کو تفصیل سے آگاہ کردیا ہے۔'' نیوز ایجنسی کے نمائندے نے کچھ ایسی لاشوں کو بھی کور کیا جو تعداد میں چھ یا سات تھیں۔ لاشیں ایک دوسرے سے دور دور بکھری پڑی نظر آرہی تھیں۔''

شیخ حامد ناشتا درمیان میں چھوڑ کر اٹھ گیا۔ جو لاشیں ٹی وی پر دکھائی گئی تھیں ان کے چہرے اس کے جانے پہچانے تھے اور ان جرائم پیشہ اور پولیس کو مطلوبہ مجرموں کے تھے جنہیں شیخ حامد نے شکاری کتوں کی طرح پال رکھا تھا۔

ٹی وی کی خبروں کے بعد شیخ حامد نے صبح کے اخبارات دیکھے، صرف ایک انگریزی اخبار نے ''اسٹاپ پریس'' کے باکس میں اس حادثے کی مختصر نشاندہی کی تھی۔ شیخ حامد نے جھلا کر نمبر ٹو سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب ملنے کے بجائے ''یور ڈائلڈ نمبر از پاور آف'' کی صدا بار بار سنائی دی۔ نمبر ٹو کی خاموشی بھی شیخ حامد کی الجھنوں میں اضافہ کررہی تھی، اس نے نمبر ٹو کے بعد ایک دو اور اعتماد کے آدمیوں کو فون کیا لیکن کسی سے رابطہ نہ ہوسکا، سب ہی نمبر بند مل رہے تھے۔

پانچ سات منٹ تک وہ کسی زخمی درندے کی طرح ٹہلتا رہا اور نچلا ہونٹ کاٹتا رہا پھر اس نے وہ نمبر آزمایا جہاں افضل خاں کو رکھا گیا تھا۔ اس بار اسے ناکامی نہیں ہوئی۔

''سب لوگ کہاں مرگئے؟'' رابطہ قائم ہونے پر وہ دہاڑنے لگا۔ ''جس قیدی کو تمہاری نگرانی میں رکھا گیا تھا وہ کہاں ہے؟''

''کل رات اسلم ڈنکا صاحب نے ان سے آخری ملاقات کی تھی سر..... پھر وہ مجھے یہ ہدایت کرکے چلے گئے تھے کہ اگر قیدی کہیں جانے لگے تو اسے روکنے کی کوشش نہ کی جائے..... اس کے بعد کل رات ہی قیدی بھی چلا گیا تھا۔''

''اس وقت تمہارے ڈنکا ولد الحرام صاحب کہاں ہیں؟''

''مجھے نہیں معلوم سر..... میں نے انہیں ابھی فون کیا تھا لیکن.....''

شیخ حامد نے اس کا جواب سننے کی زحمت نہیں گوارا کی، نمبر ٹو کا فون بند ملنا اور ٹی وی کی کوریج اس بات کی تصدیق کررہی تھی کہ گزشتہ رات کے حادثے میں یا تو وہ جہنم رسید ہوگیا یا پھر پولیس کی تحویل میں ہوگا۔ افضل خاں بھی پھنس گیا ہوگا کیونکہ اس کے نمبر بھی بند ملے تھے۔ یہ تمام صورت حال اس کے لیے نہایت صبر آزما تھی، افضل خان کو جگا کو زندہ یا مردہ لانے کی ہدایت دی گئی تھی، امداد علی کو قابو کرکے اسے جگا کو اس کے بل سے نکالنا مقصود تھا جہاں وہ روپوش تھا لیکن بساط یقیناً پلٹ گئی تھی، ساحلی علاقے پر موجود جن لاشوں کی کوریج کی گئی تھی وہ سب اسلم ڈنکا کے ماتحت تھے۔

''وہ سب ساحلی علاقے پر کس مقصد سے جمع ہوئے تھے؟ کیا امداد علی اور جگا ساحلی علاقے پر کہیں روپوش تھے.....؟ جو تصادم ہوا وہ کن پارٹیوں کے درمیان ہوا؟..... ایک پارٹی نمبر ٹو نے تشکیل دی ہوگی..... دوسری کون تھی؟..... ایس پی اورنگ زیب کی گاڑی کس نے ناکارہ کی؟..... وہ کس مقصد سے وہاں گیا تھا؟..... کیا اسے کسی نے مخبری کردی تھی؟..... اگر ایسا تھا تو اس بات کے امکان بعید از قیاس نہیں تھے کہ اسلم ڈنکا کے علاوہ امداد علی اور جگا بھی غالباً پولیس ہی کی حراست میں ہوں گے جو حالات کو بتانے سے گریز کررہی تھی.....؟'' اس کے علاوہ اور بھی بے شمار سوالات تھے جن کی یلغار نے شیخ حامد کو پریشان کررکھا تھا۔ وہ ان سوالات کے جوابات ہر قیمت پر معلوم کرنا چاہتا تھا جو اس کے ذہن کو پراگندہ کررہے تھے۔ خاصی دیر تک وہ کسی ٹھہرے ہوئے خطرناک طوفان کی طرح خاموش کھڑا اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مسلتا، توڑتا رہا پھر اس نے کچھ سوچ کر ڈی آئی جی کے نمبر ڈائل کیے۔ اس بار اسے ناکامی نہیں ہوئی۔

''ہیلو..... ڈی آئی جی آفس.....'' آغا منظور کے بجائے کسی ماتحت نے کال ریسیو کی۔

''شیخ حامد بول رہا ہوں۔ آغا منظور سے بات کراؤ.....''

دو منٹ بعد آغا منظور نے کال اٹینڈ کی تو شیخ حامد نے بڑی مشکلوں سے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''میں ابھی ابھی ٹی وی پر خبریں دیکھ کر فارغ ہوا ہوں..... خاصی گرما گرم صورت حال ہے جسے آپ لوگوں نے خاموشی اختیار کرکے عوام کے لیے اور پراسرار بنا دیا ہے، سب خیریت تو ہے.....؟''

''خیریت ہوتی جناب تو میں خود آپ کی کال ریسیو کرتا۔'' دوسری جانب سے پریشانی کا اظہار کیا گیا۔ ''جو کچھ ہوا وہ خود میرے لیے بھی ایک معما ہی ہے۔''

''کیا مطلب؟..... کیا اس ٹکراؤ میں پولیس ایک فریق نہیں تھی؟''

''جی نہیں..... ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں ہوسکا کہ دوسری پارٹی کون تھی۔'' آئی جی نے وضاحت کی۔ ''ہمارے ایکسپرٹس نے لاشوں کی تصویر سے اس بات کی تصدیق، سرد خانے کا ریکارڈ الٹ پلٹ کرنے کے بعد بہرحال کردی ہے کہ جو لاشیں ملی ہیں وہ سب مطلوبہ مجرموں کی تھیں مگر..... ان کے مقابلے پر کس کا ہاتھ تھا یہ نہیں پتا چلا۔''

''اور بھی بہت ساری ایجنسیاں ہیں آغا منظور۔'' شیخ حامد نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''سی، آئی، اے۔ انٹی کرپشن سیل، اسپیشل کرائم برانچ، اس کے علاوہ رینجرز اور ملٹری کے بھی بہت سارے شعبے ہیں اور..... یہ بھی ممکن ہے کہ دوسری پارٹی بھی جگا جیسے اڈوں کے مالکان کی ہو۔''

''یہی معلوم کرنے کی خاطر تمام کونے کھدروں کو ٹٹولا جارہا ہے۔''

''ایک امکان اور بھی ہے.....'' اس بار شیخ حامد نے چبھتے ہوئے جملے استعمال کیے۔ ''ممکن ہے تم بھی مجھے ٹالنے کی خاطر یہ سب باتیں کررہے ہو؟''

''آپ یہ شبہ کس بنیاد پر کررہے ہیں؟'' آئی جی کے لہجے میں بھی تناؤ کی کیفیت ابھر آئی۔

''تم اپنے ہیرو شیر ایس پی اورنگ زیب کو کیوں فراموش کررہے ہو۔ اس کی گاڑی بھی تو اسی جگہ سے ملی ہے جہاں ٹکراؤ ہوا تھا۔''

پروفیسر صاحب نے کلاس روم میں اپنے لیکچر کے دوران ایک لڑکے کو اداسی دیکھ کر غصے سے چلاتے ہوئے کہا ''تم میری کلاس میں سو نہیں سکتے۔''

لڑکا آنکھیں کھول کر سر اٹھاتے ہوئے قدرے بیزاری سے بولا ''سو تو سکتا ہوں سر.....! بشرطیکہ آپ اتنے زور سے نہ بولیں۔''

www.pdfbooksfree.pk

"یہی سوال دوسرے بھی کر رہے ہیں۔" آئی جی نے طویل سانس لے کر کہا۔ "اور نگ زیب کل رات سراج کے گھر پر تھا جب اسے ہنگامے کی اطلاع ملی تھی۔ وہ فوری طور پر وہاں پہنچا تھا لیکن کچھ گھات میں بیٹھے لوگوں نے اس کی گاڑی پر بھی گولیاں برسائیں۔ بات صرف ایک ٹائر برسٹ ہونے پر ٹل گئی، گاڑی کا توازن بگڑنا ہی شاید ان دونوں افسران کی زندگی کا بہانہ بن گیا۔ ایس پی نے کل رات ہی مجھے ساری پوزیشن سے باخبر کر دیا تھا مگر پولیس کے پہنچنے سے پہلے دونوں پارٹیاں جا چکی تھیں۔"

"میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟" شیخ حامد نے دوستانہ انداز میں سوال کیا۔

"دعا کریں کہ میری کرسی محفوظ رہے..... اعلیٰ افسروں کے سوالات نے تو فی الحال صبح سے ناشتے کی مہلت بھی نہیں دی۔"

"ٹھیک ہے..... تم اپنے آفیسروں کو بھگتاؤ، میری کسی خدمت کی ضرورت ہو تو تکلف نہ کرنا....."

شیخ حامد نے جملہ مکمل کرنے کے ساتھ ہی ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ اس کے چہرے پر تجسس کی علامتیں پہلے سے زیادہ نمایاں ہونے لگیں۔ نمبر ٹو اور افضل خاں کے سراغ نہ ملنے کے ساتھ ساتھ اسے جگا کی بھی فکر لاحق تھی جس نے اسے مخرب اخلاق تصویروں کے ذریعے بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس کانٹے کو ہر قیمت پر اپنے راستے سے ہٹانے کا خواہاں تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی بے چینی بھی بڑھ رہی تھی جب اس کے موبائل پر سگنل موصول ہوا۔ روشن اسکرین پر نمبر ٹو کا حوالہ دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"تم....." اس نے موبائل آن کر کے خود پر قابو پاتے ہوئے سوال کیا۔ "اب تک کہاں مرے ہوئے تھے.....؟"

"میں بہت زخمی ہوں باس، بڑی مشکلوں سے ایک پرائیویٹ اسپتال سے مرہم پٹی کرا کے اپنے محفوظ ٹھکانے تک آیا ہوں، میں نے اس عرصے میں موبائل بند کر رکھا تھا۔" اسلم ڈنکا نے بات جاری رکھی۔ "اگر پولیس کے ہاتھ لگ جاتا تو مصیبت ہی آجاتی۔"

"افضل خاں کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم، اس نے امداد علی کو بہر حال قابو کر لیا تھا، جگا بھی اپنے بل سے نکل کر سامنے آگیا تھا۔ ساحلی علاقے پر وہ تینوں موجود تھے، افضل خاں نے جگا کے آتے ہی اس پر پستول تان لیا تھا، میں قریب موجود تھا لیکن پھر..... اچانک سرکاری ایجنسی والوں نے فائرنگ شروع کر دی، میں نے بھی جواب دے کر نکلنے کی ٹھان لی تھی۔ آخری بار میں نے افضل خاں کو زمین پر گرتے دیکھا تھا، اس کے بعد ہم کو اس قدر شدید فائرنگ میں الجھنا پڑا کہ فرار کے علاوہ کوئی صورت نہیں تھی....."

"کس ایجنسی کے لوگ تھے.....؟"

"وہ سب سیاہ پتلون اور لمبی آستینوں والی قمیص میں تھے۔" اسلم ڈنکا نے تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔ "ممکن ہے پولیس یا پھر کسی اور ایجنسی کے کمانڈوز ہوں، ان کی اچانک مداخلت کا انداز کمانڈوز ایکشن سے ملتا جلتا تھا۔"

"اور کوئی خاص بات؟" شیخ حامد نے غراتے ہوئے دریافت کیا۔

"ایس پی اور نگ زیب بھی وہاں موجود تھا، سراج بھی ساتھ ہی تھا لیکن..... پولیس کی دوسری گاڑیاں نہیں تھیں، ہمارے ایک خاص آدمی نے ان دونوں کو راستے سے ہٹانے کا فوری منصوبہ بنا لیا تھا لیکن ایس پی کی قسمت اچھی تھی کہ ٹائر برسٹ ہونے کی وجہ سے گاڑی کا توازن بگڑ گیا۔ اب وہ دونوں زندہ ہیں یا مردہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔"

"لیکن تم..... بہر حال ابھی تک اپنی ناکامی کی خبر سنانے کے لیے زندہ ہو..... یون آف اے بچ، باسٹرڈ۔" شیخ حامد ایک دم ہی آپے سے باہر ہو کر اسے مغلظات سناتا رہا پھر اس نے موبائل آف کر دیا۔ اس کے تیور ہر لمحہ خطرناک ہوتے جا رہے تھے، وہ دل ہی دل میں نمبر ٹو کے لیے کوئی مناسب اور آخری سزا کے بارے میں غور کر رہا تھا جب اس کے فون پر گھنٹی بجی۔ اس نے لپک کر ریسیور اٹھایا، ٹھوس لہجے میں بولا۔

"یس..... شیخ حامد اسپیکنگ۔"

"تم اس وقت شاید افضل خاں کی ناکامی کا غم منا رہے ہو گے؟" دوسری جانب سے کسی نے نہایت سرد اور سفاک لہجے میں کہا۔ "میری بات غور سے سنو..... ہمیں تمہارے غم سے زیادہ امداد علی اور استاد کی فکر ہے۔"

"کون بکواس کر رہا ہے.....؟" شیخ حامد نے دہکتے ہوئے سوال کیا۔

"تمہارا جائز باپ۔" اس بار بھی سختی سے جواب دیا گیا۔ "مجھے تمہارے کتوں کی موت کا کوئی غم نہیں ہے۔ صرف استاد کی واپسی کا مطالبہ کر رہا ہوں، انکار کی صورت میں تمہاری اور کنول کی تصویریں منظر عام پر بھی آسکتی ہیں۔"

"بکواس مت کرو....." شیخ حامد نے تلملا کر کہا۔

"جگا اور امداد علی..... دونوں کے بارے میں مجھے بھی کچھ نہیں معلوم۔"

"بہر حال، استاد کو ٹریپ کرنے کا حکم تمہارا ہی تھا۔ کیا اس سے بھی انکار کرو گے؟"

"نہیں، میں اس بات سے انکار نہیں کروں گا۔" شیخ حامد روانی میں کہتا چلا گیا۔ "جگا نے مجھ سے پنگا لڑانے کی غلطی کر کے اپنی موت ہی کو دعوت دی تھی۔"

"ہم بھی ایک میان میں دو تلواریں برداشت کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ تمہیں ایک موقع مل سکتا ہے لیکن اسی صورت میں کہ استاد کا پتا ہمیں بتا دو۔"

"احمقانہ بات کر رہے ہو۔" شیخ حامد حلق کے بل چیخا۔ "جب میں جانتا ہی نہیں کہ اب وہ طاعون زدہ چوہا کہاں ہے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"اس کے آگے تمہاری رہنمائی میں کر سکتا ہوں۔" ٹھوس اور کرخت لہجے میں کہا گیا۔ "کرنل احتشام کو جانتے ہو؟ کسی زمانے میں تم دونوں کلاس فیلو تھے، اب وہ ملٹری انٹیلی جنس کا نمبر دو ہے..... غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

"لیکن موجودہ معاملے کا کرنل احتشام سے....."

"..... کیا تعلق ہے یہ میں تمہیں بتاتا ہوں۔ باقی کام تمہارا ہو گا۔" دوسری جانب سے جملہ مکمل کرنے کے ساتھ ہی ٹھوس آواز میں بات جاری رکھی گئی۔ "تم کیا پیچتے ہو شیخ حامد، تمہارے ڈی آئی جی کو بھی ایک دو کوڑی کے ایس پی نے گھن چکر بنا دیا ہے۔"

"کس کی بات کر رہے ہو؟" شیخ حامد نے چونک کر سوال کیا۔

"ایس پی اور نگ زیب کی..... اسی نے اپنے اثر و رسوخ سے کل رات کمانڈوز کے ذریعے تمہارے منصوبے کو ناکام بنایا تھا اور..... اب وہ بھی انجان بن رہا ہے۔ میری بات غور سے سنو..... افضل خاں، امداد علی اور استاد کو ملٹری کی خفیہ اور محفوظ کسٹڈی میں رکھا گیا ہے۔"

"آئی سی۔ مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ اور نگ زیب کی گاڑی ساحلی علاقے....."

"یہ تمہارا اور ایس پی کا معاملہ ہے۔ کرنل احتشام سے بات کر کے مجھے بتاؤ کہ تم استاد کے سلسلے میں کیا کر سکتے ہو؟"

"تم اگر کرنل کے بارے میں جانتے ہو کہ وہ میرا کلاس فیلو تھا تو یہ بھی جانتے ہو گے کہ وہ کس قدر فرض شناس اور محب وطن ہے، مر جائے گا لیکن جگا کے بارے میں میری بات نہیں مانے گا۔ ہو سکتا ہے کہ سرے سے اپنی لاعلمی کا اظہار کر دے۔"

دوسری جانب سے فوراً ہی کوئی مطالبہ نہیں ہوا۔ کچھ توقف سے کہا گیا۔ "میں کرنل احتشام کے سلسلے میں تمہاری بات سے متفق ہوں۔ تم صرف یہ معلوم کر لو کہ کیا گزشتہ رات اسی کے آدمیوں نے آپریشن کیا تھا؟"

"فرض کر لو اس نے اقرار کر لیا، پھر تم....."

"پھر، ہم استاد کو ہر صورت میں آزاد کرانے کی کوشش کریں گے۔ یہ ہمارا کام ہو گا۔ تم صرف میری معلومات کی تصدیق کر دو، میں دس منٹ بعد تم سے دوبارہ رابطہ قائم کروں گا، اتنا خیال رہے کہ تم نے اگر ڈبل کراس کرنے یا ٹال مٹول کی حماقت کی تو وہ تصویریں بھی لفافے میں بند نہیں رہیں گی۔ میڈیا کے علاوہ ایس پی اور نگ زیب بھی اسے ہر قیمت پر لینے کو آمادہ ہو جائے گا۔" اس جملے کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

شیخ حامد نے ریسیور کو کریڈل پر رکھا پھر اپنے ہونٹ چبانے لگا۔ جو معلومات اسے فراہم کی گئی تھیں، ان میں وزن تھا، خاص طور سے اور نگ زیب کے حوالے نے اسے زیادہ پریشان کر رکھا تھا۔ دو چار منٹ تک وہ پیچ و تاب کھاتا رہا پھر اس نے ریسیور اٹھا کر کرنل احتشام کے نمبر ملائے، ایک دو درمیانی رکاوٹوں کے بعد کرنل کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو شیخ..... اس وقت ہماری یاد کیسے آگئی؟" بے تکلفی سے بات کا آغاز ہوا۔

"تمہیں کل رات کا محاذ سر کرنے کی مبارکباد دینا مقصود تھا۔"

"کس بات کی.....؟"

"جگا سے اپنا بھی کچھ حساب کتاب نکلتا ہے کرنل۔" شیخ حامد نے دور اندیشی کا مظاہرہ کیا۔ "یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ تمہارے آدمیوں کی تحویل میں ہے۔"

"لیکن تمہیں....."

"ڈونٹ وری..... فون پر بات کرنا مناسب نہیں ہو گا۔" میں کل تم سے ملنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اطمینان سے بات ہو گی۔" شیخ حامد نے ذہانت سے کام لیتے ہوئے فون بند کر دیا لیکن اب اس کے وجود میں ایک نیا آتش فشاں پھٹ پڑنے کو بے قرار تھا۔ فون پر ملنے والی ٹپ کی تصدیق کے بعد اس کے ذہن میں صرف ایک نام صدائے بازگشت بن کر گونج رہا تھا..... ایس پی اور نگ زیب..... جس نے بڑی کامیابی سے اسے ڈبل کراس کیا تھا۔ وہ اس کے بارے میں کسی آخری فیصلے کو ذہن میں مرتب کر رہا تھا جب

www.pdfbooksfree.pk

فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ دوسری جانب سے جگا کے بارے میں ٹپ دینے والے کی آواز ابھری۔

''کیا معلوم ہوا.....؟''

''تمہاری اطلاع غلط نہیں لیکن.....''

''شکریہ شیخ حامد۔'' جواب بات کاٹ دیا گیا۔

''تم نے ہماری ایک مشکل آسان کردی، استاد کو کیسے نکالنا ہے؟ یہ سوچنا اب ہمارا کام ہے لیکن تم فی الحال چوبیس گھنٹوں تک خاموش ہی رہنا..... استاد کو آزاد کرانے کے بعد تم سے دوبارہ بات ہوگی۔''

شیخ حامد نے غصے سے ریسیور کریڈل پر رکھا پھر ہاتھ ملنے لگا۔ بساط کا رخ اس انداز میں بھی پلٹ سکتا ہے۔ یہ خیال ہی اس کے جنون کو ہوا دینے کی خاطر بہت تھا۔ اب چوبیس گھنٹوں تک خاموش رہنے کی بندش کے حکم نے اس کے تن بدن میں جیسے آگ بھڑکا دی تھی۔ کنول کی تصویریں اس کے پیروں میں بیڑیاں بن گئی تھیں، اس نے باسی کھانوں سے بچنے کی خاطر کنول کی تازہ ڈش کو قبول کرلیا تھا لیکن حالات نے اسے کنول سے بھی دور رہنے پر مجبور کردیا تھا۔ یہ حالات کی ستم ظریفی تھی جس نے جنگل کے بادشاہ کو صرف اپنی کچھار تک محدود کردیا اور..... اور..... اچانک شیخ حامد کے ذہن میں صبا بیگم کی خودکشی کا حادثہ ابھر آیا..... اسی ایک عورت کی خودکشی کے بعد اس کے اوپر نحوست کے بادل منڈلانے شروع ہوئے تھے۔ وہی ایک جائز رشتہ تھا جس کی آڑ میں وہ اپنے گھر کی چھت کے بچے بھی من مانی کرتا تھا، رنگ رلیاں مناتا تھا لیکن اس نے خودکشی کرکے شیخ حامد کے لیے دشواریاں پیدا کردی تھیں پھر ایس پی اورنگ زیب کے آجانے کے بعد سراج بھی اس کے ساتھ مل کر ایک اور ایک گیارہ ہوگئے تھے۔ اس کی جمی جمائی بساط کے مہرے ایک ایک کرکے پٹنے لگے، پہلے افضل خاں کو حالات کا شکار ہوکر ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنی پڑی۔ وہ شیخ حامد کے لیے کلیدی کردار کا مالک تھا۔ اس کے زوال کے بعد بلیک ٹائیگر کا سورج بھی گہنا گیا۔ شبنم کو بھی حالات کی گردش نے شکار کرلیا۔ اب اسلم ڈنکا بھی طوفان کی لپیٹ میں تھا۔

شیخ حامد کا ذہن بار بار اس بات کی نشاندہی کررہا تھا کہ اس کے زوال کا سبب صبا بیگم کی خودکشی تھی جس کے بعد اورنگ زیب کی شاطرانہ چالوں نے اس کی جڑ بنیاد کو ہلانا شروع کردیا تھا۔ کل تک جگا اور اس قسم کے دوسرے گینگ لیڈر بھی شیخ حامد کے راستوں سے کترا کر چلنے کے عادی تھے مگر اب اورنگ زیب کی وجہ سے وہ بھی اپنی اوقات سے بڑھ رہے تھے۔ تازہ واقعے کے بعد فون پر ملنے والی اور اس کی تصدیق ہوجانے کے بعد شیخ حامد کا چونکنا لازمی اس کے ذہن میں متعدد منفی طریقے ابھر رہے تھے جن اختیار کرنے کے بعد وہ اورنگ زیب کی چالوں کو کمز کرسکتا تھا۔

خاصی دیر تک وہ اپنی کھوئی ہوئی ساکھ کی جڑوں مضبوط کرنے کی پلاننگ کرتا رہا پھر اچانک اس کے ذہ میں ایک خیال بڑی سرعت سے ابھرا۔ ''ممکن ہے کہ شبنم کے اغوا میں بھی اورنگ زیب کا ہاتھ ہو؟..... اسی نے جگا بھی کچھ لو اور کچھ دو، کی بنیاد پر خرید لیا ہو؟..... اقتدار ہوس نے اسلم ڈنکا کو بھی غداری پر آمادہ کردیا ہو.....؟ کے سلسلے میں افضل خاں کی کامیابی اسے منظور نہ رہی ہو شبنم بھی اورنگ زیب کی آلۂ کار بن کر دوبارہ اس کے پاس آگئی ہو؟'' اس کے علاوہ اور بھی شکوک اور شبہات اس کے ذہن میں گرم ہوا کے تیز و تند تھپیڑوں کی طرح گردش کر رہے تھے۔ اس کا ابلیسی ذہن اورنگ زیب کی چالوں توڑ کرنے کی خاطر منصوبے بناتا رہا پھر..... ایک مثال اس کے وجود میں سنسناتی ہوئی ابھری۔ ''کشتی طوفان کی زد میں آجائے تو اسے ڈوبنے سے بچانے کی خاطر تجربہ کار ملاح اپنا قیمتی مال بھی سمندر میں پھینک کر بوجھ ہلکا کرلیتے ہیں۔'' اس خیال کے ساتھ ہی اس کے خون کی گردش تیز ہوگئی شکوک اور شبہات کو دور کرنے اور کمزور ہوتی ہوئی بازی نقشہ بدلنے کی خاطر کچھ مہرے پٹوانا اس کے لیے ضروری ہوگیا تھا، اس کے بعد وہ دشمن کی چالوں کو کمزور کرکے نئے سرے سے اپنی بازی جما سکتا تھا۔ ان مہروں کے بساط سے ہٹ جانے کے بعد اورنگ زیب کی جمی جمائی بازی بھی کمزور ہوسکتی تھی۔ اس کا دشمن اورنگ زیب کے علاوہ اگر کوئی اور بھی ہوتا تو وہ بھی ان جیتے جاگتے کرداروں کے ختم ہوجانے کے بعد آسانی سے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکتا تھا۔

اپنے نئے منصوبے پر غور و فکر کرنے کے بعد شیخ حامد نے قدرے سکون کا سانس لے کر موبائل پر کسی کے نمبر ڈائل کیے۔ رابطہ قائم ہونے اور ضروری کوڈ ورڈز کے تبادلے کے بعد اس نے بڑے ٹھوس لہجے میں حکم دیا..... ''تم شبنم کو ساتھ لے کر اسلم ڈنکا کے ٹھکانے پر جاؤ، وہ زخمی حالت میں ہوگی شبنم سے کہنا کہ وہ اسلم ڈنکا کو گولی مار کر ختم کردینے کے بعد میرا کھویا ہوا اعتماد دوبارہ حاصل کرسکتی ہے۔ اسلم ڈنکا کے خاموش ہوجانے کے بعد تم شبنم کو بھی گولی مار دینا۔ تمہارا

کامیابی تمہاری ترقی کی ضمانت بھی بن سکتی ہے..... کام ہوشیاری سے کرنا، اس کے بعد کسی پبلک فون سے قریبی تھانے کو کسی فرضی نام سے حادثے کی اطلاع بھی کردینا۔ اوور اینڈ آل۔''

شیخ حامد نے موبائل آف کرکے دوسری بار کنول کے نمبر ڈائل کیے، دوسری جانب سے کنول کے بجائے اس کی ماں کی آواز ابھری تو اس نے سرد لہجے میں پوچھا۔ ''کنول کہاں ہے؟ اس کا موبائل تم نے کیوں استعمال کیا؟''

''آپ کی ہدایت پر وہ جاتے وقت موبائل مجھے دی گئی تھی۔'' خشک لہجے میں جواب ملا۔

''میں نے اسے ایسی کوئی ہدایت نہیں دی تھی۔'' شیخ حامد تلملا کر بولا۔ ''وہ کب گئی اور کہاں کا کہہ کر گئی ہے؟''

''مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔'' اس بار بھی پستہ آواز میں کہا گیا۔ ''اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ آپ نے اسے بلوایا ہے، کہاں؟ اس کی وضاحت اس نے نہیں کی تھی۔''

''گارڈ کہاں ہے.....؟'' شیخ حامد نے ہونٹ چباتے ہوئے تحکمانہ انداز اختیار کیا۔ ''نیچے جاکر فوری طور پر اس سے میری بات کراؤ۔''

ایک منٹ بعد ڈیوٹی گارڈ نے جو کچھ کہا اسے سن کر شیخ حامد کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی۔ اس کے بیان کے مطابق کنول جس آدمی کے ساتھ گئی تھی وہ اسلم ڈنکا کا دست راست تھا لیکن شیخ حامد اسے خود اپنی نظروں سے ٹی وی پر ان افراد کی لاشوں میں دیکھ چکا تھا جن کو واضح طور پر متعدد بار کوریج دی گئی تھی۔

☆☆☆

لیاقت حسین کو جو کام سونپا گیا تھا وہ زیادہ مشکل نہیں تھا، سپروائزر کے فرائض سمجھنے میں بہ مشکل دو دن لگے تھے، کام کرنے والے سب ہی شریف لوگ تھے۔ لیاقت کے کرسی پر بیٹھنے کے بعد انہیں احساس ہوا تھا کہ شاید ڈرائیونگ سیٹ سے اٹھ کر سپروائزر کی کرسی پر بیٹھنے کے بعد وہ دفتر والوں پر اپنا سکہ جمانے کی خاطر کچھ دنوں تک رعب میں رکھنے کی کوشش کرے گا لیکن لیاقت حسین نے روز اول ہی سے اپنی شرافت اور محبت بھری باتوں سے ان کے دل جیت لیے تھے۔ دو روز بعد وہ کسی کام سے سیٹھ عثمان کے دفتر میں گیا تو انہوں نے اسے روک کر کہا۔

''تمہارا کام کیسا چل رہا ہے لیاقت حسین؟''

''خدا کا شکر ہے، ہر کام نہایت خوبی سے انجام دیا جارہا ہے لیکن.....'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''لیکن کیا.....؟'' سیٹھ عثمان نے وضاحت طلب انداز میں دریافت کیا۔

''میرے کچھ ماتحت مجھ سے زیادہ پڑھے لکھے اور تجربہ کار لوگ ہیں۔ اگر آپ ان میں سے کسی کو.....''

''سمجھ گیا۔'' سیٹھ عثمان نے مسکرا کر کہا۔ ''تم اس بات کی فکر مت کرو، میں جانتا ہوں کہ کون ورکر کس اہلیت کا ہے، اسے اسی کی محنت اور قابلیت کے اعتبار سے معاوضہ بھی ملتا ہے۔ ویسے میری اطلاع ہے کہ تم نے کرسی سنبھالتے ہی انہیں اپنا گرویدہ بنالیا ہے۔''

''یہ بھی آپ کی محبت ہے ورنہ کہاں ایک ڈرائیور اور کہاں.....''

''لیاقت حسین.....'' سیٹھ عثمان نے اسے سنجیدگی سے ٹوکا۔ ''دوبارہ اس قسم کی بات کبھی نہ کرنا۔ میں نے تمہارے ساتھ جو کچھ کیا تم اس سے کہیں زیادہ کے مستحق تھے۔ میں تمہارے احسانوں کو بھولا نہیں ہوں۔''

''سر.....'' لیاقت حسین نے قدرے جھجک کر پوچھا۔ ''میں نے سنا ہے کہ آپ نے کسی نئے ڈرائیور کے لیے اشتہار دیا ہے؟''

''ہاں..... کیوں؟''

''آپ نے میری ترقی کے وقت وعدہ کیا تھا کہ جب تک میرا دانہ پانی آپ کے ساتھ لکھا ہوا ہے، آپ کی گاڑی میرے علاوہ.....''

''مجھے یاد ہے.....'' سیٹھ عثمان نے محبت سے جواب دیا۔ ''ڈرائیور کی ضرورت مجھے آؤٹ ڈور ورک کے لیے ہے۔''

''پھر ٹھیک ہے.....'' لیاقت حسین نے سکون کی سانس لی۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھنے لگا تو سیٹھ عثمان نے اسے روک کر کہا۔

''انیکسی میں تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟''

''تکلیف کیسی؟ میں پہلے بھی تو فرحین کے ساتھ اسی انیکسی میں رہتا تھا۔''

''میرا مطلب کچھ اور تھا۔'' سیٹھ عثمان نے مسکرا کر کہا۔ ''قریب رہنے کی وجہ سے راحیلہ، فرحین کو بار بار بلا لیتی ہیں اور تم.....''

''یہ بیگم صاحبہ کی مہربانی ہے کہ وہ فرحین کو اپنے برابر بیٹھنے کا موقع دیتی ہیں۔''

''تو پھر آج رات بھی تمہیں دیر تک تنہا رہنا ہوگا۔''

www.pdfbooksfree.pk

سیٹھ عثمان نے کہا۔ ”راحیلہ نے کچھ خواتین کو رات کھانے پر بلایا ہے۔ وہ چاہتی ہیں کہ اس موقعے پر فرحین بھی ان کے ساتھ رہے۔“

”یہ تو ہمارے لیے بڑی عزت کی بات ہے، میں بھلا برا کیوں مانوں گا۔“ لیاقت حسین نے صاف گوئی سے کہا پھر کچھ دیر دفتری معاملات پر تبادلۂ خیالات کرنے کے بعد اپنے آفس میں آ گیا۔

مغرب کی نماز کے بعد فرحین بن سنور کر کمرے سے باہر نکلی تو لیاقت حسین نے چھیڑنے کی خاطر کہا۔

”یہ روپ سنگار کر کے کہاں جانے کی تیاری کر رہی ہے؟“

”پہلے یہ بتا کہ کیسی لگ رہی ہوں؟“ فرحین نے پوچھا۔

”تو ہر حال میں میرے سپنوں کی رانی ہی لگتی ہے۔“ لیاقت حسین نے یکلخت سنجیدگی سے کہا۔ ”یاد ہے..... آج سنیچر ہے؟“

”یاد تو ہے لیکن آج تجھے دیر تک میرا انتظار کرنا پڑے گا۔“ فرحین نے اس کی بات سمجھ کر بڑے لاڈ سے کہا۔ ”بیگم صاحب کی بات نہ ہوتی تو میں انکار کر دیتی لیکن تو لمبی تان کر نہ سو جانا۔ میں جلدی آنے کی کوشش کروں گی۔“

”خیال ہے تیرا..... بڑے آدمیوں کے ہاں دعوتوں کے موقعوں پر رات کا کھانا بھی ساڑھے دس گیارہ بجے سے پہلے شروع نہیں ہوتا۔ کل ویسے بھی چھٹی ہے۔“

”کہتا تو ٹھیک ہے.....“ فرحین نے لیاقت حسین کے قریب آ کر کہا پھر اس کی دلجوئی کی خاطر بولی۔ ”تو کہے تو میں بیگم صاحب سے بیماری یا سردرد کا بہانہ کر کے جان چھڑا آؤں؟“

”نہیں..... میں تو صرف تجھے آزمانے کی خاطر کہہ رہا تھا۔“ لیاقت حسین نے کہا۔ ”عثمان صاحب نے آج دفتر ہی میں بتا دیا تھا کہ بیگم صاحبہ تجھے دعوت کے موقع پر اپنے ساتھ رکھیں گی۔“

جتنی دیر فرحین سنگار میز کے سامنے کھڑی گھوم پھر کر اپنا جائزہ لیتی رہی لیاقت حسین اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتا رہا، جب وہ جانے لگی تو لیاقت حسین نے حسب معمول اپنا ٹیکس ایک پیار کی شکل میں وصول کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ اس وقت رات کے ساڑھے آٹھ کا عمل تھا، وہ جانتا تھا فرحین کی واپسی تمام مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد ہی ہوگی۔ اسے واپسی میں رات کے بارہ بھی بج سکتے تھے، راحیلہ بیگم اسے بہنوں کی طرح پیار کرتی تھیں لیے دعوت اور دوسری تقریبات کے موقعے پر اسے ساتھ رکھتی تھیں۔

لیاقت حسین نے نو بجے کھانا کھایا پھر وہ لیٹنے کا کر ہی رہا تھا کہ سراج کا فون آ گیا۔

”کیسے ہو لیاقت حسین.....؟“

”وہی پہلا جیسا صاحب لیکن آپ نے اب بھلا دیا ہے۔“ لیاقت حسین نے شکوہ کیا۔

”کچھ دفتر میں مصروفیات بڑھ گئی ہیں جس کی سے وقت نہیں نکال سکا ورنہ تم بھولنے والی چیز نہیں ہو۔“

”اس وقت کیسے یاد کیا، کیا میں آپ کے کسی آ سکتا ہوں؟“

”ابھی نہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ ایک دو روز میں تمہاری ضرورت پیش آئے، ایس پی اورنگ زیب بھی بہت یاد کرتے ہیں۔“

”میں آپ کا خادم ہوں صاحب، جب ضرورت یاد کر لیجیے گا۔“

سراج سے گفتگو کے بعد وہ لباس تبدیل کر کے بستر لیٹ گیا، فرحین کے خیال سے اس نے خواب گاہ کے دروازے کو بند نہیں کیا تھا، کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد اسے نیند آنے لگی تو اس نے بیڈ سوئچ سے دوسری بتیاں بجھا کر صرف ہلکے گلابی رنگ کا ایک نائٹ بلب جلنے دیا۔ کچھ دیر کروٹیں لینے کے بعد اس کے خراٹے بھی نشر ہونا شروع ہو گئے۔ بہت دنوں بعد یہ پہلا اتفاق تھا کہ سنیچر کے روز بستر پر تنہا لیٹا تھا ورنہ یہ رات شادی کے بعد سے اس کے اور فرحین دونوں کے لیے بہت اہم ہوتی تھی۔

لیاقت حسین کب تک نیند کی وادیوں میں ڈوبا رہا اسے یاد نہیں رہا لیکن پھر شاید وہ خواب ہی کی کیفیت تھی جب اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی سنسان ویرانے میں کھنڈر کے درمیان کہیں پھنس گیا ہو جہاں ہر سو پتھر کے عجیب و غریب مجسمے منہ پھاڑ کر اسے نگل جانے کو آمادہ نظر آ رہے تھے، وہ گھپ اندھیرے میں ان کے درمیان سے بچتا بچاتا نکلنے کی کوشش کر رہا تھا جب ایک قد آور کالا بھجنگ انسان اپنی مکروہ شکل کے ساتھ اس کے راستے کی دیوار بن گیا۔ لیاقت حسین کی خوفزدہ نظریں اس سیاہ فام مکروہ انسان کے چہرے پر مرکوز تھیں جب ایک قہقہہ اس کی قوت سماعت سے ٹکرایا پھر کسی نے اسے للکار کر کہا تھا۔

”مسلے..... آج تو پوری طرح ہمارے جال میں

پھنس گیا ہے، آج میں تیرے شریر کو دیوی کے چرنوں میں بلیدان کروں گا پھر تیرے خون سے اشنان کر کے بھوانی کے سامنے اپنی وجے کا اعلان کروں گا۔ تو بہت بھاگتا رہا، چھپتا رہا پر تو آج تیری کھاٹ کھڑی ہونے کا سے آ گیا ہے۔“

لیاقت حسین دم سادھے کھڑا اس کریہہ الفطرت ہیولے کو دیکھ رہا تھا جب کسی نے نہایت نرم مگر ٹھوس آواز میں اسے مخاطب کیا۔ ”لیاقت پتر، تو ان گندی بدروحوں کی کوئی فکر مت کر، اپنے خدا کو یاد کر۔ آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر دم کر لے، کوئی گندی طاقت تیرے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی۔“ لیاقت حسین نے اس آواز کو پہچان لیا۔ وہ اس کی ماں کی آواز تھی۔ وہ لیاقت حسین کو تعویذ کے بارے میں کچھ بتا رہی تھی جب سیاہ بھجنگ ہیولے نے چیخ کر کہا۔ ”تو جو کوئی بھی ہے میرے راستے سے دور ہو جا نہیں تو، تو بھی جل کر بھسم ہو جائے گی۔“ جملے کے ساتھ ساتھ اس نے ہوا میں ہاتھ بلند کر کے جھٹکا تو جنگلی جانوروں کے شور و غل کی آوازیں چاروں طرف سے ابھرنے لگی۔ لیاقت حسین کی ماں کی آواز ان میں دب کر رہ گئی۔

لیاقت حسین نے اپنی دستی گھڑی کے چرمی پٹے کو ٹٹولا۔ موم جامہ کیا ہوا تعویذ اب بھی پٹے کے نیچے موجود تھا۔

”کیا کھوج رہا ہے مسلے۔ آج دھرتی کی کوئی شکتی تجھے شرن (پناہ) نہیں دے سکے گی۔ پرتاب نے تجھے جو شراپ دینے کی ٹھانی تھی، دیوی کی کرپا سے وہ آج ضرور پوری ہوگی، تو نے میرے ایک منتر کو کھوٹا کر کے کسی کی جان بچالی تھی۔ آج تجھے اس کی سزا اوش بھوگنی پڑے گی۔“

پرتاب کا نام سن کر لیاقت حسین کے وجود میں چنگاریاں چٹخنے لگیں، اس نے خدا کو دل سے یاد کیا پھر دل کڑا کر کے بولا۔ ”تم اپنی من مانی کر لو، لیکن میں جانتا ہوں کہ میں نے جو بھی کیا تھا وہ کسی کی زندگی بچانے کی خاطر خدا کا نام لے کر کیا تھا۔ اسی لازوال قوت نے آج تک میری مدد کی تھی اور اب بھی وہی میری حفاظت کرے گا۔“

”سپنے دیکھنا چھوڑ دے مورکھ۔ آج تو پوری طرح پرتاب کے بیروں کے چنگل میں پھنس گیا ہے اور..... اور تو جس دھرم کرم کی بات کر رہا ہے آج وہ بھی بھوانی کی کرپا سے نشٹ ہو جائے گا۔ ایک بار تو کنڈا اور پلید ہو گیا تو پھر کوئی شکتی تیری سہائتا بھی نہیں کرے گی۔“

لیاقت حسین نے جواب دینا چاہا لیکن کسی نے پیار سے اس کے گالوں پر ہاتھ پھیرا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ گیا، مدھم نائٹ بلب کی روشنی کے باوجود اس نے فرحین کو پہچان لیا جو اس کے قریب بیٹھی تھی، اس کے جسم پر ابھی تک وہی لباس تھا جسے پہن کر وہ راحیلہ بیگم کی طرف گئی تھی۔

”تم..... تم کب آئیں.....؟“ لیاقت حسین نے خواب کی باتوں کو ذہن سے جھٹک کر فرحین کو اپنی آغوش میں گھسیٹ لیا۔

”تیری خاطر بیگم صاحب سے بات بنا کر آئی ہوں..... چھوڑ تو سہی، لباس تبدیل کر لینے دے۔ دس پندرہ منٹ کا کہہ کر آئی ہوں، ابھی واپس بھی جانا ہے۔“

”ایک دن تو نے دفتر جاتے وقت میرا لباس خراب کیا تھا، آج تیری باری ہے۔“ لیاقت حسین نے فرحین کو پوری طرح دبوچ لیا، تو فرحین نے کہا۔

”دیکھ استری خراب ہو جائے گی..... ایک منٹ صبر کر لے، میں کہیں بھاگی نہیں جا رہی۔“ فرحین نے کسمسا کر لیاقت حسین کے بازوؤں کے حصار سے نکلنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے نیم عریاں گداز جسم سے پھوٹتی ہوئی مہک نے لیاقت حسین کو دیوانہ کر رکھا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ فرحین پر حاوی ہو رہا تھا جب اس کے کانوں میں ایک ٹھوس آواز ابھری۔

”سنبھل جانا دان ورنہ دلدل میں گر جائے گا۔ موم جامہ کیا ہوا تعویذ خاموشی سے نکال کر عورت کے سینے پر رکھ دے۔“

لیاقت حسین کی پیش قدمی رک گئی، تعویذ سے متعلق اس کے ذہن میں ماں کی باتیں گونجنے لگیں۔ ایک بار پہلے بھی وہ فرحین کے دھوکے میں غلاظت میں گرتے گرتے بال بال بچا تھا۔ آج کسی غیبی آواز نے اسے بروقت سنبھالا دیا تھا۔ اس نے فرحین کو غور سے دیکھا پھر اسے ایک ہاتھ کے حصار میں جکڑ لیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس دستی گھڑی کے پٹے کے نیچے دبا ہوا تعویذ نکالا تو فرحین کے روپ میں نظر آنے والی حسینہ نے مچلتے ہوئے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

”لیاقت۔ اتنی زور سے نہ بھینچ۔ میرا دم..... گھٹ رہا ہے۔“

”انسان پر مستی سوار ہو تو پرائی عورت کو بھی من مانی پوری کیے بغیر نہیں چھوڑتا۔ تو، تو اپنی فرحین ہے۔“ لیاقت حسین نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا پھر تعویذ عورت کے گداز سینے کے درمیان رکھا تو وہ یکلخت ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔ لیاقت حسین اچھل کر بستر سے نیچے آ گیا، عورت کا جسم پاؤں کی جانب سے بتدریج سیاہ شکل اختیار کر کے دھویں میں تحلیل ہو رہا تھا۔ لیاقت حسین نے کمرے کی بتی روشن کر دی، وہ پھٹی

www.pdfbooksfree.pk

پھٹی نظروں سے عورت کے بھیانک انجام کو دیکھ رہا تھا جب دروازے کی جانب سے ایک مکروہ آواز ابھری۔

''مسلے..... میری پجارن کو چھوڑ دے ورنہ میں تجھے کتے کی موت ماروں گا۔''

لیاقت حسین نے پلٹ کر دیکھا، دروازے کے بیچوں بیچ پرتاب بھوشن سینہ تانے کھڑا، اسے حقارت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا، اس کی آنکھوں میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ پجارن مدھو کی ہذیانی چیخ بہ دستور در و دیوار سے ٹکرا رہی تھی، جب ننگ دھڑنگ سیاہ فام اور مکروہ صورت پرتاب نے دوبارہ بل کھا کر کہا۔

''میرا کہا مان لے مسلے ورنہ تیرا انجام بھی بھیانک ہوگا۔ میں تیرے ہو تو سوتوں کو بھی دیکھ لوں گا جس شکتی نے تجھے ہتھیلی لگا رکھی ہے اس کی کھاٹ بھی کھڑی کر دوں گا۔''

لیاقت حسین کچھ جواب دینا چاہتا تھا جب بجلی کا ایک کڑاکا ہوا، پرتاب بھوشن کے چہرے پر مردنی چھا گئی، وہ تیزی سے پلٹ کر باہر کی طرف بھاگا۔ لیاقت حسین اس کے پیچھے لپکا لیکن وہ کہیں نہیں ملا تو وہ پلٹ کر اندر آ گیا۔ پجارن کی لاش جل کر کوئلہ ہو رہی تھی پھر اس نے راکھ کی شکل اختیار کی جس کے بعد ہوا کا ایک جھونکا آیا اور راکھ کو بھی سمیٹ لے گیا۔ اجلی چادر پر ایک معمولی سی سلوٹ کا نشان بھی نہیں تھا۔ تعویذ بھی غائب ہو گیا تھا۔

جو بھی ہوا وہ کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ لیاقت حسین نے اسی وقت غسل کر کے دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی پھر دوبارہ بستر پر لیٹ کر پرتاب بھوشن کے بارے میں سوچنے لگا۔

❁❁❁

سراج بھی اس وقت ایس پی اورنگ زیب کے دفتر میں موجود تھا چنانچہ اس کی کالیں بھی اورنگ زیب ہی کے فون پر آ رہی تھیں لیکن تمام کالیں ایک ہیڈ کانسٹیبل ریسیو کر رہا تھا۔ اورنگ زیب اور سراج دونوں ہی خاموش بیٹھے اپنی اپنی سوچ میں گم تھے جب پھر فون کی گھنٹی بجی اور حسب معمول ہیڈ کانسٹیبل نے کال ریسیو کی۔ اس بار اس نے یہ کہہ کر بات ٹالنے کی کوشش کی تھی کہ دونوں افسران باہر گئے ہوئے ہیں لیکن دوسری طرف سے جو بات کہی گئی اسے سن کر ہیڈ کانسٹیبل نے ایک کاغذ پر جلدی سے ڈبل ایکس فور لکھ کر اورنگ زیب کے سامنے رکھتے ہوئے فون پر کہا تھا۔

''میں غلط بیانی نہیں کر رہا ہوں جناب..... صاحب جیسے ہی واپس آئیں گے میں آپ کا پیغام.....''

اورنگ زیب نے کاغذ پر ڈبل ایکس فور لکھا دیکھ کر ریسیور ہیڈ کانسٹیبل کے ہاتھ سے جھپٹ لیا، معذرت کرتے ہوئے بڑی سادگی سے کہا۔ ''آئی ایم سوری سر..... لیکن میڈیا کے علاوہ دوسرے لوگوں نے جینا عذاب کر رکھا ہے۔''

''جانتا ہوں.....'' دوسری سمت سے ایک بھاری کم آواز گونجی۔ ''لیکن، کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہاری پلاننگ کامیاب ہو جائے گی؟''

''آپ کا تعاون شامل رہا تو مجھے کامیابی کی پوری امید ہے۔''

''جو کچھ کرنا ہاتھ پیر بچا کر کرنا، تمہارا آکٹوپس بھی اب سے اپنے تعلقات کو کھنگال رہا ہے۔ ایک بات اور بھی ابھی کچھ دیر پہلے ملٹری انٹیلی جنس کے سربراہ کی کال آئی تھی آکٹوپس کو کسی طرح خبر مل گئی ہے کہ گزشتہ رات کی کارروائی اسی کے کمانڈوز نے کی تھی۔ کیا تم کو علم ہے کہ کرنل احتشام اور تمہارا مطلوبہ مجرم دونوں کلاس فیلو بھی رہ چکے ہیں؟''

''جانتا ہوں سر..... اسی وجہ سے آکٹوپس نے اسے کال بھی کیا ہوگا۔''

''کیا مطلب؟'' دوسری جانب سے چونک کر وضاحت طلب کی گئی۔

جواب میں اورنگ زیب نے اپنی پلاننگ بتاتے ہوئے جو کچھ کہا اسے سن کر سراج بھی چونکا تھا۔

''میں تمہارے لیے صرف دعا ہی کر سکتا ہوں اورنگ زیب۔'' اس بار دوسری جانب سے بڑی اپنائیت سے کہا گیا۔ ''تم نے جو پلاننگ کی ہے وہ خدا کرے کامیاب ہو لیکن اگر..... آکٹوپس کو ایک لوز پوائنٹ بھی مل گیا تو وہ تمہاری بساط پلٹ بھی سکتا ہے۔''

''اکھاڑے میں جیت صرف کسی ایک ہی پہلوان کی ہوتی ہے سر..... لیکن میں نے جو ثبوت اب تک اکٹھا کر لیے ہیں اور جو ایکشن ابھی لینے ہیں ان کی کامیابی کے بعد وہ پوری طرح قانون کے آہنی شکنجوں میں ہوگا۔''

''او کے..... آئی وش یو گڈ لک۔'' دوسری جانب سے رابطہ ختم کر دیا گیا تو اورنگ زیب نے ریسیور کریڈل پر رکھنے کے بجائے دو نمبر گھما کر لائن انگیج کر دی پھر ہیڈ کانسٹیبل کو باہر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے سراج سے مسکرا کر پوچھا۔

''تمہارے ذہن میں کیا سوالات گونج رہے ہیں؟''

''وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی مردہ آدمی کے بھیس میں کسی اور آدمی کے ذریعے کنول کو اغوا کرا لینا ایک قابل تعریف عمل ہے لیکن کیا آپ کو امید ہے کہ وہ بھی آپ

کے حق میں بیان دے گی جبکہ وہ باقاعدہ آکٹوپس سے شادی بھی کر چکی ہے؟''

''ایسا ہی ہوگا اور یہ بھی ہمارے حق میں ایک پلس پوائنٹ ہوگا۔'' اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تم شاید یہ نہیں جانتے کہ کنول کے والد کو بھی اسی خون آشام آکٹوپس نے سربازار موت کے گھاٹ اتروا دیا تھا اور ایک مجبور عورت ترک کر رہ گئی تھی۔ آج بھی اس نے زبان بند کر رکھی ہے، اس وقت بھی خاموش رہی تھی جب آکٹوپس نے کنول کے ساتھ محض محفوظ عیاشی کی خاطر نکاح پڑھوایا تھا۔''

''حیرت انگیز.....'' سراج نے تعجب کا اظہار کیا۔ ''اتنے کم عرصے میں آپ نے آکٹوپس کے بارے میں اتنی ساری معلومات کیسے حاصل کر لیں؟ یہ بھی معلوم کر لیا کہ کرنل احتشام اس کا کلاس فیلو رہ چکا ہے اور.....''

''تمہارے سارے سوالات کے جواب میں ایک بات واضح کر دوں تو شاید تم آسانی سے سب کچھ سمجھ لو گے۔'' اورنگ زیب نے مسکرا کر کہا۔ ''آکٹوپس کو کیفر کردار تک پہنچانے کی خاطر مرکز کی جانب سے میرا انتخاب کیا گیا تھا چنانچہ میں نے یہاں ڈیوٹی جوائن کرنے سے پیشتر ہی بہت ساری معلومات حاصل کر لی تھیں جو، اب میرے لیے کارآمد ثابت ہو رہی ہیں۔ تمہیں شاید یہ سن کر تعجب ہوگا کہ تمہاری میڈم روبی کے شوہر خالد ریاض کی موت میں بھی اسی..... آکٹوپس کا ہاتھ تھا، نہ ہوتا تو میڈم اس کے خلاف محاذ قائم کرنے کی خاطر انڈر ورلڈ کے ان تین آدمیوں کی خدمات بھی کبھی نہ حاصل کرتی جن میں سے دو مر چکے ہیں، صرف لوچن زندہ ہے اور..... شبنم کی ماں انجلا عرف انجم آرا کی موت بھی اسی ایٹلس کی کمینگی تھی جو آج شیخ حامد کی صورت میں ایک عزت دار اور بااثر آدمی بنا بیٹھا نہ جانے کتنے شریف لوگوں کو اپنی خباثت سے پریشان کر رہا ہے۔''

اورنگ زیب بات کرتا رہا۔ سراج حیرت سے ٹکٹکی باندھے اسے گھورتا رہا پھر جب وہ خاموش ہوا تو سراج نے پہلو بدل کر پوچھا۔ ''آپ نے جہاں اتنی باتوں کا اعتراف کر لیا ہے وہاں ایک بات اور بتا دیں۔''

''میں سمجھ رہا ہوں.....'' جواب میں اورنگ زیب نے مسکرا کر کہا۔ ''تم شاید شبنم کے بارے میں دریافت کرنا چاہتے ہو؟''

''گویا آپ کو علم ہے کہ وہ کس طرح ہمارے ہاتھ سے نکل گئی اور اب کہاں ہوگی؟''

''ہاں..... مجھے اب بھی اس کی ایک ایک نقل و حرکت کی اطلاع ملتی رہتی ہے۔ افضل خان کو بھی دھواں دھار فائرنگ کے تبادلے کے بعد میرے ہی اشارے پر محفوظ راستہ دیا گیا لیکن اس کے ساتھ یہ بھی سن لو کہ شبم اور افضل خان کے فرشتوں کو بھی اس بات کا علم نہیں تھا کہ میری پلاننگ کیا تھی اور کیا ہے۔''

''آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا آکٹوپس بھی آپ کی تمام پلاننگ سے بے خبر ہوگا؟''

''اس کا اندازہ بھی مجھے ایک دو دن کے اندر ہو جائے گا۔''

جواب میں سراج کچھ اور معلوم کرنا چاہتا تھا کہ موبائل پر کسی کے نمبر روشن ہوئے۔ اورنگ زیب نے موبائل آن کرنے میں غیر معمولی جلد بازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کوئی نئی اطلاع..... آئی سی..... اوہ..... کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ اب بھی تمہارے ساتھ تعاون کرنے میں کسی ڈبل کراس کرنے کے منصوبے پر تو غور نہیں کر رہا..... او کے..... تم وہاں پہنچو میں کمانڈوز کے چیف آفیسر سے رابطہ قائم کرتا ہوں۔ اوہ یس..... ان دونوں کو ہر قیمت پر بچانا ہوگا۔''

اورنگ زیب نے موبائل بند کر کے جیب سے پھر وہی مخصوص آپریٹس نکال لیا جو موبائل کی طرح تھا، ضروری بٹن دبانے کے بعد اسکرین پر پھر ایک سرخ نقطہ ابھر کر حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ اورنگ زیب ایک منٹ اسے بہ غور دیکھتا رہا پھر اس نے دوسرے بٹن دبا کر سڑکوں کا وہ جال دیکھا جس پر نقطہ ایک مخصوص سمت میں حرکت کر رہا تھا۔ سراج حیرت سے اس ڈیوائس کو دیکھ رہا تھا جب موبائل پر دوبارہ سگنل موصول ہوا۔ اورنگ زیب نے دوسرے ہاتھ سے موبائل آن کر کے کان سے لگایا، اس کی نظریں بہ دستور آپریٹس کی اسکرین پر مرکوز تھیں لیکن موبائل پر جو اطلاع ملی اسے سن کر اس نے جواب میں صرف..... ''او۔کے'' کہا پھر آپریٹس کو میز پر رکھ کر اس نے بڑی سرعت سے کسی کے نمبر پنچ کرنے شروع کیے۔ رابطہ قائم ہونے کے بعد اس نے غیر معمولی سنجیدگی سے سرسراتی آواز میں کہا تھا۔

''سر..... میں ایس پی اورنگ زیب بول رہا ہوں..... جی ہاں، اٹ از ارجنٹ اینڈ ٹاپ پرائریٹی سر..... انڈر ورلڈ کا دہشت گرد اور زخمی و شنود دونوں ہمارے آدمیوں کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر فرار ہو گئے ہیں۔ جی ہاں، ابھی ابھی اطلاع ملی ہے..... ایک دو سپاہی زخمی بھی ہوئے ہیں، کچھ ذمے دار بے ہودگی کی کیفیت سے دوچار ہیں لیکن بہرحال، یہ میرے لیے

www.pdfbooksfree.pk

ایک پریشان کن اطلاع ہے..... فوری طور پر میں درخواست کروں گا کہ تمام آن ڈیوٹی افسران اور کانسٹیبلری اسٹاف کو معطل کر دیا جائے اور زیر حراست رکھا جائے لیکن میرا نام درمیان میں نہ آئے تو مناسب ہوگا..... جی نہیں، شاید ابھی ہمارے ڈی آئی جی کو اس کی اطلاع نہیں ملی..... تھینکس..... تھینک یو ویری مچ سر۔"

کال ختم کر کے اورنگ زیب آپریٹس ساتھ لیتا ہوا تیزی سے کرسی سے اٹھا۔ سراج اس کے ساتھ ہی دفتر سے نکلا، گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے دبی زبان میں پوچھا۔

"آپ کا کیا خیال ہے۔ لوچن اور وشنو کے فرار ہونے میں کس کا ہاتھ ملوث ہو سکتا ہے؟"

"یہ بعد میں دیکھا جائے گا..... فی الحال ہمیں شبنم اور اسلم ڈنکا کو بچانا ہے۔" اورنگ زیب نے گاڑی کی رفتار تیز کرتے ہوئے کہا، آکٹوپس نے جوابی کارروائی کے طور پر اب میری کچھ اہم شہادتوں کو ختم کرانے کا منصوبہ بنالیا ہے۔"

"کیا آپ کو علم ہے کہ شبنم اس وقت کہاں ہوگی؟"

"ہاں..... وہ اس وقت آکٹوپس کے ایک زرخرید کتے کے ساتھ اسلم ڈنکا کی طرف جا رہی ہے۔ اسے یقین دلایا گیا ہے کہ اسلم ڈنکا کو گولی مار دینے کے بعد وہ اس کی جگہ لے سکتی ہے لیکن ایسا نہیں ہوگا۔ اسلم کے مرتے ہی شبنم کو بھی گولی مار دی جائے گی۔"

"یہ بات آپ کو کس نے بتائی؟"

"میرے مخبر نے اور..... اسے اس شخص نے اطلاع دی ہے جو اس وقت شبنم کے ساتھ ہے، یہ بھی سن لو کہ وہ اسلم ڈنکا کا خاص الخاص آدمی ہے۔ نہ ہوتا تو اس قدر اہم بات کو زبان سے نکالنے کی جرأت کبھی نہ کرتا۔"

سراج نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اورنگ زیب کی زبانی پوری صورت حال معلوم ہو جانے کے بعد وہ دل ہی دل میں اورنگ زیب کی بے پناہ صلاحیتوں پر سنجیدگی سے غور کر رہا تھا جب ایک نیا خیال بھی اس کے ذہن میں تیزی سے ابھرا۔ "کہیں لوچن اور وشنو کے فرار میں بھی تو اورنگ زیب کی کسی پلاننگ کا دخل نہیں تھا؟"

اس کا ذہن آہستہ آہستہ بیدار ہو رہا تھا۔ یہ ظاہر وہ ابھی تک "ہست و بود" کی کیفیتوں سے دوچار تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ متحرک ہے لیکن کہاں؟ اس کا ذہن اس بات کی تصدیق کرنے سے قاصر تھا پھر ایک ٹھوس مردانہ آواز، اس کے کانوں میں پہلی بار واضح طور پر گونجی۔

"یہ مر گیا یا ابھی زندہ ہے؟"

"ابھی تک بے ہوشی کی کیفیت سے دوچار ہے۔" زنانی آواز میں جواب ملا۔ "ہم نے اسے تکلیف کی شدت سے نجات دلانے کی خاطر خواب آور انجکشن لگایا تھا۔"

"زخم کی کیا کیفیت ہے؟" بہ دستور خشک لہجے میں پوچھا گیا۔

"قسمت اچھی تھی جو ہڈی بچ گئی ورنہ زندگی لنگڑاتا رہتا۔"

آوازیں اب افضل خاں کے ذہن میں واضح طور پر گونج رہی تھیں۔ اس بات کا اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ وہ ابھی تک زندہ ہے لیکن آسمان سے آ کر کہیں کھجور میں ضرور اٹک گیا ہے، اس نے فوراً ہی آنکھ کھولنے کی غلطی نہیں کی۔ خود مدہوش ظاہر کرتا رہا مگر جب اس کے پیروں سے غالباً پٹیاں کھولی جا رہی تھیں تب زخم میں شدید تکلیف کے احساس نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے کراہتے ہوئے اس سفید کپڑوں میں ملبوس نرس پر نظر ڈالی جو اس کی بائیں پنڈلی کی پٹیاں تقریباً کھول چکی تھی۔ وہ تکلیف اسے زخموں پر لگے کسی ٹیپ کے ادھیڑنے سے ہوئی تھی۔ اس کی کراہ کی آواز سن کر نرس کی نظریں اس کے چہرے پر پڑیں۔

"گھبراؤ نہیں..... ابھی تم زندہ ہو۔" نرس نے تسلی آمیز ہمدردی کا اظہار کیا۔

"میں کہاں ہوں؟"

"خاموش رہو....." وہی مردانہ ٹھوس آواز داہنی جانب سے سرسراتی ہوئی ابھری پھر ایک درمیانہ قد کا شخص اس کے سامنے آ گیا، اس کی نظروں میں بھی ملی جلی کیفیتیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ افضل خاں نے فوری طور پر کوئی دوسرا سوال نہیں کیا۔ اسے اس بات سے طمانیت کا احساس ضرور ہوا کہ وہ اس وقت کسی اسپتال میں ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں گزرے واقعات کی یلغار شروع ہو گئی۔

بگ باس کی خوشنودی حاصل کرنے اور اسلم ڈنکا کو اپنی اہمیت کا احساس دلانے کی خاطر اس نے جگا کو اس کے ٹھکانے سے نکال کر تنہا قابو کرنے کی ٹھان لی تھی۔ امداد علی کو قابو کر لینے کے بعد اسے اپنی کامیابی یقینی نظر آ رہی تھی۔ صورت حال پوری طرح اس کے قابو میں تھی۔ امداد کے فون کرنے پر جگا نے اس سے ساحلی علاقے کے اسٹیک بار پر ملاقات کرنے کا وعدہ بھی کر لیا تھا پھر..... وقت مقررہ پر جگا ایک خیراتی ادارے کی ایمبولینس سے نکل کر سامنے آیا تو افضل خاں نے امداد علی سے بڑے خوفناک لہجے میں کہا تھا۔

"کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو میں تم دونوں کو جہنم رسید کرنے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کروں گا۔"

امداد علی کوئی جواب دینے کے بجائے خاموشی سے بائی روف سے نکل کر بڑے دوستانہ انداز میں جگا سے بغلگیر ہوا تھا جب افضل خان نے سامنے آ کر جگا کو للکارا تھا۔ اسے اپنی کامیابی یقینی نظر آ رہی تھی جب کسی نے پشت سے اس کی ٹانگ کا نشانہ لیا تھا۔ غیر متوقع شاندار کامیابی کے بعد ناکامی کے اس جھٹکے نے جیسے اس کے ذہن کو یکلخت مفلوج کر دیا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی تھی لیکن اسلحہ ہاتھ سے نکل جانے کے بعد زخم میں ہونے والی شدید تکلیف نے اس کے سنبھلنے اور سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتوں کو بیکار کر دیا..... اس کی پلکوں کے نیچے گھپ اندھیرے تیرنے لگے۔ اس کا ذہن چکرایا تھا پھر وہ بے ہوشی سے دوچار ہو کر ساحل پر گرا تھا اور..... اب ہوش آنے کے بعد وہ کسی اسپتال میں تھا جہاں اس کے زخم کا معائنہ کیا جا رہا تھا لیکن ڈاکٹر نظر آنے والے شخص کے سخت اور سرد طرز تخاطب نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے اردگرد نظر ڈالی، جگا یا امداد علی اسے نظر نہیں آئے۔ وہ ان کے بارے میں قیاس آرائی کر رہا تھا جب ڈاکٹر نے اس کی پشت پر کھڑے کسی شخص کو مخاطب کیا۔ "اس کو بستر پر لٹاؤ۔"

اس جملے کے بعد ہی افضل خان کو خیال آیا کہ وہ اس وقت وہیل چیئر پر تھا۔ ڈاکٹر کے اشارے پر وہ وارڈ بوائے بھی سامنے آ گیا جو اس کی وہیل چیئر چلا رہا تھا، اس نے ڈاکٹر کے حکم کی پیروی میں افضل خاں کو بڑی آسانی سے کرسی سے اٹھا کر قریبی بستر پر ڈال دیا جو مریضوں کے معائنے کے لیے مخصوص تھا۔

افضل خان دم سادھے خاموش پڑا رہا۔ زخم کے معائنے کے دوران نرس اس کو اسسٹ کرتی رہی، ڈاکٹر نے زخموں کو دوبارہ صاف کر کے اس پر ضروری دوائیں لگائیں پھر جتنی دیر میں وارڈ بوائے زخموں کی پٹی کرتا، نرس نے ڈاکٹر کے کہنے پر اس کے بازو میں ایک انجکشن لگا دیا۔

"باقی دونوں کا کیا حال ہے؟" ڈاکٹر نے نرس کو سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر زخموں کا بہ غور معائنہ کرنے لگا۔

"وہ دونوں نارمل نظر آ رہے ہیں۔"

"اسے واپس لے جا کر ان دونوں کے پاس چھوڑ دو اور....." ڈاکٹر نے ایک بار پھر افضل خان کو تیز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "میجر نصرت کو باور کرا دینا کہ زخم ایسا نہیں ہے کہ یہ مر جائے..... ایک دو پٹیوں کے بعد اس کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔" پھر وہ نرس کا جواب سنے بغیر کمرے سے لیفٹ رائٹ کرتا تیزی سے نکل گیا۔ وارڈ بوائے اور نرس نے افضل خاں کو ڈنڈا ڈولی کر کے پھر وہیل چیئر پر بٹھا دیا۔ پانچ منٹ بعد مختلف راہداریوں سے گزارنے کے بعد اسے ایک ایسے کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں تین اسٹول، ایک بینچ اور ایک آرام دہ کرسی کے سوا اور کوئی فرنیچر نہیں تھا۔

افضل خاں نے ایک ہی نظر میں پوری سچویشن کا بہ غور جائزہ لیا، اس کا ذہن گواہی دے رہا تھا کہ وہ کسی باقاعدہ اسپتال میں نہیں تھا، کسی خاص ایجنسی یا گروہ کی تحویل میں تھا جہاں اس کے زخم کی مرہم پٹی محض اس کو زندہ رکھنے کی خاطر کی گئی تھی۔ جگا اور امداد علی کے چہروں کے تاثرات کچھ اور کہہ رہے تھے۔ بہ ظاہر ان کے چہروں سے کسی تشویش کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ وارڈ بوائے اسے وہیل چیئر سے بینچ پر منتقل کرنے کے بعد باہر گیا تو دروازہ بھی باہر سے بولٹ کر دیا گیا۔ افضل خاں کا ذہن اس سچویشن کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا جب امداد علی کی سپاٹ اور خشک آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

"دیکھ لیا تو نے اپنی پھتے خانی کا نتیجہ..... تیرے ساتھ ہم بھی بلاوجہ رگڑے میں آ گئے۔"

"ہم اس وقت کس کی تحویل میں ہیں؟" افضل خان نے مجبوراً سوال کر لیا۔

"تم....." جگا نے اسے خونخوار نظروں سے دیکھا۔ "تم اس کو بھی اپنی سسرال ہی سمجھو جہاں تمہارے ساتھ ویسا ہی سلوک ہوگا جیسا پہلی بیوی کو چھوڑ کر دوسری بیوی لانے پر اس کے سسرال والے کرتے ہیں۔"

افضل خان نے کوئی جواب نہیں دیا، صرف جگا کو سرد نظروں سے دیکھنے پر اکتفا کیا۔

"ایک بات یاد رکھ ڈھیلے!" امداد علی نے اپنی سابقہ اور ٹھیٹ پولیس والوں کی زبان استعمال کی۔ "تو اب تک جس کھونٹے پر اچھل رہا تھا، اب وہ بھی تجھے ہتھیلی لگانے کی غلطی نہیں کرے گا۔ جانتا ہے کیوں؟..... ہم اس وقت ملٹری کی ہائی کمان کے چوہے دان میں پھنس گئے ہیں جہاں کسی کی دال نہیں گلے گی، ایک ہی جلاب میں سارا کھایا پیا باہر نکال لیا جائے گا۔"

"تمہیں اس کا اندازہ کیسے ہوا.....؟" افضل خاں ملٹری کی ہائی کمان کے حوالے پر چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

"بتی جل جانے دے۔ پھر جب اسی کال کوٹھری میں میجر نصرت کی عدالت دوبارہ سجے گی تو تجھے بھی آٹے دال کا

www.pdfbooksfree.pk

بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔'' جگا نے بل کھا کر کہا۔ ''اس کی موٹی فائل میں سب کا اعمال نامہ درج ہے، تیرے اس حرامی باس کا بھی جو تجھے چارے کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔''

افضل خان نے جگا اور امداد علی کو باری باری بہ غور دیکھا پھر غراتے ہوئے بولا۔ ''موٹی فائل میں تمہارے بھی سارے سابقہ کرتوت ضرور درج ہوں گے۔ کل جو سزا نہیں ملی وہ آج مل جائے گی پھر...... ساتھ ہی جیل میں چکی بھی گھما لیں گے۔''

''بات میری تیری نہیں ہے پاگل دے پتر......'' امداد علی نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ ''اصل چکر بلی کے گلے میں گھنٹی ڈالنے کا ہے۔ میں نے پولیس کے محکمے میں ایویں پاپڑ نہیں بیلے ہیں۔ ہمیشہ تیل اور تیل کی دھار پر نظر ٹکا کر رکھی ہے۔'' اس نے ذرا مدھم آواز میں ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ ''بات اب تیرے شیخ جی کی ڈگڈگی بجانے کی ہے۔ ملٹری کے بڑوں کو بھی شیخ ڈباپیر کی ہسٹری شیٹ مکمل کرنے کے لیے ٹھوس ثبوت کی ضرورت ہے۔ دو گواہوں اور وکیل کے بغیر نکاح بھی مکمل نہیں ہوتا۔ ہماری فکر میں دبلا ہونے کی مت سوچ۔ ہم نے شہادتوں کے خانے میں انگوٹھا لگانے کی سوچ لی ہے۔ تو اپنی فکر کر ورنہ کھاٹ کھڑی ہونے میں دیری بھی نہیں ہوگی...... شیخ کی ہتھیلی اب تیرے تھلے نہیں لگ سکے گی۔''

اس بار افضل خاں نے امداد علی کو معنی خیز نظروں سے دیکھا، کوئی جواب دینے کے بجائے اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات اس بات کی ترجمانی کر رہے تھے کہ اس وقت وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔

چار گھنٹے بعد کمرے کا دروازہ دوبارہ کھلا، دو فوجی جوان ایک میز لیے کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے آرام دہ کرسی اٹھا کر میز کے ساتھ رکھی پھر لائٹس جلا کر خاموشی سے واپس چلے گئے، جگا اور امداد علی سنبھل کر بیٹھ گئے، افضل خان بہ دستور لیٹا رہا۔ دونوں فوجیوں کے جانے کے بعد ایک حوالدار ہاتھ میں موٹی سی فائل دبائے اندر آیا۔ اس نے فائل میز پر رکھ کر باری باری تینوں کو گہری نظروں سے دیکھا پھر افضل خاں کو مخاطب کر کے کرخت لہجے میں بولا۔

''اٹینشن ہو کر بیٹھ جاؤ ماسٹر، تمہاری میڈیکل رپورٹ بھی اسی فائل میں ہے۔ خوش قسمت ہو جو گولی نے ہڈی کو ہٹ نہیں کیا ورنہ اپاہج بھی ہو سکتے تھے۔''

افضل خاں خاموشی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دروازہ تیسری بار کھلا تو جگا اور امداد علی بھی سنبھل کر سیدھے ہو گئے۔ آنے والا میجر نصرت ہی تھا جسے وہ پہلے بھی دیکھ چکے تھے، کمرے میں داخل ہو کر میجر نصرت کی تیز نظریں افضل خان کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ وہ درمیانہ قد اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا، اس کی عقابی نظروں میں ذہانت کی مخصوص چمک تھی۔ افضل خاں کی نظریں بھی میجر سے چار ہو رہی تھیں۔ ایک منٹ بعد ہی اس نے نظریں جھکا لیں، میجر نصرت کی نظروں میں کوئی ایسی ہی خاص بات تھی جو وہ اس سے دیر تک نظریں نہیں ملا سکتا تھا۔ اس کے وجود میں اتھل پتھل شروع ہو گئی۔

میجر کچھ دیر کسی چٹان کی طرح اپنی جگہ کھڑا افضل خان کو گھورتا رہا پھر اس نے آرام کرسی پر بیٹھ کر موٹی فائل کھول لیا، کچھ دیر اس کے صفحات کو الٹتا پلٹتا رہا پھر ایک صفحے پر پہنچ کر وہ رک گیا، کاغذات کے اندراجات کو دیکھتا رہا پھر اس نے نظریں اٹھا کر دوبارہ افضل خان کو دیکھا۔

''تمہارا اصل نام کیا ہے؟'' اس نے ٹھوس اور تحکمانہ ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''محمد افضل......''

''خاں کا اضافہ کب اور کیسے ہوا......؟'' میجر کے لہجے میں کوئی خاص بات تھی جو افضل خاں کسمسا کر رہ گیا۔ ذرا تھم کر بولا۔

''یہ نام میرے باس نے ملازمت کے بعد رکھا تھا......''

''ملازمت سے پہلے تم کیا کرتے تھے؟'' میجر کی تیز نظریں بہ دستور افضل خاں کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''پولیس کی نظروں سے چھپتا پھرتا تھا۔'' افضل خان نے اس بار اپنی مظلومیت کا اظہار کیا۔ ''میرے خلاف کچھ ایسے بے بنیاد کیس بنائے گئے تھے جن کا براہ راست میری ذات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔''

''آئی۔ سی......'' میجر نے الفاظ چباتے ہوئے کہا۔ ''جس کیس میں تمہیں پھنسایا جا رہا تھا اس کی نوعیت کیا تھی؟''

''ایک بڑے وی آئی پی کی نوجوان لڑکی کے ریپ کا چکر تھا۔''

''اس لڑکی کا نام گل رخ تھا جو میڈیکل کالج میں پڑھ رہی تھی۔ اسے کالج سے واپس جاتے وقت راستے سے اغوا کر لیا گیا۔ اغوا کرنے والے اس کو ایک وین میں ڈال کر سینڈس پٹ لے گئے جہاں دو آدمیوں نے اس کی آبرو لوٹی

اور تیسرا مووی بناتا رہا۔ اس کے بعد لڑکی کے باپ سے تین کروڑ کا مطالبہ کیا گیا۔ رقم مل جانے کے بعد اغوا کرنے والوں نے ویڈیو کی واپسی کے لیے بھی سودے بازی کی لیکن ان کا اعتماد انہیں لے ڈوبا۔ پولیس کے ماؤس ٹریپ (MOUSE TRAP) میں ایک آدمی رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ دوسرا فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔''

''مجھے اتنی تفصیل نہیں معلوم لیکن پولیس نے میرا نام بھی اس کیس میں شامل کر لیا تھا۔'' افضل خان نے سنبھل کر معصوم بننے کی کوشش کی۔

''جس آدمی نے مووی بنائی تھی اس کا نام جانتے ہو......؟''

''جناب...... جب میں اس کیس میں شامل ہی نہیں تھا تو کسی کا نام......''

''میں بتاتا ہوں......'' میجر زہرخند سے بولا۔ ''اس کا نام باسٹرڈ...... سن آف اے بچ تھا۔''

افضل خاں کسمسا کر اپنی معصومیت کا اظہار کر رہا تھا، جب میجر نصرت نے ایک تصویر فائل سے نکال کر اس کی طرف اچھالی۔ تصویر پر نظر پڑتے ہی اس کے دیوتا کوچ کر گئے۔ وہ افضل خان کی اپنی ہی تصویر تھی جسے ایسے مخصوص زاویے سے کھینچا گیا تھا کہ اس کے چہرے کے علاوہ ایک شخص کو لڑکی کو ریپ کرتے ہوئے بھی پیش منظر میں رکھا گیا تھا۔ تصویر پر نظر پڑتے ہی خود افضل خاں بھی چکرا گیا۔

''میرے پاس وقت کم ہے افضل خاں......'' میجر نے بڑے زہریلے انداز میں بات آگے بڑھائی۔ ''اسی تصویر کے ذریعے تمہیں ملازمت ملی، پولیس کے ہاتھوں سے بچانے کی یقین دہانی کرائی گئی۔ تمہاری کرمنل ہسٹری کی فائل کو سرد خانے میں ڈلوا دیا گیا جس میں تم پولیس کو درکار تھے، اب کیا کہو گے؟''

افضل خان نے جواب نہیں دیا، حالات اور تصویری ثبوت کی بنا پر اس نے خود کو ٹھنڈا ہی رکھنے کی ٹھان لی تھی۔

''اب تم کہاں ملازم ہو......؟''

''فی الحال......''

''ون منٹ......'' میجر نصرت نے کرخت لہجے میں اسے تنبیہہ کی۔ ''یہ سوال انکوائری نہیں ہے۔ ہیرا پھیری کرو گے تو پھر گلے گلے تک پھنس جاؤ گے۔ سچ اگل دو گے تو کچھ رعایت بھی حاصل کر سکتے ہو...... اب جواب دو...... تم ابھی تک کس کے اشارے پر چل رہے ہو؟...... جگا اور امداد علی سے تمہاری کیا ذاتی دشمنی تھی جو تم نے ایک کے ذریعے دوسرے کو پھانسنے کی کوشش کی تھی؟''

''مجھے اس کی ہدایت اسلم ڈنکا نے دی تھی۔ وہ بھی پولیس کو مطلوبہ مجرموں کی فہرست میں شامل ہے۔'' افضل خان نے پھر بات گھمانے کی کوشش کی لیکن خود گھوم کر فرش پر اوندھے منہ گر پڑا۔ میجر نصرت کی انگلی کے اشارے کے ساتھ ہی حوالدار کا ہاتھ بھی گھوم گیا تھا، ضرب گدی پر لگی اور اتنی شدید تھی کہ افضل خاں کی نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ اس ہاتھ میں لوہے سے زیادہ سختی اور وزن تھا۔

میجر کی کرخت آواز پھر ابھری۔ ''تم ابھی تک کس کے اشارے پر چل رہے ہو؟''

''وہ بہت دن ہوئے مجھے ملازمت سے برطرف کر چکا ہے لیکن اس کے آدمی اب بھی اسی کے حوالے سے مجھے کام کرنے پر مجبور......''

''ڈونٹ بیٹ اباؤٹ دی بش۔'' میجر کے تیور خطرناک ہونے لگے۔ ''اس بل ڈاگ کا نام کیا تھا؟''

''ش...... اے...... شیخ حامد۔'' افضل خاں نے دبی زبان میں اقرار کر لیا۔

''گڈ......'' میجر نصرت نے کرسی سے اٹھ کر اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں ابھی جو تصویر دکھائی گئی تھی وہ بھی اسی کے آدمیوں نے تمہیں پالتو کتوں کی طرح مالک کے اشاروں پر دم ہلانے کی خاطر اتاری تھی۔ فار ون ریزن اونلی...... تاکہ تم بھونک نہ سکو...... انڈر اسٹینڈ۔''

افضل خان نے خاموشی ہی میں نجات سمجھی۔ میجر نصرت نے تیزی سے پلٹ کر امداد علی کی سمت دیکھا۔

''تمہارے سابقہ ریکارڈ میں زیادہ کچرا نہیں ہے لیکن...... پولیس کی ملازمت اور معمولی تنخواہ کے باوجود تمہارے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی کہ تم نے اپنا ذاتی کاروبار شروع کر دیا۔ ہماری انفارمیشن کے مطابق جگا کو بھی تم ہی نے سرمایہ دے کر اسٹیبلش کیا تھا؟''

''یہ سب مال غنیمت اور اوپر کی کمائی کا کرشمہ ہے صاحب بہادر۔'' امداد علی نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ ''تھانے اور کچہریوں میں جس کی گوٹ بھی پھنس جاتی تھی وہ شارٹ کٹ اختیار کرنے کی خاطر مال پانی خرچ کرنے سے دریغ بھی نہیں کرتا تھا۔ میں صرف اپنے تعلقات کو کیش کرتا تھا صاحب بہادر۔ البتہ لمبی رقم میں کبھی ڈنڈی مارنے سے بھی نہیں چوکتا تھا۔ جب چار پیسے جمع ہو گئے تو میں نے پولیس کی ملازمت پر بھی چار حروف بھیج دیے۔ یہ اوپر والے کی مہربانی تھی کہ دھندا مندا نہیں ہوا۔'' امداد علی نے بات جاری رکھی۔

www.pdfbooksfree.pk

''جہانگیرے (جگا) سے پرانی یاری تھی صاحب بہادر اس لیے میں نے اسے بھی سیدھے راستے پر لگانے کی خاطر.....''

''شیخ حامد سے تمہاری کیا دشمنی ہے.....؟'' میجر نے اس کی بات کاٹ کر سوال کیا۔

''جگا کی وجہ سے وہ بلافضول مجھ سے ادھار کھانے لگا ہے جناب ورنہ کہاں راجا بھوج اور کہاں گنگو تیلی۔''

''مسٹر جہانگیر بٹ.....'' میجر نے جگا کی طرف دیکھا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ تم نے سیدھے سادھے کاروبار کے ساتھ کچھ غنڈے بھی پال رکھے ہیں جن کی خدمات منہ مانگی اجرت وصول کرنے کے بعد فروخت کرتے ہو؟''

''میں انکار نہیں کروں گا جناب۔'' جگا نے صاف گوئی سے کہا۔ ''ایک بار پولیس کے رگڑے میں پھنسنے کے بعد میں نے اپنے ہاتھ مضبوط کرنے کی خاطر کچھ سر پھروں کی ٹولی بنالی ہے۔ نہ بنائی ہوتی تو شاید بے گناہ ہونے کے باوجود شیخ حامد کے عتاب کا شکار ہوگیا ہوتا۔ اس کے علاوہ پولیس کا بھتہ بھی دیتا رہتا ہوں۔''

میجر نصرت کچھ دیر جگا اور امداد علی کو کریدتا رہا پھر اس نے افضل خاں کی طرف دیکھا جس نے ابھی تک زمین سے اٹھنے کی غلطی نہیں کی تھی۔ ''اب تمہارا کیا فیصلہ ہے؟'' اس نے دوٹوک لہجے میں بات کی۔ ''کیا اب بھی شیخ حامد کے اشاروں پر ناچو گے یا اس کے خلاف گواہی دینے کو ترجیح دو گے.....؟ تمہارے پاس کوئی تیسرا آپشن نہیں ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں صاحب بہادر..... ملٹری والے جب دم پر پاؤں رکھ دیں تو حکومت کا تختہ بھی الٹ پلٹ ہوجاتا ہے۔'' امداد علی نے افضل خاں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''یہ کس کھیت کی.....''

''شٹ اپ.....'' میجر نصرت نے ڈپٹ کر امداد سے کہا تو وہ ہاتھ باندھ کر سمٹ گیا۔

افضل خاں کے چہرے سے یتیمی برس رہی تھی، وہ ابھی کسی آخری فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا جب کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک جونیئر آفیسر نے اندر داخل ہوکر ہاتھ میں دبا کورڈلیس میجر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''سر..... چیف آن دی لائن۔''

میجر نے کورڈلیس لے کر کانوں سے لگالیا۔ اس کے ''ہیلو سر.....'' کہتے ہی دوسری جانب سے کہا گیا۔

''فوری طور پر ایس پی اورنگ زیب سے رابطہ قائم کرو۔ اس کے پاس تین اہم نفری اور موجود ہیں جو ہمارے لیے بے حد کارآمد ثابت ہوں گی۔''

''کیا انہیں بھی ہیڈ کوارٹر لانا ہے؟''

''یس..... بی کوئیک۔'' دوسری جانب سے مختصر جواب کے ساتھ ہی رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ میجر نے کورڈلیس جونیئر آفیسر کے حوالے کرتے ہوئے افضل خان کی طرف دیکھا۔

''میں تمہیں صرف کل صبح تک کی مہلت اور دے رہا ہوں۔ اچھی طرح سوچ لو کہ تمہیں آخری جواب کیا دینا ہے۔''

پھر اس سے پیشتر کہ افضل خان کوئی جواب دیتا میجر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ ایک منٹ بعد ہی وہ ایس پی اورنگ زیب سے فون پر گفتگو کر رہا تھا۔

☆☆☆

چینی باشندے لوچن اور رام دیال کے فرار کی خبر کے ساتھ ان کی نگرانی پر مامور تمام چھوٹے بڑے افسران کی فوری معطلی کی خبر نے جہاں ایجنسی کے لوگوں کو حیران کر دیا، وہاں عوام کو بھی پولیس کے خلاف زہر اگلنے کا موقع مل گیا تھا۔ ہر جانب سے پولیس کی کارکردگی پر لعن طعن ہو رہی تھی، کاروباری حلقے کے افراد بھی شور مچا رہے تھے لیکن شیخ حامد اس خبر کو پڑھ کر بری طرح تلملا رہا تھا۔ کچھ دوسرے لوگوں کی طرح یہ بات خود اس کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہی تھی کہ وہ دونوں ایس پی اورنگ زیب جیسے دوراندیش اور ایماندار آفیسر کی نگرانی میں ہونے کے بعد کس طرح فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ اس کا شیطانی ذہن اس خبر کو آسانی سے من وعن تسلیم کر لینے پر آمادہ نہیں تھا۔

شیخ حامد کو لوچن سے زیادہ رام دیال کی فکر تھی جسے اس نے آڑے وقتوں کے لیے آخری حربہ سمجھ کر بہت سنبھال کر رکھا تھا۔ وشنو کی حیثیت سے پڑوسی ملک میں بھی اس کی دہشت گردی کا ڈنکا بج چکا تھا۔ بے شمار وارداتوں میں ملوث ہونے کے باوجود وہ ایک بار بھی کسی ایجنسی کی لسٹ پر خطرناک مجرم کی حیثیت سے درج نہیں کیا گیا تھا۔ اس کا طریقۂ واردات ہی کچھ ایسا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح عدالت سے صاف بچ نکلتا تھا لیکن اس کی اپنی بیوی ہی اس کے حق میں دشمن ثابت ہوئی تو اس کے پاس سرحد پار کر جانے کے سوا دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔ وہ کلونت سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ عورتوں کی اس کے لیے کوئی کمی نہیں تھی لیکن کلونت کور گھر کی صاف ستھری ہانڈی تھی جسے نظرانداز کر کے اس نے کبھی باہر کی کسی ''چٹپٹی ڈش'' پر بھی ہاتھ صاف کرنے کی بھول نہیں کی تھی لیکن جب ایک دن اس نے کلونت کو اپنے ہی ایک ساتھی کے ساتھ الٹ پلٹ کرتے دیکھ لیا تو اس سے

برداشت نہ ہوسکا۔ رام دیال خود چشم دید گواہ تھا اس لیے اسے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں تھی، کلونت کی بے وفائی نے اس کی ساری سوجھ بوجھ اور دوراندیشی چھین لی، اس نے اپنے ساتھی کے جسم کو گولیاں مار مار کر چھلنی کر دیا پھر اس نے کلونت کی طرف خونی نظروں سے گھورا۔

''میں نردوش ہوں رام دیال۔'' کلونت نے بپھرتے ہوئے اپنی بے گناہی کا ثبوت دیا۔ ''واگرو کی سوگند، میں اسے تیرا دوست سمجھ کر ہنس بول لیا کرتی تھی لیکن آج اس پاپی کے من میں شیطان آگیا تھا، میں نے لاکھ بنتی کی پر نتو.....''

''مجھے تجھ پر پورا پورا وشواس ہے کلونت!'' رام دیال نے آگے بڑھ کر کلونت کے گدرائے ہوئے جسم کو ایک آخری بار اپنے بازوؤں میں جکڑ کر پیار کرنا چاہا لیکن پھر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ پلک جھپکتے میں اس نے کرپان نکال کر کلونت پر پے در پے وار کرنے شروع کر دیے۔ کلونت کے انگ، انگ سے خون کا فوارہ ابلنے لگا، وہ دہائی دیتی رہی لیکن جب تک رام دیال نے اسے کرپان مار مار کر ناقابل استعمال نہیں بنا دیا اس کا ہاتھ چلتا ہی رہا پھر جب کلونت کی بڑی بڑی آنکھیں اس کے حلقوں سے ابل کر باہر آگئیں، وہ تیورا کے اس کے قدموں پر اوندھی گر گئی تو رام دیال اس پر تھوک کر باہر جانے کے لیے پلٹا لیکن اسے دیر ہوچکی تھی۔ کلونت کی چیخ وپکار سے اس کے دروازے پر پورا محلہ جمع ہوگیا تھا۔ کسی نے پولیس کو بھی اطلاع کر دی تھی۔

رام دیال نے بازی پلٹتے دیکھی تو بھاگ کر چھت پر پہنچ گیا۔ ایک دوسرے سے ملی جلی چھتوں نے آسانیاں فراہم کر دیں، وہ ایک دوسرے کو پھلانگتا ہوا آخری مکان کی چھت تک پہنچ گیا۔ یہ اس گاؤں کا آخری مکان تھا جس سے چار فرلانگ دور پڑوسی ملک کی سرحد تھی۔ سرحد کے باشندے ایک دوسروں سے ضرورت کی چیزوں کا تبادلہ کرتے رہتے تھے اس لیے وہاں سختی بھی زیادہ نہیں تھی۔

رام دیال کو بارڈر کراس کرنے میں معمولی رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن جب اس نے اپنا بھرا ہوا بٹوا، سونے کی گھڑی، ہیرے کی انگوٹھی کے علاوہ بدن کے قیمتی کپڑے بھی داؤ پر لگا دیے تو اسے چیک کرنے والوں نے اپنی آنکھیں دائیں بائیں کر لیں۔ رام دیال پل بھر میں کوسوں کا فاصلہ طے کر کے آبادی تک پہنچ گیا۔ دو رات تک وہ ایک واقف کار کے گھر رکا رہا پھر وہاں سے بڑے شہر آگیا جہاں قسمت نے یاوری کی تو بلیک ٹائیگر نے اسے رام دیال کی حیثیت سے شناخت کر لیا پھر بلیک ٹائیگر کی سفارش پر ہی شیخ حامد نے اپنے برے دنوں کے لیے سنبھال کر رکھ لیا تھا۔ رام دیال کے بجائے اسے دوبارہ وشنو کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ وشنو کی حیثیت سے اس نے بلیک ٹائیگر کے ساتھ مل کر کئی اہم اور خطرناک معاملات میں اپنے جوہر دکھائے تو شیخ حامد کی نظروں میں اس کی اہمیت بھی بڑھ گئی۔ اس نے وشنو کو بہت سنبھال کر کسی خاص موقعے پر استعمال کرنے کو محفوظ کر لیا تھا۔

اورنگ زیب کے ہاتھ لگ جانے کے بعد بھی شیخ حامد کو یقین تھا کہ وشنو کی اصلیت نہیں کھلے گی۔ اس کا جرم اتنا سنگین بھی نہیں تھا کہ قانون اسے لمبی سزا دیتا لیکن لوچن نے اسے شناخت کر لیا تھا۔ یہ بات شیخ حامد کے علم میں نہیں تھی۔ یہ اندر ہی اندر لوچن اور وشنو کے درمیان ایک کھچڑی پک رہی تھی لیکن وہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ لوچن اس کے کسی مخالف گروہ کا نمائندہ ہے۔ وشنو یا رام دیال کی اصلیت کھل جانے کے بعد بات بگڑ بھی سکتی تھی۔

شیخ حامد کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے براہ راست مرکز میں اپنے ایک زرخرید اعلیٰ عہدے دار کو فون کیا۔ رابطہ قائم ہونے کے بعد اس نے ادھر ادھر کی دوستانہ باتوں کے بعد چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''دو اہم مجرموں کے فرار کے علاوہ ان کی نگرانی پر مامور عملے کی معطلی کی اطلاع آپ کو بھی ضرور ملی ہوگی؟''

''جی ہاں..... ڈی آئی جی نے انفارم کیا تھا۔ ان کا خیال ہے کہ انہیں جلد دوبارہ گرفتار کر لیا جائے گا۔''

''کیا آپ کو اس بات کا علم ہے کہ وہ دونوں براہ راست آپ کے ایس پی اورنگ زیب کی نگرانی میں تھے؟''

''جی ہاں..... اور اسی کے کہنے پر تمام عملے کو معطل بھی کیا گیا ہے۔'' دوسری جانب سے بے پروائی سے جواب دیا گیا۔

''جو افراد فرار ہوئے ہیں ان میں ایک چینی باشندہ ہے، لوچن جو انڈر ورلڈ کا آدمی ہے، جس نے میرے آفس کو آگ لگانے میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ اس موقع پر اس کا ایک ساتھی بھی مارا گیا تھا اور دوسرا.....'' شیخ حامد نے کچھ توقف سے کہا۔ ''دوسرے کی اصلیت کا علم اگر پڑوسی ملک کو ہوگیا تو پھر یہ معاملہ بین الاقوامی طور پر بھی سنگین صورت اختیار کر سکتا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں؟'' دوسری جانب سے بے حد سنجیدگی سے پوچھا گیا۔ ''کون تھا وہ.....؟''

www.pdfbooksfree.pk

"ایک انتہائی خطرناک مجرم جو انٹرپول کی فہرست میں بھی ہے لیکن ابھی تک اسے گرفتار نہیں کیا جاسکا، شاید اس لیے کہ ابھی تک قانون کے پاس اس پر ہاتھ ڈالنے کی خاطر کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے۔"

"آپ کو اتنے اندر کی بات کس طرح معلوم ہوئی؟" دوسری جانب سے سنجیدگی سے پوچھا گیا۔

"جب آپ حضرات نے اورنگ زیب کو یہاں تعینات کیا وہ بلاوجہ میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔" شیخ حامد کے شیطانی ذہن نے فوری طور پر ایک کہانی گھڑ لی۔ بڑی چالاکی سے زہر چھڑکتے ہوئے بولا۔ "میں نے بھی چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں جو ایک ایس پی کے سامنے گھٹنے ٹیک دوں، اس کے کچھ چہیتے میری جیب میں بھی پڑے ہیں جو خاص خاص باتیں پہنچاتے رہتے ہیں۔ چینی اور دوسرے شخص نے ایک دوسرے کو شناخت کرلیا تھا پھر....." شیخ حامد نے ایک لمحے کی معنی خیز خاموشی کے بعد سرسراتے لہجے میں کہا۔ "میرا ذاتی خیال ہے کہ ان کے فرار میں بھی کوئی مصلحت یا ذاتی لالچ شامل رہی ہوگی۔"

"ایس پی ٹھوس اصولوں کا مالک ہے، اس کے علاوہ اس کے اپنے بھی کچھ تعلقات ہیں جس کی وجہ سے وہ کسی سے بلاوجہ مرعوب نہیں ہوتا لیکن....." دوسری طرف سے ٹھوس لہجے میں کہا گیا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے کہ وہ کسی قیمت پر بھی کبھی غیر قانونی حرکت میں ملوث نہیں ہوسکتا۔ ممکن ہے آپ کے مخبر نے محض حالات کے پیش نظر موقعے سے فائدہ اٹھانے کی خاطر آپ کو ایک بے بنیاد ٹپ دے دی ہو؟"

"مجھے امید تھی کہ آپ کو میری بات کا یقین نہیں آئے گا۔" جواب میں شیخ حامد نے دبی زبان میں کہا۔ "بہرحال، آپ جس کرسی پر بیٹھے ہیں اس کا دائرہ اختیار بھی خاصا وسیع ہے۔ کبھی موقع ملے تو پڑوسی ملک کے اپنے ہم منصب سے وشنو اور رام دیال کے نام لے کر ان کا باہمی تعلق دریافت کرنے کی زحمت ضرور گوارا کرلیجیے گا۔ ہوسکتا ہے کہ اس طرح آپ کو لوچن اور دوسرے فریق کے فرار ہونے میں کچھ اہم ہاتھ بھی ملوث نظر آجائیں۔"

"ون منٹ مائی ڈیئر....." دوسری جانب سے یکلخت سنجیدگی سے کہا گیا۔ "وشنو..... میرا خیال ہے کہ یہ نام میں پہلے بھی کہیں سن چکا ہوں۔ کہاں؟ اس وقت یاد نہیں آرہا۔"

"آپ مصروف شخصیت کے مالک ہیں جناب، میں نے آپ کا خاصا قیمتی وقت لے لیا۔ اب اجازت چاہوں گا۔" شیخ حامد نے پہلی بار انکساری کا مظاہرہ کیا۔ "پھر کبھی سلام دعا کرلوں گا۔"

"نہیں مائی ڈیئر..... تم نے اس وقت میرے ذہن کو کچھ الجھا دیا ہے، مجھے وشنو کے بارے میں اور کچھ بتاؤ..... پلیز۔"

"آپ کی ملٹری کے ذہین افسروں میں ایک نام کرنل احتشام کا بھی آتا ہے۔ اس سے رابطہ کرلیں، ممکن ہے وہ میرے مقابلے میں آپ کو زیادہ تفصیل سے آگاہ کرسکے۔ میں ایک دو دن میں..... دوبارہ کال کروں گا۔"

شیخ حامد نے رابطہ منقطع کردیا، اس کے چہرے پر دستور غور و فکر کے گہرے تاثرات طاری تھے۔ اس کے کار کے آدمی آہستہ آہستہ کم ہو رہے تھے۔ بلیک ٹائیگر کی موت کے بعد سے قسمت اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ جگا اور افضل خان کا ملٹری کی تحویل میں ہونا بھی اس کے لیے کوئی اچھا شگون نہیں تھا، اورنگ زیب آہستہ آہستہ اس پر حاوی آنے کی کوشش کر رہا تھا، اسے اپنے سوا کسی اور کی برتری منظور نہیں تھی، اسلم ڈنکا ایک کارآمد آدمی تھا لیکن وہ بھی افضل خان کو سر اٹھانے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا شاید اسی لیے جگا اور امداد علی کو قابو کرنے کا پروگرام عین وقت پر خراب ہوگیا تھا۔ شیخ حامد کو اس پلٹتی ہوئی بازی کے پیچھے اسلم ڈنکا کا ہاتھ محسوس ہوا تو اس نے شبنم کے ذریعے اسے بھی ٹھکانے لگانے کی سوچ لی تھی۔ ایک تیر سے اس نے کئی نشانے لینے کی جو کوشش کی تھی وہ اسی کی کامیابی کی خوشخبری سننے کا منتظر تھا۔ ابھی اس کے پالتو شکاری کتوں میں کچھ ایسے کارآمد لوگ اور بھی تھے جو پٹے ہوئے مہروں کی جگہ لے سکتے تھے۔

اورنگ زیب کے شکوک و شبہات کو ختم کرنے کی وجہ سے اس نے اسلم ڈنکا اور شبنم دونوں کو ایک ہی جھٹکے میں راستے سے ہٹانے کی چال چلی تھی۔ اس کے بعد اس کے ذہن میں صرف وشنو کا نام تھا جو اورنگ زیب کے مقابلے میں کام آسکتا تھا لیکن اس کے اور لوچن کے فرار ہوجانے کے بعد وہ مزید کوئی رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ اس کا ذہن کسی اور متبادل کے بارے میں غور کر رہا تھا جب اس کے موبائل پر سگنل ملا، روشن اسکرین پر وہی نمبر نظر آرہا تھا جس نے شیخ حامد کو یہ بتایا تھا کہ جگا، امداد علی اور افضل خان کسی ایجنسی کی تحویل میں تھے، اس کی اطلاع غلط بھی نہیں تھی۔ ایک لمحے تک وہ اس نمبر کو بہ غور دیکھتا رہا پھر ٹھوس آواز میں بولا۔

"اس وقت کیسے یاد کیا؟"

"تمہیں یہ باور کرانے کی خاطر کہ اب ایس پی اورنگ زیب کا حلقہ تمہارے گرد آہستہ آہستہ تنگ ہوتا جارہا ہے۔"

"میں شام کو شائع ہونے والے اخباروں کی بے سروپا خبروں پر زیادہ غور نہیں کرتا۔" شیخ حامد نے جھلا کر کہا۔

"صبح کے اخباروں میں جو خبریں شائع ہوئی ہیں، اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"کیا کہنا چاہتے ہو..... کھل کر کہو....."

"تم نے استاد کے بارے میں میرا کام آسان کرکے جو احسان کیا ہے اس کا بدلہ چکانا چاہتا ہوں۔" اس بار سنجیدگی سے کہا گیا۔ "لوچن اور دوسرے قیدی کا فرار محض تمہاری آنکھوں میں دھول جھونکنے کا ایک ڈراما ہے۔ جو پہریدار معطل ہوئے ہیں اس میں بھی تمہارے ایس پی کا خاص دخل ہے۔"

"تم نے جگا کو چھڑانے کی خاطر اب تک کیا تیر مار لیا ہے؟" شیخ حامد نے بل کھا کر پوچھا۔

"ہم نے سارا پروگرام مکمل کرلیا ہے۔ دو روز بعد تم کو بھی حالات کا علم ہوجائے گا۔ اس کے بعد ہی میں تمہیں ایک آخری مشورہ اور دوں گا۔ عمل کرنا نہ کرنا تمہارے اختیار کی بات ہوگی۔"

"اس وقت کس مقصد سے فون کیا تھا.....؟"

"کھوپڑی کو ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کیا کرو شیخ حامد..... زیادہ گرمی کھانے سے ذہنی صلاحیتیں بھی آہستہ آہستہ زنگ آلود ہونے لگتی ہیں۔" بے پروائی سے کہا گیا۔ "قسمت ساتھ نہ دے تو پانسے بھی دغا دے جاتے ہیں۔ صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ تم نے شبنم اور اسلم ڈنکا کے لیے جو فیصلہ کیا تھا وہ بھی تمہاری جلد بازی تھی۔ تم شاید بھول گئے تھے کہ جو آدمی شبنم کو لے کر اسلم کی طرف گیا وہ اس کا خاص آدمی ہے اور..... خاص لوگ خاص خاص موقعوں پر ہی کام دکھاتے ہیں۔ دو روز بعد تمہاری خیریت دوبارہ دریافت کروں گا..... بائی۔"

دوسری جانب سے ایک معنی خیز جملہ کہہ کر سلسلہ منقطع کیا گیا تو شیخ حامد فوراً ہی چونکا۔ اس نے کسی شبہے کے امکانات کو دور کرنے کی خاطر بار بار اسلم ڈنکا، شبنم اور تیسرے آدمی کو کال کیا لیکن دوسری جانب سے کسی نے کال ریسیو نہیں کی۔ یہ بھی اس بات کی تصدیق تھی کہ فون پر اسے جو اطلاع ملی وہ غلط نہیں تھی۔

اسلم ڈنکا اور شبنم کے ہاتھ سے نکل جانے کا تصور ہی شیخ حامد کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ خبر کی تصدیق ہوجانے کے بعد وہ خاصی دیر تک پیچ و تاب کھاتا رہا پھر اس نے کسی کے نمبر ڈائل کرنے کی خاطر فون کا ریسیور اٹھایا تھا کہ موبائل پر سگنل ملے۔ اسکرین پر جانے پہچانے نمبر نہیں تھے اس کے باوجود اس نے رخ بدلتے حالات کے پیش نظر کال اٹینڈ کرنے کو ترجیح دی۔

"کون بول رہا ہے؟" مائک پر ایک نئی آواز سن کر اس نے خشک لہجے میں سوال کیا۔

"آپ کا خادم ہوں باس۔" دوسری جانب سے مانوس آواز سنائی دی۔ شیخ حامد وشنو کی آواز سن کر چونکا۔

"تم..... تم اس وقت کہاں ہو.....؟"

فن حنوط کاری

یہ مصریوں کا لاشیں محفوظ کرنے کا خاص فن تھا۔ وہ لوگ اس کام کے لیے مختلف روغن عرق، مسالے اور بیج استعمال کرتے تھے۔ یہ فن مصری تہذیب کے مٹنے کے ساتھ ہی مٹ گیا اور اب مصر میں کسی کو اس کی ترکیب معلوم نہیں۔ مصری اپنے مردوں کو پیٹ چاک کرکے معدہ، آنتیں، دل، پھیپھڑے اور دیگر اعضا نکال دیتے، اس کے بعد اسے مذکورہ بالا اشیا سے بنی مرہم یا پیسٹ لگا کر اس پر جراثیم کش محلول میں ڈوبی ہوئی سوتی پٹیاں لپیٹ دیتے تھے پھر لاش کا میک اپ کیا جاتا تھا جس کی وجہ سے وہ اصل سے مشابہ نظر آنے لگتی تھی۔ پھر وہ اسے تابوت میں لٹا کر تکون نما اہرام میں رکھ دیتے تھے، اہرام کا ڈیزائن بھی ایسا تھا جس سے لاشیں تروتازہ رہتیں اور خراب نہ ہوتی تھیں۔ اس طرح وہ انہیں طویل عرصہ تک محفوظ رکھنے میں کامیاب ہوجاتے تھے۔ ان محفوظ شدہ لاشوں کو "ممیاں" کہا جاتا ہے۔

مرسلہ: احسان سحر، میانوالی

www.pdfbooksfree.pk

''یہ نہیں بتا سکتا مالک لیکن جہاں بھی ہوں پوری طرح محفوظ ہوں۔''

''میں تم سے فوری طور پر ملنا پسند کروں گا۔ ایک اہم کام لینا ہے۔''

''ابھی ملاقات کا سے نہیں ہے باس لیکن اتنا وشواس رکھو کہ وشنو اب دوبارہ آسانی سے خاکی وردی والوں کے ہاتھ نہیں آئے گا۔''

''تمہارے ساتھ اور کون ہے.....؟'' شیخ حامد نے کچھ سوچ کر سنجیدگی سے سوال کیا۔

''وہی جس کے ساتھ مل کر میں ایک اور ایک گیارہ ہوگیا ہوں۔''

''اس پر اعتماد نہ کرنا وشنو۔ وہ تمہارا دوست نہیں ہوسکتا۔''

''پرانی بات ہے باس۔'' اطمینان سے جواب دیا گیا۔ ''جس پارٹی سے بھی ہو لیکن اب وہ میرا لنگوٹیا بن گیا ہے۔ ہم پہلے بھی ایک دوسرے کے ساتھ مل کر قانون کو ٹکنی کا ناچ نچا چکے ہیں۔ اب پھر وہی کھیل تماشا شروع کرنا ہے۔ آپ کے دیس کے لوگوں اور خاکی وردی والوں کو بھی اندازہ ہوجائے گا کہ جیل کی سلاخیں وشنو کا راستہ کبھی کھوٹا نہیں کرسکتیں۔''

''مم..... میں، لوچن کی بات کر رہا ہوں۔''

''جانتا ہوں باس.....'' اس بار بہت جلدی میں کہا گیا۔ ''میرے پاس سے کم ہے، آپ اپنا کام بتاؤ اور وشواس رکھو کہ میں اب بھی آپ ہی کا نمک حلال ہوں۔ آپ نے اور سورگ باسی بلیک ٹائیگر نے میری جو سہائتا کی تھی وہ ابھی تک یاد ہے مجھے۔''

''تم اس چپنی کو غلط سمجھ رہے ہو وشنو..... وہ تمہارا.....''

''اس کو بھول جاؤ باس.....'' دوبارہ جلد بازی میں جواب ملا۔ ''مجھے حکم دو تمہارے کس کام آسکتا ہوں؟''

''بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ معاملات تمہاری سوچ سے زیادہ آگے نکل چکے ہیں۔''

''یہ بھی کھبر ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ فوج کو ہتھیلی لگانے کے لیے کس نے دعوت دی تھی لیکن اب وہ بھی نہیں بچے گا۔'' وشنو نے دھمکتے لہجے میں کہا۔ ''جس دن میں نے کلونت کے سندر شریر کو اپنے ہاتھوں سے ٹکڑے ٹکڑے کیا تھا، اس دن وشنو بھی مرگیا تھا۔ اب کیول رام دیال زندہ ہے جس کو صرف ایک آخری مہرہ اور پیٹنا ہے، اس سے حساب چکتا کرلوں پھر کوئی چنتا نہیں رہے گی۔''

''کس کی بات کر رہے ہو.....؟'' شیخ حامد آخری مہرے والی بات پر چونکا۔

''تمہارے اسی ایس پی کی جس نے جگا اور افضل خاں جیسے چوہوں کو شکار کرنے کا تانک رچایا تھا اور اب انجان بن رہا ہے۔'' اس بار بھی دبنگ لہجے میں کہا گیا۔ ''اس کی کھاٹ کھڑی کردوں پھر من کو شانتی مل جائے گی۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں لیکن تم جس دو غلے شخص پر بھروسا کر رہے ہو وہ.....''

''آم کھانے کی بات کرو باس۔ پیڑوں کی گنتی کا دھیان من سے نکال دو۔ تمہارا کام بہت جلدی ہوجائے گا۔''

دوسری جانب سے جملہ مکمل کرنے کے ساتھ ہی رابطہ منقطع کردیا گیا تو شیخ حامد دانت پیس کر رہ گیا۔ جس نمبر سے کال کی گئی تھی اس کو اس نے دوبارہ آزمایا۔ مائک پر ایک ہی جملہ بار بار سنائی دیا۔ ''آپ نے جس نمبر کو ملایا ہے وہ کسی کے استعمال میں نہیں۔ مزید معلومات کے لیے ہماری کسٹمر سروس سے رابطہ قائم کریں۔''

شیخ حامد بری طرح پیچ وتاب کھا رہا تھا۔ اسے اس وقت وشنو کی تلاش تھی جو اس کے ہاتھ آکر دوبارہ چھومنتر ہوگیا تھا۔ یہ بات بھی اس کے لیے تشویش ناک تھی کہ وشنو نے لوچن کے بارے میں کوئی بات نہیں سنی تھی۔ یہ بھی حیران کن بات تھی کہ وشنو کو جیل سے فرار ہونے کے بعد ان باتوں کا علم کس طرح ہوگیا کہ افضل خاں اور جگا کو فوج کے خفیہ ہاتھوں تک پہنچانے میں اورنگ زیب کا ہاتھ تھا۔ ان باتوں کا علم خود اسے بھی کسی نامعلوم فرد کے ذریعے ہوا تھا جو جگا کو ہر قیمت پر بچانے پر آمادہ تھا۔ ''وہ شخص کون تھا؟ اسے اورنگ زیب اور فوجی انٹیلی جنس کے گٹھ جوڑ کا علم کس طرح ہوگیا؟ یہ بات پورے یقین سے کس طرح کہی تھی کہ جگا کے بارے میں حالات کا فیصلہ دو دن کے اندر ہوجائے گا؟..... اور..... اس بات کا دعویٰ کس بنیاد پر کیا گیا تھا کہ لوچن اور وشنو کا فرار ہوجانا محض ایک ڈراما تھا؟ نیز جن پہرے داروں کو غفلت کا مرتکب سمجھ کر معطل کیا گیا اس میں بھی اورنگ زیب کے مشورے کا عمل دخل تھا؟''

اس پراسرار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید واقعات آیندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

بلّی کی چوری

اقبال کاظمی

کبھی کبھی غیر اہم چیزیں زندگی کے لیے اتنی اہمیت کی حامل ہوجاتی ہیں کہ انسان سر دھڑکی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ نک ویلوٹ کے کارناموں سے اگرچہ ایک دنیا واقف ہے مگر کچھ نہ کچھ ایسا بھی ہے جو اب تک منظرِ عام پر نہ آسکا۔ اس بلّی میں بھی کچھ ایسا ہی راز پوشیدہ تھا۔

اصول پسندی کو حقیقت پسندی کے قالب میں ڈھالنے والے نک ویلوٹ کا ایک اور کارنامہ

ناممکن کا لفظ اگر چہ نک ویلوٹ کی لغت میں نہیں تھا لیکن آج وہ بڑی سنجیدگی سے اس لفظ کے مفہوم پر غور کر رہا تھا۔ ماضی میں اس نے ایسے ایسے کارنامے کر دکھائے تھے جن پر پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ ناممکن کی مہر لگائی جاسکتی تھی مگر نک نے ثابت کر دکھایا تھا کہ اگر انسان میں صلاحیت اور حوصلہ ہو تو اس دنیا میں کوئی بھی کام ایسا نہیں ہوتا جسے ناممکن قرار دیا جاسکتا ہو۔ مگر آج وہ ہوٹل کے وسیع لان کے ایک گوشے میں تنہا بیٹھا وہسکی کی چسکیاں

www.pdfbooksfree.pk

لیتے ہوئے اس لفظ کے معنی تلاش کررہا تھا جسے بقول خود اس نے کبھی لفٹ نہیں دی تھی۔ اس کے خیال میں لفظ ناممکن کے ایک معنی ناکامی بھی ہوسکتے تھے اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ زندگی میں پہلی بار اپنی کسی مہم کے سلسلے میں اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔

تقریباً پندرہ روز قبل اس کے ایک موکل نے نیویارک میں ایک ہیئر کلپ چرانے کے سلسلے میں اس کی خدمت حاصل کی تھی۔ پیٹر جون نامی اس شخص کی عمر پچاس کے لگ بھگ تو ضرور رہی ہوگی۔ اس کا شمار بلاشبہ شہر کے چند گنے چنے دولت مندوں میں کیا جا سکتا تھا۔ وہ اپنی ایک دوست کا ہیئر کلپ چوری کروانا چاہتا تھا۔ پیٹر جون کے کہنے کے مطابق یہ کلپ اس نے تین سال قبل اپنی داشتہ للی کو تحفے میں دیا تھا۔ للی اب تک یہ سمجھتی رہی کہ پیٹر اس سے شادی کرلے گا۔ لیکن جب اس نے صاف انکار کردیا تو للی نے اسے دھمکی دے ڈالی کہ اگر پیٹر نے ایک ماہ کے اندر اندر اپنی بیوی نینسی کو طلاق دے کر اس سے شادی نہ کی تو وہ نینسی کو پیٹر اور اپنے تعلقات کے بارے میں سب کچھ بتادے گی۔ للی کو کسی طرح یہ معلوم ہوگیا تھا کہ پیٹر نے اسے جو ہیئر کلپ تحفے میں دیا تھا وہ نینسی کی ملکیت تھا اور اس نے پیٹر کو یہ دھمکی بھی دی تھی کہ انکار کی صورت میں وہ نہ صرف نینسی کو تمام حالات سے آگاہ کردے گی بلکہ ثبوت کے طور پر وہ کلپ بھی پیش کردے گی۔ پیٹر جون کے یہ سارے ٹھاٹ باٹ اپنی بیوی نینسی ہی کے مرہون منت تھے۔ شادی سے پہلے وہ ایک قلاش آدمی تھا لیکن پھر نینسی نے اپنا سب کچھ اس کے حوالے کردیا۔ اس کی بدولت پیٹر کو آج عزت اور شہرت کا یہ مقام حاصل تھا اور اب تو وہ کونسل کا الیکشن لڑنے کے تیاری بھی کررہا تھا جس میں اس کی کامیابی یقینی تھی لیکن للی کی وجہ سے اب یہ سب کچھ خطرے میں نظر آرہا تھا۔ شادی سے پہلے پیٹر اور نینسی میں ایک تحریری معاہدہ ہوا تھا۔ اس معاہدے کی رو سے پیٹر اس کی ہر چیز کا مالک تھا۔ وہ نینسی کی کروڑوں کی جائداد کا بھی نگراں تھا اور نینسی نے کبھی اس سے حساب طلب نہیں کیا تھا۔ اس طرح اسے سیاہ سفید کا مالک کہا جاسکتا تھا لیکن یہ سب کچھ مشروط تھا۔ نینسی نے معاہدے میں یہ شرط بھی رکھی تھی کہ اگر کبھی پیٹر کے کسی دوسری عورت سے تعلقات ثابت ہوگئے تو نہ صرف یہ کہ یہ سب کچھ اس سے چھن جائے گا بلکہ نینسی بھی اس سے طلاق حاصل کرلے گی۔ پیٹر جانتا تھا کہ یہ سب کچھ چھن جانے کا مطلب کیا ہوگا۔ وہ ایک بار پھر قعر مذلت کی گہرائیوں میں کھوجائے گا اور للی اسے پستیوں میں دھکیلنے پر تلی ہوئی تھی۔

پیٹر جون کے کہنے کے مطابق اس ہیئر کلپ کی قیمت پچیس تیس ڈالرز سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کی واپسی کے لیے اس نے للی کو ایک گراں قدر رقم کی پیش کش کی تھی کیونکہ اس کے خیال میں اس کلپ کی عدم موجودگی میں للی اس کے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں کرسکتی تھی۔ جبکہ للی کا صرف ایک ہی مطالبہ تھا کہ وہ نینسی سے طلاق لے کر اس سے شادی کرلے۔ اس کے لیے اس نے پیٹر جون کو ایک ماہ کی مہلت دی تھی۔ للی کے پاس اگر کچھ دولت ہوتی تو پیٹر اس کے مطالبے پر غور کرسکتا تھا لیکن وہ تو خود دولت کی طلبگار تھی۔ اس کا خیال تھا کہ پیٹر کے ساتھ اس کے قدموں میں دولت کا بھی ڈھیر لگ جائے گا۔

پیٹر جون نے اپنا سب کچھ بچانے کے لیے نک ویلوٹ کی خدمات حاصل کیں اور اس کی مقررہ فیس پچیس ہزار ڈالرز نقد ادا کرکے اسے پندرہ دن کے اندر اندر للی سے وہ ہیئر کلپ حاصل کرنے کی درخواست کی، نک نے اسی روز منصوبہ بندی شروع کردی۔ وہ آٹھ روز تک للی کی نگرانی کرتا رہا۔ اس دوران للی نے وہ کلپ ایک لمحہ کو بھی اپنے بالوں سے جدا نہیں کیا تھا۔ نک کی منصوبہ بندی اگرچہ بڑی خوبصورت تھی لیکن للی کی احتیاط اور دوراندیشی سے اس کی ساری منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ اسے بھی غالباً اس کلپ کی اہمیت کا اندازہ ہوچکا تھا اور شاید اس کی چھٹی حس اس سلسلے میں اسے خبردار بھی کررہی تھی۔

نویں روز للی اچانک ہی نیوجرسی روانہ ہوگئی۔ اگر نک اس کی نگرانی نہ کررہا ہوتا تو ناپتا ہی رہ جاتا۔ اسے صرف ایک گھنٹا پہلے پتا چلا تھا۔ وہ گلوریا کو اطلاع دیے بغیر للی کے تعاقب میں روانہ ہوگیا۔ للی نے نیوجرسی میں صرف ایک روز قیام کیا تھا، اس سے اگلے روز وہ فلوریڈا روانہ ہوگئی۔ یہ نک کی خوش قسمتی تھی کہ اس مرتبہ للی نے بحری سفر کو ترجیح دی تھی۔ نک کا خیال تھا کہ بحری سفر کے دوران اسے للی کے کلپ پر ہاتھ صاف کرنے کا موقع مل جائے گا۔ مگر اس مرتبہ بدقسمتی شروع ہی سے اس کے تعاقب میں تھی۔ سفر کے دوسرے روز شام کے وقت للی جہاز کے عرشے کی ریلنگ کے قریب کھڑی تھی کہ یکایک اس کا پیر پھسلا اور وہ سمندر

میں جاگری۔ اس وقت عرشے پر نک کے علاوہ صرف ایک عورت تھی جس نے للی کو گرتے دیکھ کر شور مچادیا۔ تیز رفتار جہاز رکتے رکتے بھی وہاں سے تقریباً ایک میل آگے نکل چکا تھا۔ مزید بدقسمتی یہ کہ اسی وقت بارش بھی شروع ہوگئی۔ تقریباً دو گھنٹے تک للی کی لاش تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی رہی مگر تاریکی اور بارش کے باعث کامیابی نہ ہوسکی اور جہاز اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔ نک کو اگرچہ علم تھا کہ سمندر میں گرتے وقت کلپ للی کے بالوں میں لگا ہوا تھا لیکن اسی رات اس نے للی کے کیبن کی تلاش بھی لے ڈالی جس میں ظاہر ہے اسے ناکامی کے سوا کچھ نہ ملا تھا۔

اگلی بندرگاہ پر نک نے جہاز چھوڑ دیا اور طیارے پر نیویارک روانہ ہوگیا جہاں اسے یہ افسوسناک اطلاع ملی کہ پیٹر گزشتہ رات کار کے حادثے میں ہلاک ہوچکا تھا۔ اس اتفاق پر نک کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا اتفاق تھا۔ اس کیس میں تین باتیں ہوئی تھیں۔ پہلی تو یہ کہ اس کا شکار سمندر میں ڈوب کر ہلاک ہوگیا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ وہ مطلوبہ چیز چرانے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا اور تیسری بات یہ کہ اس کا موکل بھی ایک حادثے میں ہلاک ہوگیا تھا۔ نک ویلوٹ نے اگرچہ اپنی فیس پچیس ہزار ڈالرز پہلے ہی وصول کرلی تھی لیکن اس نے یہ فیس رکھنا گوارہ نہیں کیا۔ وہ پیٹر جون کی بیوہ کو بھی یہ رقم نہیں لوٹا سکتا تھا۔ اس نے اخراجات کاٹ کر باقی رقم ایک گمنام مخیر کی حیثیت سے ایک محتاج خانے کو بھیج دی اور اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس کیس کے نتیجے کو اپنی ناکامی سمجھے یا کوئی اور مفہوم پہنائے۔

گلوریا آج سہ پہر کسی کام سے مین ہٹن گئی تھی اور ابھی تک لوٹ کر نہیں آئی تھی۔ ہوٹل میں کھانا کھانے کے بعد نک ویلوٹ لان میں آگیا تھا اور ایک گوشے میں تنہا بیٹھا بیئر کی چسکیاں لیتے ہوئے اس کیس پر غور کررہا تھا کہ اپنی پشت پر کسی کی موجوگی محسوس کرتے ہی اس نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا دوسرے ہی لمحے وہ چونک گیا۔

وہ ایک دراز قامت عورت تھی۔ لمبے سیاہ ریشمی بال کندھوں پر جھول رہے تھے۔ آتشی رنگ کے سرخ لباس میں وہ شعلہ جوالہ نظر آرہی تھی۔ وہاں اگرچہ روشنی بہت کم تھی لیکن نک نے پہلی ہی نظر میں اس کا تفصیلی جائزہ لے لیا اور اسے یہ اندازہ لگانے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ کوئی غیر ملکی تھی

سچی کہانیوں آپ بیتیوں جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ

ماہنامہ
سرگزشت

دسمبر 2012ء
کی جھلکیاں

اختر اردو
اردو کے ایک بڑے ادیب کی سوانح حیات

خوش نوا: پوری دنیا میں آواز کی بدولت تہلکہ مچادینے والے گلوکار کا تذکرہ

زور آور برادران
ان دو پہلوان بھائیوں کا زندگی نامہ جو دشمنی کا شکار ہوگئے

موگن
ایک معدوم ہوتی نسل جو پانی پر زندگی گزارتی ہے، خشکی پر رہنا اسے پسند نہیں

خواب ہوگئے
عزم واستقلال اور قسمت کے گرد گھومتی ایک نوجوان کی دلچسپ آپ بیتی

اس کے علاوہ
اور بھی بہت سے سچے واقعات، معلوماتی تحریریں

ہر شمارہ خاص شمارہ جسے آپ محفوظ رکھنا ضروری سمجھیں گے

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرالیں

خاص شمارہ ... ہر شمارہ، خاص شمارہ ... ہر شمارہ، خاص شمارہ

www.pdfbooksfree.pk

اور پھر عورت کے لہجے نے اس امر کی تصدیق بھی کردی۔

''اگر میرا خیال غلط نہیں تو میں اس صدی کے عظیم ترین فنکار نک ویلوٹ سے مخاطب ہوں۔'' وہ شعلہ بدن دلفریب انداز میں مسکرائی۔

''فنکار!'' نک چونک گیا۔ ''میرا نام نک ویلوٹ ضرور ہے لیکن تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے، کسی فن سے میرا دور کا بھی کوئی تعلق نہیں.....''

''مجھے شہپر کہتے ہیں، مس شہپر۔'' عورت نے تعارف کرایا۔ ''میرا تعلق ایران سے ہے اور شکاگو یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کررہی ہوں۔ میرا خیال ہے ہر وہ شخص فنکار کہلانے کا مستحق ہے جو اپنے فن میں مہارت رکھتا ہو اور تمہارے بارے میں میری معلومات غلط نہیں ہوسکتیں۔ تم اپنا کام جس سلیقے اور ہنرمندی سے انجام دیتے ہو۔ اس کی مثال نہیں ملتی۔''

''شاید تمہیں.....''

''مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔'' مس شہپر نے اسے ٹوک دیا۔ ''میں نے کم از کم دو ماہ تک تمہاری نگرانی کرائی ہے اور تمہارے بارے میں وہ سب کچھ جان چکی ہوں جو میں اپنے لیے ضروری سمجھتی تھی۔ تم میری معلومات کو چیلنج نہیں کرسکتے۔ کیا یہ غلط ہے کہ چند روز قبل پیٹر جون نامی ایک دولت مند شخص نے للی نامی ایک عورت کے قبضے سے ہیئر کلپ چرانے کے لیے تمہاری خدمات حاصل کی تھیں اور اس وقت تم یہاں بیٹھے اپنی ناکامی کا ماتم کررہے تھے؟''

''ناکامی۔'' نک نے عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ یہ ایرانی عورت اس کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی، اس سے کچھ چھپانا بے سود تھا۔ ''کیا تم اسے ناکامی کہہ سکتی ہو؟''

''دراصل اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔'' مس شہپر مسکرائی۔ ''للی نامی وہ عورت اگر سمندر کی لہروں کی نذر نہ ہوجاتی تو تم اپنے مقصد میں یقیناً کامیاب ہوجاتے۔ کیا تمہارے لیے یہ خوشی کی بات نہیں کہ اپنے موکل کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچ گئے؟''

''تم واقعی میرے بارے میں بہت کچھ جانتی ہو۔ بہرحال میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ فی الحال میں کسی کام کے موڈ میں نہیں ہوں۔ اگر تم کوئی مسئلہ لے کر آئی ہو تو اس کے لیے تمہیں کم از کم چھ ماہ مزید انتظار کرنا پڑے گا۔'' نک ویلوٹ نے کہا۔

''اس وقت حالات بالکل مختلف ہوں گے۔'' مس شہپر بڑبڑائی۔ ''نہیں، میں اس قدر طویل انتظار نہیں کرسکتی۔ اگر تم چاہو تو میں تمہاری فیس میں اضافہ کرسکتی ہوں۔''

نک ویلوٹ واقعی کام کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ اپنے ذہن سے پچھلے کیس کے اثرات زائل کرنے کے لیے کم از کم دو ہفتے مکمل طور پر آرام کرنا چاہتا تھا لیکن فیس میں اضافہ کے نام پر اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ ''کتنا اضافہ کرسکتی ہو؟'' اس نے شہپر کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

''دس ہزار ڈالرز۔ اخراجات اس کے علاوہ ہوں گے۔ اگر تم چاہو تو میرے کیس میں تقریباً چالیس ہزار ڈالرز کما سکتے ہو۔''

''میں کسی کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ میری مقررہ فیس سے زیادہ ادا کرے لیکن لوگ ہی اپنی جیبوں کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتے ہوں تو مجھے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ اگر تمہیں میرے بارے میں تمام معلومات کا دعویٰ ہے تو میری شرائط سے بھی آگاہ ہوگی؟''

''ہاں، جانتی ہوں کہ تم اپنی فیس پیشگی لیتے ہو اور کوئی ایسی چیز نہیں چراتے جس کی کوئی تاریخی اہمیت ہو یا.....''

''ٹھیک ہے!'' نک نے اسے مزید کہنے سے روک دیا۔ ''تم کیا چرانا چاہتی ہو؟''

''بلی۔ اس کے لیے تمہیں جیکسن سٹی جانا پڑے گا۔'' شہپر نے جواب دیا۔

''بلی!'' نک نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے آج تک لوگوں کے لیے جتنی بھی چیزیں چرائی تھیں ان کی کوئی نہ کوئی ایسی حیثیت ضرور تھی جس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا لیکن بلی سے کیا فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ وہ سوچنے لگا کہیں اس ایرانی لڑکی کا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔ چالیس ہزار ڈالرز میں تو کم از کم چار ہزار بلیاں خریدی جاسکتی تھیں۔

''کوئی خاص بلی ہے۔ میرا مطلب ہے اس بلی کی کوئی خاص اہمیت ہے جسے تم چوری کرانا چاہتی ہو؟''

''اس سلسلے میں تم مجھ سے کوئی سوال نہیں کرو گے۔ البتہ میں تمہیں بلی کا حلیہ بتاسکتی ہوں۔''

''بلی کا حلیہ۔'' نک نے اسے گھورا۔

''ہاں، اگرچہ بہت سی بلیاں ایک جیسی ہوسکتی ہیں لیکن میری مطلوبہ بلی قدرے مختلف ہے۔ ایرانی بلی ہے۔ لمبے سفید بالوں والی جس کی پیشانی پر دائیں آنکھ سے ذرا اوپر سیاہ بال ہیں۔ گنتی کے چند سیاہ بال جو ممکن ہے دور سے نظر نہ آسکیں۔ اس کے لیے تمہیں اس کے قریب جاکر دیکھنا پڑے گا۔ لیکن یہ خیال رہے کہ وہ بہت خونخوار قسم کی بلی ہے۔''

''میں کئی خونخوار عورتوں کو رام کرچکا ہوں۔ بلی کی کیا حیثیت ہے لیکن کیا یہ نہیں بتاؤ گی کہ ان صاحبہ سے کہاں ملاقات ہوسکتی ہے؟'' نک نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اس سے پہلے میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم اس کام کے لیے تیار ہو یا نہیں؟'' شہپر اس کے مزاح کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

''اگر آمادہ نہ ہوتا تو اس وقت تم میرے پاس نہ بیٹھی ہوتیں۔''

شہپر اسے گھور کر رہ گئی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔ ''تیرہ ڈیسن ڈرائیو۔ جیکسن سٹی۔ یہ ایک بہت بڑی عمارت ہے جہاں میرے ہم وطن مقیم ہیں۔ اس کام کے لیے کوئی مدت مقرر نہیں ہے لیکن یہ جتنی جلدی ہوجائے بہتر ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم سے کہاں رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے؟'' نک نے پوچھا۔

''یہاں میں اپنے ایک ہم وطن کے ہاں مقیم ہوں جو دوسروں سے میرا ملنا جلنا پسند نہیں کرتا اس لیے تمہیں اپنا پتا اور فون نمبر بتانے کا رہے۔ ضرورت پڑنے پر میں خود تم سے رابطہ قائم کرلوں گی۔ یہ چابی اپنے پاس رکھ لو سینٹرل اسٹیشن کے لاکر نمبر ایک سو بیس میں تمہیں چالیس ہزار ڈالرز کی رقم مل جائے گی۔ بہتر ہوگا کہ یہ چابی اپنی دوست گلوریا کو دے کر آج رات ہی جیکسن سٹی روانہ ہوجاؤ۔ گیارہ بج کر بیالیس منٹ پر جیکسن کے لیے ایک پرواز جانے والی ہے۔ اس کے بعد صبح سات بجے سے پہلے تمہیں کوئی براہ راست پرواز نہیں ملے گی۔'' شہپر نے پرس سے ایک چابی نکال کر میز پر رکھ دی۔

''گلوریا یہاں موجود نہیں۔ وہ مین ہٹن گئی ہوئی ہے۔ لاکر سے رقم لینے میں خود جاؤں گا۔'' نک بولا۔

''گلوریا اب سے تقریباً ایک گھنٹا پہلے اپنے فلیٹ پر پہنچ چکی ہے۔ بہرحال، میں تمہیں فوری روانگی پر مجبور نہیں کروں گی۔ تم اپنا پروگرام خود ترتیب دے سکتے ہو۔ میں تین دن بعد کسی بھی وقت تم سے رابطہ قائم کروں گی۔'' شہپر کہتے ہوئے اٹھ گئی۔

نک ویلوٹ نے گلاس اٹھا کر چسکی بھری اور عجیب سی نظروں سے شہپر کی طرف دیکھنے لگا جو قیامت کی چال چلتی ہوئی ہوٹل کی لابی کی طرف جارہی تھی۔ اس نے آخری گھونٹ بھر کر گلاس میز پر رکھا اور خود بھی اٹھ گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ بھی تیز تیز قدموں سے لابی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

تلاش بسیار کے باوجود شہپر نظر نہیں آسکی تھی۔ لابی میں پہنچتے ہی گویا وہ فضا میں تحلیل ہوگئی تھی۔ نک پیر جھٹکتا ہوا ایک فون بوتھ کی طرف بڑھ گیا۔ چند سیکنڈ بعد ہی تصدیق ہوگئی کہ گلوریا تقریباً ایک گھنٹا پہلے مین ہٹن سے واپس آچکی تھی۔ ہوٹل سے نکل کر نک سیدھا نیویارک سینٹرل اسٹیشن پہنچا۔ وہ راستے بھر اس ایرانی لڑکی کے بارے میں سوچتا رہا جو محض ایک بلی چرانے کے لیے اسے چالیس ہزار ڈالرز ادا کررہی تھی۔ نک نے اپنے موکلوں کے بارے میں کبھی سنجیدگی سے نہیں سوچا تھا لیکن شہپر نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا تھا جو اس کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی۔ اس طرح وہ اس کے لیے خطرناک بھی ثابت ہوسکتی تھی۔ نک جانتا تھا کہ ایران میں انقلاب کے بعد ہزاروں شاہ پسند امریکا آگئے تھے اور ایران کی انقلابی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے منصوبہ بناتے رہتے تھے۔ لیکن یہ الگ بات تھی کہ آج تک ان کی کوئی سازش کامیاب نہیں ہوسکی تھی۔ اس کی وجہ صرف اور صرف یہ تھی کہ انقلاب کے بانی مذہبی رہنما کی گرفت شروع ہی سے بہت مضبوط رہی تھی اور سازشی عناصر عتاب سے بچنے کے لیے ملک چھوڑ چھوڑ کر فرار ہورہے تھے۔ وہ غیر ممالک میں بیٹھ کر ایران کی انقلابی حکومت کے خلاف سازشیں کرتے رہتے لیکن نک ویلوٹ کو امید تھی کہ بلی کی چوری کے اس کیس میں کوئی سازش نہیں ہوسکتی تھی۔

ایک سو بیس نمبر کا لاکر کھلتے ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں چالیس ہزار ڈالرز کے نوٹوں کی موٹی سی گڈی کے ساتھ جیکسن کے لیے ایک ہوائی ٹکٹ بھی موجود تھا۔ ٹکٹ پر نک ویلوٹ کا نام اور پرواز کا وقت گیارہ بج کر بیالیس منٹ درج تھا۔ شہپر نے اگر جو اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ لاکر کی چابی گلوریا کو دے کر خود جیکسن سٹی روانہ ہوجائے لیکن اس کے باوجود اسے یقین رہا ہوگا کہ لاکر نک خود کھولے گا۔ اس لیے اس نے پہلے ہی اس کی روانگی کا انتظام بھی کررکھا تھا۔ گویا وہ نک کی فطرت سے بھی پوری طرح آگاہ تھی۔

رقم اور ٹکٹ نکال کر نک ویلوٹ اپنے فلیٹ کی طرف روانہ ہوگیا جہاں گلوریا اس کی منتظر تھی۔ نک نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا اور روانگی کی تیاری کرنے لگا۔ اس وقت دس بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ جب وہ ایک مختصر سا سفری بیگ لے کر گلوریا کے ساتھ فلیٹ سے باہر نکلا تو اسے یقین تھا کہ شہپر یا اس کا کوئی نہ کوئی آدمی اس کی نگرانی ضرور کررہا ہوگا۔ شہپر نے جس انداز میں سے اپنے آپ کو پیش کیا تھا اس سے وہ خاصا محتاط ہوگیا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

ایرپورٹ پر پہنچ کر گلوریا نے اسے خدا حافظ کہا اور نک بیگ ہاتھ میں لٹکائے ڈیپارچر لاؤنج میں داخل ہوگیا جہاں کاؤنٹر سے اس نے ٹکٹ او کے کروایا اور لوگوں کے ہجوم میں نہاتا ہوا محتاط نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کوئی چہرہ اس کی نظروں میں مشتبہ نہیں تھا لیکن وہ احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ چند منٹ بعد اس نے بیگ ایک سیٹ پر رکھا اور قریب بیٹھی ہوئی عورت کو بیگ کی حفاظت کے لیے کہتا ہوا باتھ روم میں گھس گیا۔ اس کے چند منٹ بعد وہ عقبی کھڑکی سے کود کر اس لاؤنج کے عقبی حصے کی طرف بڑھ رہا تھا جو آنے والے مسافروں کے لیے مخصوص تھا۔ اس لاؤنج میں آنے کے لیے بھی اسے باتھ روم کی کھڑکی کا سہارا لینا پڑا۔

تقریباً پانچ منٹ بعد وہ لاؤنج سے نکل کر ایک ٹیکسی میں بیٹھا شہر کی طرف جا رہا تھا۔ نک کو یہ سارا چکر چلانے کی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ شہر پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ تمام تر چالاکیوں کے باوجود وہ اس کی سرگرمیوں پر نگاہ نہیں رکھ سکتی۔

پہلے چوراہے پر ایک کار کھڑی دیکھ کر اس نے ٹیکسی رکوالی اور بل ادا کر کے تیز تیز قدموں سے کار کی طرف بڑھ گیا۔ وہ گلوریا تھی جو وہاں اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ نک کے بیٹھتے ہی گلوریا نے کار آگے بڑھا دی۔ اس کا رخ جیکسن سٹی کی طرف تھا۔ ہوائی جہاز سے نک ویلوٹ صرف ڈیڑھ گھنٹے میں وہاں پہنچ سکتا تھا۔ لیکن کار میں یہی فاصلہ وہ صبح تک طے کر پاتے، نک نے اس مرتبہ گلوریا کو بھی اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ کسی گڑبڑ کی صورت میں وہ اس کے لیے مددگار ثابت ہو سکے۔

صبح ساڑھے سات بجے وہ جیکسن سٹی پہنچ گئے۔ اس وقت اسٹیئرنگ نک کے ہاتھ میں تھا۔ سب سے پہلے نظر آنے والے ہوٹل کے سامنے اس نے گاڑی روک لی اور انہیں ساتویں منزل پر ایک کمرا مل گیا۔ تازہ دم ہونے کے بعد انہوں نے ناشتا کیا اور پلنگ پر دراز ہو گئے۔ چند منٹ بعد ہی کمرے کی فضا میں گلوریا کے خراٹے سنائی دینے لگے۔ نک پر بھی غنودگی سی طاری ہو رہی تھی لیکن وہ آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

گیارہ بجے کے قریب نک نہایت خاموشی سے بستر سے اٹھ گیا، اس نے لباس تبدیل کیا اور آہٹ پیدا کیے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔ آٹو میٹک دروازہ خود بہ خود مقفل ہو گیا تھا اور چابی پلنگ کے قریب میز پر موجود تھی۔ اسے یقین تھا کہ بیدار ہونے کے بعد گلوریا اگر کمرے سے نکلنا بھی چاہے گی تو اسے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔

نک ویلوٹ ایک مرتبہ پہلے بھی جیکسن سٹی آچکا تھا لیکن اس شہر کے بارے میں اس کی معلومات زیادہ نہیں تھیں۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ ڈیسن ڈرائیو کس طرف ہے۔ وہ ہوٹل میں شہر کا نقشہ دیکھنا بھی بھول گیا تھا لیکن یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا کہ جس کا حل تلاش نہ کیا جا سکتا ہو۔ اس نے قریب سے گزرتی ہوئی ایک خالی ٹیکسی کو اشارہ کیا جو اس سے چند گز آگے جا کر رکی۔ نک نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے ڈرائیور کو ڈیسن ڈرائیو چلنے کو کہہ دیا۔

ڈیسن ڈرائیو شہر کے آخری سرے پر ثابت ہوا۔ اسے بلاشبہ شہر کا خوبصورت ترین علاقہ کہا جا سکتا تھا۔ نک نے چوراہے کے قریب ٹیکسی چھوڑ دی اور پیدل ہی ایک طرف چلنے لگا۔ خوبصورت شاپنگ سینٹر سے آگے رہائشی علاقہ تھا۔ وسیع و عالیشان کوٹھیاں تھیں۔ نک کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ علاقہ شہر کے امرا کی رہائش کے لیے مخصوص تھا۔ اوسط آمدنی والا کوئی شخص تو یہاں رہائش اختیار کرنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

تیرہ نمبر کی عمارت خاصی وسیع و عریض ثابت ہوئی۔ اس دو منزلہ عمارت کے چاروں طرف وسیع رقبے پر لان پھیلا ہوا تھا۔

چار دیواری اگرچہ زیادہ بلند نہیں تھی لیکن اس کے اوپر تقریباً دس فٹ کی بلندی تک خاردار تاروں کی باڑ لگی ہوئی تھی۔ نک کو اس باڑ کی ساخت سے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ رات کو ان خاردار تاروں میں برقی رو چھوڑ دی جاتی ہوگی۔ گیٹ پر خوف ناک صورت والا ایک محافظ بھی موجود تھا جو پتلون کی بیلٹ میں ریوالور اڑسے اندر کی سمت ٹہل رہا تھا۔ وہ کوئی ایرانی باشندہ ہی تھا۔ گیٹ کے ساتھ ہی ایک بڑی سی تختی بھی آویزاں تھی جس پر کیاؤنڈ میں خونخوار کتوں کی موجودگی کی اطلاع دیتے ہوئے لوگوں کو دور رہنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ نک کے خیال میں یہ تختی بیکار ہی میں لگائی گئی تھی۔ کتے تو اندر ہوں گے لیکن لوگ تو گیٹ پر ٹہلتے ہوئے خونخوار محافظ کی صورت دیکھ کر ہی گیٹ کے قریب جانے کی جرأت نہ کرتے ہوں گے۔

نک ویلوٹ ٹہلتا ہوا ایک نسبتاً اونچی جگہ پر رک گیا جہاں سے کوٹھی کے اندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ دوسری طرف منزل کی بالکونی پر دو بچے کھیل رہے تھے۔ ان کے علاوہ وہاں کوئی اور نظر نہیں آیا۔ نک چند منٹ وہاں کھڑا جائزہ لیتا رہا پھر ایک طویل چکر کاٹ کر عمارت کی پچھلی طرف پہنچ گیا۔ اس طرف تنگ سی سڑک تھی جس کے پرلی طرف گنجان درخت تھے۔ سڑک سنسان تھی۔ نک ایک

درخت پر چڑھ کر لان کا جائزہ لینے لگا۔ دوسرے ہی لمحے اسے چونک جانا پڑا۔ اس طرف سوئمنگ پول تھا جس کے کنارے گھاس پر تیرا کی کے لباس میں ایک عورت پشت کے بل لیٹی سن باتھ لے رہی تھی۔ فاصلہ اگرچہ زیادہ تھا لیکن اس عورت کے چہرے کے نقوش نک ویلوٹ کو بالکل صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ یقیناً شہپر کی ہم وطن ہی تھی۔ نک درخت کی شاخوں میں چھپا غور سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ چند منٹ بعد ہی اسے ایک اور عورت دکھائی دی جو ایک ٹرے ہاتھ میں اٹھائے مکان سے نکل کر پول کی طرف آ رہی تھی۔ وہ کوئی مقامی لڑکی تھی اور نک ویلوٹ کے اندازے .... کے مطابق اس کی عمر بیس بائیس برس سے زیادہ نہیں رہی ہوگی۔ ایرانی عورت کے قریب پہنچ کر اس نے ٹرے زمین پر رکھ دی اور ایک گلاس میں شراب انڈیل کر گلاس عورت کی طرف بڑھا دیا۔ وہ عورت اٹھ کر بیٹھ گئی۔ چند چسکیاں لے کر اس نے گلاس ٹرے میں رکھا اور دوڑتے ہوئے تالاب میں چھلانگ لگا دی۔ مقامی لڑکی جو یقیناً ملازمہ تھی، کنارے پر کھڑی دلچسپ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چند منٹ پیرا کی کے کرتب دکھانے کے بعد اس ایرانی عورت نے کنارے کے قریب پہنچ کر سہارے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ملازمہ نے جھک کر اس کا ہاتھ تھام لیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ تالاب کے ٹھنڈے پانی میں غوطے کھانے لگی۔ فضا ایرانی عورت کے قہقہوں سے گونجنے لگی۔

نک درخت سے اتر آیا۔ کوٹھی کے چاروں طرف چکر لگانے کے بعد بھی اسے محافظ کے علاوہ کوٹھی میں کوئی مرد نظر نہیں آیا تھا۔ البتہ ایک طرف اس نے دو خونخوار کتوں کو ٹہلتے ہوئے ضرور دیکھا تھا۔ نک کو یقین تھا کہ اگر کوئی کسی طرح کوٹھی میں داخل ہونے میں کامیاب ہو بھی گیا تو یہ خونخوار کتے آن واحد میں اس کا تیا پانچا کر دیں گے۔

نک ہوٹل واپس پہنچا تو گلوریا اس وقت بھی سو رہی تھی۔ اس نے گھڑی دیکھی ڈیڑھ بج رہا تھا۔ اس نے گلوریا کو جگانا مناسب نہیں سمجھا اور صوفے پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ اس وسیع و عریض عمارت کے اندر رسائی کس طرح حاصل کی جا سکتی ہے۔ ظاہر ہے وہ اندر داخل ہوئے بغیر بلی تک بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ عمارت میں داخل ہونے کا صرف ایک راستہ تھا جس پر خوف ناک صورت والا مسلح محافظ متعین تھا۔ بالفرض اگر وہ محافظ کو خچہ دے کر اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو بھی جائے تو کتے اسے چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے۔ مس شہپر نے اگرچہ اس کی مقررہ فیس سے دس ہزار ڈالرز زیادہ ادا کیے تھے لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ اس مرتبہ واقعی اسے دانتوں پسینا آجائے گا۔

دو بجے کے لگ بھگ گلوریا بھی اٹھ گئی۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ کمرے ہی میں بیٹھے صورت حال پر تبصرہ کرتے رہے۔ نک نے اسے عمارت کے بارے میں بتایا تھا اور گلوریا کا بھی یہی خیال تھا کہ اس مرتبہ معاملہ جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔

پانچ بجے کے قریب وہ دونوں ہوٹل سے نکل آئے۔ شہر کے مختلف حصوں کی سیر کرتے ہوئے وہ ڈیسن ڈرائیو پہنچ گئے۔ نک، گلوریا کو وہ مکان دکھانا چاہتا تھا جہاں سے اسے ایرانی بلی چرانا تھی۔ مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس مرتبہ نک کو دو آدمی بھی دکھائی دیے جو عمارت کے برآمدے کے سامنے بیٹھے بیئر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان کے ساتھ وہ خوبصورت عورت بھی تھی جسے وہ صبح سوئمنگ پول کے قریب دیکھ چکا تھا۔ البتہ نوجوان ملازمہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ نک کی نظریں اچانک دائیں طرف اٹھ گئیں جہاں دو بچے لان میں کھیل رہے تھے۔ ایک لڑکی تھی اور دوسرا لڑکا، لڑکی کی عمر سات سال اور لڑکے کی عمر کا اندازہ نو برس کے لگ بھگ لگایا جا سکتا تھا۔ دفعتاً لڑکی دوڑتی ہوئی مکان کی آڑ میں چلی گئی اور جب واپس لوٹی تو اس نے بانہوں میں روئی کا ایک بڑا سا گالا اٹھا رکھا تھا۔ نک بڑی توجہ سے لڑکی کے ہاتھوں میں روئی کے اس سفید گالے کی طرف دیکھ رہا تھا جو اچانک ہی اچھل کر لڑکی کے ہاتھوں سے نکلا اور دوڑتا ہوا پودوں کی آڑ میں چلا گیا۔ وہ لمبے بالوں والی بلی تھی۔ لڑکی بھی اس کے پیچھے دوڑی اور پھر وہ دونوں قد آدم پودوں کے پیچھے نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

نک سمجھ گیا اسے یہی بلی چرانا تھی جس کے لیے اسے چالیس ہزار ڈالرز کی ادائی کی گئی تھی۔ وہ دوبارہ اس طرف دیکھنے لگا جہاں وہ تینوں شراب نوشی میں مشغول تھے۔ اسی لمحے ملازمہ برآمدے سے نکل کر ان کے قریب پہنچ گئی۔ میز کے قریب پہنچ کر وہ کچھ دیر تک ایرانی عورت سے باتیں کرتی رہی پھر پختہ روش پر گیٹ کی طرف بڑھنے لگی۔ گیٹ سے نکلتے ہوئے محافظ نے اس سے کوئی بات بھی کی تھی جس پر لڑکی دلفریب انداز میں مسکرا کر رہ گئی تھی۔

اچانک ہی نک ویلوٹ کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ مکان میں داخل ہونے کی ترکیب اس کے ذہن میں آگئی تھی۔ اس نے گلوریا کو اشارہ کیا اور وہ دونوں ملازمہ کے پیچھے پیچھے چلنے لگے جو چوراہے کی طرف جا رہی تھی۔ چوراہے پر پہنچ کر نک نے گلوریا کو رخصت کر دیا اور خود بہ

www.pdfbooksfree.pk

دستور لڑکی کے تعاقب میں لگا رہا جو اب سن سیٹ بلے وارڈ کی ایک کئی منزلہ عمارت کے گیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ نک نے عمارت کے اندر بھی اس کا تعاقب جاری رکھا۔ وہ دوسری منزل کے ایک دروازے کے سامنے رکی اور جیب سے چابی نکال کر تالا کھولا لینے لگی۔ نک راہداری میں آگے بڑھتا چلا گیا اور پھر عقبی زینے سے اتر کر عمارت سے باہر آ گیا۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ فلیٹ اس لڑکی ہی کی ملکیت تھا جو اپنے کام سے چھٹی کرنے کے بعد واپس آ جاتی تھی۔

نک عقب سے گھوم کر ایک بار پھر عمارت کے سامنے آ گیا اور سڑک کے اس پار ایک چھوٹے سے بار روم میں ایک ایسی میز پر بیٹھ گیا جہاں سے عمارت کے دروازے پر نگاہ رکھی جا سکتی تھی۔ بیئر کی چسکیاں لیتے ہوئے اس کی نظریں بہ دستور فلیٹ والی عمارت کے دروازے پر ہی مرکوز تھیں۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ لڑکی عمارت سے باہر نکلی۔ بدلے ہوئے لباس میں وہ ایک لمحہ کو تو اسے پہچان ہی نہیں سکا تھا۔ اگر اس نے پہلے ہی لڑکی کو غور سے نہ دیکھا ہوتا تو یقیناً دھوکا کھا جاتا۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر کاؤنٹر پر بل ادا کیا اور بار روم سے نکل کر لڑکی کے تعاقب میں چل پڑا جو اس مرتبہ زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا۔ وہ لڑکی ایک شراب خانے میں داخل ہو گئی تھی۔ نک باہر ہی رک گیا۔ پھر تقریباً دس منٹ بعد وہ بھی اندر داخل ہو کر تجسس نگاہوں سے ہال کا جائزہ لینے لگا۔ وہ لڑکی کونے کی ایک میز پر تنہا بیٹھی شراب کی چسکیاں لے رہی تھی۔ وہ اس رخ پر بیٹھی تھی کہ اس کا چہرہ پوری طرح نظر نہیں آ رہا تھا۔

''ہیلو گلوریا!'' نک نے قریب پہنچ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بے تکلفی سے کہا۔

لڑکی چونک کر مڑی، ایک اجنبی کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں الجھن کے آثار ابھر آئے۔ نک نے چونک جانے کی اداکاری کرتے ہوئے ایسا انداز میں اختیار کر لیا جیسے اس غلط فہمی پر معذرت خواہ ہو۔

''معاف کرنا خاتون! میں تمہیں اپنی دوست سمجھا۔ گلوریا کی شکل صورت تم سے اس حد تک ملتی جلتی ہے کہ بڑی آسانی سے دھوکا کھا گیا۔'' وہ بولا۔

''میرا نام ارسلا ہے۔'' لڑکی نے مسکراتے ہوئے اپنا تعارف کرا دیا۔

''گڈ۔'' نک بھی معنی خیز انداز میں مسکرا دیا۔ ''اس کا مطلب ہے میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں، اگر آج کی شام ہم اچھے دوستوں کی طرح گزاریں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا۔ دراصل میں اس شہر میں اجنبی ہوں، تمہیں گلوریا سمجھ کر مجھے خوشی ہوئی تھی کہ وہ بھی یہاں موجود ہے۔ کم از کم بوریت تو نہ ہوگی۔''

''اتفاق سے آج کی رات میں بھی فارغ ہوں۔ بیٹھ جاؤ۔ اگر اچھا ساتھی مل جائے تو تفریح کا لطف آ جاتا ہے۔ کیا پیو گے؟'' لڑکی نے پوچھا۔

''تم مجھے یقیناً اچھا بلکہ بہت اچھا ساتھی پاؤ گی۔ ویسے اس وقت میں بیئر کو ترجیح دوں گا۔ اگر تم چاہو تو اپنے لیے شمپین منگوا سکتی ہو۔ بل میرے ذمے رہے گا۔'' نک نے کہا اور ساتھ ہی ویٹرس کو بلا کر بیئر اور شمپین کا آرڈر بھی دے دیا۔

ارسلا بہت کم گو ثابت ہوئی لیکن نک نے اس سے بہت کچھ اگلوا لیا۔ وہ تقریباً دو مہینے پہلے نیو جرسی سے آئی تھی۔ پانچ ہفتے ایک ریسٹورنٹ میں کام کیا پھر کسی وجہ سے اسے نکال دیا گیا۔ ایک ہفتے کی بیکاری کے بعد اسے مصدق نامی ایک ایرانی کے ہاں کام مل گیا جو ایران میں انقلاب آنے کے بعد سے یہاں مقیم تھا۔ مصدق اور اس کی فیملی کے بارے میں ارسلا کا خیال تھا کہ وہ لوگ بہت دولت مند ہونے کے ساتھ سخت گیر بھی ہیں۔ ان کے ہاں اکثر مہمان آتے رہتے ہیں جو زیادہ ایرانی ہی ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی امریکی بھی جاتا ہے۔ ایسے موقعے پر ارسلا کو اس کمرے میں آنے کی اجازت نہیں ہوتی جہاں وہ لوگ بیٹھے ہوں۔ ارسلا کے کہنے کے مطابق کوئی ملازمہ زیادہ عرصہ تک ان کے ہاں نہیں ٹھہرتی تھی۔ ان کے ناروا سلوک کی وجہ سے اکثر ملازمائیں کام چھوڑ کر بھاگ جاتی تھیں۔ اسے خود اگرچہ یہاں کام کرتے ہوئے صرف پندرہ دن ہی ہوئے تھے لیکن اس مختصر سے عرصے میں وہ ان سے تنگ آ چکی تھی اور کسی دوسری جگہ کام حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ارسلا کے کہنے کے مطابق آج مصدق کے ہاں کچھ خاص مہمان آنے والے تھے جس کی وجہ سے اسے رات بھر کی چھٹی دے دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ کوٹھی میں کھانا وغیرہ پکانے کے لیے صرف ایک اور ملازمہ تھی اور اس کا تعلق بھی ایران ہی سے تھا۔

''مجھے حیرت ہے تم جیسی خوددار لڑکی اب تک کیسے ان لوگوں کو برداشت کرتی رہی ہے؟'' نک نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''جب تک کوئی اور کام نہ مل جائے اس وقت تک تو میں وہاں رہنے پر مجبور ہوں اور پھر تنخواہ اتنی ہے کہ کسی اور جگہ اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔'' ارسلا نے جواب دیا۔

''کیا ملتا ہوگا؟''

''دو سو ڈالرز فی ہفتہ۔'' ارسلا نے بتایا۔

نک واقعی چونک گیا۔ ایک گھریلو ملازمہ کو اتنی تنخواہ واقعی کہیں نہیں مل سکتی تھی۔ وہ چند لمحے ارسلا کی طرف دیکھتا رہا پھر ساحل پر چلنے کی تجویز پیش کی جسے ارسلا نے بلا جھجک قبول کر لیا۔ نک نے اٹھ کر بل ادا کیا اور دونوں شراب خانے سے باہر آ گئے۔

شام ہو چکی تھی۔ ساحل پر ایک میلا سا لگا ہوا تھا۔ وہ لوگ چونکہ پیراکی کا لباس لے کر نہیں آئے تھے اس لیے ایک طرف بیٹھ کر نظارہ کرنے لگے۔ نک اس سے کرید کرید کر کوٹھی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ اس کا یہ خیال درست نکلا کہ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی چار دیواری پر تاروں کی باڑ میں برقی رو دوڑا دی جاتی تھی۔ رات بھر خونخوار کتے کمپاؤنڈ میں گشت کرتے رہتے تھے۔

''تم..... یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہو۔ کہیں چوری کا منصوبہ تو نہیں بنا رہے؟ اگر ایسا ہے تو بھول کر بھی کوٹھی میں گھسنے کی کوشش مت کرنا ورنہ زندہ واپس نہ آ سکو گے۔'' ارسلا نے کہا۔

''کیا میں صورت سے تمہیں چور نظر آتا ہوں؟'' نک نے اسے گھورا۔ ''یہ معلومات تو اس لیے حاصل کر رہا تھا کہ ممکن ہے کبھی مجھے وہاں ملازمت کرنے کا موقع ملے تو اپنے آپ کو اس ماحول میں اجنبی نہ پاؤں۔'' نک نے جواب دیا۔

''یہ خیال بھی دل سے نکال دو، وہ مردوں کو ملازم نہیں رکھتے۔'' ارسلا بولی۔

نک ویلوٹ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے زبان کھولی تو ایک نئے موضوع پر گفتگو کر رہا تھا۔ رات کے گیارہ بجے کے قریب جب وہ واپس جانے کے لیے اٹھے تو چند قدم چلنے کے بعد ہی نک ٹھٹک کر رک گیا اور اس آدمی کو گھورنے لگا جو اس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ وہ ایسٹ برج پولیس کا سراغرساں لیفٹیننٹ چارلی ایسٹن تھا۔

چارلی ایسٹن پولیس کا واحد آدمی تھا جو نک ویلوٹ کی اصلیت سے آگاہ تھا۔ اسے علم تھا کہ نک بھاری معاوضہ لے کر چیزیں چراتا ہے۔ وہ شروع سے نک کی تاک میں تھا لیکن آج تک اس کے خلاف کوئی ثبوت فراہم نہیں کر سکا تھا اور اب اسے اپنے سامنے دیکھ کر نک کا اس طرح ٹھٹک جانا غیر فطری نہیں تھا۔

''ہیلو چارلی! یہاں کیسے؟'' وہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

''یہی سوال میں تم سے بھی کر سکتا ہوں نک۔'' چارلی ایسٹن نے اسے گھورا۔ ''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم کس معرکے پر آئے ہو؟''

''تمہاری مذاق کی عادت نہیں گئی۔'' نک نے ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے کہا اور اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف ہو گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ چارلی، ارسلا کے سامنے اس کے بارے میں کوئی ایسی بات کہہ دے جو اس کے موجودہ مشن کے لیے نقصان دہ ثابت ہو۔

''ایک کیس کی تحقیقات کے سلسلے میں دو دن سے یہاں ہوں۔ شاید دو چار دن اور یہاں رہنا پڑے۔ اتفاق سے تمہیں دیکھ لیا۔ میں تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں اگر تم نے یہاں کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو پچھتاؤ گے۔ یہاں کی پولیس بعض معاملات میں میری احسان مند ہے، میرا ایک اشارہ تمہیں سلاخوں کے پیچھے پہنچانے کے لیے کافی ہوگا۔''

''تم غلط سمجھ رہے ہو چارلی! میں یہاں محض تفریح کے لیے آیا ہوں۔ دو چار روز بعد چلا جاؤں گا۔''

''تفریح، گلوریا کے بغیر؟'' چارلی ایسٹن نے اسے گھورا۔

''نہیں گلوریا بھی میرے ساتھ آئی ہوئی ہے۔ وہ ایک دوست سے ملنے چلی گئی تھی۔ میں اس طرف نکل آیا جہاں اس لڑکی سے ملاقات ہو گئی۔ آخر تفریح کے لیے کسی نہ کسی ساتھی کی ضرورت تو پڑتی ہی ہے۔'' نک نے کہتے ہوئے مخصوص انداز میں آنکھ کا گوشہ دبایا۔

''ٹھیک ہے میں خیال رکھوں گا کہ کم از کم میری موجودگی میں تم کوئی حرکت نہ کرنے پاؤ۔'' چارلی ایسٹن کہتا ہوا ایک طرف بڑھ گیا۔

نک الجھ کر رہ گیا۔ چارلی ایسٹن سے ملاقات اس کے لیے پریشانیوں کا سبب بن سکتی تھی۔ اگر اس نے مقامی پولیس کو اس کے بارے میں آگاہ کر دیا تو اس کا یہ مشن یقیناً خطرے میں پڑ سکتا تھا۔ لہٰذا اسے جو کچھ بھی کرنا تھا بہت جلد اور سوچ سمجھ کر کرنا تھا۔ اس سلسلے میں ارسلا سے حاصل ہونے والی معلومات اس کے لیے مفید ثابت ہو سکتی تھی۔

جب وہ ارسلا کے فلیٹ پر پہنچے تو بارہ بج کر دس منٹ ہو چکے تھے۔ ارسلا نے اسے ایک جام پینے کے لیے روک لیا۔ اسی لمحہ نک کے دل میں وہ خیال ابھرا جو شراب خانے میں ارسلا کی باتیں سن کر اس کے دل میں آیا تھا۔ یہ پروگرام اس نے کل کے لیے بنایا تھا لیکن لیفٹیننٹ چارلی سے ملاقات کے بعد کسی قسم کی تاخیر اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔ اس لیے اس نے فوری طور پر اس

www.pdfbooksfree.pk

پروگرام پر عمل کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

''وہسکی چلے گی؟'' ارسلا نے کیبنٹ کھولتے ہوئے پوچھا۔

''ضرور چلے گی۔ لیکن اتنی عجلت بھی کیا ہے۔ میں چند منٹ یہاں رکنا چاہتا ہوں۔'' نک ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے۔ تب پھر میں لباس تبدیل کرلوں۔'' ارسلا کہتی ہوئی دوسرے کمرے میں گھس گئی۔

دوسرے کمرے میں پہنچ کر ارسلا نے بتی جلانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی لیکن بیچ کا دروازہ کھلا ہی رہنے دیا تھا جس سے مدھم روشنی دوسرے کمرے میں پہنچ رہی تھی۔ ملبوسات کی الماری سامنے ہی تھی۔ ارسلا نے الماری کھول کر کپڑے نکالے اور لباس تبدیل کرنے لگی۔ اچانک کال بیل کی آواز نے نک کو جھونکا دیا۔ ارسلا بھی جلدی سے میکسی پہن کر کمرے سے باہر آگئی اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔

نک کرسی پر بیٹھا کن انکھیوں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ باہر سے باتوں کی آواز سنائی دے رہی تھی ارسلا کسی کو سمجھانے کی کوشش کررہی تھی کہ وہ غلط جگہ پر آگیا ہے۔ نک کو صورت حال کا اندازہ لگانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ اٹھ کر دروازے پر پہنچ گیا جہاں شراب کے نشے میں دھت ایک شخص زبردستی اندر گھسنے کی کوشش کررہا تھا۔ نک نے ارسلا کو ایک طرف ہٹایا اور شرابی کو گریبان سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا زینے تک لے گیا۔ شرابی اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کررہا تھا۔ نک نے بڑے اطمینان سے اسے سیڑھیوں پر دھکیل دیا اور ہاتھ جھاڑتا ہوا واپس آگیا۔ اسے حیرت ہوئی تھی کہ شورسن کر راہداری میں کسی اور فلیٹ کا دروازہ نہیں کھلا تھا۔ وہ تو اسے بعد میں ارسلا سے معلوم ہوا کہ اس راہداری میں صرف چار فلیٹ تھے جن میں سے ایک میں وہ خود رہائش پذیر تھی۔ سامنے والے فلیٹ کے باسی دو دن سے میامی گئے ہوئے تھے اور ایک ہفتہ سے پہلے ان کی واپسی کی کوئی توقع نہیں تھی۔ باقی دو فلیٹ خالی پڑے تھے۔ ارسلا کی ان معلومات نے نک کا کام کچھ اور بھی آسان بنادیا۔

کمرے میں آکر ارسلا نے دو گلاسوں میں شراب انڈیلی اور ایک اس کی طرف بڑھادیا۔ گلاس اٹھانے سے پہلے نک اس طرح جیبیں ٹٹولنے لگا جیسے کچھ تلاش کررہا ہو۔ پھر بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔

''سگریٹ ختم ہوگئے۔ مجھے باہر جانا پڑے گا۔''

''باہر جانے کی ضرورت نہیں، میرے پاس سگریٹ ہیں۔ ابھی لاتی ہوں۔'' ارسلا کہتی ہوئی اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وہ جیسے ہی دروازے کی آڑ میں ہوئی نک نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک چھوٹا سا کیپسول نکال کر ارسلا کے گلاس میں ڈال دیا۔ تقریباً دو منٹ بعد ارسلا سگریٹ کا پیکٹ اور لائیٹر لے کر واپس آگئی۔ نک نے ایک سگریٹ سلگایا اور وہسکی کی چسکیوں کے ساتھ سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔

ارسلا کا گلاس آدھا بھی ختم نہیں ہوا تھا کہ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے جھول گئی۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاس فرش پر گر کر چکنا چور ہوچکا تھا اور بچی ہوئی شراب فرش پر پھیل گئی تھی۔ نک کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ کیپسول نے فوراً ہی اپنا کام کردکھایا تھا اور اسے یقین تھا کہ ارسلا اب کم از کم صبح سات بجے سے پہلے ہوش میں نہیں آسکے گی۔ اس نے ارسلا کو اٹھا کر دوسرے کمرے میں پلنگ پر لٹا دیا اور ڈرائنگ روم میں آکر اس میز کے قریب پہنچ گیا جس پر ٹیلیفون رکھا ہوا تھا۔ اس نے فون کا ریسیور اٹھایا اور ہوٹل کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

☆☆☆

صبح پانچ بجے نک ویلوٹ اور گلوریا نے ہوٹل چھوڑ دیا۔ ہوٹل کے گیراج میں ان کی کار موجود تھی۔ شہر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے نک نے گزشتہ روز ٹیکسیوں پر ہی گزارا تھا۔ جبکہ اس دوران گلوریا کو بھی گاڑی کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ ہوٹل سے رخصت ہونے کے بعد وہ کچھ دیر تک شہر کی سنسان سڑکوں پر گھومتے رہے پھر نک نے گاڑی کا رخ سن سیٹ بنے وارڈ کی طرف موڑ دیا۔

عمارت کے سامنے پارکنگ لاٹ پر گاڑی روکتے ہوئے نک نے گہری نظروں سے اطراف کا جائزہ لیا تھا، کوئی مشتبہ بات نظر نہیں آئی تھی۔ وہ گلوریا کو اشارہ کرتا ہوا نیچے اتر آیا۔ گلوریا نے پچھلی سیٹ سے سوٹ کیس اٹھالیا اور دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے عمارت میں داخل ہوگئے۔ پوری عمارت سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی اور دوسری منزل پر توسی کی موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نک نے جیب سے چابی نکال کر ارسلا کے فلیٹ کا دروازہ کھولا اور دونوں اندر داخل ہوگئے۔ نک سیدھے بیڈروم میں گیا تھا۔ یہ دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ ارسلا بستر پر اسی حالت میں پڑی تھی جس حالت میں وہ اسے چھوڑ کر گیا تھا۔

نک ویلوٹ نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔

چھ بجنے میں چند منٹ باقی تھے اور کم از کم مزید ایک گھنٹے تک ارسلا کے ہوش میں آنے کی امید نہیں تھی۔ وہ پلنگ کے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

''اب یہ فلیٹ ہی ہمارے ہیڈ کوارٹر کا کام دے گا۔ یہاں کسی کی مداخلت کا خطرہ بھی نہیں ہے۔'' وہ بولا۔

''لیکن لیفٹیننٹ چارلی ایسٹن کے بارے میں کیا خیال ہے، کیا اس نے مقامی پولیس کو شہر میں تمہاری موجودگی کے بارے میں آگاہ نہیں کردیا ہوگا؟'' گلوریا نے تشویش کا اظہار کیا۔

''خدشہ تو ہے لیکن میں اسے دردسر نہیں بنانا چاہتا۔ بہرحال پہلے تم ناشتا تیار کرو، اس کے بعد ہی کوئی پروگرام بنائیں گے۔ مجھے امید ہے فریج میں ضرورت کی چیزیں موجود ہوں گی۔'' نک پیر پھیلاتے ہوئے بولا۔

گلوریا کچن میں چلی گئی۔ نک کا خیال درست ثابت ہوا۔ ضرورت کی ہر چیز کچن میں موجود تھی۔ اس نے ناشتا تیار کیا اور پھر بیڈروم ہی میں چھوٹی میز پر بیٹھ کر ناشتا کرنے لگے۔ ناشتے کے بعد نک کافی کی چسکیاں لے رہا تھا کہ ارسلا کو بستر پر کسمساتے ہوئے دیکھ کر چونک گیا۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر سوٹ کیس کھولا اور اس میں سے اسٹیل کا ایک چھوٹا سا بکس نکال لیا جس میں سرنج کے علاوہ ایک چھوٹی سی شیشی میں بے رنگ سا کوئی سیال بھرا ہوا تھا۔ سیال سرنج میں بھر کر وہ پلنگ کے قریب آگیا اور ارسلا کے بازو کا مسل ٹٹولنے لگا۔ اسی لمحے ارسلا نے آنکھیں کھول دیں لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے منہ سے سسکاری سی نکل گئی۔ نک سوئی اس کے بازو میں پیوست کرچکا تھا اور اب بہت آہستہ آہستہ پسٹن دبا رہا تھا۔ سرنج میں بھرا ہوا سیال ارسلا کے جسم میں منتقل ہوگیا تو اس نے سوئی باہر کھینچ لی۔ ارسلا ایک بار بھرپور حس و حرکت ہوچکی تھی۔

''اب یہ سہ پہر چار بجے سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گی، تم کافی پیتے ہی روانہ ہوجاؤ۔ تمہیں جو کچھ بھی کرنا ہے۔ اچھی طرح سمجھ چکی ہو۔ اس مشن کی کامیابی کا انحصار تمہاری ذہانت پر ہے۔ میں شام چھ بجے تمہاری رپورٹ کا انتظار کروں گا۔'' نک نے سرنج صاف کرتے ہوئے گلوریا سے مخاطب ہوکر کہا۔

''اگر انہوں نے انکار کردیا تو؟'' گلوریا نے خدشے کا اظہار کیا۔

''یہ خدشہ بہرحال موجود ہے لیکن زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ تمہیں اپنے ہاں رکھ لیں گے۔ ارسلا کے اچانک غائب ہوجانے کی وجہ سے انہیں یقیناً ملازمہ کی ضرورت ہوگی۔ امید ہے کہ ارسلا کا خط دیکھ کر وہ تمہارے بارے میں تحقیقات کی ضرورت نہیں سمجھیں گے۔ لو، یہ خط احتیاط سے اپنے پاس رکھ لو۔'' نک نے کہتے ہوئے اپنی جیب سے ایک پرچہ نکال کر اس کی طرف بڑھادیا۔

گلوریا نے خط کھول کر دیکھا۔ ظاہر ہے ارسلا کی طرف سے یہ جعلی خط تھا جو نک ویلوٹ نے بڑی مہارت سے تیار کیا تھا۔ اس خط میں ارسلا کی طرف سے مسٹر مصدق کو اطلاع دی گئی تھی کہ ماں کی بیماری کی اطلاع پاکر ارسلا کو فوری طور پر نیو جرسی جانا پڑا۔ وہ اپنی کزن گلوریا کو بھیج رہی ہے جو اس کی واپسی تک مسٹر مصدق کی فیملی کی خدمات انجام دے گی اور انہیں شکایت کا کوئی موقع نہیں ملے گا۔

گلوریا نے خط پڑھ کر احتیاط سے جیب میں رکھ لیا اور کپ اٹھا کر کافی کی چسکیاں لینے لگی۔ پھر ٹھیک آٹھ بجے وہ دونوں فلیٹ سے باہر نکل آئے۔ نک نے گلوریا کو مصدق کی کوٹھی سے تقریباً سو گز دور گاڑی سے اتار دیا اور اس وقت تک وہیں رکا رہا جب تک گلوریا گیٹ پر نہ پہنچ گئی۔ وہ تقریباً پانچ منٹ گیٹ پر کھڑی رہی اور پھر اندر داخل ہوگئی۔ محافظ نے شاید اندر سے اجازت ملنے کے بعد ہی گلوریا کو گیٹ میں داخل ہونے کی اجازت دی تھی۔ گلوریا کی اس کامیابی پر نک کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی اور اس نے گاڑی کو ایک ہلکے سے جھٹکے سے آگے بڑھادیا۔

نک کا وہ دن بڑی مصروفیت میں گزرا۔ دو بجے جب وہ ارسلا کے فلیٹ میں واپس پہنچا تو اس کے ہاتھ میں ایک پیکٹ بھی موجود تھا جس میں مختلف نوعیت کی چیزیں تھیں جو شہر کی مختلف دکانوں سے خریدی گئی تھیں۔ اس نے پیکٹ احتیاط سے میز پر رکھ دیا اور کرسی پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا۔

چار بجے کے قریب اس نے بے ہوش ارسلا کو ایک اور انجکشن لگا دیا اور کرسی پر نیم دراز ہوکر آنکھیں بند کرلیں۔ وہ جانتا تھا کہ ارسلا کی مسلسل بے ہوشی اس کے لیے نقصان دہ نہیں تھی۔ اس کے جسم میں منتقل ہونے والا یہ بے رنگ سا سیال اسے نہ صرف دنیا و مافیہا سے غافل رکھے ہوئے تھا بلکہ اسے وہ توانائی بھی فراہم کررہا تھا جو کسی انسان کو صحت مند رکھنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

نک کرسی پر بیٹھے بیٹھے اونگھ گیا اور پھر اچانک ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ گڑبڑا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ارسلا بدستور بستر پر بے ہوش پڑی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پارہا تھا کہ اس کی آنکھ کیسے کھل گئی تھی۔ اسے زیادہ نہیں سوچنا پڑا، دوسرے ہی لمحے اپنی کلائی پر گھڑی کے عین نیچے سوئی کی چبھن محسوس کرکے اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ

www.pdfbooksfree.pk

آ گئی۔ وہ واچ ٹرانسمیٹر پر سگنل تھا۔ اس چبھن سے ہی اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے گھڑی اتار کر سگنل سے باہر کھینچ لیا اور دونوں سوئیاں یارہ پر ملا دیں۔ اس کے ساتھ ہی گھڑی میں پوشیدہ ننھے سے ٹرانسمیٹر سے گلوریا کی آواز سنائی دی۔

''گلوریا اسپیکنگ، نکی! کم آن دی لائن۔''

''یس، نک ریسیونگ۔ کیا رپورٹ ہے گلوریا۔ تمہیں کوئی دشواری تو پیش نہیں آئی؟'' نک نے گھڑی کو منہ کے قریب کرتے ہوئے کہا۔ اس ننھے سے ٹرانسمیٹر پر پچاس میل کے دائرے میں بات کی جا سکتی تھی۔

''زیادہ نہیں۔'' مسٹر مصدق کو قائل کرنا پڑا تھا کہ میں واقعی ارسلا کی کزن ہوں اور وہ اپنی ماں کی بیماری کی اطلاع پا کر نیو جرسی جا چکی ہے جہاں سے چند روز بعد اس کی واپسی ہوگی۔''

''گڈ۔ کام کے بارے میں کیا رپورٹ ہے؟'' نک نے دریافت کیا۔

''یہ مکان واقعی خطرناک ہے۔ مسٹر مصدق اور اس کے بعض ہم وطن اپنے ملک کی انقلابی حکومت کے خلاف کسی قسم کی سازش کر رہے ہیں۔ یہ دراصل دو مختلف پارٹیاں ہیں جو اپنے اپنے طور پر اقتدار حاصل کرنے کے لیے منصوبہ بندی کر رہی ہیں۔ مصدق کا تعلق اس پارٹی سے ہے جو.....''

''میں نے تمہیں وہاں سیاسی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے نہیں بھیجا تھا گلوریا۔'' نک نے اسے ٹوک دیا۔

''سوری نکی!'' گلوریا معذرت آمیز لہجے میں بولی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ''یہ مکان دو منزلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی منزل صرف مسٹر مصدق اور اس کے مہمانوں کے لیے مخصوص ہے۔ دوسری منزل پر چھ کمرے ہیں۔ ایک کمرا بچوں کے لیے مخصوص ہے، دوسرا مسز مصدق کے لیے۔ ارسلا یعنی ملازمہ کا کمرا بھی اسی منزل پر ہے جس کے پچھلی طرف دیوار کے بجائے اوپر سے نیچے تک جالی لگی ہوئی ہے۔ اس کمرے کے ساتھ ہی چکردار عقبی زینہ ہے۔ مجھے بلی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ برف کی طرح سفید لمبے بالوں میں پیشانی پر دائیں آنکھ سے ذرا اوپر سیاہ رنگ کے دو چار بال بھی موجود ہیں۔''

''گڈ۔'' نک مسکرا دیا۔ ''کوٹھی کے حفاظتی انتظامات کے بارے میں بتاؤ؟''

''محافظ دو ہیں۔ ایک دن کو ڈیوٹی دیتا ہے اور دوسرا رات کو۔ دن کو ڈیوٹی والا حافظ رات کو یہاں نہیں رہتا۔ دوبل ٹیریر نسل کے خونخوار کتے ہیں جو دن رات کمپاؤنڈ میں ٹہلتے رہتے ہیں۔ کمپاؤنڈ وال کے اوپر خاردار تاروں میں شام کا اندھیرا پھیلتے ہی برقی رو چھوڑ دی جاتی ہے جو صبح کاذب ہونے تک جاری رہتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی حفاظتی انتظام نہیں ہے۔''

''بلی کے بارے میں کوئی خاص بات معلوم ہوئی؟ میرا مطلب ہے یہ لوگ بلی کو کس حد تک اہمیت دیتے ہیں؟''

''زیادہ نہیں۔ بس ایک پالتو جانور سمجھتے ہیں جسے دن بھر ان کے بچوں کا دل بہلا رہتا ہے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ آج کل بلی کچھ بیمار ہے۔ وہ چلتے چلتے اچانک رک کر چیخنے لگتی ہے جیسے کسی قسم کی تکلیف ہو لیکن ان لوگوں کو غالباً اس کی ذرا بھی پروا نہیں ہے۔'' گلوریا نے بتایا۔

''کمپاؤنڈ وال کی تاروں میں برقی رو کہاں سے آتی ہے؟ میرا مطلب ہے سوئچ مشترکہ ہے یا.....''

''اس کا سوئچ الگ ہے۔'' گلوریا نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے جواب دیا۔

''گڈ۔'' نک نے کہا۔ چند لمحے خاموش رہ کر کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے گلوریا! ہم زیادہ وقت ضائع نہیں کریں گے۔ کیوں نہ آج ہی رات مشن کے آخری مرحلے سے بھی نمٹ لیا جائے؟''

''میں بھی یہی کہنے والی تھی۔ مسٹر مصدق آج رات گیارہ بجے کی فلائٹ سے واشنگٹن جا رہے ہیں۔ اس سے اچھا موقع شاید پھر کبھی نہ ملے۔'' گلوریا نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ اس کے لیے رات کا پچھلا پہر مناسب رہے گا۔ ٹھیک تین بجے۔'' نک بولا۔

''او کے۔ تم مجھے تیار پاؤ گے۔'' گلوریا کی آواز سنائی دی۔ نک چند لمحے اسے مزید کچھ ہدایات دیتا رہا پھر ٹرانسمیٹر آف کر کے گھڑی کو کلائی پر باندھا اور بے ہوش ارسلا کی طرف دیکھتا ہوا فلیٹ سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

رات کے دو بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ نک بے ارسلا کی طرف دیکھا جس کے کم از کم دو گھنٹے تک ہوش میں آنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اس نے رائٹنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر ارسلا کے نام ایک مختصر سی تحریر لکھی اور جیب سے ایک ہزار ڈالرز مالیت کے نوٹ نکال کر اس خط کے ساتھ ہی میز پر رکھ دیے اور ارسلا پر آخری نگاہ ڈالتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ جب وہ فلیٹ سے باہر نکلا تو اس کے ایک ہاتھ میں سوٹ کیس اور دوسرے کندھے پر ایک تھیلا لٹکا ہوا تھا۔

عمارت کے سامنے والی سڑک پر ٹریفک برائے نام ہی تھا۔ پارکنگ لاٹ پر پہنچ کر اس نے سوٹ کیس اور تھیلا کار کی پچھلی سیٹ پر رکھا اور انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی کو پارکنگ لاٹ سے نکال لے گیا۔ اس کا رخ ڈیسن ڈرائیو کی طرف تھا۔

نک ویلوٹ نے مصدق کی کوٹھی کی طرف جانے کے لیے اس چھوٹی سڑک کا انتخاب کیا تھا جو دن میں بھی سنسان رہتی تھی اور رات کے اس آخری پہر تو وہاں کسی قسم کے ٹریفک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کوٹھی کے عقب میں درختوں کے جھنڈ کے قریب اس نے گاڑی روکی تو تین بجنے میں پانچ منٹ تھے۔ وہ تھیلا لے کر کار سے اتر گیا اور کوٹھی کی طرف دیکھنے لگا۔ عمارت کی بالائی منزل کی دو کھڑکیوں سے نائٹ بلب کی مدھم روشنی جھلک رہی تھی، اس کے علاوہ پوری کوٹھی سناٹے اور تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ البتہ مین روڈ کی طرف گیٹ پر تیز روشنی کا بلب جل رہا تھا لیکن محافظ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ غالباً اپنے کیبن میں بیٹھا تھا۔ سناٹے میں کبھی کبھار کتوں کے غرانے کی آواز بھی سنائی دے جاتی جو کمپاؤنڈ میں ٹہل رہے تھے۔

ٹھیک تین بجے نک ویلوٹ کو گھڑی کے نیچے کلائی پر سوئی کی چبھن محسوس ہوئی۔ اس نے گھڑی اتارے بغیر بٹن کھینچ کر سوئیاں ایڈجسٹ کیں اور گھڑی منہ کے قریب لاتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔

''یس، نک ویلوٹ۔''

''راستہ صاف ہے نکی! میں نے سوئچ آف کر دیا ہے، تم آ سکتے ہو۔'' گھڑی کے ٹرانسمیٹر پر گلوریا کی سرگوشیانہ آواز بھری۔

''ٹھیک ہے، میں آ رہا ہوں۔ تم تیار رہنا۔'' نک نے کہتے ہوئے گھڑی کا بٹن دبا دیا اور دبے قدموں چلتا ہوا دیوار کے قریب پہنچ گیا۔

پختہ دیوار چار فٹ اونچی تھی اور اس کے اوپر مزید دس فٹ کی بلندی تک خاردار تاروں کا جنگلا تھا۔ دیوار کے قریب پہنچ کر نک نے تھیلے میں سے الیکٹرک ٹیسٹر نکالا اور اس کا اسکریو ڈرائیور نما حصہ جنگلے کی ایک تار پر رکھ دیا۔ تار میں برقی رو نہیں تھی۔ اس نے تین چار تاروں کو آزما ڈالا۔ ٹیسٹر کا بلب نہیں جلا اس کا مطلب یہ تھا کہ گلوریا ان تاروں کو برقی رو فراہم کرنے والا سوئچ آف کر چکی تھی۔ اس نے ٹیسٹر تھیلے میں ڈال کر پلائر نکال لیا اور احتیاط سے تاریں کاٹنے لگا۔ چند تاریں کاٹنے سے جنگلے میں اتنا خلا پیدا ہو گیا کہ ایک آدمی آسانی سے گزر سکتا تھا۔ اس نے تھیلا کندھے پر سنبھالا اور اچک کر دیوار پر چڑھ گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ نہایت آہستگی سے اندر کود گیا۔ اگرچہ اس نے بڑی احتیاط سے کام لیا تھا لیکن دھپ کی ہلکی سی آواز پھر بھی ابھری تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ دبک کر بیٹھ گیا اور تاریکی میں گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ اس لمحے فضا میں غراہٹ کی خوفناک آواز ابھری، نک ہوشیار ہو گیا۔ کسی کتے نے اس کی موجودگی کو محسوس کر لیا تھا اور اب غراتا ہوا اس کی طرف آ رہا تھا۔ نک کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا چند سیکنڈ بعد ہی اسے وہ کتا دکھائی دیا جو اس پر جھپٹ رہا تھا۔ نک نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر گوشت کا ایک بڑا سا لوتھڑا نکال لیا۔ کتا جیسے ہی قریب پہنچا نک نے گوشت کا لوتھڑا اس کی طرف اچھال دیا لیکن اتنی دیر میں کتا اس پر چھانگ لگا چکا تھا۔ نک نے بڑی پھرتی سے ایک طرف چھلانگ لگا دی۔ کتا اپنی جھونک میں دیوار سے ٹکرایا۔ اس کے منہ سے خوف ناک غراہٹ نکلی۔ نک نے بڑی پھرتی سے گوشت کا لوتھڑا اٹھا کر اس کے سامنے ڈال دیا۔ گوشت کی خوشبو نے کتے کی توجہ اس کی طرف سے ہٹا دی۔ اسی لمحے نک کو دوسرے کتے کی غراہٹ سنائی دی۔ نک نے تھیلے میں سے گوشت کا ایک اور لوتھڑا نکال لیا اور دوسرے کتے کا استقبال کرنے کو تیار ہو گیا۔ چند سیکنڈ بعد دوسرا کتا بھی گھاس پر بیٹھا گوشت پر منہ چلا رہا تھا۔

نک چند قدم دور بیٹھا بڑی دلچسپی سے کتوں کو گوشت کھاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ کتوں کے منہ سے تیز غراہٹیں نکل رہی تھیں جو رفتہ رفتہ مانڈ پڑنے لگیں اور پھر گوشت کے لوتھڑے ختم ہونے سے پہلے ہی دونوں کتے گھاس پر لڑھک گئے۔ نک نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور تھیلا سنبھال کر تاریکی کا سہارا لیتا ہوا دبے قدموں عمارت کے عقبی حصے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے گوشت کے لوتھڑوں کو جس سیال میں تر کیا تھا وہ ان خونخوار کتوں کو کم از کم دو گھنٹوں تک بے ہوش رکھ سکتا تھا۔

عمارت کے عقب میں چکردار زینے کے قریب پہنچ کر وہ ایک لمحہ رکا اور پھر محتاط انداز میں زینے پر چڑھنے لگا۔ زینے کے اختتام پر دروازے کے سامنے وہ رک گیا۔ چند لمحے اطراف کا جائزہ لیتا رہا پھر دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے آہستگی سے گھمانے لگا۔ دروازہ مقفل نہیں تھا۔ آواز پیدا کیے بغیر کھلتا چلا گیا۔

راہداری کے آخری سرے پر مدھم روشنی کا بلب جل

www.pdfbooksfree.pk

رہا تھا۔ نک ویلوٹ نے ایک لمحہ انتظار کیا اور قریبی دروازہ کھول دیا۔ اس کمرے میں مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ دروازے کے عین سامنے والی دیوار جالی کی تھی جس سے آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے نظر آرہے تھے۔ کمرے کے عین وسط میں ایک آرام دہ بستر پر لمبے بالوں والی سفید رنگ کی وہ بلی محوِ خواب تھی جس کی خاطر اسے یہ خطرات مول لینا پڑے تھے۔ نک نے تھیلے میں سے ایک چھوٹی اسپرے گن نکال لی اور بلی کی طرف بڑھا۔ وہ جیسے ہی قریب پہنچا بلی اٹھ کر غرانے لگی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے جھپٹ سکتی ہے۔ نک نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اسپرے گن کا بٹن دبا دیا۔ بلی کے منہ پر ایک پھوار پڑی۔ وہ غراتی ہوئی اچھلی اور پھر بستر پر ڈھیر ہو کر بے حس و حرکت ہوگئی۔

نک ویلوٹ نے تھیلے سے پلاسٹک کا ایک اور تھیلا نکال لیا۔ بلی کو اس تھیلے میں منتقل کرنے سے پہلے اس نے پیشانی کو غور سے دیکھا۔ دائیں آنکھ سے کچھ اوپر چند سیاہ بال بھی نظر آرہے تھے۔ یہ بلاشبہ وہی بلی تھی جس کے لیے اسے چالیس ہزار ڈالرز کی نقد ادائی کی گئی تھی۔

بلی کو تھیلے میں ڈال کر وہ جیسے ہی باہر نکلا راہداری کے آخری سرے پر ایک سائے کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ چپک گیا لیکن اسے دیکھ لیا گیا تھا۔ اسی لمحے فضا میں ایک نسوانی آواز ابھری۔

''کون ہے، وہاں کون ہے؟''

نک ویلوٹ نے زینے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ چکر دار زینے پر اترنا اگرچہ خطرناک تھا لیکن وہ تھیلے کو سنبھالے دوڑتا چلا گیا۔ نیچے پہنچتے ہی اسے ایک اور سایہ اپنی طرف لپکتا دکھائی دیا۔

وہ گلوریا تھی جو اس کے انتظار میں وہاں کھڑی تھی۔ اسی لمحے فضا میں عورت کے چیخنے اور شور مچانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

''نکی! بھاگو۔ محافظ نے اگر چیخوں کی یہ آواز سن لی تو وہ اندھا دھند فائرنگ شروع کر دے گا۔'' گلوریا چلائی۔

نک ویلوٹ، گلوریا کا ہاتھ پکڑ کر اس طرف دوڑا جہاں اس نے جنگلے کے تار کاٹے تھے۔ دیوار کے قریب دونوں کتے بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔ دیوار پھاندتے وقت گلوریا نے کوئی سفید چیز اندر کی طرف اچھال دی۔

''یہ کیا تھا؟'' نک نے اس کے پیچھے چھلانگ لگاتے ہوئے پوچھا۔ ''فیوز کا کٹ آؤٹ جسے میں نے احتیاطاً اپنے پاس رکھ لیا تھا۔'' گلوریا نے جواب دیا۔

وہ دونوں کار کی طرف دوڑتے چلے گئے۔ کوٹھی کے لان سے اب شور کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ اسی لمحے فضا میں فائرنگ کی آواز گونجی۔ محافظ نے شاید انہیں دیکھ لیا تھا لیکن نک نے وقت ضائع کیے بغیر گاڑی کا انجن اسٹارٹ کر کے اسے ایک زبردست جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ کار تیز رفتاری سے سنسان سڑک پر دوڑنے لگی۔ اس کا رخ نیشنل ہائی وے کی طرف تھا۔

☆☆☆

شام کے سات بجے فون کی گھنٹی کی آواز سن کر نک کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ آگئی۔ اس نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا۔ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ یہ مس شہپر کی کال تھی۔

''ہیلو مسٹر نک! تم اگرچہ میرے آدمی کو نچہ دے کر ایئر پورٹ سے غائب ہو گئے تھے لیکن مجھے تمہاری اتنی جلد واپسی کی توقع نہیں تھی۔ میں ایک گھنٹے بعد تمہارے فلیٹ پر پہنچ رہی ہوں، بلی لینے کے لیے۔''

''مجھے افسوس ہے مس شہپر کہ بلی آج تمہیں نہیں مل سکتی۔'' نک نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''کیوں؟ آج کیوں نہیں مل سکتی؟'' شہپر کے لہجے میں ہلکی سی غراہٹ تھی۔

''اس کی وجہ یہ ہے کہ.....''

''میں کوئی وجہ نہیں سننا چاہتی۔ میں زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں وہاں پہنچ رہی ہوں۔'' شہپر کی آواز کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

نک نے ریسیور رکھتے ہوئے بلی کی طرف دیکھا جو گلوریا کے بستر پر محوِ خواب تھی۔ وہ لوگ آج دوپہر کے قریب واپس پہنچے تھے۔ گلوریا کو فلیٹ پر چھوڑ کر نک بلی سمیت کہیں غائب ہو گیا تھا۔ اس کی واپسی اب سے تقریباً آدھ گھنٹا پہلے ہوئی تھی اور گلوریا یہ دیکھ کر حیرت زدہ سی رہ گئی تھی کہ وہ ایرانی بلی نک سے اس طرح مانوس ہو گئی تھی جیسے شروع ہی سے اس کے پاس رہ رہی ہو۔

نک آتشدان کے قریب کرسی پر نیم دراز سا ہو گیا۔ گلوریا اس وقت دوسرے کمرے میں تھی۔ ٹھیک ایک گھنٹے بعد کال بیل بجی تو دروازہ نک ہی نے اٹھ کر کھولا تھا۔ وہ شہپر تھی جو دروازہ کھلتے ہی مسکراتے ہوئے اندر داخل ہو گئی۔ نک اسے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی شہپر کی نظر صوفے پر

محوِ خواب بلی پڑی تھی۔ وہ لپک کر اس کے قریب پہنچ گئی۔ اسی لمحے بلی نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے ہلکی سی غراہٹ بھی نکلی تھی۔ شہپر جھک کر بلی کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ بلی نے چاروں ٹانگیں پھیلا کر انگڑائی سی لی اور اسی لمحے شہپر چونک گئی۔ وہ بلی پیٹ کو دیکھ رہی تھی جہاں سے کچھ بال کٹے ہوئے تھے اور بینڈیج لگی تھی جیسے وہاں کوئی زخم رہا ہو۔

''یہ..... یہ کیا..... یہ زخم کیسا ہے؟'' شہپر نے متوحش نگاہوں سے نک کی طرف دیکھا۔ اسی وقت گلوریا بھی کمرے میں داخل ہو کر خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

''یہ زخم کیسا ہے؟ اس کے بارے میں مجھ سے بہتر تم جانتی ہوگی۔ یہی تمہاری مطلوبہ بلی ہے۔ اس کے زخمی ہونے کی وجہ سے ہی میں نے تمہیں آج یہاں آنے سے روکنا چاہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ زخم ٹھیک ہو جائے تو دو چار روز بعد بلی تمہارے حوالے کر دوں گا۔'' نک نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ..... یہ زخم پہلے سے تھا یا.....؟''

''ایک زخم پہلے تھا جو مندمل ہو چکا تھا۔ یہ تازہ زخم اس آپریشن کی وجہ سے ہوا ہے جو آج ہی میں نے کروایا تھا۔''

''کیا مطلب؟'' شہپر نے اسے گھورا۔

''مس شہپر!'' نک اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہنے لگا۔ ''تمہیں معلوم ہے میں ایسی کوئی چیز نہیں چراتا جس کی کوئی سیاسی، تاریخی یا مالی اہمیت ہو۔ میری ان شرائط سے واقف ہوتے ہوئے بھی تم نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی۔ تمہیں دراصل اس بلی کی نہیں اس فلم کی ضرورت تھی جو آپریشن کے ذریعے اس کے پیٹ میں چھپائی گئی تھی۔ تم لوگ اپنے ملک کی انقلابی حکومت کے خلاف کیا سازشیں کر رہے ہو؟ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں لیکن میں بلاواسطہ یا بالواسطہ کسی بھی طرح اس معاملے میں ملوث نہیں ہونا چاہتا۔ تہران میں تمہارے آدمیوں نے انقلابی حکومت کے خلاف ایک خوفناک سازش تیار کی تھی۔ ایران میں رہتے ہوئے چونکہ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانا ممکن نہیں تھا اس لیے انہوں نے یہ ساری سازش ایک مائیکرو فلم پر منتقل کر کے اسے آپریشن کے ذریعے بلی کے پیٹ میں محفوظ کر دیا اور وہ بلی تمہارے یہاں کے گروہ کے سربراہ مسٹر مصدق کے نام بھیج دی گئی۔ مگر بدقسمتی سے بلی مصدق نامی ایک اور ایرانی کے پاس پہنچ گئی جو ایران کی انقلابی حکومت کا خاص آدمی ہے اور انقلابی حکومت کے خلاف سازشوں کا سراغ لگانے کے سلسلے ہی میں یہاں مقیم ہے، اسے بلی کی حقیقت کا علم نہیں تھا۔ اس نے کسی دوست کا تحفہ سمجھ کر اسے قبول کر لیا۔ اگر اسے حقیقت کا علم ہو جاتا تو اب تک تم لوگوں کا خاتمہ ہو چکا ہوتا۔ بہرحال مجھے کچھ شبہ تو اسی وقت ہو چکا تھا جب تم نے محض ایک بلی کے لیے چالیس ہزار ڈالرز ادا کیے تھے لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بلی کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے لیکن جب گلوریا نے بتایا کہ بلی چلتے چلتے اچانک رک کر چیخنے لگتی ہے تو میرے شبے کو تقویت ملی۔ آج دوپہر یہاں واپس آتے ہی میں نے بلی کا ایکسرے کروایا اور پھر آپریشن کے ذریعے یہ مائیکرو فلم نکال لی جس میں ایران کی انقلابی حکومت کے خلاف وہ خوفناک سازش موجود ہے جس سے اگر حکومت کا تختہ نہ بھی الٹا جائے تو پورے ملک میں خانہ جنگی شروع ہو سکتی ہے۔ میں یہ فلم تمہارے حوالے نہیں کر سکتا۔ تم نے بلی چرانے کے لیے کہا تھا، اسے شوق سے لے جا سکتی ہو۔'' نک نے کہتے ہوئے جیب سے ایک ننھی سی فلم نکالی، اسے کھولا اور آتشدان میں اچھال دیا۔

شہپر آتشدان کی طرف لپکی لیکن اتنی سی دیر میں ہی شعلے مائیکرو فلم کو خاکستر کر چکے تھے۔ ''یہ تم نے کیا، کیا؟'' وہ نک کی طرف دیکھ کر چیخی۔

''وہی، جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ بلی حاضر ہے، چاہو تو ابھی لے جا سکتی ہو۔'' نک نے بلی کی طرف اشارہ کیا۔

''اسے بھی اپنے ہی پاس رکھو، مجھے بلی کی ضرورت نہیں۔'' شہپر چیخی۔

''کوئی بات نہیں۔ ایک بلی پہلے ہی سے میرے پاس موجود ہے یہ دوسری بھی سہی۔'' نک نے مسکراتے ہوئے پہلے ایرانی بلی اور پھر گلوریا کی طرف دیکھا۔

شہپر اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکی تھی۔ اس نے خونخوار نظروں سے نک کی طرف دیکھا اور پیر پٹختی ہوئی باہر نکل گئی۔ مگر گلوریا نک کا مطلب اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔ وہ غراتے ہوئے نک کی طرف بڑھی۔

''کیا کہا..... کیا کہا تم نے نکی؟''

''کک..... کچھ نہیں..... میرا مطلب ہے ایرانی بلی۔'' نک اچھل کر اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ دوسرے ہی لمحے کمرے کی فضا ان دونوں کے قہقہوں سے گونجنے لگی اور بستر پر بیٹھی ہوئی ایرانی بلی حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔ گلوریا نے آگے بڑھ کر بلی کو گود میں اٹھا لیا اور پیار سے اس کے ریشمی بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

www.pdfbooksfree.pk

پہاڑ اور جھل

ملک صفدر حیات

کہتے ہیں کہ محبت پیروں کی ایسی زنجیر ہوتی ہے جو محبوب کو اِدھر اُدھر ہونے نہیں دیتی مگر... کبھی کبھی ایسی حماقتیں بھی سرزد ہوجاتی ہیں کہ یہی زنجیر بیڑیوں کی شکل اختیار کرلیتی ہے اور ایسے میں محبت، محبت نہیں بلکہ رسوائی بن جاتی ہے... کچھ ایسی ہی غلطیوں کا ارتکاب وہ بھی کر بیٹھے تھے لیکن ان کی قسمت اچھی تھی کہ اس دور کی معاشرتی صورتِ حال عہدِ حاضر کی طرح بگڑی ہوئی نہ تھی۔ ورنہ آج ان کی اپنی سانس ان پر ہی بھاری ہوجاتی... کٹھن معاملے کو سہل بنانے کے لیے ملک صاحب کو ٹھیک ٹھاک محنت کرنا پڑی... کہ سچی محبت تو ہر دل کو بھاتی ہے۔

زندگی کے نازک دوراہے پر مجرم کو محرم بنانے والے پولیس انسپکٹر کی فرض شناسی

بعض لوگ بڑے عجیب ہوتے ہیں!

وہ اچانک آپ کے سامنے آکر کوئی ایسی حرکت کرتے ہیں کہ آپ چونک جاتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر ایک نامعلوم سا تجسس جاگ اٹھتا ہے اور جب وہ زبان کھولتے ہیں تو فضا میں سنسنی سی پھیل جاتی ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی آپ پوری توجہ سے ان کی بات سننے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔

جُما بھی ایک ایسا ہی کردار تھا.....!

وہ ماہِ جولائی کے اختتامی ایّام تھے۔ ساون اپنے جوبن پر تھا۔ رات کو سونے کے لیے لیٹو تو بارش ہورہی ہے۔ صبح آنکھ کھلے تو بارش موجود اور دن بھر بھی گاہے بہ گاہے یہ اپنی شکل دکھانے سے باز نہیں آرہی۔ معمولاتِ زندگی بری طرح متاثر ہوکر رہ گئے تھے۔ ایسی ہی ایک برساتی شام میں، میں تھانے میں بیٹھا ہوا تھا کہ جُما مجھ سے ملنے آگیا۔ اگر وہ پانچ، دس منٹ لیٹ ہوجاتا تو میں کمرے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر میں جاچکا ہوتا۔

کانسٹیبل باسط نے کمرے میں آکر مجھے بتایا۔ ''ملک صاحب! ایک بندہ آپ سے ملاقات کرنے آیا ہے.....!''

''برستی بارش میں یہ کون مجھ سے ملنے آگیا!'' میں نے سوالیہ نظر سے باسط کی جانب دیکھا۔ ''لگتا ہے، کوئی سنگین معاملہ ہی ہے ورنہ ایسی ایمرجنسی کی کیا ضرورت تھی.....''

''جناب! میں نے اسے کُریدنے کی کوشش کی ہے۔'' کانسٹیبل نے بتایا۔ ''لیکن وہ ایک ہی ضد پر اَڑا ہوا ہے کہ آپ سے مل کر ہی اپنی آمد کے بارے میں بتائے گا۔''

''ٹھیک ہے، بھیجو اسے اندر۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''دیکھوں تو سہی، وہ ہے کون اور کون سی اطلاع لے کر آیا ہے۔''

''جی اچھا ملک صاحب!'' باسط یہ کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

چند سیکنڈ کے بعد جُما میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

اس کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد کاٹھ کا مالک ایک ایسا شخص تھا جس کی شناختی علامات بڑی واضح تھیں۔ وہ ایک آنکھ سے محروم اور ایک ٹانگ سے معذور تھا اور یہ تمام تر محرومی و معذوری جسم کے بائیں حصے میں واقع ہوئی تھی۔ وہ جب لنگڑاتے ہوئے میرے سامنے آکر بیٹھا تو میں چونک کر رہ گیا تھا ایک محروم اور معذور شخص کا بارش میں مجھ سے ملنے آنے کا ایک ہی

www.pdfbooksfree.pk

مطلب تھا اور وہ یہ کہ میرے تھانے کی حدود میں کوئی بڑی گڑبڑ ہو چکی تھی۔ میں نے تشویش بھری نظر سے اپنے سامنے بیٹھے جُما کو دیکھا اور اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال کرتا، اس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

"تھانے دار صاحب! اگر معاملہ سنگین نہ ہوتا تو میں اتنی بارش میں کبھی آپ کے پاس نہ آتا۔"

"ہاں..... وہ تو مجھے بھی اندازہ ہو رہا ہے۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔ "لیکن تمہارا لباس تو بالکل خشک ہے، کیا بارش نے تمہارا مزاج نہیں پوچھا؟"

"جناب، یہ کسی کو معاف نہیں کرتی۔" اس نے کمرے کے دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ میرا مزاج بھی ضرور پوچھتی لیکن میں نے موم جامہ اوڑھ رکھا تھا، اس لیے اس کی مہربانی سے محفوظ رہا ہوں۔"

گاؤں دیہات میں، بارش کے دوران میں لوگ عموماً موم جامہ اوڑھ کر باہر نکلتے ہیں، یہ موم جامہ کوئی خاص قسم کا اوڑھنا نہیں ہوتا بلکہ موم کی، بڑے سائز کی تھیلی کی ایک سائڈ لمبائی کے رخ پر کھول لی جاتی ہے اور کسی ٹوپے والے جُبّے کے مانند اسے پہن لیا جاتا ہے۔

میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ "جُما! وہ کون سا سنگین معاملہ ہے جس نے اس برسات کے موسم میں تمہیں تھانے آنے پر مجبور کر دیا ہے؟"

اس نے جواب دینے سے پہلے ایک مرتبہ پھر چوکنا نظر سے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا پھر دھیمی آواز میں بولا۔ "تھانے دار صاحب! سخاوت کو چوان کی لڑکی غائب ہو گئی ہے۔"

اس کے انکشاف نے مجھے چونکا دیا اور میں اضطراری انداز میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ "سخاوت کو چوان.....؟"

"جی ہاں!" اس نے بڑے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی۔ "سخاوت کی گم ہونے والی لڑکی کا نام نازلی ہے جناب اور وہ آج صبح ہی سے لاپتا ہے۔"

"اب تو شام ہو رہی ہے۔" میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ "اگر نازلی صبح سے لاپتا ہے تو اس کے باپ نے ابھی تک یہاں آ کر رپورٹ درج کیوں نہیں کرائی.....؟"

"ایک وجہ تو یہ بارش ہے تھانے دار صاحب!" وہ آواز دبا کر بولا۔ "اور دوسرا سبب عزت وغیرہ کا معاملہ ہو سکتا ہے۔ سخاوت اپنے طور پر نازلی کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ابھی تک یہ خبر عام نہیں ہوئی۔ بس، مجھے کہیں سے پتا چل گیا ہے۔ سخاوت کی خواہش ہے کہ وہ اس واقعے کی دھوم مچنے سے پہلے ہی کسی نہ کسی طرح نازلی کو ڈھونڈ نکالے تاکہ پھر گاؤں والوں اور خصوصاً خاندان والوں کو یہ نہ بتانا پڑے کہ نازلی کہاں گئی تھی اور اسے کس سے تلاش کیا گیا ہے۔"

"ہوں.....!" میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر میں نے آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ "تمہارا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟"

"کچھ نہیں جناب.....!" وہ اپنی اکلوتی آنکھ سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں تو جی بس، ہمدردی میں آپ کو یہ سنسنی خیز اطلاع دینے آ گیا ہوں۔"

"کس کی ہمدردی میں؟" میں نے پوچھا۔ "سخاوت کو چوان کی یا پولیس کی ہمدردی میں.....!"

"دونوں ہی کی سمجھ لیں سرکار....." وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اگر آپ کی کوشش سے سخاوت کی لڑکی مل جائے گی تو اس میں دونوں ہی کا فائدہ ہے نا۔ نازلی خیر خیریت سے اپنے گھر پہنچ جائے گی اور آپ کے ریکارڈ میں ایک اور کارنامے کا اضافہ ہو جائے گا۔"

"تمہاری فرض شناسی نے مجھے متاثر کیا ہے جُما!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا پھر پوچھا۔ "کیا تم ادھرا یمن آباد ہی میں رہتے ہو؟"

ان دنوں میری تعیناتی ایک ایسے تھانے میں تھی جو کی حدود میں قصبہ ایمن آباد بھی آتا تھا اور اس تھانے میں تعینات ہوئے ابھی مجھے لگ بھگ ایک ماہ ہی ہوا تھا۔ اس سے پہلے میں جھنگ صدر کے ایک تھانے میں پیشہ وارانہ فرائض ادا کر رہا تھا۔ ایمن آباد ضلع گوجرانوالہ کی حدود میں آتا تھا۔

جُما نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ "جناب! جبھی تو مجھے پتا چلا ہے کہ سخاوت کی لڑکی نازلی گھر سے غائب ہے۔"

یہ جواب اس بات کی تصدیق تھا کہ جما ایمن آباد ہی کا رہائشی تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "تم کرتے کیا ہو؟"

"وہ جی، میں کریانے کی ایک چھوٹی سی دکان چلاتا ہوں۔" اس نے بتایا۔

"تمہارا اصل نام کیا ہے؟"

"نام تو میرا جمال دین ہے جی۔" وہ دھیمی آواز میں بولا۔ "لیکن سب مجھے جُما جما ہی کہتے ہیں اور..... بعض تو "جُما جج نال" بھی کہہ دیتے ہیں۔"

"تمہاری سخاوت علی کے ساتھ کوئی رشتے داری تو

نہیں ہے نا؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "میرا مطلب ہے، گم ہونے والی لڑکی تمہاری کچھ لگتی تو نہیں.....؟"

"کچھ نہیں جناب۔" وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ "بس، محلے داری سمجھ لیں۔"

"ٹھیک ہے جُما.....!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "یہ اہم اطلاع دینے کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں لیکن اس سلسلے میں فی الحال میں کوئی عملی قدم نہیں اٹھا سکتا۔"

"کیا مطلب تھانے دار صاحب.....؟" وہ تعجب خیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اس کی چشم دید کے اطمینان کی خاطر کہا۔ "بات دراصل یہ ہے جُما کہ جب تک نازلی کے گھر والوں یعنی اس کے ورثا میں سے کوئی تھانے آ کر اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج نہ کرا دے، میں نازلی کی تلاش کے لیے قانونی چارہ جوئی نہیں کر سکتا البتہ....." میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"البتہ، میں اپنے عملے کے ایک مقامی کانسٹیبل کو اس معاملے کی سُن گُن کے لیے مقرر کر دیتا ہوں تاکہ مجھے تازہ ترین حالات کا پتا چلتا رہے۔"

"ٹھیک ہے جناب! آپ اتنا ہی کر لیں۔" وہ سادگی سے بولا۔

"لیکن میرے سرگرم ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ تم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاؤ۔" میں نے تنبیہ کرنے والے انداز میں کہا۔ "تم اپنی آنکھیں اور کان مسلسل کھلے رکھو گے اور جیسے ہی تمہیں کام کی کوئی بات معلوم ہو، تم سیدھا میرے پاس آ کر بتاؤ گے۔ سمجھ رہے ہو نا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں.....؟"

"بڑی چنگی طراں سمجھ رہا ہوں تھانے دار صاحب!" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا پھر اپنی ڈاڑھی میں انگلیاں گھمانے کے بعد یہ اضافہ کیا۔ "آپ اس سلسلے میں تو بالکل بے فکر ہو جائیں۔"

"شاباش!" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "تو آپ اب مجھے اجازت دیں۔ میں اپنی دکان پر گوشی کو بٹھا کر آیا ہوں۔"

"یہ گوشی کون ہے؟" میں نے روا روی میں پوچھ لیا۔

"گوشی میرا آٹھ سالہ بیٹا ہے جناب....." جُما نے بتایا۔ "نام تو اس کا نصیر ہے جی لیکن لوگ اسے گوشی کہہ کر بلاتے ہیں۔" لمحاتی توقف کے بعد اس نے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

"وہ بچپن میں بالکل بگوگوشے (ناشپاتی) کی طرح کا تھا اسی لیے گوشی مشہور ہو گیا اور..... ابھی بھی وہ ایسا ہی ہے۔"

میں نے جمال دین عرف جُما کو جانے کی اجازت دے دی۔ وہ جس طرح لنگڑاتے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوا تھا بالکل ویسے ہی لنگڑاتے ہوئے واپس چلا گیا اور جاتے جاتے مجھ سے ایک وعدہ بھی لے گیا۔ جب وہ اٹھ کر کھڑا ہوا تھا تو اس نے درخواست آمیز انداز میں مجھ سے کہا تھا۔

"تھانے دار صاحب! میں تو سخاوت کی بھلائی کے لیے آپ کو اطلاع دینے آ گیا ہوں لیکن میرا نام کہیں نہ ہی آئے تو اچھا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ سخاوت کا دل میری طرف سے میلا ہو۔ وہ جس معاملے کو چھپا رہا ہے، میں اس کو کھولنے والا مشہور ہو گیا تو وہ مجھ سے ناراض بھی ہو سکتا ہے۔"

"میں تمہاری مجبوری کا خیال رکھوں گا۔" میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ "تم مطمئن ہو کر جاؤ اور مزے سے دکان داری کرو۔"

وہ اپنی تشکر سے لبریز اکلوتی آنکھ سے مجھے دیکھنے کے بعد رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے کانسٹیبل باسط کو اپنے پاس بلا لیا اور پوچھا۔ "کیا کانسٹیبل نوازش ڈیوٹی پر آ گیا ہے؟"

نوازش نامی یہ کانسٹیبل مقامی تھا، یعنی اس کی رہائش ادھرا یمن آباد ہی میں تھی۔ وہ آج کل شبینہ ڈیوٹی کر رہا تھا۔ باسط نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

"نہیں جناب! ابھی تک تو نہیں پہنچا۔ ٹائم تو ہو گیا ہے۔ بس، آنے ہی والا ہو گا۔"

"وہ جیسے ہی آئے، اسے میرے پاس بھیج دینا۔" میں نے کہا۔ "ایک بہت ہی ضروری کام ہے اس سے....."

"اس لنگڑے نے کہیں نوازش کی کوئی شکایت وغیرہ تو نہیں کر دی۔" باسط نے ٹٹولنے والی نظر سے میری طرف دیکھا۔

"ہاں..... کچھ ایسی ہی بات ہے۔" میں نے گول مول جواب دیا۔

"ملک صاحب! خیریت تو ہے نا....." اس کی آنکھوں میں تشویش بھر گئی۔ "یہ لنگڑا تھا کون؟"

"کیا تم اسے جانتے نہیں ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جناب!" باسط نے نفی میں گردن ہلائی۔ "میں نے اسے آج پہلی مرتبہ دیکھا ہے لیکن یہ بندہ مجھے بڑا ہی عجیب سا لگا ہے۔"

"عجیب سا.....!" میں نے چونک کر کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

www.pdfbooksfree.pk

''پتا نہیں جناب، آپ میری بات کو مذاق سمجھیں گے۔'' وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ''لیکن میں نے جو دیکھا ہے، وہ مجھے ہضم نہیں ہو رہا......''

''تم نے ایسا کیا دیکھ لیا ہے باسط؟'' میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

''ملک صاحب! جب یہ بندہ تھانے کی عمارت میں داخل ہوا تھا تو میں نے اسے باقاعدہ لنگڑاتے ہوئے دیکھا تھا۔''

''ہاں، وہ تو میں نے بھی دیکھا ہے۔'' میں نے اضطراری انداز میں قطع کلامی کی۔ ''وہ میرے کمرے میں لنگڑاتے ہوئے ہی آیا ہے۔''

وہ بولا۔ ''یہ ایک اتفاق ہے کہ جب وہ شخص تھانے سے رخصت ہو رہا تھا تو بھی میں نے اسے جاتے ہوئے دیکھا ہے اور تبھی مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ ڈراما کر رہا ہے......''

''کس قسم کا ڈراما؟'' اس کے خاموش ہوتے ہی میں نے سوال کر دیا۔

''مجھے یقین ہے کہ وہ لنگڑا نہیں۔''

''کیا...... کیا مطلب؟''

''وہ جب تھانے کی عمارت سے نکل کر اپنے گھوڑے کی جانب بڑھ رہا تھا تو میں نے اسے غور سے دیکھا ہے جناب۔'' باسط انکشاف انگیز لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ چند قدم تو لنگڑاہٹ بھری چال کے ساتھ آگے بڑھا پھر جب وہ اپنے گھوڑے سے آٹھ، دس فٹ کے فاصلے پر تھا تو اس کی چال بالکل نارمل ہو گئی۔ وہ اُچک کر گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہوا اور گھوڑے کو چلاتے ہوئے جی ٹی روڈ کی طرف بڑھ گیا تھا، اسی وقت آپ نے مجھے اپنے پاس بلا لیا اور میں یہ نہ دیکھ سکا کہ وہ آگے کس سمت گیا ہے......''

باسط ایک ایسی بات بتا رہا تھا جسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا۔ اگر جُمّا ایمن آباد ہی کا وسنیک تھا تو پھر اسے جی ٹی روڈ کی جانب جانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اپنی کریانے کی دکان کھلی چھوڑ کر آیا تھا اسی لیے اسے واپسی کی بھی جلدی تھی لہٰذا اسے تو فی الفور اپنی دکان پر یعنی ایمن آباد کے اندرونی حصے کی طرف جانا چاہیے تھا اور کانسٹیبل باسط کوئی اور ہی کہانی سنا رہا تھا۔

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہیں دیکھنے میں کوئی مغالطہ ہوا ہو؟'' میں نے باسط کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''بارش کے سبب اس کی چال میں تیزی آ گئی ہو اور تمہیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ لنگڑا نہیں رہا ہو بلکہ کسی صحت مند ٹانگوں والے انسان کی طرح چل کر اپنے گھوڑے کی جانب بڑھا ہو۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ملک صاحب!'' وہ پُر یقین سے بولا۔ ''میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ نے جو بھی دیکھا وہی آپ کو بتایا ہے۔ میری بات کا کریں یا نہ کریں، یہ آپ کی مرضی ہے جناب۔''

''ٹھیک ہے، میں اس بندے کو چیک کروں گا۔'' نے معاملے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''تم اب جاؤ اور نواز ش ہی تھانے پہنچے، اسے فوراً میرے کمرے میں بھیج دینا۔''

''اوکے سر......!'' وہ مجھے سلیوٹ کر کے واپس چلا

میں دراصل نوازش کو اپنے پاس بلا کر سخاوت علی کی شدہ بیٹی نازلی کے بارے میں استفسار کرنے کا ارادہ تھا۔ جُمّا کی اطلاع کے مطابق نازلی آج صبح ہی سے غائب تھی۔ نوازش چونکہ ایمن آباد ہی کا رہنے والا تھا لہٰذا نازلی گمشدگی کے حوالے سے اس سے زیادہ معتبر خبر کوئی دے نہیں سکتا تھا جبکہ وہ دن بھر گھر میں بھی رہا تھا لیکن نے ابھی جُمّا کی لنگڑاہٹ کے ذیل میں جو سنسنی خیز انکشاف کیا تھا اس کی روشنی میں جُمّا قابل بھروسا نہیں رہتا جب وہ قابل اعتبار نہیں رہا تھا تو پھر اس کی فراہم کردہ اطلاع کو کیوں کر معتبر سمجھا اور جانا جا سکتا تھا۔

میرا ذہن کئی زاویوں پر بہ یک وقت سوچتے ہوئے خاصا الجھ سا گیا تھا اور اس الجھن کو ایک ہی شخص دور کر سکتا اور وہ تھا کانسٹیبل نوازش...... میں بڑی بے تابی سے اس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

جب مزید ایک گھنٹے تک بھی نوازش تھانے پہنچا اور ہی نازلی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے کی خاطر نے ادھر کا رخ کیا تو میں تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر کی طرف آ گیا۔ مذکورہ کوارٹر تھانے کی عمارت کے پچھواڑے واقع تھا۔

نہایت ہی مختصر اور جامع الفاظ میں یہی کہا جا سکتا کہ کانسٹیبل باسط نے جُمّا کی چال کے بارے میں جو فتویٰ جاری کیا تھا، وہ بے وزن نہیں تھا۔

✂✂✂

میں نے حسب معمول مغرب کی نماز کے بعد رات کھانا کھایا اور برآمدے میں بستر لگا کر لیٹ گیا۔ موسم تھا کہ کمرے کے اندر سویا جا سکتا تھا اور نہ ہی کوارٹر کے میں لیٹنا ممکن تھا۔ کمرے میں گھٹن، گرمی اور مچھر تھے صحن میں بارش برس رہی تھی لہٰذا آج کل اکثر راتیں برآمدے ہی میں گزر رہی تھیں۔

میں خود تو کوارٹر کے برآمدے میں لیٹا ہوا تھا اور ذہن

جمال دین عرف جُمّا کے معاملے میں الجھا ہوا تھا۔ اگر کانسٹیبل باسط کی آنکھوں کو کوئی دھوکا نہیں ہوا تھا تو پھر جُمّا کی تھانے میں آمد بڑی تشویش ناک تھی۔ اس نے مجھے سخاوت کوچوان کی بیٹی نازلی کی گمشدگی کی اطلاع دی تھی لیکن سخاوت علی کی جانب سے کوئی بھی شخص اس واقعے کی رپورٹ درج کرانے نہیں آیا تھا۔ یہ بھی سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔ جُمّا نے اس کوتاہی کا جو جواز پیش کیا تھا وہ میرے لیے قابل قبول نہیں تھا۔

ان لمحات میں، میں ان خطوط پر بھی سوچ رہا تھا کہ اگر سخاوت کوچوان کی بیٹی نازلی گھر سے غائب نہیں ہوئی تھی تو پھر کہیں جُمّا مجھے غلط معلومات فراہم کر کے اپنا کوئی پوشیدہ مقصد تو حاصل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کانسٹیبل باسط کے حیرت انگیز انکشاف نے جُمّا کی ذات کو شک کی دبیز چادر میں لپیٹ کر رکھ دیا تھا۔ وہ سامنے ہوتا تو میں اس یک چشم، ڈیڑھ ٹانگ شخص سے اپنے مطلب کی بات چٹکی بجاتے میں اگلوا لیتا۔

میں اسی اُدھیڑ بن میں تھا کہ کوارٹر کے دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔ میں نے لیٹے لیٹے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا۔ بارش کا سلسلہ وقتی طور پر رک گیا تھا تاہم ہلکی پھلکی بوندا باندی جاری تھی۔ فوری طور پر میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ سخاوت کی طرف سے نازلی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے کوئی تھانے پہنچا ہو گا جبھی کوئی کانسٹیبل میرے دروازے کو کھٹ کھٹانے آ گیا تھا۔

میں نے بستر چھوڑ دیا اور جب تک صحن کو عبور کر کے میں بیرونی دروازے تک پہنچتا، دستک کی آواز ایک مرتبہ پھر ابھری تھی۔ تیسری دستک سے پہلے ہی میں دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ دروازہ کھولنے سے قبل میں نے حسبِ عادت پوچھ لیا۔

''کون ہے بھئی......؟''

''میں ہوں جی...... نوازش۔'' دوسری جانب کانسٹیبل نوازش کی جانی پہچانی آواز ابھری۔ ''میں جانتا ہوں، آپ ابھی تک سوئے نہیں ہوں گے اسی لیے ادھر آ گیا ہوں ورنہ کبھی زحمت نہ دیتا......''

نوازش کا اندازہ صد فیصد درست تھا۔ میں عموماً عشا کی نماز کی ادائی کے بعد ہی سونے کے لیے لیٹا کرتا تھا اور ابھی عشا کی اذان بھی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے کنڈی گرا کر دروازہ کھول دیا۔

سامنے کانسٹیبل نوازش کھڑا تھا۔ میں نے اسے راستہ دیتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اندر آ جاؤ۔''

''باسط نے ابھی مجھے بتایا ہے کہ آپ مجھے یاد کر رہے تھے......'' وہ کوارٹر کے اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں معذرت چاہتا ہوں ملک صاحب...... آج مجھے ڈیوٹی پر آنے میں کافی دیر ہو گئی ہے۔''

اس کے بعد وہ مجھے بتانے لگا کہ اس تاخیر کا سبب کیا تھا۔ بارش نے اس کے گھر کی ایک دو چھتوں کے ساتھ خاصی گڑبڑ کر دی تھی اور وہ ان کی ٹپکن کو روکنے میں ایسا مصروف تھا لہٰذا وقت پر تھانے نہ پہنچ سکا۔

میں نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی۔ اس دوران میں ہم چلتے ہوئے برآمدے میں آ گئے تھے جہاں میری چارپائی کے ساتھ ہی دو کرسیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک کرسی سنبھال لی اور دوسری پر اسے بیٹھنے کا اشارہ کرنے کے بعد کہا۔

''تم نے بالکل ٹھیک سنا ہے، میں واقعی تمہیں بڑی شدت کے ساتھ یاد کر رہا تھا۔''

''ملک صاحب! خیریت تو ہے نا......؟'' وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے پریشانی سے بولا۔

''ابھی تک تو خیریت ہی ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن آگے کیا ہو گا اس بارے میں قبل از وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

''آپ تو مجھے ڈرا رہے ہیں جناب......!'' اس کی پریشانی دوچند ہو گئی۔ ''کچھ بتائیں تو سہی، آخر معاملہ کیا ہے؟''

''کچھ نہیں...... بلکہ میں پورا معاملہ ہی تمہارے سامنے کھول دیتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ باسط نے تمہیں کیا کہانی سنائی ہے؟''

''اس نے تو یہی بتایا ہے کہ آج شام میں ایک کانا اور لنگڑا گھڑسوار تھانے آیا تھا۔'' نوازش نے الجھن زدہ لہجے میں جواب دیا۔ ''اس شخص نے آپ سے میری کوئی شکایت کی ہے اسی لیے آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''یہ وہ کہانی ہے جو میں نے باسط کو ٹالنے کے لیے سنائی تھی۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔''

''اور حقیقت کیا ہے ملک صاحب......؟'' اس کی پریشانی منزل بہ منزل عروج کی طرف جا رہی تھی۔ ''وہ گھڑسوار تھا کون...... میں تو کسی لنگڑے اور کانے شخص کو نہیں جانتا......''

اس کی بات نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ ''نوازش! کیا تم ایمن آباد میں

www.pdfbooksfree.pk

نہیں رہتے ہو؟"

"رہتا ہوں جی.....!" وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

"پھر تم جُما، جُما جج نال کو تو اچھی طرح جانتے ہوگے.....؟"

میں ہر زاویے سے اطلاع فراہم کرنے والے جُما کے بارے میں تسلی کرلینا چاہتا تھا اسی لیے غیر محسوس انداز میں نوازش کو ٹٹول رہا تھا۔ مجھے تو ایمن آباد کے علاقے میں تعینات ہوئے ابھی صرف ایک ماہ ہی ہوا تھا لہٰذا یہاں کے لوگوں کو جاننے اور پہچاننے کا دعویدار نہیں تھا لیکن کانسٹیبل نوازش جدی پشتی ایمن آباد ہی کا رہنے والا تھا اس لیے یہاں کے بچے بچے اور بڑے بوڑھے کو اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے جُما کا ذکر کیا تو اس کی حیرت دوچند ہوگئی۔ بے حد الجھے ہوئے انداز میں بولا۔

"آپ کی باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں ملک صاحب! یہ جُما جج نال کیا شے ہے جناب.....؟"

"کمال ہے..... تم ایمن آباد میں رہتے ہو اور جمال دین عرف جُما سے واقف نہیں ہو۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میں اس شخص کی بات کررہا ہوں جس کی بائیں ٹانگ میں لنگ ہے اور وہ بائیں ہی آنکھ سے محروم بھی ہے۔ اس نے درمیانے سائز کی ڈاڑھی بھی رکھی ہوئی ہے۔ اس کے آٹھ سالہ بیٹے کا نام نصیر عرف بگو گوشہ ہے اور یہ جُما ایمن آباد ہی میں کریانے کی دکان کرتا ہے۔"

"ملک صاحب! یا تو میں ابھی ابھی ایمن آباد میں پیدا ہوا ہوں اور یا پھر آپ میرا امتحان لینے کے لیے ایسے الٹے سیدھے سوال کررہے ہیں۔" وہ بے حد سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "میری معلومات اور یادداشت کے مطابق میں ایسے کسی شخص کو نہیں جانتا بلکہ میں یہاں تک دعویٰ کرسکتا ہوں کہ اس حلیے، وضع قطع اور بہ یک وقت دو بنیادی جسمانی عیوب والا کوئی بندہ پورے ایمن آباد میں ہے ہی نہیں۔"

"اور اگر اس بندے کا ایک عیب کم کردیا جائے تو.....؟" میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔

کانسٹیبل باسط کی بات میرے ذہن میں لہرا کر گزر گئی تھی۔

"ایک عیب کم کرنے سے آپ کی کیا مراد ہے ملک صاحب؟" نوازش نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "میں کچھ سمجھا نہیں جناب.....!"

"مثلاً..... ہم فرض کرلیتے ہیں کہ جُما لنگڑا نہیں ہے۔" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "بس اس کی ایک آنکھ نہیں، پھر تمہارا جواب کیا ہوگا؟"

لمحاتی تذبذب کے بعد اس نے جواب دیا۔ "پھر بھی یہی کہوں گا کہ آپ جس بندے کا ذکر کررہے ہیں پورے ایمن آباد میں کہیں نہیں ہے۔" وہ چند ثانیے توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

"ہمارے علاقے میں صرف ایک ہی کانا شخص ہے جس کا نام منظور ہے۔ اس کی ڈاڑھی بھی نہیں اور ساٹھ سال سے کچھ اوپر ہی ہے۔ وہ پچھلے دو سال سے چارپائی سے لگا ہوا ہے۔ گھڑسواری تو دور کی بات، وہ تو پھرنے کے بھی قابل نہیں....."

"ہوں.....!" میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کا مطلب ہے، مجھ سے ملاقات کرنے والا وہ جُما فراڈ شخص تھا، وہ اپنے کسی خاص مقصد کی خاطر مجھے گمراہ کرنے یہاں آیا تھا۔"

"جناب! آپ مجھے اس بندے کے بارے میں تفصیل سے تو بتائیں....." نوازش نے بے حد الجھن زدہ انداز میں کہا۔ "اس کی آپ کے ساتھ کیا بات چیت ہوئی ہے.....؟"

نوازش کے استفسار کے جواب میں، میں نے تمہید ہی جامع اور مختصر الفاظ میں اسے صورت حال سے آگاہ کردیا۔ میں خاموش ہوا تو وہ سنسنی خیز لہجے میں بولا۔

"ملک صاحب! میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں، وہ جو کوئی بھی تھا بہت ہی دھوکے باز انسان تھا۔ اس نے ہر حوالے سے آپ کے ساتھ سراسر غلط بیانی کی ہے۔ سخاوت کو چوان میری گلی ہی میں رہتا ہے۔ اگر ایسا کوئی واقعہ پیش آیا ہوتا تو مجھ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا۔ میں یہاں سے جانے کے بعد گھر پر صرف چار گھنٹے سویا ہوں گا۔ میں دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے اٹھ گیا تھا۔ سخاوت کوچوان کی لڑکی نازلی کو تو میں نے سہ پہر میں خود اپنی آنکھوں سے گلی میں کھڑے دیکھا ہے۔ اگر وہ آج صبح سے گھر سے غائب ہوگئی ہوتی تو پھر کیسے نظر آتی۔"

نوازش کی گواہی نے اس معاملے کو روز روشن کے مانند عیاں کردیا تھا۔ اب اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ جُما نامی وہ کانا سراسر دروغ گو اور فراڈ شخص تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس نے یہ حرکت آخر کی ہی کیوں؟"

اس کا یہ عمل فہمی مذاق کے خانے میں تو فٹ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کوئی شخص اتنی دیدہ دلیری کے ساتھ تھانے میں آکر خوامخواہ تو اس قسم کی حرکت نہیں کرسکتا تھا۔ اگر جُما

یہ سب کیا تھا تو پھر اس عمل کے پیچھے اس کا کون سا مقصد پوشیدہ تھا، اس بات کا پتا چلانا بہت ضروری تھا۔

"جناب! مجھے تو وہ آدمی کوئی بہت ہی چالاک مجرم محسوس ہورہا ہے۔" نوازش نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "کوئی عام شریف انسان تو اس قسم کی حرکت کی ہمت ہرگز نہیں کرسکتا۔ اس کے پیچھے اس کی کوئی گہری چال بھی ہوسکتی ہے۔"

"بھی ہوسکتی ہے..... نہیں، بلکہ یقیناً اس عمل کے پیچھے اس کا کوئی خطرناک مقصد پوشیدہ ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اور ہمیں جلد از جلد اس کے مقصد تک رسائی حاصل کرنا ہوگی۔"

"وہ کیسے ملک صاحب.....؟" وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وہ ایسے کہ.....!"

آئندہ پندرہ بیس منٹ میں، میرے اور کانسٹیبل نوازش کے درمیان جمال دین عرف جُما کے عزائم اور مقاصد کے حوالے سے خاصی سنجیدہ گفتگو ہوئی اور یہ طے پاگیا کہ اگلی صبح کو ہم اس شخص کو ڈھونڈ نکالنے کے لیے کیا لائحہ عمل اختیار کریں گے۔

وہ شخص لنگڑا تھا یا نہیں اور اس کا نام بھی جُما ہی تھا یا کچھ اور..... یہ بات اتنی اہم نہیں تھی۔ میرے لیے سب سے زیادہ قابل توجہ امر یہ تھا کہ اس نے یہ سارا ڈراما آخر کس مقصد کے حصول کے لیے رچایا تھا.....؟

اس کا مقصد جو بھی تھا لیکن مجھے قوی یقین تھا کہ میں بہت جلد اس کے عزائم کی تہ تک پہنچ جاؤں گا۔ اگر یہ حرکت اس کا کوئی مذاق تھا تو یہ مذاق اسے بہت مہنگا پڑنے والا تھا اور..... اگر یہ مذاق نہیں تھا تو پھر بھی کسی صورت اس کی اب خیر نہیں تھی۔ جلد یا بہ دیر، میں اسے ڈھونڈ نکالتا، پھر اس کا جو بھی حشر ہوتا، وہ پورا ایمن آباد دیکھتا۔

✂✂✂

اگلی صبح بڑی ہنگامہ خیز تھی۔

میں رات کو کانسٹیبل نوازش کے جانے کے بعد کافی دیر تک اس ایک آنکھ اور ڈیڑھ ٹانگ والے دھوکے باز جُما، جُما جج نال کے بارے میں سوچتا رہا تھا، اس لیے صبح آنکھ تھوڑی تاخیر سے کھلی تھی۔ میں نے جلدی جلدی ناشتا کیا اور تیار ہوکر تھانے پہنچ گیا جہاں ایک نیا ہنگامہ میرا منتظر تھا۔ میں اپنے کمرے میں جاکر بیٹھا ہی تھا کہ نوازش میرے پاس آگیا اور سنسنی خیز لہجے میں بولا۔

"ملک صاحب! سارا مسئلہ ہی حل ہوگیا....."

"کون سا مسئلہ؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔

"وہی جناب..... اس لنگڑے اور کانے والا مسئلہ۔" وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ "اس نے اپنی کالی زبان سے آپ کو جو اطلاع دی تھی، وہ حقیقت میں پیش آچکا ہے۔"

"کیا مطلب.....!" میں نے متذبذب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ سخاوت کی لڑکی غائب ہوگئی ہے.....؟"

"جی ہاں..... میرا یہی مطلب ہے۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "سخاوت کوچوان اور اس کی گھر والی باہر برآمدے میں آئے بیٹھے ہیں۔"

میں ابھی برآمدے میں سے گزر کر جب اپنے کمرے کی جانب آرہا تھا تو میں نے برآمدے میں بچھی چوبی بینچ پر ایک مرد اور عورت کو بیٹھے دیکھا تھا۔ میں انہیں چہروں سے نہیں پہچانتا تھا۔ اب نوازش نے بتایا تو پتا چلا کہ وہ سخاوت علی اور اس کی بیوی بشریٰ تھے۔

"وہ نازلی کی گمشدگی کے بارے میں کیا بتا رہے ہیں؟" میں نے کانسٹیبل سے سوال کیا۔

"میں انہیں آپ کے پاس لے کر آتا ہوں۔" نوازش نے کہا۔ "آپ ان کی زبانی ہی کہانی سنیں تو زیادہ اچھا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے..... لے آؤ انہیں اندر....." میں نے جلدی سے کہا۔

اگلے ہی لمحے وہ دونوں میاں بیوی میرے سامنے بیٹھے تھے۔ ان کی پریشانی سے تو میں آگاہ ہو ہی چکا تھا پھر بھی میں نے یکے بعد دیگرے ان کے چہروں کا جائزہ لیا اور پوچھا۔

"جی بتائیں..... میں آپ لوگوں کے لیے کیا کرسکتا ہوں؟"

انہوں نے اضطراری نظروں سے باری باری ایک دوسرے کو دیکھا۔ ان کے انداز میں ایک خاص قسم کی ہچکچاہٹ پائی جاتی تھی جیسے نگاہوں ہی نگاہوں میں وہ ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہوں کہ تھانے دار کو کون مسئلے سے آگاہ کرنا ہے۔

میں نے ان کی مشکل کو آسان کرتے ہوئے استفسار کیا۔ "کیا آپ لوگ کسی قسم کی رپورٹ درج کرانے تھانے آئے ہیں؟"

"ہم بہت پریشان ہیں تھانے دار صاحب.....!"

www.pdfbooksfree.pk

مرد نے بکھری ہوئی آواز میں کہا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"میں سخاوت علی ہوں جی۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا پھر اپنی ساتھی عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ میری گھر والی بشریٰ ہے جناب......!"

"ٹھیک ہے...... آپ دونوں کا تعارف تو ہوگیا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اب یہ بھی بتادیں کہ کون سی پریشانی آپ کو کھینچ کر تھانے لے آئی ہے؟"

"ہماری پریشانی نازلی کی وجہ سے ہے تھانے دار صاحب......" بشریٰ گلوگیر آواز میں بولی۔ "وہ رات سے کہیں غائب ہے۔ کچھ پتا نہیں چل رہا کہ وہ کہاں گئی۔ ہم اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر جیسے پاگل ہوگئے ہیں۔"

"نازلی ہماری بیٹی ہے جناب!" بشریٰ کے خاموش ہوتے ہی سخاوت نے بتایا۔ "سمجھ میں نہیں آرہا کہ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نے نگل لیا ہے۔ ہم نے پورا ایمن آباد چھان مارا ہے لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ ساری رات ہم نے جاگ کر گزاری ہے......"

"آپ کی بیٹی کی عمر کیا ہے؟" میں نے باری باری ان کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

"ان سردیوں میں وہ پورے بائیس سال کی ہوجائے گی جناب۔" بشریٰ نے بتایا۔

"آخری بار نازلی کو آپ لوگوں نے کب اور کہاں دیکھا تھا؟" میں نے پوچھا۔

جُمّا کی اطلاع کے مطابق نازلی گزشتہ روز صبح گھر سے غائب ہوئی تھی۔ یہ اطلاع سراسر غلط تھی کیونکہ کانسٹیبل نوازش نے کل سہ پہر نازلی کو اپنی گلی میں کھڑے دیکھا تھا۔ نوازش اور سخاوت کوچوان ایک ہی گلی میں رہتے تھے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ نازلی کے والدین اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں۔

میرے سوال کے جواب میں سخاوت نے بتایا۔ "مغرب کی اذان کے وقت تو وہ گھر میں ہی تھی۔ جب میں مسجد کی طرف گیا تو اسے گھر کے اندر ہی دیکھا تھا اور جب واپس آیا تو وہ گھر میں موجود نہیں تھی۔"

"جب تم مغرب کی نماز کے لیے گھر سے نکلے تو اس وقت نازلی کے علاوہ اور کون کون گھر کے اندر موجود تھا؟" میں نے سخاوت کوچوان سے پوچھا۔

"بشریٰ تھی اور...... خالد تھا......" اس نے جواب دیا۔ "بشریٰ اور نازلی دونوں گھر کے اندر تھیں اور میرا چھوٹا بیٹا خالد باہر دروازے کے سامنے گلی میں کھیل رہا تھا۔ میں نے اسے گھر جانے کے لیے کہا۔ جب وہ درواز... اندر داخل ہوگیا تو میں مسجد کی طرف چلا گیا تھا۔"

جُمّا مغرب کی نماز سے کچھ دیر پہلے میرے پا... تھا یعنی جب وہ تھانے میں بیٹھا مجھے نازلی کی گمشدگی کی... سنا رہا تھا اس وقت نازلی اپنے گھر پر موجود تھی۔ اس... فوری طور پر ایک بات ذہن میں آئی تھی کہ عین ممکن... نازلی کی گمشدگی میں اسی کانے جُمّا کا ہاتھ ہو۔

"اور جب تم مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد... سے واپس آئے تو نازلی گھر میں موجود نہیں تھی۔" می... دوبارہ سخاوت کوچوان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے... "تم نے ابھی مجھے یہی بتایا ہے نا......؟"

"جی ہاں، تھانے دار صاحب!" اس نے اثبات... گردن ہلائی۔ "یہی حقیقت ہے جو میں نے بیان کی ہے..."

میں نے اپنا رخ بشریٰ کی طرف پھیرا اور سوال ک...

"اب تم مجھے بتاؤ کہ نازلی کہاں چلی گئی۔ سخاوت تو اسے... میں چھوڑ کر گیا تھا اور جب یہ واپس آیا تو وہ غائب تھی۔... دوران میں تم تو گھر پر تھیں نا......؟"

"جی تھانے دار صاحب، میں گھر میں تھی۔" اس... تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ "اس وقت بارش رک... تھی۔ وہ میرے پاس آئی اور کہا کہ دس منٹ کے لیے عا... کے گھر جارہی ہے۔ ابھی واپس آجائے گی اور...... وہ ا... تک واپس نہیں آئی۔" بات ختم کرتے کرتے اس کی آ... رندھ گئی۔

"کیا تم لوگوں نے نازلی کو عارفہ کے گھر میں تلاش کیا..." میں نے استفسار کیا۔ "اور یہ بھی بتائیں کہ عارفہ کون ہے......"

بشریٰ کے مطابق، عارفہ، صفیہ نامی ایک بیوہ کی... تھی۔ صفیہ کا گھر ان کی پچھلی گلی میں تھا۔ یہ تفصیل فرا... کرنے کے بعد بشریٰ نے بتایا۔

"جی سب سے پہلے تو ہم نے وہیں دیکھا تھا... نازلی وہاں نہیں تھی۔"

"عارفہ نے کیا بتایا......؟"

"عارفہ کا کہنا ہے کہ پندرہ بیس منٹ کے بعد... اس کے گھر سے چلی گئی تھی۔" بشریٰ نے جواب دیا۔ "... وہ ابھی تک اپنے گھر نہیں پہنچی تھانے دار صاحب......"

"کیا وہ پہلے بھی عارفہ کے گھر جاتی رہتی تھی؟"

"جی...... یہ کوئی نئی بات نہیں۔" سخاوت نے جو... دیا۔ "عارفہ اور نازلی آپس میں سہیلیاں ہیں۔ دونوں... ایک دوسرے کے گھر آتی جاتی رہتی ہیں۔"

www.pdfbooksfree.pk

"نازلی مغرب کی اذان کے وقت عارفہ کے گھر گئی......" میں نے پرسوچ لہجے میں کہا۔ "پندرہ بیس منٹ وہاں بیٹھی اور ان لوگوں کے بیان کے مطابق وہ اپنے گھر واپس آگئی لیکن آپ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ گھر نہیں پہنچی۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا......؟"

"جی ہاں، یہی صورتِ حال ہے۔" سخاوت نے کمزور سی آواز میں کہا۔

"تم لوگوں نے نازلی کو کہاں کہاں تلاش کیا ہے؟"

"یہ پوچھیں کہ کہاں تلاش نہیں کیا......" وہ بولا۔ "ہم نے اسے پورے ایمن آباد میں ڈھونڈا ہے مگر وہ کہیں نہیں ملی۔"

"اور ایمن آباد کے باہر......؟" میں نے سوالیہ نظر سے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا۔

"باہر وہ کہاں جاسکتی ہے تھانے دار صاحب......!" سخاوت بے چارگی سے بولا۔

"میرا مطلب ہے......" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "ایمن آباد سے باہر آپ لوگوں کے رشتے دار وغیرہ تو ہوں گے۔ ہوسکتا ہے، وہ کسی رشتے دار کے گھر چلی گئی ہو؟"

یہ سوال میں نے محض خانہ پُری کے لیے کیا تھا تاکہ اس امکانی گوشے پر بھی کچھ روشنی پڑ جائے ورنہ اس بات کے امکانات تو نہ ہونے کے برابر تھے۔ میری توقع کے عین مطابق بشریٰ نے جواب دیا۔

"اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھانے دار صاحب۔" وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔ "آج تک وہ اکیلی کہیں نہیں گئی۔ اگر اسے ایمن آباد سے باہر کہیں جانا بھی تھا تو وہ ہمیں بتاتی۔ اس طرح چپ چاپ خود ہی منہ اٹھا کر وہ کہیں نہیں جاسکتی۔" وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوئی پھر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

"مجھے تو جناب...... یہ کوئی اور ہی چکر لگتا ہے۔"

"تمہارے ذہن میں کیا ہے؟" میں نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے بشریٰ کی طرف دیکھا۔

"کسی نے اسے اغوا......!" وہ اس سے آگے کچھ نہ بول سکی۔

"ہم اس پہلو پر بھی بات کریں گے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "پہلے آپ لوگ مجھے اس بات کا جواب دیں کہ ایمن آباد سے باہر آپ کے رشتے دار اور کہاں کہاں رہتے ہیں؟"

"بشریٰ کا تو کوئی رشتے دار اس دنیا میں ہے نہیں تھانے دار صاحب۔" سخاوت کوچوان نے بڑی رسان سے جواب دیا۔ "اور میرا بھی صرف ایک بڑا بھائی اور ایک چھوٹی بہن ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں......"

"کیا تمہارے یہ بھائی بہن ادھر ایمن آباد ہی میں رہتے ہیں؟"

"نہیں جی......" سخاوت نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ "بھائی امانت علی تو موضع ہندو چک میں رہتا ہے اور میری چھوٹی بہن زینت ادھر کامونکی میں رہتی ہے۔"

"ہندو چک" ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جو ایمن آباد کے تقریباً شمال مشرق میں واقع تھا جبکہ کامونکی نامی قصبہ ایمن آباد کے جنوب میں واقع تھا۔ اگر گوجرانوالہ سے لاہور کی طرف سفر کریں تو اپر چناب نہر عبور کرنے کے بعد قصبہ ایمن آباد آتا تھا۔ اس کے بعد کامونکی، پھر مریدکے، شاہدرہ اور دریائے راوی عبور کرنے کے بعد لاہور۔ ایمن آباد، کامونکی، مریدکے، شاہدرہ...... سب جی ٹی روڈ پر واقع تھے۔ کامونکی اور مریدکے کی غلہ منڈیاں بہت مشہور تھیں۔

"ہاں بھئی بشریٰ......!" میں نے گمشدہ نازلی کی ماں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہارے خیال میں نازلی ہندو چک کی طرف گئی ہے اور نہ ہی اس نے کامونکی کا رخ کیا ہے بلکہ تم اس رخ پر سوچ رہی ہو کہ شاید اسے کسی نے اغوا کرلیا ہے...... ہیں نا؟"

"جج...... جی!" اس نے اثباتی انداز میں پلکیں جھپکائیں۔

میں ان میاں بیوی سے گفتگو کے دوران میں اہم پوائنٹس ایک کاغذ پر نوٹ بھی کرتا جارہا تھا۔ بشریٰ کے جواب پر میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"جب کوئی شخص اچانک منظر سے غائب ہوجاتا ہے اور ڈھونڈنے پر دستیاب نہیں ہوتا تو ذہن اس کے اغوا یا قتل کی طرف جاتا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس قسم کا کام کوئی سجن دوست نہیں کرسکتا بلکہ یہ کسی دشمن کی کارروائی سمجھی جاتی ہے۔ اب آپ لوگ مجھے یہ بتائیں کہ......" میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کا دشمن کون ہوسکتا ہے......؟"

"دشمن......!" سخاوت نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ "ہمارا تو کوئی بھی دشمن نہیں ہے تھانے دار صاحب......"

"اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دے رہے ہیں نا؟"

"جی ہاں...... بالکل......" سخاوت نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں تو ایسے کسی شخص کو نہیں جانتا جو دشمنی نکالنے کے لیے نازلی کو اغوا کرلے......"

"جمال دین کا نام سنا ہے تم لوگوں نے؟" میں نے اِتمام حُجت ضروری جانا۔

"جمال دین.....!" دونوں کی زبان سے بہ یک وقت نکلا اور وہ متحد بذب نظروں سے ایک دوسرے کو تکنے لگے۔

میں نے ان کی مشکل آسان کرنے کی غرض سے کہا۔ "میں اس جمال دین کی بات کر رہا ہوں جس کی ایک ٹانگ میں لنگ ہے اور وہ ایک آنکھ سے کانا ہے۔ اس نے ڈاڑھی رکھی ہوئی ہے اور لوگ اسے جُمّا کہتے ہیں اور..... بعض تو اسے چھیڑنے کے لیے "جُمّا، جانچ نال" بھی کہہ کر پکارتے ہیں.....؟"

"یہ کون بندہ ہے جناب؟" سخاوت کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔ "میں تو ایسے کسی شخص سے واقف نہیں ہوں۔"

"اور تم.....؟" میں نے سوالیہ نظر سے بشریٰ کی جانب دیکھا۔

اس نے جلدی سے نفی میں گردن ہلائی اور بولی۔ "نہیں جی..... میں نے اس قسم کے بندے کو کبھی نہیں دیکھا۔"

ان میاں بیوی کے واضح جوابات سے یہ بات تو پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ جو شخص جُمّا کی حیثیت میں، گزشتہ شام مجھ سے ملنے تھانے آیا تھا، یہ لوگ اسے بالکل نہیں جانتے تھے۔ نہ دوست کے طور پر اور نہ ہی کسی دشمن کے رنگ میں۔ میں نے سوچا، اس جُمّا کی ہسٹری تو میں بعد میں معلوم کروں گا، پہلے ذرا فریادیوں کی دادرسی کر لوں۔

"آپ دونوں کی باتوں سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نازلی کی گمشدگی میں کسی کا ہاتھ نہیں بلکہ وہ خود اپنی مرضی سے غائب ہوئی ہے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب؟" سخاوت کے لہجے میں احتجاج تھا۔

بشریٰ بھی بے یقینی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "وہ اپنی مرضی سے کہیں نہیں جا سکتی جناب۔ آج سے پہلے بھی ایسا نہیں ہوا۔"

"اگر پہلے کبھی کچھ نہ ہوا ہو تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ آئندہ بھی ویسا نہیں ہو سکے گا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا پھر باری باری ان دونوں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

"کیا نازلی کی شادی ہو چکی تھی؟"

کاسنیل نوازش کی زبانی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ نازلی کنواری تھی تاہم میں نے یہ سوال کارروائی کی ضرورت کے پیش نظر کیا تھا۔ سخاوت علی نے جواب دیا۔

"نہیں جناب..... وہ غیر شادی شدہ ہے۔"

"کوئی منگنی وغیرہ ہوئی ہو؟"

"نہ منگنی اور نہ ہی شادی....." اس بار بشریٰ نے جواب دیا۔ "اس کے کئی رشتے تو آئے ہوئے ہیں لیکن اب تک کوئی فیصلہ نہیں کیا ہم نے....."

"میں تو بہت پہلے اس بات کا فیصلہ کر چکا ہوں تھانے دار صاحب!" سخاوت علی نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "میری بات بشریٰ کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

"بات ڈھنگ کی ہو گی تو سمجھ میں آئے گی نا۔" بشریٰ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ "پورے چار سال کا فرق ہے دونوں کی عمروں میں۔"

"اللہ کی بندی! چار سال کا فرق بھی بھلا کوئی فرق ہوتا ہے۔" سخاوت علی نے شاکی نظر سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ "اپنا پھر اپنا ہی ہوتا ہے۔"

"یہ تم لوگوں نے کون سی نئی کہانی شروع کر دی ہے۔" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "نازلی کی گمشدگی کا ان باتوں سے کیا تعلق واسطہ ہے؟"

"ٹھہریں جی، میں آپ کو بتاتا ہوں۔" سخاوت جلدی سے بولا۔

"میں تو تمہارے کہنے پر تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر جاؤں گا لیکن وقت کو ٹھہرانا ممکن نہیں جو کہ بہت تیزی سے گزرتا چلا جا رہا ہے۔" میں نے خفگی آمیز انداز میں کہا۔ "تمہیں جو کچھ بھی بتانا ہے، جلدی سے چار لفظوں میں بتا ڈالو۔"

"اچھا جی.....!" اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور شروع ہو گیا۔

سخاوت علی کو چوان کے مطابق وہ نازلی کی شادی اپنے بڑے بھائی امانت علی کے بیٹے سرفراز سے کرنے کی خواہش مند تھا لیکن بشریٰ اس رشتے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس کا سب سے بڑا اعتراض سرفراز کی عمر پر تھا۔ اس وقت نازلی بائیس سال کی اور سرفراز اٹھارہ سال کا تھا۔ بشریٰ کا موقف یہ تھا کہ شوہر کو بیوی سے دو چار سال بڑا ہونا چاہیے نا کہ بیوی شوہر سے بڑی ہو۔ دوسری جانب خرابی والی بات یہ تھی کہ ان کے رشتے داروں میں سرفراز کے سوا اور کوئی لڑکا نہیں تھا جس سے نازلی کی شادی کی جاتی۔ امانت علی کے بڑے تمام بیٹوں کی شادی ہو چکی تھی اور کامونکی والی سخاوت علی کی چھوٹی بہن زینت کے آگے صرف لڑکیاں تھیں۔ زینت کی چار بیٹیاں تھیں لہٰذا خاندان کے اندر نازلی کی شادی سرفراز ہی سے ممکن تھی اور خاندان سے باہر شادی کے لیے سخاوت علی تیار نہیں تھا۔

"یہ جھگڑا تو بعد میں نمٹایا جا سکتا ہے کہ نازلی اور سرفراز کی جوڑی مناسب رہے گی یا نہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آپ مجھے یہ بتائیں کہ نازلی کا سرفراز کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"وہ تو جی سرفراز کو اپنا چھوٹا بھائی سمجھتی ہے۔" بشریٰ نے جلدی سے کہا۔ "اس نے کبھی اس حوالے سے تو سوچا ہی نہیں کہ سرفراز سے اس کی شادی بھی ہو سکتی ہے۔"

"اور نازلی کے لیے جو رشتے آئے ہوئے ہیں.....!" میں نے سوالیہ نظروں سے باری باری ان کے چہروں کا جائزہ لیا۔ "کیا وہ یہیں ایمن آباد ہی کے رہنے والے ہیں؟"

"جی ہاں....." سخاوت علی نے جواب دیا۔

"ان لڑکوں کے بارے میں نازلی کی کیا رائے تھی؟"

"اس نے بتایا نہیں جی....." بشریٰ نے کہا۔ "ہم نے اس حوالے سے نازلی سے پوچھا نہیں تھا۔"

"ہوں.....!" میں نے پرسوچ انداز میں کہا۔ "آپ لوگوں سے ایک بہت ہی نازک سا سوال پوچھ رہا ہوں۔ بہت سوچ سمجھ کر جواب دینا ہو گا۔ کسی قسم کی غلط بیانی سے معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے۔"

"نہیں جناب، ہم آپ سے بالکل جھوٹ نہیں بولیں گے۔" سخاوت علی نے نفی میں گردن ہلائی۔ "آپ پوچھیں، کیا پوچھنا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا نازلی کسی لڑکے کو پسند کرتی تھی؟"

میرے اس سوال پر ان دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا پھر بہ یک زبان بولے۔ "نہیں جی..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"اچھا!" میں نے ٹٹولنے والی نظر سے ان کے چہروں پر نمودار ہونے والے تاثرات کا جائزہ لیا پھر پوچھا۔ "اور کوئی لڑکا اسے پسند کرتا ہو؟"

"تھانے دار صاحب! ہماری نازلی کے ساتھ ایسا کوئی معاملہ نہیں تھا۔" سخاوت نے دکھی لہجے میں کہا۔ "آپ کو اگر ہماری بات کا یقین نہ ہو تو اپنے کانسٹیبل نوازش سے بھی پوچھ سکتے ہیں۔ وہ ہماری گلی ہی میں رہتا ہے۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو نوازش اس سے بے خبر نہیں رہ سکتا تھا۔"

"ٹھیک ہے، میں نوازش سے ضرور اس معاملے کی تصدیق کروں گا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم لوگ اب اپنے گھر جاؤ۔ میں تفتیش کے لیے تھوڑی دیر

www.pdfbooksfree.pk

میں ادھر ہی آرہا ہوں۔ مجھے نازلی کی سہیلی عارفہ سے بھی پوچھ گچھ کرنا ہے۔''

انہوں نے اطمینان سے گردن ہلائی اور مجھے سلام کر کے رخصت ہو گئے۔

ان کے جانے کے بعد، میں نے کانسٹیبل نوازش کو اپنے پاس بلالیا۔ جب بشریٰ اور سخاوت علی میرے کمرے میں آئے تھے تو میں نے نوازش کو باہر جانے کا اشارہ کر دیا تھا۔ وہ میرے سامنے آکر بیٹھا تو میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے ان میاں بیوی سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا اور آخر میں سوال کیا۔

''اب بتاؤ، تم کیا کہتے ہو بیچ اس مسئلے کے۔ سارے حالات تمہارے سامنے ہیں؟''

''مجھے ایک سو ایک فیصد یقین ہے ملک صاحب.....!'' وہ دبے دبے جوش کے ساتھ بولا۔ ''نازلی کی گمشدگی میں اسی خبیث کانے کا ہاتھ ہے جس نے آپ کو اپنا نام جُما بتایا تھا۔''

''سارے اشارے تو اسی کی طرف جا رہے ہیں۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''لیکن یہ بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی کہ کوئی مجرم اتنا ہمت والا بھی ہو سکتا ہے کہ شام میں تھانے آکر مجھے نازلی کی گمشدگی کی اطلاع بھی دے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ نازلی کو اغوا بھی کر کے لے جائے؟''

''آپ اسے دوسرے زاویے سے دیکھیں ملک صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''کون سا دوسرا زاویہ؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

اس نے بتایا۔ ''وہ کانا بہادر یا ہمت والا تھا یا نہیں، ہم اس بحث میں نہیں پڑتے اور فرض کر لیتے ہیں کہ وہ ایک چالاک اور ہوشیار مجرم تھا اور اس واردات میں کوئی اس کا شریک کار بھی رہا تھا۔'' وہ لمحے بھر کے لیے سانس لینے کو رکا تو میں نے اسے روکنا یا ٹوکنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''وہ تھانے میں بیٹھ کر آپ کو نازلی کی گمشدگی کی کہانی سنا تا رہا اور دوسری طرف اس کے ساتھی نے اپنا کام دکھا دیا ہوگا۔ پھر دونوں طے شدہ پروگرام کے مطابق کہیں ملے ہوں گے اور اپنی منزل کی جانب بڑھ گئے ہوں۔''

''تمہاری اس تھیوری میں اچھا خاصا کرنٹ تو ہے۔'' میں نے سوچتی ہوئی نظر سے نوازش کی طرف دیکھا۔ ''لیکن اب تک جو حالات و واقعات سامنے آئے ہیں ان کی روشنی میں میرا ذہن یہ کہتا ہے کہ نازلی کو اغوا نہیں کیا گیا بلکہ وہ جہاں بھی گئی ہے اور جس کے ساتھ بھی گئی ہے اس میں اس کی مرضی بھی شامل تھی.....'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''جب کسی شخص کو اغوا کیا جاتا ہے تو اس کارروائی کے نشانات بھی ظاہر ہوتے ہیں کیونکہ اس عمل میں مغوی کی مرضی شامل نہیں ہوتی۔ وہ اپنے اٹھا لیے جانے کے خلاف کم یا زیادہ مزاحمت ضرور کرتا ہے۔ یقیناً اغوا کی صورت میں نازلی کو بھی اسی رویے کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا لیکن ایسے شواہد کہیں بھی نہیں ملے۔ وہ اپنی سہیلی سے ملنے پچھلی گلی میں گئی اور پھر واپس نہیں آئی۔''

نوازش کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''ملک صاحب! وہ کون سی سہیلی کے گھر گئی تھی؟''

''انہوں نے اس سہیلی کا نام عارفہ بتایا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''عارفہ کا گھر پچھلی گلی میں ہے۔ وہ کسی بیوہ کی بیٹی ہے۔''

''ہاں، ہاں..... میں اچھی طرح جانتا ہوں جی۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''صفیہ نامی وہ عورت مطلقہ اور بیوہ ہے۔''

''مطلقہ اور بیوہ؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''وہ بات دراصل یہ ہے ملک صاحب.....!'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''صفیہ نے کوئی سولہ سترہ سال پہلے رحمان نامی ایک زمیندار سے شادی کی تھی جو پچھلی والا میں رہتا تھا، عارفہ اسی رحمان کی اولاد ہے۔ شادی کے دو سال بعد ہی صفیہ کو طلاق ہو گئی اور وہ پہلی والا سے واپس ایمن آباد آ گئی۔ چند سال بعد، اس نے خاور نامی ایک بندے سے شادی کر لی جس سے اس کا ایک بیٹا انور ہے۔ خاور کا تعلق ایمن آباد ہی سے تھا۔ کچھ عرصہ پہلے خاور کا انتقال ہو گیا اور اب صفیہ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ میری پچھلی گلی میں رہتی ہے۔''

''ہوں.....'' میں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی اور پوچھا۔ ''صفیہ کا بیٹا انور تو ابھی چھوٹا ہی ہوگا؟''

''جی، وہ سات آٹھ سال کا ہے۔''

''پھر ان لوگوں کی گزر بسر کیسے ہوتی ہے؟'' میں نے ایک اہم سوال کیا۔

''خاور مرتے وقت ان کے لیے ایک دکان اور آٹھ ایکڑ زمین چھوڑ گیا تھا۔'' نوازش نے بتایا۔ ''اس آٹھ ایکڑ اراضی کو صفیہ نے ٹھیکے پر دے رکھا ہے جہاں سے حاصل ہونے والے اناج اور آمدنی سے ان کا گزارہ ہو جاتا ہے۔

پھر رہائش کے لیے ذاتی گھر ہے اس لیے زیادہ مسائل نہیں ہیں ان لوگوں کے ساتھ۔''

''ٹھیک ہے، میں باسط کو اپنے ساتھ لے کر سخاوت کوچوان کے گھر جا رہا ہوں۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''تم اس مشن پر روانہ ہو جاؤ جس کے حوالے سے ہم نے رات میں گفتگو کی تھی.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے دروازے سے باہر دیکھا اور پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اللہ کا شکر ہے کہ آج بارش کو ابھی تک برسنا یاد نہیں آیا اس لیے زیادہ سے زیادہ کام نمٹا لینا چاہیے۔''

''جی ملک صاحب! یہ تو آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اگر ابھی تک بارش شروع نہیں ہوئی تو یہ سوچ کر مطمئن نہیں ہونا چاہیے کہ آج بارش ہوگی ہی نہیں۔ آسمان کی شکل رونے والی بنی ہوئی ہے۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے جناب.....''

''بس تو پھر تم روانہ ہو جاؤ۔'' میں نے حتمی انداز میں کہا۔ ''اور میں بھی نکل رہا ہوں۔''

ہمارے درمیان، رات والی میٹنگ میں یہ طے ہو گیا تھا کہ آج صبح نوازش گھوم پھر کر کانے گھڑسوار کے بارے میں معلومات جمع کرے گا۔ اس بات میں تو اب کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ وہ یک چشم لنگڑا گھڑسوار ایمن آباد سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ وہ برستی بارش میں جب مجھ سے ملنے آیا تھا اور مجھ سے مل کر جب وہ واپس گیا تھا تو یقینی طور پر کچھ لوگوں نے اسے آتے اور جاتے ہوئے بھی دیکھا ہوگا۔ کانسٹیبل باسط کے دعوے کے مطابق وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر جی ٹی روڈ کی جانب گیا تھا۔ اب مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ جی ٹی روڈ پر چڑھنے کے بعد لاہور کی سمت گیا تھا یا اس نے گوجرانوالہ کا رخ کیا تھا۔ گوجرانوالہ، ایمن آباد کے شمال میں اور لاہور جنوب میں واقع تھا۔

کانے جُما کے بارے میں تحقیق کی ذمے داری میں نے نوازش کو سونپی تھی۔

سخاوت علی کوچوان کا گھر درمیانے سائز کا تھا۔ میں نے ایک ہی نظر میں اس گھر کا تنقیدی جائزہ لے لیا تھا۔ وہ تین کمروں اور صحن پر مشتمل ایک روایتی سا دیہاتی مکان تھا۔ دو کمرے پہلو بہ پہلو مکان کے پچھلے حصے میں بنے ہوئے تھے جبکہ تیسرا کمرا بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور یہ گھر کے داخلی دروازے کے ساتھ ہی سامنے والے حصے میں تعمیر کیا گیا تھا۔ صحن کی ایک دیوار کے ساتھ باورچی خانہ اور غسل خانہ ایک قطار میں بنے ہوئے تھے اور اسی دیوار کے آخری سرے پر چھپر کے نیچے ایک کنڈلی رکھی نظر آرہی تھی۔ اس چھپر اور کنڈلی کو دیکھ کر مجھے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دقت محسوس نہ ہوئی کہ سخاوت کوچوان بہ وقت ضرورت اپنے گھوڑے کو اس چھپر کے نیچے باندھتا ہوگا۔

میں نے سخاوت اور بشریٰ کی راہنمائی میں گھر کا معائنہ کر لیا تو مجھے پتا چلا کہ عقبی دونوں کمروں میں سے ایک میں تو بشریٰ اور سخاوت نے رہائش اختیار کر رکھی تھی جبکہ اس کے برابر والے کمرے میں نازلی و خالد کا بسیرا تھا۔ خالد کی عمر لگ بھگ دس سال رہی ہوگی۔ ان دونوں بھائی بہن میں صبح وشام ''تو تو، میں میں'' بھی ہوتی رہتی تھی اور وہ مل کر ایک ساتھ بھی رہتے تھے۔ نازلی کی گمشدگی نے خالد کو اداس کر دیا تھا۔

بیٹھک میں کسی نے ڈیرا نہیں ڈال رکھا تھا۔ وہ مہمانوں کو بٹھانے اور خاطر تواضع کرنے کے استعمال میں آتی تھی۔ رسمی بات چیت اور پوچھ گچھ کے بعد میں نے سخاوت سے کہا۔

''میں اس کمرے کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں جہاں نازلی کا سامان رکھا ہوا ہے۔''

''سامان کیا ہے جی.....'' بشریٰ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''ایک سوٹ کیس ہے جناب جس میں وہ اپنے کپڑے وغیرہ رکھتی ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں وہی سوٹ کیس دیکھ لیتا ہوں۔'' میں نے نرمی سے کہا۔

جب سے میرے ذہن میں یہ خیال جاگزیں ہوا تھا کہ نازلی کی گمشدگی میں اس کی اپنی مرضی شامل ہے اسی لمحے سے میرے اندر رہ رہ کر ایک آواز اٹھتی تھی اور وہ یہ کہ نازلی تک رسائی حاصل کرنے کے لیے، اس کے گھر کے اندر ہی سے کوئی سراغ ملے گا۔ اسی جستجو کے پیشِ نظر میں نے اس کا سامان دیکھنے کی فرمائش کر ڈالی تھی۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد، میں سخاوت کوچوان کی معیت میں نازلی کے کمرے میں پہنچ گیا۔

وہ ایک عام سا کمرا تھا، چار دیواروں والا..... دو دیواروں کے ساتھ دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ چارپائیاں یقیناً خالد اور نازلی کے لیے تھیں کیونکہ اس کمرے پر انہی دونوں کا قبضہ بتایا جاتا تھا۔ کمرے کی تیسری دیوار میں داخلی دروازہ بنا ہوا تھا جبکہ چوتھی دیوار کے ساتھ ایک بڑی جستی پیٹی رکھی نظر آرہی تھی۔ اس پیٹی

www.pdfbooksfree.pk

کے اوپر دو تین صندوق بھی پڑے ہوئے تھے۔ جستی پیٹی یقیناً لحافوں اور گدوں وغیرہ کے لیے استعمال ہو رہی تھی اور صندوقوں میں کپڑے ہوں گے۔

سخاوت علی نے ایک سوٹ کیس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھے بتایا۔ ''تھانے دار صاحب! نازلی کا سامان اس بکسے کے اندر ہے۔''

مذکورہ سوٹ کیس ریگزین کا بنا ہوا تھا جس پر چیک دار رنگین پرنٹ تھا اور یہ سوٹ کیس، جستی صندوقوں کے پہلو میں، پیٹی کے اوپر رکھا دکھائی دے رہا تھا۔ اس وقت کمرے میں میرے اور سخاوت علی کے سوا اور کوئی موجود نہیں تھا۔ بشریٰ بارش کے حوالے سے کسی گھریلو مسئلے میں الجھ گئی تھی کیونکہ باہر ایک مرتبہ پھر برسات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

میں نے سخاوت علی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''سخاوت! نازلی کے سامان والے سوٹ کیس کو نیچے تو اتارو۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں، گم ہو جانے والی لڑکی نے اس کے اندر کیا بھر رکھا ہے.....؟''

اس نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور مذکورہ سوٹ کیس کو پیٹی کے اوپر سے اتار کر نازلی کے بستر پر رکھ دیا۔

''اسے کھولو.....'' میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''اور اس کے اندر موجود سامان کو ایک ایک کر کے باہر نکالنا شروع کر دو۔''

وہ ایک بار پھر میرے حکم کی تعمیل میں مصروف ہو گیا۔

سوٹ کیس کے اندر زیادہ تر نازلی کے پہننے والے کپڑے ہی رکھے نظر آ رہے ہیں۔ سخاوت ایک ایک کپڑا نکال کر مجھے دیتا جا رہا تھا اور میں اس کپڑے کی تہیں کھول کر اور اچھی طرح جھٹک کر اپنی تسلی کرتا جا رہا تھا، پھر میں ''کلیئر'' کپڑے کو دوسری جانب رکھ دیتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے، سوٹ کیس خالی ہو گیا لیکن ایسی کوئی بھی اہم شے ہتھے نہ چڑھی جسے میں نازلی کی تلاش میں استعمال کر سکتا۔

سوٹ کیس کے ڈھکنے کی اندرونی جانب جو دو پاکٹ بنی ہوئی تھیں، میں نے انہیں بھی کھنگال ڈالا لیکن نتیجہ وہی، ڈھاک کے تین پات.....!

اچانک ایک برق رفتار خیال میرے ذہن سے گزرا اور میں بہ دست خود سوٹ کیس کے ساتھ نبرد آزما ہو گیا۔

یہ خیال ان اخبارات کو دیکھ کر میرے ذہن میں پیدا ہوا تھا جو سوٹ کیس کی تہ میں بچھائے گئے تھے۔ وہ گزری ہوئی تاریخوں کے پرانے اخبارات تھے۔ لوگ عموماً یہ حرکت کرتے ہیں کہ سوٹ کیس، درازوں اور شیلف وغیرہ میں کوئی چیز رکھنے سے پہلے نیچے اخبار وغیرہ بچھا دیتے ہیں۔ نازلی نے بھی اپنے سوٹ کیس میں کچھ ایسا ہی کر رکھا تھا۔ میں نے اضطراری انداز میں وہ اخبارات ہٹا کر دیکھا تو گوہر مقصود میرے ہاتھ لگ گیا۔

ان تہ شدہ بچھے ہوئے اخبارات کے نیچے سے دو اہم چیزیں برآمد ہوئیں جنہیں دیکھ کر میں نہ صرف چونک اٹھا بلکہ میرے رگ و پے میں سنسنی بھی دوڑ گئی تھی۔ ان دو سنسنی خیز اشیا میں ایک تو تہ شدہ ریشمی رومال تھا اور دوسری چاندی کی ایک انگوٹھی تھی۔ چاندی کی اس زنانہ انگوٹھی میں سرخ رنگ کا ایک نگینہ بھی جڑا ہوا تھا جو کسی بھی قیمت پر یاقوت نہیں تھا۔ میری نظر میں وہ کانچ یا پلاسٹک کا ایک ٹکڑا تھا۔

میں نے تہ شدہ رومال کو کھول کر دیکھا تو اس کے اندر موجودہ مسئلے کا حل مجھے صاف نظر آ گیا۔ مذکورہ رومال کے ایک کونے پر رنگین دھاگے کی مدد سے ایک خوب صورت پھول کاڑھا گیا تھا جبکہ دوسرے کونے میں دو دل پہلو بہ پہلو بنے ہوئے تھے۔ ایک دل کے اندر انگریزی حرف اے (A) اور دوسرے دل کے اندر (N) بھی کاڑھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ دو دلوں کے اندر کڑھے ہوئے یہ A اور N کسی محبت کی کہانی کی جانب اشارہ کرتے تھے۔ یہ رومال چونکہ نازلی کے سوٹ کیس کے اندر سے دستیاب ہوا تھا اور اسے بڑی احتیاط کے ساتھ چھپا کر رکھا گیا تھا لہٰذا میں بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ (N) کا مطلب تو نازلی ہے اگر میں (A) نام والے کسی مرد کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتا تو یہ کیس چٹکی بجاتے میں حل ہو سکتا تھا۔ میرے فوری اندازے کے مطابق چاندی کی وہ انگوٹھی کسی (A) نے نازلی کو محبت کے تحفے کے طور پر دی تھی اور نازلی نے یہ ریشمی رومال اپنی محبت کی نشانی کے طور پر اسی (A) کے لیے کاڑھا تھا۔

میں نے یہ دونوں چیزیں سخاوت علی کو دکھائیں اور قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔ ''یہ سب کیا ہے سخاوت.....؟''

میرے ساتھ ہی وہ بھی رومال اور انگوٹھی کو دیکھ چکا تھا۔ میں نے اس کے چہرے اور آنکھوں میں بے یقینی تذبذب اور الجھن کے تاثرات نمودار ہوتے دیکھے۔ بڑی ہمت کر کے کمزوری سی آواز میں بولا۔

''تھانے دار صاحب..... میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''اس معاملے کو تو سمجھ رہے ہو نا؟'' میں نے معنی خیز انداز میں ریشمی رومال والے دو دلوں پر انگلی رکھتے ہوئے سوال کیا۔

''جی..... یہ تو..... صاف..... نظر آ رہا ہے.....''

ندامت کے بوجھ سے اس کی آواز کٹ کر رہ گئی تھی۔

''جب میں نے پوچھا تھا کہ.....'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''نازلی کسی لڑکے کو پسند تو نہیں کرتی تھی یا کوئی لڑکا اس میں دلچسپی تو نہیں لے رہا تھا تو آپ دونوں میاں بیوی نے صاف انکار کر دیا تھا..... ہیں نا؟''

''میں بڑی سے بڑی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں جناب کہ نازلی کے اس معاملے کی مجھے کوئی خبر نہیں تھی۔'' وہ روہانسا ہو گیا پھر شکستہ لہجے میں بولا۔ ''ٹھہریں، میں بشریٰ کو بلا کر لاتا ہوں۔''

سوٹ کیس میں سے برآمد ہونے والی اشیا کو دیکھ کر سخاوت کے چہرے پر خفت اور ندامت کے جو تاثرات ابھرے تھے وہ ایک فطری ردعمل تھا۔ یہ انکشاف ہی اتنا سنسنی خیز اور خطرناک تھا کہ کسی بھی شریف النفس باپ کو شرمندگی کی دلدل میں دھنسانے کے لیے کافی تھا۔ میں سخاوت کی جذباتی کیفیت اور مجروح احساسات کو بہ خوبی سمجھ سکتا تھا۔ ان لمحات میں اس نے کسی قسم کی اداکاری کا مظاہرہ نہیں کیا تھا بلکہ یہ رویہ اس کے دلی جذبات کی سچی ترجمانی تھا۔ بیٹی کے خفیہ معاملے سے آگاہ ہونے کے بعد وہ یکا یک ایک بے بس، لاچار اور بوڑھا باپ نظر آنے لگا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنی بیوی بشریٰ کو لے کر میرے پاس آ گیا۔ اس دوران میں، میں نے چاندی کی انگوٹھی اور ریشمی رومال کا ہر پہلو سے اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا، جب میں نے مختصر الفاظ میں بشریٰ کو تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ جھٹ سے بولی۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے تھانے دار جی.....''

''ہو سکتا نہیں بلکہ..... یہ ہو چکا ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''سارے ثبوت تمہارے سامنے ہیں، تم اس حقیقت کو کیسے جھٹلا سکتی ہو.....''

''پر جناب..... نازلی تو ایسی لڑکی نہیں تھی۔''

میں نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''وہ ایسی تھی یا نہیں، اب یہ اتنا اہم نہیں رہا۔ سوٹ کیس کی تہ سے برآمد ہونے والے یہ واضح ثبوت اسے کسی مشکوک سرگرمی میں ملوث ظاہر کرتے ہیں یا تو تم اپنی بیٹی کو سمجھ نہیں پائی ہو اور یا پھر تمہیں سب پتا ہے اور تم جان بوجھ کر نازلی کے اس معاملے پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہی ہو۔''

''ایسی بات نہیں ہے جناب.....'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔ آپ کہیں گے تو میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔''

''تو تمہارے خیال میں یہ انگوٹھی اور رومال میں نے نازلی کے سوٹ کیس میں رکھا تھا.....؟'' میں نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

''میں نے یہ تو نہیں کہا جی.....!'' وہ بے چارگی سے مجھے تکنے لگی۔

اس دوران میں سخاوت علی خاموش کھڑا ہم دونوں کے بیچ ہونے والی گفتگو کو سن رہا تھا۔ اس کی نگاہ کبھی میرے چہرے پر اور کبھی بشریٰ کے چہرے پر ٹھہر جاتی تھی۔ موجودہ صورتِ حال نے گویا اسے گنگ کر کے رکھ دیا تھا۔

میں نے مذکورہ ریشمی رومال کو بشریٰ کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس ''این'' کا تو سیدھا سیدھا مطلب ہے، نازلی اور باقی رہ گیا ''اے''..... مجھے اسی ''اے'' کی تلاش ہے.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''کوئی ایسا لڑکا جس کا نام الف یا عین سے شروع ہوتا ہو۔ مجھے یقین ہے، یہ رومال اور انگوٹھی اسی لڑکے نے نازلی کو دیے ہوں گے۔ ان دونوں کے بیچ محبت والی کہانی چل رہی تھی اور..... اور نازلی کی گمشدگی میں بھی اسی محبت کا عمل دخل ہو سکتا ہے۔''

''لیکن تھانے دار صاحب! یہ بھی تو ممکن ہے کہ.....'' سخاوت علی کچھ کہتے کہتے اچانک رک گیا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا ممکن ہے سخاوت علی؟''

''وہ جناب..... عارفہ کا نام بھی تو عین سے شروع ہوتا ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''نازلی اور عارفہ بڑی پکی سہیلیاں ہیں اور ان میں بہت زیادہ محبت بھی ہے، ممکن ہے یہ رومال عارفہ ہی نے نازلی کو تحفے میں دیا ہو۔''

''تمہاری بات میں وزن ہے سخاوت علی!'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یہ وزن اس قدر نہیں ہے کہ میری سوچ اس سے متاثر ہو جائے۔ بہرحال.....'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں یہاں سے اٹھنے کے بعد عارفہ کے گھر جا رہا ہوں۔ میں اسے بھی چیک کر کے دیکھ لیتا ہوں۔ اگر یہ رومال اسی نے نازلی کو دیا تھا تو پتا چل جائے گا۔''

بات ختم کرتے ہی میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بشریٰ نے جلدی سے کہا۔ ''میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں جی.....''

''اس کی ضرورت نہیں بشریٰ.....!'' میں نے قطع کلامی

www.pdfbooksfree.pk

کرتے ہوئے کہا۔ ”وہاں میں اکیلا ہی جاؤں گا۔ تم اپنے چھوٹے بیٹے کو میرے ساتھ بھیج دو..... راہنمائی کے لیے۔“

ان کے پاس میرے حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا چنانچہ بے بسی سے مجھے دیکھ کر رہ گئے۔ میں نازلی کے چھوٹے بھائی دس سالہ خالد کے ہمراہ عارفہ کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

بارش کا سلسلہ ہنوز جاری وساری تھا تاہم فی الوقت یہ معاملہ محض بوندا باندی تک ہی محدود تھا۔ میں نے بشریٰ کو اپنے ساتھ لانے سے اس لیے منع کر دیا تھا کہ میں عارفہ سے بالکل علیحدگی میں پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا۔ اگر بشریٰ اور سخاوت میں سے کوئی موجود ہوتا تو اس بات کا امکان بہرحال رہتا کہ عارفہ مجھے کھل کر کچھ بتا نہ پاتی۔ عارفہ کا گھر چونکہ پچھلی گلی ہی میں واقع تھا لہٰذا وہاں تک رسائی میں بہ مشکل تین منٹ لگے ہوں گے۔

جب خالد نے مطلوبہ مکان کی نشاندہی کر دی تو میں نے اسے بھی واپس بھیج دیا۔ اس کے بعد میرا کام شروع ہوتا تھا جس کے لیے مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر عارفہ کے دروازے پر دستک دی اور دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد میں عارفہ کی بیٹھک میں موجود تھا۔

✂✂✂

کانسٹیبل نوازش نے مجھے عارفہ اور اس کے خاندان کے دیگر افراد کے بارے میں جو معلومات فراہم کی تھیں وہ من وعن درست ثابت ہوئیں۔ نازلی کی گمشدگی والا معاملہ اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہا تھا۔ میں نے ذاتی تعارف کے بعد جب عارفہ کی ماں صفیہ کو اپنی آمد کی غرض وغایت سے آگاہ کیا تو وہ بڑی فکرمندی سے بولی۔

”تھانے دار صاحب! کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ نازلی کہاں غائب ہوگئی ہے۔ کل شام میں تو وہ یہاں سے بھلی چنگی گئی تھی۔“

”یہاں سے وہ بھلی چنگی رخصت ہوئی لیکن اپنے گھر نہیں پہنچی.....“ میں نے صفیہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور جہاں تک اس کے کہیں غائب ہوجانے کا تعلق ہے تو اس کا پتا ابھی لگا لیتا ہوں میں.....“ میں نے تھوڑا توقف کر کے معنی خیز انداز میں عارفہ کی طرف دیکھا پھر اس سے سوال کیا۔

”کیوں عارفہ..... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا.....؟“

”مم..... مجھے..... کیا پتا جی.....!“ وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولی۔

عارفہ کی عمر مجھے پندرہ سال کے قریب بتائی گئی تھی لیکن ماشاءاللہ! اس نے صحت ایسی پائی تھی کہ اٹھارہ بیس کی نظر آتی تھی۔ اس کی گھبراہٹ کو دیکھتے ہوئے میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

”تمہیں کیا پتا نہیں عارفہ.....؟“

”وہ جی..... میں یہ کہہ رہی تھی کہ.....“ وہ لڑکھڑاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ ”مجھے کیا پتا کہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں یا غلط.....!“

”ہوں.....!“ میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”میں یہ سمجھا کہ تمہیں اس بات کا پتا نہیں کہ نازلی کہاں غائب ہوئی ہے.....؟“

”مجھے..... اس کا بھی کچھ پتا نہیں جی.....!“ اس نے پلکیں جھپکاتے ہوئے جواب دیا۔

”تھانے دار صاحب! آپ تو میری بچی کو اس طرح گھور رہے ہیں جیسے نازلی کو اسی نے کہیں گم کر دیا ہو۔“ صفیہ نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

”اگر اس نے گم نہیں بھی کیا تو.....“ میں نے صفیہ کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”تو یہ کم از کم اتنا ضرور جانتی ہے کہ وہ کہاں غائب ہوئی ہے.....؟“

میں نے حالات و واقعات کے پیش نظر تفتیش کے اندھیرے میں اندازے کا ایک تیر چھوڑا تو صفیہ متعجب انداز میں مجھے دیکھنے لگی پھر قدرے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

”تھانے دار صاحب! اگر عارفہ کو اس بات کا پتا ہوتا تو وہ اب تک ضرور بتا چکی ہوتی۔ کل رات ہی سے نازلی کے ماں باپ اس قدر پریشان ہیں کہ بس، میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔“

”تم نہیں بھی بتاؤ تو مجھے اس بات کا بہ خوبی اندازہ ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کیونکہ اب آپ لوگوں کے ساتھ ساتھ میں خود بھی بہت پریشان ہو چکا ہوں اور میری پریشانی اس وقت تک دور نہیں ہوگی جب تک میں الف یا عین سے شروع ہونے والے نامی بندے کو گرفتار نہیں کرلوں گا۔“

اس وقت میرے، عارفہ اور اس کی ماں صفیہ کے سوا بیٹھک میں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ عارفہ کا چھوٹا بھائی انور پڑوسی بچوں کے ساتھ انہی کے گھر میں کھیل رہا تھا۔ صفیہ میری وضاحت پر بری طرح چونک اٹھی تھی۔

”یہ الف اور عین کا کیا چکر ہے تھانے دار صاحب.....؟“ اس نے حیرت بھرے لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

www.pdfbooksfree.pk

میں نے نہایت ہی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میری اب تک کی تحقیق اور تفتیش نے مجھے بتایا ہے کہ نازلی اپنی مرضی اور رضامندی سے غائب ہوئی ہے اور اس کے گمشدگی والے اس عمل میں جس لڑکے نے اس کا ساتھ دیا ہے اس کا نام یا تو الف سے شروع ہوتا ہے یا پھر عین سے.....!“

ریشمی رومال اور چاندی کی انگوٹھی کی دستیابی کے بعد نازلی کی گمشدگی کے حوالے سے میرا ایک مخصوص ذہن بن گیا تھا اور اسی ذہنیت کے تحت میں نازلی کی تلاش کے کام کو آگے بڑھا رہا تھا۔

”لیکن تھانے دار جی.....“ صفیہ نے الجھن بھرے انداز میں کہا۔ ”الف اور عین سے شروع ہونے والے نام تو درجنوں بلکہ سیکڑوں ہوں گے۔ آپ کس طرح پتا چلائیں گے کہ نازلی کی گمشدگی میں کون بندہ ملوث ہے؟“

”اس سلسلے میں، تمہاری بیٹی عارفہ میری مدد کرے گی۔“ میں نے گمبھیر انداز میں کہا پھر عارفہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”تم میری مدد کرو گی نا.....؟“

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا اور اس رنگ نے مجھے بتا دیا کہ میرے اس سوال نے اسے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ تھوک نگل کر لکنت زدہ لہجے میں بولی۔

”مم..... میں کیا..... مدد کر سکتی ہوں جی..... مجھے تو کچھ پتا ہی نہیں..... وہ کہاں گئی ہے.....!“

”یہ پتا میں خود چلا لوں گا کہ وہ کہاں گئی ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تم صرف مجھے یہ بتاؤ گی کہ الف یا عین نام والے کس بندے سے اس کا عشق وغیرہ چل رہا تھا.....؟“

عارفہ کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں پھیل گئیں جس سے مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ میرے اندازے کے مطابق، وہ نازلی کی گمشدگی کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات چیخ چیخ کر اس امر کی گواہی دے رہے تھے کہ دال میں کچھ نہیں، بلکہ بہت کچھ کالا ہے۔

صفیہ نے بے حد گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”تھانے دار جی! آپ تو اس طرح بات کر رہے ہیں جیسے نازلی کی گمشدگی کے سلسلے میں کوئی بہت ہی مضبوط ثبوت آپ کے ہاتھ لگ گیا ہو.....؟“

اپنی اس بات سے صفیہ نامی وہ عورت مجھے خاصی سمجھ دار اور عقل مند محسوس ہوئی۔ کوئی عام عورت اتنا درست اندازہ قائم نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے اس کے استفسار کے جواب میں کہا۔

”ہاں صفیہ! ایسی ہی بات ہے۔ دو ثبوت میرے ہاتھ لگے ہیں۔ بس، عارفہ سے ان کی تصدیق کرنا ہے۔ مجھے یقین ہے، عارفہ اس بارے میں بہت کچھ جانتی ہوگی۔ یہ اس کی گہری اور رازدار سہیلی ہے..... اس کی محبت سے بھی بہ خوبی واقف ہوگی۔ عارفہ کے تعاون سے میرا کام آسان ہو جائے گا۔ اس کے بعد میں پہلی فرصت میں نازلی کو ڈھونڈ نکالوں گا۔“

”کون سے دو ثبوت؟“ صفیہ اور عارفہ نے بہ یک زبان پوچھا۔

میں نے سردست ان کے اس سنسنی خیز سوال کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور براہِ راست عارفہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا یہ بات درست ہے کہ کل شام میں، مغرب کی اذان سے چند لمحے پہلے گمشدہ نازلی تم سے ملنے یہاں آئی تھی؟“

”جی ہاں، وہ آئی تھی.....!“ عارفہ کے بجائے صفیہ نے تصدیقی انداز میں جواب دیا۔

”صفیہ بی بی!“ میں نے تنبیہی لہجے میں کہا۔ ”جب تک میں تم سے کوئی سوال نہ کروں، تم بالکل خاموش بیٹھی رہو گی۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا.....؟“

”جی چنگی طراں سمجھ گئی۔“ وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”اب میں چپ رہوں گی تھانے دار صاحب.....!“

”شاباش!“ میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم ایک تجربہ کار اور بردبار عورت ہو۔ مجھے تم سے ایسی ہی عقل مندی کے مظاہرے کی توقع تھی۔“

صفیہ کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔ میں عارفہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”تمہاری والدہ نے اس بات کی تصدیق تو کر دی کہ گزشتہ شام نازلی تم سے ملنے کے لیے یہاں آئی تھی۔ اب تم مجھے یہ بتاؤ گی کہ کیا وہ خود ہی تمہارے گھر آئی تھی یا تم نے خاص طور پر اسے بلایا تھا؟“

اس سوال کا جواب مجھے پہلے سے معلوم تھا لیکن پھر بھی میں عارفہ کی زبان سے اس کی تصدیق یا تردید چاہتا تھا کیونکہ آگے آنے والے بیش تر سوالات کا دارومدار اسی تصدیق یا تردید پر تھا۔

عارفہ نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔ ”جی ہاں..... وہ میرے بلانے پر ہی یہاں آئی تھی۔“

”کیا تم نے اسے کسی خاص کام سے بلایا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔ ”جی ہاں.....!“

”کس کام سے؟“ میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھایا۔

”وہ جی..... میں سرہانے کا غلاف کاڑھ رہی تھی۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”کوئی نیا ڈیزائن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، سوچا کہ نازلی سے مشورہ کر لوں۔ میں نے اسی مقصد سے اسے اپنے پاس بلایا تھا۔“

”تمہاری بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ نازلی کو سلائی کڑھائی کا بڑا تجربہ تھا؟“

”جی ہاں، وہ امورِ خانہ داری کی بہت ماہر ہے۔“

لفظ ”کڑھائی“ سے میرا ذہن فوراً اس ریشمی رومال کی جانب چلا گیا تھا جو گمشدہ نازلی کے سوٹ کیس میں سے برآمد ہوا تھا۔ میں نے سخاوت علی کے گھر سے نکلتے وقت چاندی کی انگوٹھی اور ریشمی رومال اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔

”عارفہ!“ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”جو لوگ کسی بھی ہنر کے ماہر ہوتے ہیں ان کے کام کا اپنا ایک مخصوص انداز ہوتا ہے جو سیکڑوں ہزاروں لوگوں کے کاموں میں بالکل الگ پہچانا جا سکتا ہے۔“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ٹٹولنے والی نظر سے عارفہ کو دیکھا پھر سوال کیا۔

”کیا نازلی کی کڑھائی کا بھی اپنا ایک منفرد انداز ہے؟“

”جی ہاں..... بالکل ہے!“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ”ہمارے محلے میں نازلی سے زیادہ صاف کڑھائی اور کوئی لڑکی کر ہی نہیں سکتی۔“

”گویا تم نازلی کے ہاتھ کے کام کو دور ہی سے دیکھ کر پہچان سکتی ہو؟“

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے فی الحال سوالات کے زاویے کو تھوڑا سا تبدیل کر دیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”سچ سچ بتاؤ عارفہ! نازلی کا کس لڑکے کے ساتھ چکر چل رہا تھا؟“

”وہ جی.....“ وہ بے حد گھبرا گئی۔ ”مجھے کچھ پتا نہیں.....“

”اس کا مطلب ہے، شرافت کی زبان تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔“ میں نے خاصے خطرناک انداز میں کہا۔ ”باقی کی پوچھ گچھ کے لیے تمہیں اپنے ساتھ تھانے لے کر جانا پڑے گا۔“

عارفہ سہمی ہوئی نظر سے اپنی ماں کو تکنے لگی۔ صفیہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

”تھانے دار صاحب! آپ عارفہ کی صحت پر نہ جائیں۔ میری بچی بہت ہی حساس اور دل کی کمزور ہے۔ آپ کی خوف ناک باتیں کہیں اس کے دماغ پر کوئی الٹا اثر نہ کر دیں۔“

”مجھے تو کوئی شوق نہیں ہے اسے تھانے لے کر جانے کا۔“ میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ”لیکن اگر یہ مجھ سے تعاون نہیں کرے گی تو پھر مجھے مجبوراً یہ قدم تو اٹھانا ہی پڑے گا۔“

”آپ کو کس بنا پر یقین ہے کہ نازلی کا کسی لڑکے سے کوئی چکر تھا۔“ صفیہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ ”اور یہ کہ عارفہ ان کے چکر سے بھی واقف ہے.....؟“

”میں نے تھوڑی دیر پہلے دو ٹھوس ثبوت ہاتھ لگنے کی بات کی تھی۔“ میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”انہی ثبوت کی بنا پر میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ نازلی کسی ایسے لڑکے کی محبت میں گرفتار تھی جس کا نام الف یا عین سے شروع ہوتا ہے۔“

”سخاوت اور اس کی گھر والی نے اس سلسلے میں کیا بتایا ہے؟“ صفیہ نے ایک اہم سوال کیا۔

”انہوں نے اس معاملے سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔“ میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”اسی لیے نازلی کی رازدار سہیلی سے معلومات حاصل کرنے میں یہاں پہنچا ہوں۔“

”کیا وہ دونوں ٹھوس ثبوت آپ مجھے دکھا سکتے ہیں؟“ صفیہ نے پوچھا۔

”بالکل دکھا سکتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی جیب میں سے چاندی کی انگوٹھی نکال لی پھر اسے صفیہ کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ مجھے نازلی کے سوٹ کیس میں سے ملی ہے۔“

صفیہ نے مذکورہ انگوٹھی کو اپنے ہاتھ میں لے کر گھما پھرا کر دیکھا پھر نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے تو یہ انگوٹھی نازلی کے ہاتھ میں کبھی نظر نہیں آئی۔“

”خفیہ محبت کی نشانیوں کو استعمال میں نہیں لایا جاتا صفیہ بی بی!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”ورنہ محبت کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔“

میرے اس تبصرے پر صفیہ نے سوالیہ نظر سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”تم نے کبھی اس انگوٹھی کو نازلی کے پاس دیکھا تھا.....؟“

”آں.....!“ وہ ہچکچا کر خاموش ہو گئی۔

www.pdfbooksfree.pk

"عارفہ!" میں نے سخت لہجے میں اسے مخاطب کیا۔
"بالکل واضح جواب دو۔ ہاں یا نہ.....؟"
"جی..... مجھے یاد آرہا ہے کہ..... نازلی نے ایک بار مجھے یہ انگوٹھی دکھائی تو تھی۔" وہ پرسوچ انداز میں بولی۔ "لیکن اب یہ یاد نہیں کہ اس انگوٹھی کے حوالے سے اس نے مجھے بتایا کیا تھا۔"
عارفہ کا لہجہ اور انداز اس بات کی چغلی کھا رہا تھا کہ وہ دیدہ ودانستہ اپنی سہیلی کے معاملے کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اب میں اسے آسانی سے فرار کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔
"یادداشت کو واپس لانے کا فارمولا بھی ہے میرے پاس....." میں نے دوسری جیب میں ہاتھ ڈال کر تہ شدہ ریشمی رومال نکال لیا اور اسے عارفہ کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اسے کھول کر دیکھو۔"
"یہ کیا ہے جی؟" اس نے ہچکچاہٹ آمیز انداز میں وہ تہ شدہ رومال میرے ہاتھ سے لے لیا۔
"کھول کر دیکھو گی تو پندرھواں طبق روشن ہو جائے گا۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "اس میں دور دراز گئی ہوئی یادداشت کو واپس لانے کا فارمولا بند ہے۔"
صفیہ الجھن زدہ نظر سے کبھی مجھے اور کبھی اپنی بیٹی عارفہ کو دیکھ رہی تھی تاہم میری ہدایت کا خیال رکھتے ہوئے اس نے ہمارے بیچ کسی قسم کی مداخلت کی کوشش نہیں کی تھی۔
عارفہ نے جیسے ہی ریشمی رومال کھول کر دیکھا، اسے ایک جھٹکا سا لگا، مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں ذرا سی بھی مشکل پیش نہ آئی کہ وہ اس سے پہلے بھی مذکورہ رومال کو دیکھ چکی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں اور چہرے پر شناسائی کے بڑے واضح آثار ابھرتے دیکھے تھے۔
"یادداشت واپس آگئی یا تھانے چلیں عارفہ.....؟" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔
"اس رومال میں ہے کیا جی، ذرا مجھے بھی تو پتا چلے۔" صفیہ کی تشویش میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔
وہ ایک ایسے زاویے پر بیٹھی ہوئی تھی کہ عارفہ کے ہاتھ میں موجود رومال کو پوری تفصیل کے ساتھ دیکھ نہیں سکتی تھی۔ تھانے کے ذکر پر اس کی پریشانی ہوا سے باتیں کرنے لگی تھی۔
میں نے اس کی تشویش کو نظر انداز کرتے ہوئے عارفہ سے کہا۔ "تم تو نازلی کے ہاتھ کی کڑھائی کو دیکھتے ہی پہچان لینے کی دعوے دار ہو۔ اس رومال پر جو کام ہوا ہے اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے.....؟" میں نے لمحاتی توقف کے بعد بڑے سنگین الفاظ میں اضافہ کیا۔
"عارفہ! میں تمہیں سچ بولنے کا آخری موقع دے رہا ہوں۔ اگر تم نے کوئی گڑبڑ کی تو پھر سمجھ لو۔ میں سختی کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"
"جی..... میں نے پہچان لیا ہے۔" وہ اقرار میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "یہ کڑھائی نازلی ہی کے ہاتھ کی ہے۔"
"نازلی نے یہ رومال کس کے لیے کاڑھا تھا؟" میں نے پوچھا۔
وہ ہچکچا کر دائیں بائیں ہونے کا ارادہ کر ہی رہی تھی کہ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "کوئی گڑبڑ نہیں عارفہ..... میں جانتا ہوں کہ تم نے اس کڑھائی ہی کو نہیں بلکہ رومال کو بھی پہچان لیا ہے..... تم اس رومال کو نازلی کے پاس پہلے بھی دیکھ چکی ہو۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا.....؟"
"جی.....!" وہ اقراری لہجے میں بولی۔ "نازلی نے یہ رومال مجھے دکھایا تھا۔"
"اور وہ چاندی کی زنانہ انگوٹھی؟"
"وہ بھی.....!"
"اب جلدی سے یہ بھی بتا دو کہ چاندی کی انگوٹھی کس نے نازلی کو دی تھی۔" میں نے کہا۔ "اور نازلی نے یہ ریشمی رومال کس کو دینے کے لیے کاڑھا تھا؟"
صفیہ بڑی دیر سے الجھن زدہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ میں نے اس کی تسلی کے لیے نہایت ہی مختصر الفاظ میں ریشمی رومال اور چاندی کی انگوٹھی کے بارے میں بتا دیا۔ میں نے دو دل اور انگریزی حروف (N) اور (A) کی بھی وضاحت کر دی۔ اس نے میری بات پوری توجہ سے سنی اور میرے خاموش ہونے پر عارفہ کی طرف دیکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں بولی۔
"عارفہ! تمہیں جو کچھ پتا ہے، صاف صاف تھانے دار جی کو بتا دو ورنہ یہ تو تمہیں بعد میں تھانے لے کر جائیں گے، میں ابھی سے تمہیں کوٹنا شروع کر دوں گی۔ اس بدبخت نازلی نے تمہیں کن چکروں میں ڈال رکھا ہے۔"
حقیقت حال سے واقفیت کے بعد صفیہ بڑے جلال میں آگئی تھی اور اس کے اس رویے سے میرا کام خاصا آسان ہو گیا تھا۔ جب دونوں جانب سے چڑھائی دیکھی تو عارفہ کی ہمت جواب دے گئی اور اسے اقرار کرتے ہی بنی۔
"اس لڑکے کا نام اسلم ہے....." وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔ "لیکن سب اسے "بھولا" کہتے ہیں۔"

"بھولا!" صفیہ نے الجھن زدہ نظر سے عارفہ کی طرف دیکھا۔ "یہ کون ہے۔ میں تو کسی اسلم یا بھولا کو نہیں جانتی؟"
عارفہ کے انکشاف کے بعد (A) والا معاملہ تو بالکل صاف ہو گیا تھا۔ (N) سے نازلی اور (A) سے اسلم..... لیکن ابھی بھی مجھے اس سے بہت ساری باتیں پوچھنا تھیں۔ اپنی ماں کے سوال کے جواب میں عارفہ نے بتایا۔
"بھولا کو میں نے بھی نہیں دیکھا۔ بس، نازلی کی زبان ہی سے اس کا نام سنا ہے....."
میں نے عارفہ سے ایک اہم سوال کیا۔ "اس اسلم عرف بھولا کو نہ تو تم نے دیکھا ہے اور نہ ہی تمہاری ماں اسے جانتی ہے۔ اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بندہ ایمن آباد کا رہنے والا نہیں۔ کیا میرا اندازہ درست ہے؟"
"جی....." اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "بھولا ادھر کامونکی میں رہتا ہے۔"
"کامونکی" کے نام پر میں چونک اٹھا۔ میری معلومات کے مطابق، نازلی کی پھوپی زینت کامونکی میں رہتی تھی۔ میں نے اضطراری لہجے میں عارفہ سے پوچھا۔
"کامونکی میں کس جگہ.....؟"
"جگہ کا تو مجھے پتا نہیں جناب....." وہ متاملانہ انداز میں بولی۔ "نازلی نے صرف اتنا بتایا تھا کہ بھولا اس کی کامونکی والی پھوپی کے پڑوس میں رہتا ہے۔"
"تم کتنی گھنی ہو عارفہ.....!" صفیہ نے تیز نظر سے اپنی بیٹی کو گھورا۔ "تم دونوں سہیلیاں اتنا خطرناک کھیل، کھیل رہی تھیں اور مجھے کوئی خبر بھی نہیں.....؟"
"میں اس کے ساتھ شامل نہیں تھی اماں۔" عارفہ اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولی۔ "یہ سارا چکر نازلی کا تھا۔ بس، میں اس کے معاملے سے واقف ہو گئی تھی۔"
"اس سے زیادہ گھنی تو وہ نازلی تھی۔" میں نے صفیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس کے ماں باپ کو تو اس کے کرتوتوں کا کچھ پتا نہیں۔"
صفیہ نے تھانے دار بننے کی کوشش کرتے ہوئے عارفہ سے سوال کیا۔ "نازلی اور بھولا کا چکر کب سے چل رہا تھا؟"
"مجھے ٹھیک طرح سے پتا نہیں۔" وہ جواباً بولی۔ "نازلی نے دو تین ماہ پہلے ہی مجھے اس بارے میں بتایا تھا۔"
"کیا کل شام میں بھولا یہاں ایمن آباد..... آیا تھا؟" میں نے عارفہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے استفسار کیا۔
"مجھے نہیں پتا جی.....!" وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔

جدید محاورے

☆ اندھا کیا چاہے..... دو لینس
☆ ہر کامیاب شاگرد کے پیچھے نقل کا ہاتھ ہوتا ہے
☆ کامیابی کا راز..... کسی بھی لڑکی کے مشورے پر عمل نہ کرنا۔
☆ آ بیل کے بل..... مجھے مار.....
☆ ایک انار..... سو کیڑے۔
☆ گھی سیدھی انگلی سے نہ نکلے تو ڈبہ ٹیڑھا کر لیں۔
☆ سو لون کی..... ایک ہیرو کی۔

مرسلہ: محمد جاوید راؤ، گلاب علی، بہاولنگر

مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی کہ وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے رہی تھی۔ اس کے الفاظ اور انداز سے اعتماد جھلکتا تھا۔ میں نے بہ دستور سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔
"کیا اس نے ایسا کوئی ذکر کیا تھا کہ گزشتہ روز بھولا اس سے ملنے کے لیے ایمن آباد آنے والا ہے؟"
"نہیں جی، اس نے اس بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔"
"تمہیں یہ تو معلوم ہوگا کہ بھولا کبھی یہاں آیا ہو؟"
اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ "جناب! جہاں تک میں جانتی ہوں یا نازلی نے مجھے جتنا بتایا ہے اس کے مطابق تو بھولا، نازلی سے ملنے یہاں کبھی نہیں آیا۔ یہ جب اپنی پھوپو کے پاس کامونکی جایا کرتی تھی تو وہاں ان کی ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔"
میں نے گھما پھرا کر اسی حوالے سے مزید دو چار سوالات کیے لیکن کوئی نیا یا زیادہ حوصلہ افزا نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ نازلی کی حالیہ گمشدگی یا اپنی مرضی سے فرار کے بارے میں عارفہ کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ جس حد تک مجھے معلومات فراہم کر سکتی تھی، وہ اس نے کر دی تھی۔ میں اس سے جو کچھ بھی اگلوانے میں کامیاب ہو سکا، اس سے میری تفتیش کے لیے ایک واضح راہ متعین ہو گئی تھی۔ میں نے ان الفاظ کے ساتھ عارفہ کو فارغ کر دیا۔
"دیکھو عارفہ! تم ایک اچھی اور سمجھ دار لڑکی ہو۔ تم نے مجھے جو کچھ بھی بتایا ہے اس پر میں نے آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ بعد میں، ان میں سے کوئی

www.pdfbooksfree.pk

بات غلط ثابت نہیں ہوگی....." میں نے لمحاتی توقف کرکے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں اضافہ کیا۔

"میں تم سے یہ امید رکھ سکتا ہوں نا کہ تم نے مجھے سب کچھ سولہ آنے سچ بتایا ہے؟"

"جی ہاں..... میں نے آپ سے ایک ذرا سا بھی جھوٹ نہیں بولا۔" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "آپ کو یقین نہیں آرہا تو میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو بھی تیار ہوں۔"

"قسم کھانے کی ضرورت نہیں، مجھے تمہاری بات کا ایسے ہی بڑا اعتبار ہے۔" میں نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ویسے بھی قسم کھا لینے سے چیزوں کی حقیقت تھوڑی تبدیل ہوجاتی ہے۔ سچ ہر حال میں سچ اور جھوٹ ہر حالت میں جھوٹ ہی رہتا ہے۔"

"یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب!" صفیہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے تائیدی انداز میں بولی۔ "مجھے زندگی میں بارہا اس حقیقت کا تجربہ ہوا ہے۔"

میں نے اس تعاون پر ان ماں بیٹی کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے اٹھ کر دوبارہ گشدہ نازلی کے گھر آ گیا۔

✂

دوپہر کے بعد کانسٹیبل نوازش واپس آ گیا۔

وہ لنگڑے جما کے بارے میں ایک سنسنی خیز تحقیق کرکے لوٹا تھا۔ اس نے پورے ایمن آباد میں گھوم پھر کر اور مختلف لوگوں سے پوچھ گچھ کرکے یہ معلوم کرلیا تھا کہ گزشتہ شام وہ کانا گھڑسوار جمال دین عرف جما مجھ سے ملاقات کے بعد کس طرف گیا تھا۔ نوازش کے انکشاف نے اس کیس کی ایک واضح شکل نکال دی تھی۔ اس کے مطابق، وہ کانا جما اپنے گھوڑے پر سوار کامونکی کی جانب گیا تھا۔

میں نے صفیہ کے گھر سے اٹھ کر سخاوت علی اور بشریٰ سے دوبارہ ملاقات کی تھی اور انہیں نازلی کے مصدقہ کارنامے سے بھی آگاہ کیا تھا۔ پہلے تو وہ لوگ اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ نازلی کا کوئی ایسا ویسا چکر بھی ہوسکتا ہے لیکن چاندی کی انگوٹھی، ریشمی رومال اور سب سے بڑھ کر عارفہ کی گواہی کے آگے وہ زیادہ دیر تک مزاحمت نہ کرسکے اور یہ کہہ کر انہوں نے خاموشی اختیار کرلی کہ..... خدا گواہ ہے، ہمیں نازلی کے اس معاملے کی کوئی خبر نہیں.....!

میں نے ان سے کامونکی والے اسلم عرف بھولا کے بارے میں بھی استفسار کیا۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ سخاوت کی چھوٹی بہن زینت کے پڑوس میں اللہ دتا اور رحمت بی بی کا گھر ہے۔ اللہ دتا کے لڑکے کا نام بھولا ہی تھا۔ گویا عارفہ کے انکشاف کی تصدیق ہوگئی لیکن اس سلسلے کی ایک کڑی ابھی تک میرے ذہن میں چبھن پیدا کررہی تھی۔ سخاوت اور بشریٰ نے اسلم عرف بھولا کا جو حلیہ اور وضع قطع بیان کی تھی وہ جما سے قطعی مختلف تھی..... اس کا واضح طور پر ایک ہی مطلب تھا کہ کانا جما اور بھولا دو بالکل مختلف اور الگ کردار تھے اور عین ممکن تھا..... یہ دونوں آپس میں دوست ہوں اور یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ان میں شدید نوعیت کی دشمنی ہو۔

میں نے سخاوت علی کے گھر سے نکلتے ہوئے اس کی کامونکی والی بہن کے گھر کا مکمل پتا اچھی طرح سمجھ لیا تھا کیونکہ نازلی تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اسلم عرف بھولا کو زیر تفتیش لانا بہت ضروری ہوگیا تھا۔

ہم دونوں اس وقت بیٹھے اسی معاملے پر غور و فکر کررہے تھے اور اس بات پر متفق تھے کہ ہمیں فی الفور کامونکی کی طرف روانہ ہوجانا چاہیے۔ میں نے کہا۔

"نوازش! اس برستی بارش میں، گھوڑوں پر سوار ہوکر کامونکی کا رخ کرنا تو عقل مندی نہیں ہوگی۔ ہمیں کوئی دوسرا ہی ذریعہ اختیار کرنا ہوگا۔"

"دوسرا ذریعہ تانگا ہوسکتا ہے ملک صاحب۔" وہ تجویز دینے والے انداز میں بولا۔ "آپ کہیں تو میں سخاوت علی کو لے کر آجاتا ہوں۔"

سخاوت علی کے نام پر میں چونک اٹھا اور مجھے یاد آیا کہ وہ کوچوانی کرتا تھا۔ اس افراتفری میں میرے ذہن سے بالکل نکل گیا تھا کہ سخاوت کا ذریعۂ معاش کیا ہے۔ کامونکی تک رسائی حاصل کرنے کے لیے سخاوت علی کے تانگے سے زیادہ مناسب اور کوئی سواری نہیں ہوسکتی تھی۔

"ٹھیک ہے....." میں نے نوازش سے کہا۔ "تم فوراً سخاوت علی کو اس کے تانگے سمیت پکڑ لاؤ۔ ہم ابھی کامونکی روانہ ہورہے ہیں۔"

وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور مجھے سلام کرکے رخصت ہوگیا۔

آج بارش کا زور کل کی نسبت تو کم تھا لیکن وہ وقفے وقفے سے اپنا فریضہ پورا کرنے سے نہیں چوکتی تھی۔ کبھی بوندا باندی کی شکل میں، کبھی بوچھار کی صورت، کبھی چند چھینٹوں کے روپ میں تو کبھی موسلا دھار..... وہ اپنا جلوہ دکھا ہی رہی تھی۔ ہماری یہ خوش قسمتی تھی کہ جب ہم کامونکی کی جانب روانہ ہونے لگے تو یہ بوندا باندی کے ڈھب پر چل رہی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں کانسٹیبل نوازش، سخاوت علی کو لے کر تھانے پہنچ گیا۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ وہ بیٹی کی گمشدگی کے غم میں نڈھال ہورہا تھا اور جلد از جلد اس کی بازیابی کا خواہاں تھا۔ لہٰذا میری بات فوراً ہی اس کی سمجھ میں آ گئی۔ پھر پانچ منٹ بعد ہی ہم تینوں تانگے میں بیٹھ کر کامونکی کی جانب روانہ ہوگئے۔ سخاوت کوچوان اور کانسٹیبل نوازش اگلی سیٹ پر تھے اور میں عقبی نشست پر براجمان تھا۔ لگ بھگ آدھے گھنٹے کے بعد، ہم بہ خیر و عافیت کامونکی پہنچ گئے۔

ہم سیدھے سخاوت کی بہن زینت کے گھر گئے اور انہیں تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا۔ یہ سن کر سب کو سخت افسوس ہوا کہ نازلی کہیں غائب ہوگئی تھی۔ میں نے خاص طور پر زینت کی دو بڑی بیٹیوں سے پوچھ گچھ کی۔ موضوع تفتیش نازلی اور بھولا کا باہمی "معاملہ" ہی تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ ان میں سے کوئی اس چکر سے واقف نہ ہو، اگر واقعی یہ کوئی چکر تھا تو.....!

تھوڑی سی محنت کے بعد مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوگئی۔ میں اٹھا اور بھولا کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا ڈالا۔ زینت اور اللہ دتا کے گھروں کے دروازے پہلو بہ پہلو تھے۔ اس وقت میرے ساتھ نوازش بھی تھا۔ ہم دونوں پولیس کی یونیفارم میں تھے۔ سخاوت علی کو ہم نے گھر کے اندر ہی چھوڑ دیا تھا۔

دروازہ اسلم عرف بھولا کی ماں رحمت بی بی نے کھولا۔ وہ اس وقت گھر میں اکیلی ہی تھی۔ بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ بھولا ان میاں بیوی کی اکلوتی اولاد تھا۔ دو پولیس والوں کو اپنے سامنے دیکھ کر رحمت بی بی گھبرا گئی۔

گھر کے اندر پہنچ کر جب میں نے اسے اپنی آمد کی غرض و غایت سے آگاہ کیا تو اس کی گھبراہٹ وحشت میں بدل گئی۔ وہ بڑی تیزی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

"بھولا تو بہت ہی بی بی بابچہ ہے جی..... وہ ایسا کام نہیں کرسکتا۔ آپ کو کوئی مغالطہ ہوا ہے....."

"وہ کتنا بھولا اور بی بی باہے، اس بات کا پتا تو اس وقت چلے گا جب وہ میرے ہاتھ آئے گا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "تم مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ وہ اس وقت ہے کہاں؟"

"وہ تو جی..... کل صبح سے لاہور گیا ہوا ہے۔" وہ پریشانی سے بولی۔ "دو تین دن کے بعد واپس آئے گا۔"

بھولا کا کامونکی میں موجود نہ ہونا بھی اسی امر پر دلالت کرتا تھا کہ نازلی کی گمشدگی میں سراسر اسی کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔

میں نے کڑے لہجے میں رحمت بی بی سے پوچھا۔

"وہ لاہور کیا کرنے گیا ہے؟"

"اپنے کسی دوست سے ملنے گیا ہے جی۔"

"لاہور میں اس کا دوست کس جگہ رہتا ہے؟"

"مجھے نہیں پتا جی..... وہ اپنے باپ کو بتا کر گیا ہے۔"

"اللہ دتا اس وقت کہاں ملے گا؟" میں نے بھولا کے باپ کے بارے میں پوچھا۔

"وہ منڈی میں ہے جی۔" رحمت بی بی نے بتایا۔ "شام کو ہی واپس آئے گا۔"

اللہ دتا کامونکی کی غلہ منڈی میں کام کرتا تھا۔ میں نے رحمت بی بی کے ساتھ مزید وقت صرف کرنا مناسب نہ جانا اور نوازش علی کو لے کر غلہ منڈی پہنچ گیا۔ اس جانب کا رخ کرتے وقت میں نے سخاوت علی کو سختی سے ہدایت کردی تھی کہ جب تک میں واپس نہ آؤں، وہ اپنی بہن کے گھر میں رک کر میرا انتظار کرے گا۔

غلہ منڈی کامونکی پہنچ کر میں نے اس آڑھتی کی دکان تلاش کی جہاں اللہ دتا کام کرتا تھا۔ مذکورہ آڑھتی کا نام شوکت حسین تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد میں شوکت حسین آڑھتی کی دکان پر اللہ دتا کے روبرو تھا۔

میری بات سن کر اللہ دتا پریشان ہوگیا اور حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ "مجھے تو یقین نہیں آرہا جناب.....!"

"تمہاری یقینی اور بے یقینی کا فیصلہ انشاءاللہ! آج ہی کی تاریخ میں ہوجائے گا اللہ دتا!" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ہم ابھی اور اسی وقت بھولا کی تلاش میں لاہور روانہ ہورہے ہیں اور تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے..... تم ہی ہمیں بھولا کے دوست کے گھر تک پہنچاؤ گے..... میری بات سمجھ رہے ہو نا.....؟"

"جی، سمجھ رہا ہوں۔" وہ بے چارگی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

اس موقعے پر آڑھتی شوکت حسین نے قانون کے ساتھ اپنے بھرپور تعاون کا مظاہرہ کیا۔ جب میں اللہ دتا کو صورت حال کی سنگینی سے آگاہ کررہا تھا تو شوکت حسین بھی ہمارے پاس ہی موجود تھا۔ پوری بات سننے اور اسے محسوس کرنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا۔

"ملک صاحب! اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کو اپنی کار میں لاہور پہنچا سکتا ہوں۔ لاری یا بس میں لاہور پہنچنے میں آپ کو کافی وقت لگ جائے گا پھر بس اسٹینڈ سے بھولا تک رسائی حاصل کرنے میں بھی اچھا خاصا وقت لگے گا

www.pdfbooksfree.pk

جبکہ....." وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"جبکہ میری کار میں آپ لوگ آدھے وقت میں اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔"

میں نے چشم زدن میں آڑھتی شوکت حسین کی پیشکش سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کرلیا اور ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد ہم لوگ کامونکی سے لاہور کی جانب روانہ ہو چکے تھے۔

✂

لاہور کا دورہ بڑا کامیاب ثابت ہوا تھا۔

میں اس وقت اپنے تھانے میں بیٹھا تھانے داری کر رہا تھا۔ نازلی اور بھولا میرے سامنے مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑے تھے۔ ان دونوں کے باپ بھی ایک طرف بینچ پر بیٹھے خفگی آمیز نظروں سے انہیں گاہے بہ گاہے دیکھ رہے تھے اور باہر بارش اپنی بہار دکھا رہی تھی۔ رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیل چکا تھا اور اس گھپ تاریکی میں برستی بارش کی آواز بڑا عجیب سا تاثر پیدا کر رہی تھی۔

لاہور میں بھولا کے دوست کا گھر تلاش کرنے میں مجھے زیادہ وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ منظور احمد نامی وہ شخص کرشن نگر کے علاقے میں رہتا تھا۔ ہماری خوش قسمتی کہ جب ہم نے منظور احمد کے گھر پر چھاپا مارا تو نازلی اور بھولا گھر کے اندر موجود تھے۔ اس تمام تر کارروائی میں آڑھتی شوکت حسین نے بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ واپسی میں مجھے تھانے پہنچانے کے بعد ہی اپنے گھر گیا تھا۔

جب ہم لوگ نازلی اور بھولا کو لے کر لاہور سے واپس آرہے تھے تو ہم نے کامونکی سے سخاوت علی کو بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا۔

جب کوئی مجرم اپنے جرم کا اقرار کرلیتا ہے تو پھر اس سے آگے کا کیس بہت سیدھا اور آسان ہو جاتا ہے۔ نازلی اور بھولا کی ندامت کے بوجھ سے جھکی ہوئی گردنیں اقبال جرم کی عمدہ مثال تھیں لیکن میں نے اس اظہار شرمندگی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی زبان سے بھی تسلیم کرایا کہ یہ مجرمانہ حماقت ان سے سرزد ہوئی تھی۔

میں نے اللہ دتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بھولا نے نازلی کو گھر سے بھگا کر جو جرم کیا ہے اس کے لیے میں اسے سیدھا جیل بھجوا سکتا ہوں۔"

وہ سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے روئے سخن سخاوت علی کی طرف موڑا اور یہ دستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "بھولا جیل چلا جائے گا اور نازلی کو تم اپنے ساتھ گھر لے جاؤ گے لیکن ایک بات ذہن میں رکھ لو کہ بھولا جیل کے اندر سزا کاٹے گا اور نازلی گھر کے اندر بیٹھ کر.....!"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب.....!" وہ گھبراہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ "نازلی کو آپ کیوں سزا دیں گے؟"

"نازلی کو میں نہیں بلکہ یہ معاشرہ سزا دے گا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "جو لڑکی ایک مرتبہ گھر سے بھاگ جاتی ہے پھر معاشرہ اس کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ کہیں سے اس کا کوئی معقول رشتہ نہیں آتا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"نہیں جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" سخاوت نے اثبات میں گردن ہلائی۔

اللہ دتا بھی تائیدی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے باری باری دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ لوگ میرے مشورے پر عمل کے لیے تیار ہو جاؤ تو اس پیچیدہ مسئلے کو ادھر تھانے ہی میں حل کیا جا سکتا ہے۔"

"جی، آپ حکم کریں.....!" وہ بہ یک زبان بولے۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ بات تو ثابت ہو چکی کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے اپنی محبت کی تکمیل کے لیے بہت ہی غلط قدم اٹھایا ہے۔ میں سمجھتا ہوں، اگر ہم سب مل کر ان کی غلطی کو معاف کردیں تو ان کی زندگی بڑی عزت سے گزر سکتی ہے۔"

"آپ کا اشارہ ان کی شادی کی طرف ہے.....؟" اللہ دتا نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"بالکل..... میں یہی کہنا چاہ رہا ہوں۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی پھر سخاوت علی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تمہیں نازلی اور بھولا کی شادی پر کوئی اعتراض تو نہیں سخاوت علی.....؟"

حالات نے ان تمام کرداروں کو ایک ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا تھا کہ کسی کی زبان میری تجویز سے انکار کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی لہٰذا ایک ماہ کے اندر ہی دونوں خاندانوں نے میرے مشورے پر عمل کر ڈالا۔

اس موقعے پر بھولا اور نازلی کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ دل و جان سے میرے احسان مند تھے کہ میں نے دو محبت کرنے والوں کو قانوناً اور شرعاً ایک ڈور سے باندھ دیا تھا۔

چند روز کے بعد کانسٹیبل دوبارہ میرے پاس آیا اور اس نے ایک دلچسپ کہانی سنائی۔ کبھی فرصت ملی تو یہ کہانی بھی آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔

(تحریر: حُسام بٹ)

خوئے نہاں

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

شک زہر بن کر رگوں میں اترے یا ناگ بن کر ڈستا رہے، ہر صورت میں دل و دماغ کو متاثر کرتا ہے... یہاں تو کتنی ہی معصوم زندگیاں داؤ پر لگی ہوئی تھیں۔ محبت جب نفرت میں ڈھل جائے تو صرف دل مردہ ہوتے ہیں مگر جب... نفرت کی چنگاری شبہات کے الاؤ میں بھڑک اٹھے تو کئی گھر جل کر راکھ کے ڈھیر بن جاتے ہیں۔

وڈیرا شاہی نظام کا ایک لرزہ خیز منظر

"نہ بابا نہ..... میں تو تم سے شادی نہیں کرسکتی۔ مجھے تم جیسے وڈیرے زادوں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔"

رافعیہ نے مصنوعی پن سے اور قدرے تاؤ دلانے والے انداز میں اپنے سامنے بے قرار سے بیٹھے آغل خان سے کہا تو جواباً اس کے سرخ و سفید اور بھرے بھرے پروقار چہرے ہر خفگی طاری ہوگئی۔ وہ جھنجلا سا گیا تھا بلکہ اس کی بات پر..... اسے تاؤ آگیا تھا۔ وہ تھا بھی کچھ ایسی ہی طبیعت کا..... آتش مزاج..... چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دم بھڑک

www.pdfbooksfree.pk

اٹھنے والا۔ مگر پتا نہیں کیوں رافعیہ کو اسے غصہ دلانے میں بہت مزہ تو آتا تھا نتیجتاً دوسرے ہی لمحے رافعیہ کے ہونٹوں سے ایک کھلکھلاتی ہنسی چھوٹی تو وہ قدرے پرسکون ہوا۔

یہ دونوں اس وقت کالج کینٹین میں بیٹھے چائے نوش کرر ہے تھے۔ ایک پیریڈ خالی تھا، اس وقت کینٹین میں رش بھی کم تھا۔

''فری! تم نے میرے بات کا جواب دینے کے بجائے ہنسی میں ٹال دی، بولو ناں؟ کرو گی ناں شادی مجھ سے؟''

آغل خان نے غالباً اس کی ہنسی سے اندازہ لگالیا تھا کہ اس نے ایسا مذاقاً کہا تھا اس لیے اس نے اپنا پہلا سوال دُہرانے کے بجائے رافعیہ سے اس کا جواب مانگا تھا۔ وہ اسے پیار سے فری کہتا تھا۔ لہٰذا رافعیہ کو بھی اب سنجیدہ ہونا پڑا اور وہ سنجیدہ لہجے میں بولی۔

''آغل! تم سے شادی کرنا میری خوش قسمتی ہی ہوگی لیکن......'' اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''لیکن کیا؟'' اس سے رہا نہ گیا۔

''میں ڈرتی ہوں آغل! کہ ہم دونوں کے بیچ یا یوں سمجھ لو...... کہ ہمارے خاندانوں کے بیچ جو طبقاتی تفاوت ہے کہیں وہ ہم دونوں کی زندگی میں زہر گھولنے کا باعث نہ بن جائے۔''

بالآخر رافعیہ کے دل کی بات نوکِ زبان پر آہی گئی اس وقت اس کی نگاہیں آغل خان کے خوبرو چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ رافعیہ نے دیکھا کہ اس کی بات پر آغل خان کی گھنی مونچھوں تلے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ اس کی طرف محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے پیار بھری حلاوت سے بولا۔

''فری! یہ تمہاری خام خیالی ہے، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ دیکھو! طبقاتی تفاوت اس وقت تک انسان کا کچھ نہیں بگاڑتا جب تک وہ احساس کمتری یا برتری میں مبتلا نہ ہو اور خدا کا شکر ہے ہم دونوں ہی اس احساس سے مُبرا ہیں۔ ہمارے دل و دماغ میں صرف ایک دوسرے کے لیے احساس محبت ہے۔ پھر تم ایک پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ بھلا تم نے یہ سب کیسے اور کیوں کر سوچ لیا۔'' آغل نے بات ختم کی تو رافعیہ نے بھیدوں بھرے تبسم کے ساتھ اپنا سر جھکا لیا۔

☆☆☆

آغل خان ایک خوبرو نوجوان تھا۔ چمک دار روشن آنکھیں اور پروجاہت دراز قامت۔ وہ دادو اور سہون شریف کے بیچ واقع گوٹھ فتح پور کا رہنے والا تھا، اس کا باپ موجا خان، اپنے علاقے کا ایک بااثر وڈیرا تھا۔ آغل خان اس کی اکلوتی اولاد تھا اور ظاہر ہے اپنے ماں باپ کی آنکھوں کا تارا بھی تھا۔ جبکہ رافعیہ حیدرآباد کے ایک متوسط علاقے میں اپنی بوا کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ ایک اوسط درجے کے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ ماں باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ بھائی بہن تھے نہیں، ایک بوا ہی تھیں جنہوں نے اسے پالا تھا رافعیہ خود کو ایک بے مایہ ہستی سمجھتی تھی۔ اس پر ایک امیر کبیر رئیس زادے کے بیٹے کا فریفتہ ہونا وہ اپنی خوش قسمتی ہی پر محمول کرتی تھی۔ یوں بھی اس کی غیر معمولی خوب صورتی نے اس کی غربت کے داغ کو ڈھانپ رکھا تھا۔

جب رافعیہ نے فرسٹ ایر میں داخلہ لیا تھا تو اس کی آغل خان سے دوستی ہو گئی تھی جو محبت میں بدل کر اب فائنل ایر کے اختتام میں شادی پر منتج ہونے والی تھی۔

جامعۂ سندھ میں یہ دونوں ایم اے فائنل کر رہے تھے۔ آغل خان جیسے وڈیرے زادوں کو عموماً پڑھائی وغیرہ سے اتنا شغف نہیں ہوتا مگر آغل خان ایک مختلف شخص تھا۔ اسے پڑھنے کا شوق تھا کم از کم وہ انگریزی میں ایم اے ضرور کرنا چاہتا تھا۔ جبکہ خود رافعیہ۔ ایم اے اردو میں تھی اور اس کی دلچسپی تعلیم سے واجبی ہی تھی۔

غربت بھی انسان کے اندر بسا اوقات زبردست قسم کا احساس محرومی پیدا کرتی ہے۔ رافعیہ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ وہ اکثر سوچا کرتی کہ میری زندگی بھی کیا ہے؟ خود میری اپنی حیثیت کیا ہے۔ غربت کی پوٹ میں آنکھ کھولی پھر ماں باپ کے سائے سے محرومی' شادی نصیب میں ہوئی تو اپنے ہی جیسے کسی غربت کے مارے کے پلّے باندھ دی جاؤں گی، یعنی پھر ایک تنگ دست اور حسرت زدہ زندگی کی ایک سے گنتی شروع ہو جاتی۔ بھلا غربت کی گھڑی کوئی شہزادہ گلفام تو اٹھانے سے رہا۔ غرضیکہ کبھی کبھی رافعیہ کو اپنے آپ سے بھی نفرت ہونے لگتی تھی۔ لیکن تب پھر اچانک ایک روز ایک دوست نے اسے احساس دلایا کہ وہ غریب نہیں امیر بلکہ امیر ترین لڑکی ہے اور وہ دوست اس کا آئینہ تھا۔ وہ اکثر کمرے میں بند ہو کر گھنٹوں اس کے سامنے کھڑی اپنے سراپا کا جائزہ لیا کرتی تھی۔ تب اسے احساس ہوا کہ وہ تو غربت کی گدڑی کا لعل تھی۔ حسن و شباب کی دولت سے مالا مال، پس اس نے دل میں تہیہ کرلیا تھا کہ وہ اپنے حسن بے بدل کے اس چیک کو ایک نہ ایک دن ضرور کیش کرائے گی۔ یوں آغل خان سے دوستی کے بعد اسے اپنے رنگین خوابوں کی تعبیریں پوری ہوتی محسوس ہونے لگیں۔ مادی اندازِ فکر نے گویا رافعیہ کی سوچ ہی بدل ڈالی تھی۔ اپنی ناآسودہ اور محروم تمناؤں سے

چھٹکارا پانے کے لیے آغل خان کی طرف کھنچتی چلی گئی مگر اس کا یہ مطلب بھی نہ تھا کہ وہ خود کو ''کھلونا'' بنا ڈالے۔ آغل خان یونیورسٹی کیمپس میں رہتا تھا مگر حیدرآباد شہر کے ایک پوش علاقے میں اس کی شاندار کوٹھی بھی تھی جو گینجھر ہاؤس کے نام سے موسوم تھی۔ ایک روز آغل خان کے بہت اصرار پر رافعیہ گینجھر ہاؤس بھی گئی تھی اور اس کی شایانہ سج دھج دیکھ کر مسحور ہو کر رہ گئی تھی۔ نوکر چاکر کی ایک پوری فوج وہاں خدمت کے لیے موجود تھی۔ بیش قیمت اشیاء سے آراستہ و پیراستہ چھوٹے بڑے بہت سے کمرے تھے۔ وہاں آغل خان نے موقعے سے فائدہ بھی اٹھانے کی کوشش کی تھی مگر وہ بھی ایک کائیاں تھی۔ بہ طریقِ احسن اسے طرح دے گئی تھی۔ اب جبکہ فائنل ایر کے امتحانات سر پہ تھے، آغل نے آج اس سے شادی کے متعلق حتمی گفتگو کرتے ہوئے اٹل جواب مانگا تھا اور رافعیہ نے بھی اس کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی کی تھی۔

☆☆☆

یونیورسٹی سے ایک ''پوائنٹ'' حیدرآباد شہر آتا تھا جس میں سارے طلبہ و طالبات یونیورسٹی سے گھر اور گھر سے یونیورسٹی آتے جاتے تھے۔ اس روز بھی ہمیشہ کی طرح پوائنٹ نے رافعیہ کو گاڑی کھاتہ اتارا اور پھر وہ ایک تنگ سی گلی میں آگئی جہاں دونوں اطراف بوسیدہ اور شکستہ سے مکانات کی قطاریں تھیں۔ ایسے ہی ایک پرانے گھر کے دروازے پر اس نے رک کر دستک دی۔ دروازہ بوا نے ہی کھولا تھا۔ وہ ساٹھ کے پیٹے میں تھیں' ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ رافعیہ کو ہی وہ اپنی اولاد اور بیٹی سمجھتی تھیں۔

ذرا دیر بعد بوا رافعیہ کے کمرے میں آئیں، پھر بولیں۔

''آج توفیق آیا تھا۔ بڑا خوش تھا۔ بتا رہا تھا کہ اسے کسی دوائیوں کی کمپنی میں اچھی سی نوکری مل گئی ہے۔''

''اچھا!'' رافعیہ کے منہ سے استہزائیہ نکلا۔

''ہاں! وہ آج شام کو پھر آئے گا۔ کہہ رہا تھا کہ میں یہ خوشخبری رافعیہ کو سناؤں گا۔''

بوا کو غالباً اس کے اچھا کہنے پر خوش فہمی نے آلیا تھا۔ رافعیہ بولی۔

''بے چارہ! مجھے نوکری کی خوش خبری اس لیے سنانا چاہتا ہے تاکہ میں اس سے شادی کے لیے ہاں کہہ دوں.... ہونہہ...... پھٹیچر کہیں کا۔'' پھر وہ بوا سے مخاطب ہوئی۔ ''بوا! آپ نے اس پھٹیچر کو زیادہ منہ تو نہیں لگالیا۔ اس سے کہیں کہ کسی اور کا گھر دیکھے، یہاں اس کی دال گلنے والی نہیں۔''

بوا نے یہ سنا تو مایوس ہو گئیں، بولیں۔ ''بیٹی! ایسا نہ بول، توفیق ایک شریف اور دیکھا بھالا لڑکا ہے، وہ بے چارہ کتنا ہمارے کام بھی آتا ہے۔ سچ پوچھو تو مجھے اس کے ہوتے ہوئے اپنے بیٹے کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔''

''بے چارہ!'' رافعیہ نے پھر تمسخر اڑایا اور حقارت سے کہا۔ ''بوا! تم نے اگر اسے اپنا بیٹا بنالیا ہے تو اس سے میری ایک درخواست کر دینا کہ وہ میرا بھائی بن جائے اور اس طرح سعادت مندی سے ماں اور بہن کے کام آتا رہے۔ دیکھنا پھر بوا! ناک کے راستے اس کی ساری بے چارگی نکل جائے گی۔''

''بیٹی! حقیقت کی دنیا میں اس قدر سخت پیمانہ اور کسوٹی نہیں رکھی جاتی، تیری مرضی۔'' بوا یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئیں

☆☆☆

شام کو توفیق پھر آدھمکا۔ رافعیہ کو دیکھتے ہی اپنی باچھیں پھیلاتے ہوئے فلمی انداز میں جو صرف رافعیہ کو محسوس ہوا تھا، ورنہ وہ تو بے چارہ بڑی معصومیت سے بولا تھا۔

''رافعیہ! مجھے نوکری مل گئی ہے۔''

''آں...... غلط، درست مکالمہ بولو...... اس طرح ...... ماں! مجھے نوکری مل گئی ہے۔''

رافعیہ نے تمسخر اڑایا تو توفیق کے چہرے پر کڑوی گولی نگلنے کے سے تاثرات نمودار ہو گئے تاہم وہ اسے اپنی تحقیر کے بجائے اس کی بذلہ سنجی پر محمول کرتے ہوئے زیادہ ڈھٹائی کے ساتھ خوش ہو کر بولا۔ ''رافعیہ! میں سچ کہہ رہا ہوں' پورے سات ہزار تنخواہ ہے اور ڈیلی الاؤنس الگ......''

''اچھا!'' رافعیہ کا انداز بہ دستور تضحیک آمیز رہا۔

''بس اب جلدی سے شادی کرلو' میں تیار ہوں۔'' رافعیہ بہ دستور اسے زچ کرنے پر تلی ہوئی تھی مگر وہ تھا کہ برا مان کر ہی نہیں دے رہا تھا بلکہ رافعیہ کی اس بات کو سچ پر محمول کر کے خوشی سے چلّایا۔

''کیا کہا تم سچ کہہ رہی ہو۔ رافعیہ؟''

''بالکل سچ کہہ رہی ہوں میں'' وہ برجستہ بولی۔ ''بس ایک کام پہلے اور کرلو، جلدی سے کسی اچھے علاقے میں ایک بنگلا خرید لو اور ایک عدد لمبی سی اچھی سے کار بھی، تاکہ مجھے دلہن بنا کر سیدھا وہاں لے جاسکو۔'' رافعیہ کی اس چوٹ پر جیسے اس کی خوشی پر اوس پڑ گئی۔ اس کا چہرہ بجھ سا گیا۔ اس نے آہستگی سے کہا۔

''یہ سب رفتہ رفتہ ہو جائے گا' میں خوب محنت کروں گا۔''

www.pdfbooksfree.pk

''اور...... میں جب تک چولہا جھونکتے بڈھی ہو جاؤں گی۔'' رافعیہ نے درمیان سے اس کا جملہ اچک لیا تو وہ اس کی جانب مایوسی سے تکنے لگا۔ تذلیل کے احساس سے اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔ اور یہی وہ چاہتی تھی۔

''رافعیہ میں تم سے شدید محبت کرتا ہوں اس ساری تذلیل کے باوجود...... کہ یہ ایک اعلیٰ وارفع محبت کی معراج ہے اور پیمانہ بھی خدا حافظ۔''

توفیق کو دیکھ کر رافعیہ کو اپنی غربت اور بے مائیگی کا زیادہ ہی احساس ہوتا تھا۔ توفیق حسب توفیق اسے رجھانے اور میدان حسن مارنے کے لیے بلند و بانگ دعوے کرتا رہتا تھا۔ اس کے ارادے مضبوط سہی مگر کم از کم رافعیہ کو ریت کی دیوار ہی محسوس ہوتے تھے رافعیہ کے خیال کے مطابق وہ چھ سات ہزار کی نوکری سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے بی ایس سی کیا تھا۔ محلے میں ہی اس کا کرائے کا گھر تھا۔ ماں باپ کا اکلوتا تھا، باپ کلرک تھا جو ریٹائر ہونے والا تھا۔

رافعیہ اور بوا کی گزر بسر بھی بس شتم پشتم تھی۔ رافعیہ کے ابو نے اپنا بیمہ کروا رکھا تھا اور ان کے انتقال کے بعد بیمہ کمپنی والوں نے ایک خاطر خواہ رقم دی تھی جس سے فکس ڈپازٹ سرٹیفکیٹس خرید لیے گئے تھے اور ماہانہ آنے والے انٹرسٹ سے ان کی بس ٹھیک ہی گزر بسر ہوتی تھی۔

بہر طور اس دن کے بعد سے توفیق نے اس موضوع پر دوبارہ بات کرنے کی کوشش یا ہمت نہیں کی تھی۔ رافعیہ نے گویا اپنے تئیں اسے اچھا سبق سکھایا تھا یوں رافعیہ نے بھی سکھ کا سانس لیا تھا تاہم اس کا خیال تھا کہ توفیق کی ٹھیک ٹھاک ٹکور کرنے کے بعد شاید وہ پہلے کی طرح ان کے کام نہیں آئے گا مگر بعد میں رافعیہ کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی جب اس نے اسے اسی طرح اپنے گھر کا سودا سلف لاتے اور باہر کے چھوٹے موٹے کام کرتے دیکھا تھا۔

☆☆☆

ایم اے فائنل کے امتحان سے فارغ ہوتے ہی رافعیہ نے جیسے دھماکا کر دیا، اس کا اٹل فیصلہ بوا اور توفیق کے لیے دھماکا ہی ثابت ہوا تھا۔ یعنی آغل خان سے شادی کا حتمی فیصلہ...... بوا پریشان بلکہ ہراساں ہو گئی تھیں۔ جبکہ توفیق کا چہرہ اتر گیا تھا۔

بے چاری بوا نے رافعیہ کو اپنے ارادے سے باز رکھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے سمجھایا بھی تھا۔ ''بیٹی! بھلے تو توفیق سے شادی نہ کر کسی اور سے ہی کر لے لیکن مجھے جانے کیوں اس رئیس زادے سے تیرا بیاہ بہتر محسوس نہیں ہو رہا ہے یہ اور ہی دماغ اور سوچ کے لوگ ہوتے ہیں۔''

رافعیہ بوا کی بات پر کھلکھلا کر ہنسی ''ارے بوا! آ... خان ایسا نہیں ہے وہ ایک پڑھا لکھا اور سلجھا ہوا لڑکا ہے...'' مگر بوا کی تسلی نہ ہوئی تاہم انہوں نے بھی چپ سادھ لی...

رافعیہ کی شادی آغل خان سے ہو گئی۔

شادی سے پہلے رافعیہ نے اس سے یہ بات منوا... کہ وہ اس کے آبائی گوٹھ کی حویلی کے بجائے شہر میں ... کی شاندار کوٹھی کینجھر ہاؤس میں رہے گی اس لیے آغل ... اسے اپنی دلہن بنا کر وعدے کے مطابق کینجھر ہاؤس ہی ... تھا۔ گوٹھ سے اس کے ماں باپ کے علاوہ دیگر رشتے دار ... شریک ہوئے تھے۔

غرض آغل خان سے شادی کر کے رافعیہ بہت خو... تھی۔ گویا اس نے اپنے خوش آئند خوابوں کی جیسی تعبیر چ... وہی پالی تھی۔ شادی کے ابتدائی دن خوب سیر سپا... ہوئے۔ کینجھر ہاؤس جیسی عالی شان کوٹھی میں رافعیہ خود کو... تصور کرنے لگی تھی۔ ہر وقت نوکر چاکر ہاتھ باندھے ... کی جنبش ابرو کے منتظر رہتے تھے۔ ایک روز آغل خان ... رافعیہ کو بہ صد اصرار گوٹھ کا بھی چکر لگانے کو کہا۔

''میں وہاں نہیں جاؤں گی، کیا تم نے اپنا و... بھلا دیا؟'' وہ منہ پھلا کے بولی تو آغل خان نے بڑے محب... بھرے انداز میں رافعیہ کو خود سے لگا کے کہا۔

''ایسا ہو سکتا ہے بھلا کہ میں وعدہ توڑ کر تم سے ... ہو جاؤں۔''

''تو پھر گوٹھ جانے کا کیوں کہتے ہو؟'' رافعیہ ... دلار سے کہا تو آغل خان نے ایک بڑی مست سی جماہ... کرتے ہوئے کہا۔

''ارے بابا! میں کون سا ہمیشہ کے لیے تمہیں وہا... رہنے کا کہہ رہا ہوں، چند دنوں کے لیے بابا سائیں اور ا... جانی کی خواہش ہے۔ پلیز فری جان! میری خاطر صرف ... دنوں کے لیے۔''

رافعیہ نے دلنشین مسکراہٹ کے ساتھ اثبات ... سر ہلا دیا۔

☆☆☆

گوٹھ جانے کے لیے یہ دونوں ایک نئے ماڈل ... ڈبل کیبن انٹرکولر میں روانہ ہوئے۔ اس گاڑی میں ... رافعیہ کو یوں لگا تھا جیسے وہ کسی ٹھنڈے ٹھار اڑن کھٹ... پر سوار ہو ایسی شاہانہ زندگی کا ہی تو رافعیہ نے خواب د... اور آج اس کی تعبیر پا رہی تھی۔

وہ دو ڈھائی گھنٹوں کی ڈرائیونگ کے بعد آبائی حویلی پہنچ گئے۔ یہاں بھی رافعیہ نے سب کو اپنے آگے پیچھے گھومتے ہوئے پایا تھا۔ بے شمار نوکر چاکر تھے جو اسے چھوٹی وڈیرنی...... چھوٹی وڈیرنی کہتے نہیں تھکتے تھے۔ آغل خان کا باپ موجا خان ایک ساٹھا پاٹھا شخص تھا۔ رافعیہ کو وہ بڑی دبدبے والی شخصیت دکھائی دیے تھے۔ خاصے سخت گیر اور رعونت مزاج بھی محسوس ہوئے، مگر رافعیہ کے ساتھ ان کا رویہ نہایت مشفقانہ رہا تھا۔ پھر بھی ان کی نرم خوئی میں ایک عجیب طرح کی سخت گیری محسوس ہوتی تھی جو شاید ان کے شاہانہ مزاج کا حصہ ہی تھی۔ رافعیہ کو اپنی ساس بھی اچھی خاتون محسوس ہوئی تھیں۔ وہاں رہتے ہوئے آغل اور رافعیہ کو ایک ہفتہ بیت گیا۔ اس دوران آغل خان نے اسے اپنی زمینیں بھی دکھائی تھیں۔ رافعیہ تو پہلے دن ہی ایک ہی جگہ یعنی حویلی میں خود کو محصور پا کر بیزار ہونے لگی تھی اور آغل خان تھا کہ واپس شہر جانے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ بالآخر ایک دن رافعیہ نے اس کا شکوہ کر ہی ڈالا۔

''یہ کیا بھئی، آغل! تم تو مجھے ایک آدھ روز کا کہہ کر یہاں لائے تھے۔ اب یہ دوسرا ہفتہ ہونے کو آ رہا ہے، مجھے تو یہاں پہلے ہی دن سے بڑی گھٹن سی محسوس ہو رہی ہے۔'' اس کی بات پر وہ بڑی حلاوت آمیز نظروں سے دیکھ کر بولا۔

''ارے بھئی تو کیا ہوا۔ بھلا میرے ہوتے ہوئے بھی تم یہاں بوریت محسوس کر رہی ہو؟''

جواباً رافعیہ نے منہ بنا لیا تو وہ جیسے اسے مناتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو فری! میں ماں باپ کا واحد سہارا ہوں اور ان کا بازو بھی۔ بس تھوڑا اور انتظار کر لو، فصل اترنے والی ہے اس کے بعد چلیں گے واپس شہر۔''

''وہ تو ٹھیک ہے آغل لیکن میں اس ماحول کی عادی نہیں ہوں۔'' رافعیہ نے بیزاری سے کہا تو آغل خان نے پہلی بار بڑے عجیب سے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''فری! تمہیں اب خود کو ایسے ماحول کا عادی بنا لینا چاہیے۔'' یہ سن کر رافعیہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، اس وقت وہ اسے بدلا بدلا سا محسوس ہوا تاہم وہ خاموش رہی۔

رافعیہ نے سوچا کہ چلو مزید کچھ دن یہاں رہنے میں کوئی قباحت نہیں۔ آخر اتنے بڑے گھر کی بہو ہوں۔ مجھے یہاں بھی کچھ روز گزارنے چاہئیں۔ تاہم ایک بات اسے سخت کھلنے لگی تھی کہ اس کے سسر نے آغل کو اب اپنے زمینی معاملات میں کچھ زیادہ ہی الجھا دیا تھا۔ اب آغل کا یہ معمول بن گیا تھا کہ وہ صبح سویرے اپنے کمداروں کے ساتھ

کھل کر مسکرائیں

استاد (شاگرد سے) ''جانوروں کے بال کیوں ہوتے ہیں۔''

شاگرد۔ ''جناب جنگل میں حجامت کرنے کا کوئی انتظام جو نہیں ہوتا۔''

☆☆☆

پروفیسر صاحب کی بیوی نے مسکراتے ہوئے پروفیسر سے کہا۔ ''دیکھیے میں آپ کے لیے بازار سے ایک سوٹ لائی ہوں۔''

پروفیسر نے حیرت سے پوچھا۔ ''آج تمہیں میرا خیال کیسے آ گیا؟''

بیوی نے جواب دیا۔ ''خیال کیوں نہ آتا تین ساڑھیاں خریدنے پر مفت جو مل رہا تھا۔''

☆☆☆

ایک دوست دوسرے دوست کے گھر گیا تو میزبان نے پوچھا۔ ''بھئی تم تکلف مت کرنا، بولو چائے پیو گے یا ٹھنڈا؟''

مہمان۔ ''جب تک چائے بنے ٹھنڈا دے دو۔''

☆☆☆

ایک شخص کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ وہ اپنے سسرال گیا۔ سسرال والوں کی آؤ بھگت اور خاطر مدارت دیکھ کر اس نے ایک بورڈ اپنے سسرال والوں کے باہر آویزاں کر دیا۔ ''سسرال جنت کا نمونہ ہے۔''

اس گھر کے دوسرے داماد نے جس کی شادی کو کافی عرصہ گزر چکا تھا جب یہ بورڈ پڑھا تو اس نے اس تحریر کے نیچے لکھ دیا۔

''چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات ہے۔''

مراسلہ: سعید عباسی، نامعلوم مقام

www.pdfbooksfree.pk

زمینوں کی طرف نکل جاتا اور شام کو حویلی لوٹتا، واپس آنے کے بعد بھی خاصی دیر تک وہ اپنے باپ کے ساتھ باتوں میں مصروف رہتا اور پھر جب وہ رافعیہ کے پاس آتا تو اس قدر تھکا ہوا ہوتا کہ اس سے کوئی بات تک کرنے کا یارانہ ہوتا۔ اس دن کے بعد سے رافعیہ میں آغل خان سے کوئی شکوہ کرنے کی جرأت نہ ہوسکی۔

☆☆☆

رافعیہ کو اپنی بوا کا بھی خیال آتا تھا۔ وہ بے چاری رافعیہ کی شادی کے بعد تنہا ہوگئی تھیں۔ حالانکہ اس نے ان سے کہا تھا کہ وہ بھی ساتھ ہی تنجھر ہاؤس چل کر رہیں مگر انہوں نے ٹال دیا تھا۔

البتہ اب بھی وہ رافعیہ کا عاشق نامراد توفیق بوا کا پورا پورا خیال رکھتا تھا۔ رافعیہ کو اب کچھ کچھ اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ واقعی توفیق ایک اچھا انسان تھا ورنہ رافعیہ سے ناامید ہونے کے بعد وہ بوا سے بھی ناتا توڑ سکتا تھا مگر ایسا اس نے کیا نہیں تھا۔ وہ رافعیہ کی شادی کے بعد بھی ان کی پوری دیکھ بھال کر رہا تھا۔

بہرطور رافعیہ خود کو حویلی میں قیدی کی طرح وقت گزارتے ہوئے محسوس کرنے لگی، آغل خان کے پاس تو اس کے لیے جیسے وقت ہی نہ رہا تھا۔ پھر اس دوران غلامو کی موجودگی نے رافعیہ کو کسی حد تک سہارا دیا تھا۔ وہ ایک گول مٹول سا نوعمر لڑکا تھا، معصوم سا۔ اس کی معصومیت اور بھولپن سے ہی رافعیہ اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ وہ بڑا پیارا لڑکا تھا۔ بہ مشکل چودہ پندرہ سال کا ہوگا۔ وہ حویلی کے ایک بہت ہی پرانے اور بااعتماد مرحوم ملازم کا بیٹا تھا۔ وہ حویلی میں کام کرتا تھا اور اُدھر ہی رہتا تھا۔ وہ بڑی پیاری پیاری اور معصوم سی باتیں کرتا تھا۔ چھوٹی عمر کے باوجود وہ اچھے خاصے ڈیل ڈول کا مالک تھا۔ رنگت سانولی تھی۔ وہ رافعیہ کو بڑے پیار سے چھوٹی وڈیرنی کہا کرتا تھا۔ مگر پھر بعد میں رافعیہ کے منع کرنے پر وہ اسے ادی جیجل کہنے لگا۔ رافعیہ نے ایک دن یونہی اُس سے پوچھا۔ ”غلامو! یہ ادی تو میری سمجھ میں آتا ہے جس کا مطلب بہن ہوتا ہے مگر یہ تم ادی کے ساتھ جیجل لگاتے ہو اس کا کیا مطلب ہے؟“

اس کی بات پر غلامو نہایت معصومانہ انداز سے بولا۔ ”ادی جیجل کا مطلب ہوتا ہے، پیاری، تم میری ادی جیجل ہونا، یعنی پیاری بہن۔“

رافعیہ یہ سن کر بہت خوش ہوئی، غلامو کی صورت میں اسے ایک محبت کرنے والا بھائی مل گیا تھا۔ جب رافعیہ حویلی میں زیادہ بور ہونے لگتی تو اکثر غلامو کے ساتھ باہر سیر کو چلی جایا کرتی تھی۔ آغل خان کا یہ گوٹھ بہت پرفضا تھا۔ آج کل آغاز سرما تھا مگر رافعیہ نے سنا تھا یہاں قیامت خیز گرمی پڑتی ہے۔ بہرطور، غلامو اکثر اسے گوٹھ کے جنوب میں جہاں گندم اور مٹر کی فصلیں لہلہاتی تھیں، وہاں ایک بڑی ندی کی طرف لے جایا کرتا تھا اس نے رافعیہ کو اس ندی کے متعلق بتایا تھا کہ یہ گاج ندی ہے یہاں کی کھیتی باڑی کا زیادہ تر انحصار اس ندی پر تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ جب وہ غلامو کے ساتھ سیر کو نکلتی تو آغل خان بھی اتفاق سے راستے میں کہیں مل جاتا تھا۔

ایک دن آغل خان نے اس سے بڑے عجیب لہجے میں کہا۔

”رافعیہ! یہ شہر نہیں گاؤں ہے۔ تمہیں یہاں سیر سپاٹا زیب نہیں دیتا اور وہ بھی ایک معمولی نوکر کے ساتھ۔“

”تو پھر کس کے ساتھ میں باہر جاؤں؟“ رافعیہ نے تڑخ کر کہا۔ ”تمہارے پاس تو میرے لیے وقت ہی نہیں ہے۔ اور ویسے بھی غلامو کو میں نوکر نہیں سمجھتی بلکہ میں اسے اپنا چھوٹا بھائی سمجھتی ہوں۔“

اس جواب پر وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔

”ہونہہ...... بھائی!“

لفظ بھائی کو اس نے قدرے چبا کر ادا کیا تھا۔ بے اختیار نجانے کس خیال کے تحت رافعیہ کو اپنے اندر عجیب سی سنسنی کا احساس ہوا۔ اس نے دیکھا کہ اس وقت آغل خان کے چہرے پہ عجیب سا سناٹا طاری ہوگیا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں غلطاں تھا۔ اس وقت جانے کیوں رافعیہ کو بوا کی بات یاد آنے لگی، انہوں نے ایک دن رافعیہ سے کہا تھا۔ ”یہ اور ہی دماغ اور سوچ کے مالک ہوتے ہیں۔“

”تو کیا آغل...... میرے اور غلامو کے تعلق کو شبے کی نگاہ سے دیکھنے لگا تھا۔“ مگر یہ شبہ اور شک کا زہر تو ہر مرد کے اندر موجود ہوتا ہے۔ ”نہیں نہیں میرا آغل ایسا نہیں ہوسکتا...... میری اس سے اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ وہ عام مردوں سے ہٹ کر کے مجھ سے محبت کرتا ہے۔“ رافعیہ خود سے تکرار میں الجھ جاتی۔

اور...... پھر اس روز واقعی رافعیہ کی زندگی میں ایک خوفناک طوفان آگیا۔

☆☆☆

غلامو سخت بیمار پڑ گیا تھا۔

اس بے چارے کا دنیا میں اور کوئی نہ تھا جو اس کی

تیمارداری کرتا، بیماری کی حالت میں بھی اس غریب معصوم کو نہیں بخشا گیا تھا اسے آرام کروانے کے بجائے حویلی کا کام لیا جا رہا تھا۔ رافعیہ نے اس حویلی میں جہاں دوسری بہت سی باتیں نوٹ کی تھیں۔ وہاں ایک یہ بھی تھی کہ نوکروں اور ملازموں کے ساتھ یہاں بڑا تحقیر آمیز رویہ اختیار کیا جاتا تھا۔ بلکہ اکثر تو بیگار کاٹا کرتے تھے۔ وہ جھوٹا کھاتے اور اترن پہنا کرتے تھے۔ لیکن حویلی ہی کے سیلن زدہ کونوں کھدروں میں پڑے رہتے تھے، غلامو...... کو بھی رافعیہ نے ایک ایسے ہی سیلن زدہ کمرے میں بخار میں پھنکتے ہوئے پایا تھا۔ رافعیہ کو اس پر بڑا ترس آیا اور وہ اسے اپنے کمرے میں لے آئی۔ اس نے دیکھا وہ بہت سہا ہوا تھا۔

”غلامو! تمہیں اتنا شدید بخار ہے تم نے کوئی دوا نہیں لی۔“ رافعیہ نے دکھتے دل سے پوچھا۔

”ادی جیجل! مجھے بھلا کون دوائی دے گا۔ میرا تو کوئی نہیں، ہم غریبوں کی زندگی تو بس ایسی ہی ہوتی ہے کام کرو بس تو ہل کے بیل کی طرح، بیمار پڑ جائیں تو کوئی پرسانِ حال نہیں۔“

اس کے معصومانہ لہجے میں گہرے دکھ کی کاٹ تھی، رافعیہ کا دل بے اختیار پسیج گیا پھر اس سے بولی ”غلامو! تم خود کو اکیلا کیوں سمجھتے ہو، کیا میں تمہاری بہن نہیں ہوں۔ تمہاری ادی جیجل!“

وہ پھیکے سے انداز میں مسکرایا تھا۔ رافعیہ نے فوراً ایک ملازم کے ساتھ غلامو کو حکیم جی کے مطب بھیجا اور کچھ پیسے بھی اسے دیے ایک دو روز بعد وہ بھلا چنگا ہوگیا۔ اس میں رافعیہ کی خصوصی دیکھ بھال کا ہی حصہ تھا۔ پھر مگر پتا نہیں کیوں آغل کو یہ بات بری طرح کھلنے لگی تھی۔ رافعیہ کو اس کی وجہ نہیں سمجھ آرہی تھی کہ اسے بھلا اس معصوم بچے سے کیا پرخاش تھی۔ پھر معلوم نہیں کیا ہوا کہ غلامو، رافعیہ سے کھنچا کھنچا سا رہنے لگا۔ اس کے ساتھ سیر کرنے کے لیے جانا تو ایک طرف رہا اس نے رافعیہ سے ملنا حتیٰ کہ بات کرنا بھی اب ترک کردیا تھا۔ رافعیہ کو اس کی اچانک بے اعتنائی پر حیرت کے ساتھ دکھ بھی ہوا، آخرکار ایک روز رافعیہ نے غلامو کو اپنے کمرے میں بلا کر پوچھ ہی لیا۔

”غلامو! کیا بات ہے؟ تم مجھ سے کچھ ناراض لگتے ہو۔“ یہ کہتے ہوئے رافعیہ نے غلامو کے چہرے کو بھانپتی ہوئی نگاہوں سے بھی دیکھا تو اسے وہاں معصومیت اور بے بسی کے تاثرات محسوس ہوئے تب اس نے دیکھا کہ غلامو کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو امڈ آئے اور وہ رندھے ہوئے لہجے میں بولا۔

”ادی جیجل! بات کسی کو بتانا مت۔ مجھے دراصل چھوٹے سائیں (آغل خان) نے ہی آپ کے ساتھ رہنے اور بات کرنے کو سختی سے منع کیا ہے۔ پر ادی...... تم...... میں تو تمہیں واقعی آپڑیں بہن سمجھتا ہوں۔ کیا ہم غریبوں کی بہن نہیں ہوسکتی۔“ اس نے آخر میں اس قدر معصومیت سے کہا کہ رافعیہ نے بے اختیار اسے گلے سے لگالیا۔

ٹھیک اسی وقت دروازہ کھلا۔ سامنے آغل خان دونوں کو جلتی سلگتی نظروں سے گھور رہا تھا۔

نظر دھوکا دیتی ہے۔ جو منظر دکھاتی ہے، ضروری نہیں وہ سچ ہو، سچ سوچ سے پیدا ہوتا ہے۔ رافعیہ نے غلامو کو بھائی کے مقدس رشتے سے گلے لگایا تھا۔ یہ سوچ سچ تھی اور آغل خان کی آنکھیں جو منظر دیکھ رہی تھیں۔ وہ اپنی بیوی کو ایک غیر مرد کے ساتھ گلے ملتے دیکھ رہی تھیں۔ مگر سچ اور حقیقت کیا تھی یہ وہ نہیں جانتا تھا۔ رافعیہ اور غلامو کے دل میں کوئی چور نہ تھا۔ مگر بے چارہ معصوم غلامو اسے دیکھ کر ایک دم پرے...... ہوگیا اور خوف زدہ نظروں سے آغل خان کی طرف دیکھنے لگا، خود رافعیہ بھی پریشان ہوگئی تھی۔ کیونکہ اسے اپنے

تخت زرنگار

یہ فرعون توتخ آمون کا تخت خاص ہے جو سونے کا بنا ہوا ہے۔ اس کی پشت پر ایک ماہر جوہری اور کامل نقاش کی کاریگری سے توتخ آمون کو تخت نشین دکھایا گیا ہے۔ نوجوان بادشاہ کے سامنے اس کی ملکہ کھڑی ہے جس نے بائیں ہاتھ میں ایک منقش مرتبان اٹھایا ہوا ہے اور دایاں ہاتھ نزاکت سے سرتاج کے کندھے پر رکھا ہوا ہے۔ سورج دیوتا کی شعاعیں ان پر روشنی ڈال رہی ہیں گویا ان دونوں پر نعمتوں کی بارش کر رہی ہیں۔ تخت کے چاروں طرف ہیرے وجواہر، نیلم، زمرد، پکھراج جڑے ہوئے ہیں اسے دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے ہم زندہ اس فرعون کے دربار میں کھڑے ہیں۔ ابھی بگل بجے گا اور نقارے خون وقوت وزندگی“ کے الفاظ پکاریں گے۔ اس کے ساتھ ہی سر پر دہرا تاج سجاتے جوبیس سالہ بادشاہ نمودار ہوگا۔

مرسلہ: احسان سحر، میانوالی

www.pdfbooksfree.pk

شوہر کے تیور خراب نظر آ رہے تھے۔ آغل کے بغل میں ہولسٹر جھول رہا تھا۔ اندر بھرا ہوا پستول موجود تھا۔ کمرے کی فضا یکلخت ہی سرد ہوگئی تھی۔ پھر اس میں آغل خان کی سنسناتی آواز ابھری۔

"مجھے پہلے ہی تم دونوں پر شک تھا۔ واہ...... رافعیہ بی بی تم نے اپنی بوریت دور کرنے کا خوب سامان کر رکھا تھا ایک حقیر ملازم کے ساتھ۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم آغل ! ہوش کے ناخن لو۔" رافعیہ یک دم مسہری سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تمہیں شرم آنی چاہیے اپنی بیوی پر ایسا گندا الزام لگاتے ہوئے، غلامو تو بھائی جیسا ہے۔"

"خوب!" وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ "بھائی کی آڑ میں ہی ایسے گل کھلاتی ہیں تمہارے جیسی عورتیں۔ تم دونوں اب کاروکاری ہو، بدکار ہو۔ تم دونوں کو اب ایک ساتھ ہی مرنا ہوگا۔"

یہ کہتے ہی اس کا ایک ہاتھ اپنے بغلی ہولسٹر کی طرف بڑھا اثنائے راہ غلامو شاید اس کا خطرناک ارادہ بھانپ کر آگے لپکا جانے اس میں اتنی ہمت کیسے آگئی تھی کہ قبل اس کے کہ آغل اپنا پستول ان پر سیدھا کرتا، غلامو بڑی زور سے اس کے ساتھ ٹکرایا۔ آغل خان کو شاید اپنے اس حقیر غلام سے اتنی جرأت کی توقع نہ تھی۔ نتیجتاً وہ چند قدم پیچھے کی جانب لڑکھڑایا اور توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے سیدھا فرش پر آگرا اس وقت غلامو نے رافعیہ کا ہاتھ تھام لیا اور چلا کر خوف زدہ لہجے میں بولا۔

"ادی جیجل ! فوراً یہاں سے بھاگ چلو ورنہ خیر نہیں۔"

رافعیہ بھی اس وقت تک صورتِ حال کی سنگینی کو بھانپ چکی تھی۔ فوراً ہی غلامو کے ساتھ کمرے سے باہر دوڑ پڑی پھر وہ دونوں وہاں رکے نہیں، غلامو نے کمرے سے نکلتے وقت ایک عقل مندی کی تھی، اس کا دروازہ بند کر کے آغل خان کو کچھ وقت کے لیے وہاں محدود کر دیا تھا۔ حویلی کے ملازمین کی نظروں سے بچتے ہوئے وہ باہر نکلے اور اندھا دھند دوڑتے ہوئے بالآخر شہر جانے والی سڑک پر آ کے ہی دم لیا۔ وہاں سے وہ حیدرآباد شہر جانے والی ایک مسافر لاری میں سوار ہوگئے پھر سیدھا بوا کے گھر آ کر ہی ان دونوں نے دم لیا۔

بوا ان کی ہیئت کذائی دیکھ کر پریشان ہوگئیں۔ رافعیہ نے انہیں ساری رام کتھا سنا ڈالی تو وہ بھی بری طرح دہل گئیں اور ہراساں لہجے میں بولیں۔

"بیٹی! یہ تو بہت برا ہوگیا، بہت برا ہوگیا۔"

"نہیں بوا! جو ہوا صحیح ہوا۔" رافعیہ اب خود کو قدرے سنبھال چکی تھی۔ "اچھا ہوا بوا کہ آغل خان کے چہرے سے معصومیت کا نقاب اتر گیا۔" مگر بوا کی پریشانی پھر بھی کم نہیں ہوئی، ادھر غلامو بھی مسلسل اضطراب کا شکار تھا۔ وہ معصوم اب خوف میں جکڑا ہوا تھا۔ جبکہ رافعیہ سمجھ رہی تھی کہ اب وہ شہر آ کر زیادہ محفوظ ہوگئی تھی۔

"بیٹی! میں نے کہا تھا نا کہ رئیس زادے لوگ اور ہی دماغ کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ کم بخت آغل خان تمہارا یہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ میں ایسوں کی جاہلانہ اور خونی فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں۔" بوا نے تفکرانہ لہجے میں رافعیہ سے کہا۔

غلامو بھی ان کی بات کی تائید کرتے ہوئے متفکرانہ انداز میں بولا۔ "ہاں، ادی جیجل ! چھوٹے سائیں ہمیں کبھی معاف نہیں کریں گے۔" اب پہلی بار رافعیہ کو انجانے اور خوفناک اندیشوں نے جکڑ لیا۔

"میرا خیال ہے ہمیں پولیس کی مدد لینی چاہیے۔" رافعیہ نے قدرے توقف کے بعد تجویز پیش کی تب بوا نے بھی چند ثانیوں کی پرسوچ خاموشی کے بعد اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"یہی بہتر رہے گا۔ لیکن اس سے پہلے ہمیں بھائی امتیاز احمد سے ملنا پڑے گا۔"

امتیاز احمد کے نام پر رافعیہ چونک سی گئی۔ بات ہی ایسی تھی کیونکہ امتیاز صاحب توفیق کے والد تھے۔ رافعیہ کو کچھ سوچ کر شرمندگی کا احساس ہوا مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا کیونکہ غلامو کی زندگی کا بھی سوال تھا ناچار یہ سب امتیاز صاحب کے گھر گئے۔ وہ بہت ہمدرد انسان تھے۔ رافعیہ کی ساری کہانی سنتے ہی فوراً متعلقہ تھانے ان سب کو لے کر پہنچ گئے۔

انسپکٹر، رافعیہ کی روداد سن کر گہری تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ غالباً اسے بھی حالات کی سنگینی کا ادراک تھا۔ تاہم اس نے ان کی ہر ممکن مدد کرنے کا وعدہ ضرور کر لیا۔

اس دوران رافعیہ نے عدالت میں خلع کی درخواست دائر کر دی۔

ادھر آغل خان نے عدالتی نوٹس ملنے پر بہت کوشش کی کہ یہ معاملہ ان کے روایتی طریقے یعنی راجواڑیں (جرگے) میں حل ہو مگر رافعیہ نے پہلے ہی عدالت میں سختی سے اس بات سے انکار کر ڈالا تھا۔ یوں بھی جرگے پر پابندی

کا قانون چند ماہ پہلے ہی نافذ کیا جا چکا تھا لہٰذا عدالت نے چند پیشیوں میں ہی فیصلہ رافعیہ کے حق میں دے دیا اور اسے خلع مل گئی، رافعیہ بہت خوش تھی بوا نے بھی گویا سکھ کا سانس لیا تھا کہ آغل خان جیسے سفاک اور پڑھے لکھے جاہل آدمی سے جان چھوٹ گئی تھی۔ البتہ غلامو نجانے کیوں چپ چپ سا رہنے لگا تھا۔ اس نے کسی خوشی کا کوئی اظہار نہ کیا تھا۔

☆☆☆

ایک روز رافعیہ کا توفیق سے سامنا ہوا۔ ندامت کے باعث رافعیہ کو اس سے نظریں ملانے تک کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ یہ وہی توفیق تھا جسے وہ ہر وقت نہایت بے رحمی سے تضحیک کا نشانہ بنائے رکھتی تھی اور اب وہ خود تصویرِ ذلت بنی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ گویا توفیق سے بہ زبانِ خاموشی کہہ رہی ہو کہ اب تمہاری باری ہے۔

مگر اس نے صرف اتنا کہا۔

"رافعیہ ! یہ سارے تقدیر کے الٹ پھیر ہیں یقین جانو مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔ اللہ جانتا ہے میں نے تمہاری خوشیوں کے لیے دعائیں مانگی تھیں۔ ہم کسی پر اپنی سوچ مسلط تو نہیں کر سکتے۔ تمہیں شاہانہ زندگی پسند تھی مگر میرے پاس یہ سب نہ تھا۔ اب یہ ضروری تو نہیں تھا کہ تمہیں میری بات سمجھ آجاتی یا پھر...... خیر چھوڑو۔" وہ چپ ہوگیا۔

رافعیہ کو یوں لگا جیسے وہ گھڑوں آبِ ندامت میں نہا گئی ہو۔ پھر شکستہ سی آواز میں بولی۔ "توفیق ! میں تو شاید تم سے اب معافی مانگنے کے قابل بھی نہیں رہی ہوں۔" یہ کہنے کے ساتھ ہی اس کی آواز بھرا گئی، آنکھیں بھر آئیں۔ تب توفیق چند قدم آگے بڑھا اور رافعیہ کا احساسِ ندامت کے مارے جھکا سر ٹھوڑی سے تھام کر بولا۔ "تم کس قابل ہو یہ تو میرا دل ہی جانتا ہے۔"

"میں...میں اب تمہارے قابل نہیں رہی توفیق۔" وہ رو دی۔

"میں تم سے صرف یہ سننا چاہتا ہوں کہ کیا میں اب تمہارے قابل ہوں یا نہیں۔" توفیق نے اس کی طرف دیکھ کر گہری متانت سے کہا اور رافعیہ نے اپنے دونوں ہاتھوں کا پیالہ اپنے چہرے پہ رکھ لیا اور سسک سسک کر رو پڑی۔ توفیق نے اسے دھیرے سے خود سے لگا لیا۔ رافعیہ نے کوئی مزاحمت نہ کی تھی۔

☆☆☆

تقدیر کا الٹ پھیر اسی کو تو کہتے ہیں، منزل تک پہنچنے یا پہنچانے والے راستے ضروری نہیں کہ سیدھے سبھاؤ ہوں۔ وہ ٹیڑھے میڑھے بھی ہوتے ہیں اور انسان ہر موڑ کو اپنی منزل سمجھنے کے مغالطے میں مبتلا رہتا ہے۔ رافعیہ نے بھی آغل خان کو اپنی منزل سمجھا تھا مگر وہ تو محض ٹیڑھے سے راستے کا ایک تنگ موڑ ثابت ہوا تھا۔ منزل تو اسے اب ملی تھی جب توفیق سے شادی کر کے ہی اس نے اپنی اصل منزل پا لی تھی۔

وہ شام کا وقت تھا۔ اس روز رافعیہ اور توفیق بوا سے ملنے گھر آئے۔ غلامو اب بوا کے پاس ہی رہنے لگا تھا۔ یہ سب لوگ صحن میں ہی بیٹھے تھے اور بہت خوش تھے کہ اچانک گھر کا دروازہ ایک دھماکے سے کھلا۔ سب بری طرح چونک پڑے۔ دروازے پر چند ڈھاٹا پوش افراد کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پستولیں تھیں۔ ان میں سے ایک نے اپنی پستول کا رخ رافعیہ کی طرف کر لیا، جب تک یہ کچھ سمجھتے اچانک غلامو نے مذکورہ پستول بدست ڈھاٹا پوش پر چھلانگ لگا دی۔ مگر اس اثنا میں وہ ڈھاٹا پوش پستول کا ٹرائیگر دبا چکا تھا۔ صحن کی محدود فضا میں زوردار دھماکا ہوا۔ گولی رافعیہ کو لگنے کے بجائے غلامو کے جا لگی مگر اس سے ٹکرا کر گرتے گرتے بھی غلامو نے قاتل ڈھاٹا پوش کو اپنے ساتھ ہی رگید ڈالا تھا۔ پھر نہ جانے کس طرح اس نے زخمی ہونے کے باوجود اس ڈھاٹا پوش کا پستول چھین کر اسے گولی ماری اور پھر دوسرا اس کی گولی کا نشانہ بن کر گرا اس پر فائر کرنے کو پر تول رہا تھا۔ گلی میں شور مچ گیا۔ باقی دو ڈھاٹا پوش اپنے دونوں ساتھیوں کا انجام دیکھ کر بدحواس ہو کے بھاگ کھڑے ہوئے۔ سب زمین پر پڑے آخری سانسیں لیتے غلامو کی طرف متوجہ ہوئے۔

"غلامو ! میرے بھائی یہ...... یہ تو نے کیا کر دیا؟" رافعیہ اسے خون میں غلطاں پا کر چیخ اٹھی۔

وہ ٹوٹی ہوئی سانسوں کے درمیان بہ مشکل بولا۔ "آ...... ادی...... جِ...... جیجل...... سس...... سدا سکھی رہو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ رافعیہ کے سر تک لانا چاہا مگر دوسرے ہی لمحے وہ ہاتھ نیچے گر گیا۔ اور غلاموں کی گردن بھی ایک طرف کو ڈھلک گئی، وہ اپنی بہن پر قربان ہو کے ثابت کر چکا تھا کہ بھائی بہن کے رشتے صرف خون کے ہی نہیں ہوتے۔

رافعیہ کے حلق سے شدتِ غم کے مارے بڑی کرب ناک چیخ برآمد ہوئی تھی۔ جس قاتل ڈھاٹا پوش کی گولی کا غلامو نشانہ بنا تھا، بعد میں اس کے چہرے سے ڈھاٹا ہٹایا گیا تو وہ چہرہ آغل خان کا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

محفلِ شعر و سخن

❁ یاسر علی راجپوت.....تحصیل گوجرہ، نواں لاہور
اگر ڈھونڈے یہ دنیا ثانیے محمد ﷺ ثانی تو بڑی چیز ہے سایہ نہ ملے گا

❁ محمد نوید خان.....حیدر آباد
ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے
قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

❁ طارق کلیر اایڈ کرم علی چوہان.....نور پور تھل
تجھ سے لفظوں کا نہیں روح کا رشتہ ہے میرا
تو سانسوں میں تحلیل ہے خوشبو کی طرح

❁ سعید عباسی.....نامعلوم مقام
ہمیں بھی دکھ تو بہت ہے مگر یہ جھوٹ نہیں
بھلا نہ دیتے اسے ہم تو مر گئے ہوتے

❁ بابر عباس.....گلیانہ روڈ، کھاریاں
یاد ہے جب باتوں باتوں میں گزر جاتی تھی رات
اس قدر اک دوسرے میں محو ہو جاتے تھے ہم
وقت کی پابندیاں، جذبات میں حائل نہ تھیں
کیا خبر تھی کس طرح کس وقت سو جاتے تھے ہم

❁ محمد بوٹا سیٹھی.....رتی ٹبی، صفدر آباد
پیار کر کے مول لے لی عمر بھر کی بے بسی
دل نہ پھر قابو میں آیا آپ پر آنے کے بعد

❁ رمضان پاشا.....گلشن اقبال، کراچی
شبنمی لہجہ ہے آہستہ غزل پڑھنا
تتلی کی کہانی ہے پھولوں کی زبانی ہے

❁ تفسیر عباس بابر.....اوکاڑہ
پوچھو یزید سے کہ تیرا راج کہاں ہے
وہ خون سے آلودہ تیرا تاج کہاں ہے
زندہ ہیں حسینؑ ابن علیؑ زندہ رہیں گے
لعنت کے سوا ذکر تیرا آج کہاں ہے

❁ حسنین عباس، کمیل عباس.....گلیانہ روڈ، کھاریاں
بھولتا ہوں لاکھ لیکن یاد آتی ہے مجھے!
ہوگئی تھی نوجوانی میں مجھ سے ایک بھول!

❁ صوبیہ تفسیر بابر.....اوکاڑہ
حسینؑ کٹاتا ہے سر کرب وبلا!
عشق جب دین کو پیغام بقا دیتا ہے
عشق رقم جو کرتا ہے کبھی ابوابِ وفا!
تو نہرِ فرات پہ بازو بھی کٹا دیتا ہے

❁ محمد قدرت اللہ نیازی.....حکیم ٹاؤن، خانیوال
پھر کسی پیار کے صحرا میں مجھے نیند آجائے
اور پھر میں خواب میں مانگوں تجھے پانی کی طرح

❁ عون عباس بابر.....اوکاڑہ
محبت منفرد میری، تمنا چار سو تیری
مگر تم ہو بھی اس کے، بھی اس کے سوائے میرے

❁ رانا محمد عامر شاد.....میاں چنوں
بھی اک خواب کا جاگا ہوا منظر ہی نہ ہو
تیرے ہاتھوں میں میرا ہاتھ کہاں ممکن ہے

❁ محمد جاوید راؤ.....بہاولنگر
نہ عشق باادب رہا، نہ حسن باحیا رہا
ہوس کی دھوم دھام ہے نگر نگر گلی گلی

❁ احمد خان توحیدی.....پاکستان اسٹیل، کراچی
قریب تر ہے جو فکر وخیال میں میرے
وہی ہے دور بہت دور آسماں کی طرح

❁ سعدیہ بخاری.....چاہ ماڑی لنک روڈ، اٹک
چند لمحوں کی رفاقت غنیمت ہے کہ پھر
چند لمحوں میں شیرازہ بکھر جائے گا
اپنی یادوں کو سمیٹ لے بچھڑنے والے
کسے معلوم پھر کون کدھر جائے گا

❁ غلام رسول خان.....لاہور
تمام پیڑ جلا کر اپنے ہاتھوں سے
عجیب شخص ہے سائے تلاش کرتا ہے

❁ ڈاکٹر ایچ اے لطیف.....فقیر والی
حسرتوں اور خوابوں کا کارواں ہے زندگی
کون کہتا ہے فقط راز نہاں ہے زندگی

❁ ساجدہ راجا.....ساہیوال، ضلع سرگودھا
دوستوں کے ہجوم میں ناصر
میرے اندر کا شخص تنہا ہے

❁ آغا محمد زبیر.....پشاور
یاد آتے ہیں آج اپنے گناہ کیا کیا
پہلا یہ کہ محبت کرلی آخر یہ کہ ان سے کرلی

❁ محمد امجد ریاض.....ضلع ساہیوال
صاحب عقل ہو اک مشورہ مخلصانہ چاہیے
زندگی سے تنگ ہوں خودکشی کروں یا عشق؟

❁ مقبول عاشق.....ضلع خوشاب
وہ مجھے بھولنے کی فکر میں ہے
یہ میری فتح ہے شکست نہیں

❁ مولا بخش.....بہاولپور
ضبطِ گریہ نے مجھے تھام تو رکھا ہے مگر
مجھ سے تاوان میں آنکھوں کی جلن مانگتا ہے

❁ یاسمین.....بہاولنگر
دنیا سے جارہا ہوں چھپا کر کفن میں منہ
افسوس بعد مرنے کے آئی حیا مجھے

❁ محمد اشفاق سیال.....شورکوٹ سٹی
آسمانوں میں وہ مصروف بہت ہے یا پھر
بانجھ ہونے لگے الفاظ مناجاتوں کے!

❁ افسر خان.....پشاور
چلو یہ اشک ہی موتی سمجھ کے بیچ آئیں
کسی طرح تو ہمیں روزگار کرنا ہے

❁ ریاض بٹ.....حسن ابدال
دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اس ادا میں رضامند کر گئی

❁ محمد جاوید بلوچ.....تحصیل علی پور
خراش ڈال نہ جائے گلوں کے چہروں پر
ہوا کے ہاتھ میں نشتر دکھائی دیتا ہے

❁ بشیر احمد بھٹی.....فوجی بستی، بہاول پور
ایک پتھر ادھر آیا تو اس سوچ میں ہوں
میری اس شہر میں کس کس سے شناسائی ہے

❁ عدنان یوسف.....بنوں
قضا ہوگئے ہم سے سجدے بھی سارے
اے عشق سچ بتا کہیں تو کافر تو نہیں

❁ ادریس احمد خان.....ناظم آباد، کراچی
یہ سوچ کر کوئی عہد وفا کرو ہم سے
ہم ایک وعدے پہ عمریں گزار دیتے ہیں

❁ طاہر الدین بیگ.....میر پور خاص
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

❁ اطہر علی.....کراچی
جب بھی گئے عذاب در و بام تھے وہی
آخر کو کتنی دیر سے گھر جانا چاہیے

❁ احسان سحر.....میانوالی
تو پھول ہے گلاب کا
میں عاشق ترے شباب کا
تیری تصویر مرے دل میں ہے
کیا فائدہ اس نقاب کا

www.pdfbooksfree.pk

❋ صفدر شاہ...... پاکستان اسٹیل مل
یہ بھی سچ ہے کہ محبت پہ نہیں میں مجبور
یہ بھی سچ ہے کہ ترا حسن کچھ ایسا بھی نہیں

❋ جنید احمد ملک...... گلستان جوہر، کراچی
خود اپنے سائے کے آگے کھڑا ہوں ہاتھ پھیلائے
طلب دنیا سے کیا کرتا، میں سائل ہوں فقط اپنا

❋ مدحت...... کراچی
پاس رہنا ہے تو پھر مجھ سے یہ دوری کیسی
دور رہنا ہے تو پھر دل میں سماتے کیوں ہو

❋ حنا...... کراچی
یہ مشاہدہ نہیں ہے مرے درد کی صدا ہے
مرے داغ دل لٹے ہیں تیری بزم جب سجی ہے

❋ محمد شاہ...... راولپنڈی
اسے چاہا، اسے پوجا، یہی توقیر ہے اپنی
ہمیں گمراہ مت سمجھو، عبادت کب بدلتی ہے

❋ زرمین خان...... پشاور
تم نے دو حرف تسلی کے کہے ہوتے تو
ہجر کی شام سے ہم لوگ نمٹ کر آتے

❋ نسیم احمد...... خانیوال
کسی کے نام سے رشتہ ہمارا قائم ہے
وہ ہے رقیب تو پھر بھی مجھے برا نہ لگے

❋ محمد بھٹی...... اسلام آباد
اپنے من میں ڈوب کر پاجا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا، نہ بن اپنا تو بن

❋ امتیاز احمد...... کراچی
مجھ میں کیا ہے کہ مجھے یاد کرے گا کوئی
اچھے اچھوں کو یہاں لوگ بھلا دیتے ہیں

❋ محمد کمال انور...... اورنگی ٹاؤن، کراچی
ذہن میں بت بھی تراشے تھے مگر آخر کار
سب سے منہ موڑ کے یارب تیرے گھر آیا ہوں

❋ عدنان صدیقی...... اسلام آباد
صبح ہوتے ہی نکل آتے ہیں بازار میں لوگ
گٹھڑیاں سر پہ اٹھائے ہوئے ایمانوں کی

❋ زوہیب احمد ملک...... گلستان جوہر، کراچی
مسافر تو بچھڑتے ہیں رفاقت کب بدلتی ہے
محبت زندہ رہتی ہے، محبت کب بدلتی ہے

❋ محمد اقبال...... کورنگی، کراچی
جیسے مہتاب کو بے انت سمندر چاہے
میں نے اس طور سے چاہا تجھے اکثر جاناں

❋ فرحان احمد...... پاک کالونی، کراچی
شب ہجراں کی فرصت میں ستارے بول اٹھتے ہیں
کسی سے دل لگانے کا عذاب اچھا کہ موت اچھی

❋ محمد ادریس...... کراچی
اپنی سزا طویل کیے جا رہے ہیں ہم
اب تک مفاہمت کا ارادہ نہیں کیا

❋ جبران احمد ملک...... کراچی
ہم ان کو سوچ میں گم دیکھ کر واپس پلٹ آئے
وہ اپنے دھیان میں بیٹھے ہوئے اچھے لگے ہم کو

❋ امیر بخش...... کوئٹہ
داستان ان کی اداؤں کی ہے رنگین لیکن
اس میں کچھ خون تمنا بھی ہے شامل میرا

❋ دلشاد احمد...... بفرزون، کراچی
ایسا نہ ہو یہ درد بنے درد لا دوا
ایسا نہ ہو کہ تم بھی مداوا نہ کرسکو

❋ محمد اظہر...... ملیر، کراچی
چھوڑا اسے تو اور بھی غم اس کا بڑھ گیا
مقروض ہو گیا ہوں میں قرضہ اتار کر

❋ محمد احسن...... سرگودھا
آنکھوں کی طرح تھک گئے پھیلے ہوئے بازو
وہ میرا پتا بھول گیا اب کے برس بھی

کوپن
برائے شمارہ
جنوری
2013

محفلِ شعروسخن

نام : --

پتا : --

گوشہ عافیت

اس پُرشور ماحول اور بھاگتی دوڑتی زندگی سے
چند پُرسکون لمحات کشید کرنے کے لیے انسان کو
کتنی تگ و دو کرنا پڑتی ہے، زیرِ نظر کہانی میں ان
مشکلات کی بھرپور عکاسی تو ہے مگر کہیں کہیں
اپنی کوتاہی بھی نظر آتی ہے جس کی وجہ سے
انسان خود اپنا سکون برباد کرتا دکھائی دیتا
ہے... بہرحال پھر بھی زندگی کہیں نہ کہیں
اسے گوشۂ عافیت فراہم کر ہی دیتی ہے۔

تنویر ریاض

کبوتر کے مانند آنکھ بند کر کے مشکلات سے فرار حاصل کرنے والوں کا قصہ

وہ اس گھر کا سب سے چھوٹا کمرا تھا جس میں اُس کی بیٹی کیٹی رہا کرتی تھی لیکن اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچتے ہی وہ سان فرانسسکو کے ایک اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گئی۔ وائٹ کو ہمیشہ سے یقین تھا کہ کیٹی کے جانے کے بعد وہ اسے اپنا خلوت خانہ بنا لے گا لیکن اس کی بیوی رتھ نے اسے یہ کمرا دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کا اصرار تھا کہ اس کمرے کو اسی حالت میں رہنے دیا جائے۔ ممکن ہے کہ اس احمق لڑکی یعنی کیٹی کو جلد یا بدیر اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اور وہ گھر واپس آجائے۔ جبکہ اس کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس سے پہلے ٹام بھی سن بلوغت کو پہنچتے ہی گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا اور کبھی واپس لوٹ کر نہیں آیا۔ وائٹ جانتا تھا کہ رتھ محض بہانہ بنا رہی ہے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ اسے یہ کمرا دینا ہی نہیں چاہتی تھی۔

”تمہیں الگ کمرے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا لونگ روم تمہارے لیے کافی نہیں ہے؟“

وائٹ نے اسے کئی بار سمجھانے کی کوشش کی کہ لونگ روم میں اسے وہ سکون اور تنہائی میسر نہیں جس کا وہ خواہاں ہے۔ لونگ روم اس کا نہیں بلکہ رتھ کا ہے بلکہ وہ اس گھر کے ہر حصے پر قابض تھی۔ ماسٹر بیڈروم، کچن، گیسٹ روم، سیونگ روم (جہاں وہ بیٹھ کر کبھی کبھار سلائی کیا کرتی تھی) روز گارڈن، لان، سب کچھ رتھ کا ہی تھا۔ وائٹ کی حیثیت محض ایک کرایہ دار کی سی تھی جو اپنی پنشن اور سوشل سیکیورٹی

www.pdfbooksfree.pk

کی آمدنی سے تمام بل ادا کیا کرتا تھا۔

اس کے لیے وہ کسی دوسرے کو موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتا تھا بلکہ سارا قصور خود اس کا اپنا ہی تھا۔ اس نے شروع دن سے ہی رتھ کو گھر، بچوں اور خود پر کنٹرول کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ فطرتاً معتدل مزاج اور نرم خو واقع ہوا تھا۔ لڑنا جھگڑنا، بحث کرنا یا اپنی بات منوانا اس کے خمیر میں شامل نہیں تھا۔ اسی لیے رتھ اس پر حاوی ہوتی چلی گئی اور اپنی انہی خوبیوں یا خامیوں کی بدولت وائٹ بے اختیار ہوتا چلا گیا جبکہ رتھ اس کے بالکل برعکس تھی۔ مضبوط قوتِ ارادی کی مالک، بے رحم اور ہر ایک کو اپنے آگے جھکانے والی۔ اس سرد رویہ کی وجہ سے نہ صرف اس کے بچے دور ہو گئے بلکہ دوست بھی اس سے ملنے سے کتراتے تھے۔ وائٹ بھی بہت پہلے اس سے جان چھڑا لیتا اگر اس میں تھوڑی سی بھی ہمت ہوتی مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ باسٹھ سال کا تھا اور اس کی صحت بھی ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ اب اس کا پنشن اور سوشل سیکیورٹی سے ملنے والے چیک پر ہی گزارہ تھا۔ بچوں سے تو یہ توقع کرنا ہی بے کار تھا کہ وہ اسے جذباتی یا مالی طور پر سہارا دے سکیں۔ اس لیے وہ عمر کے آخری حصے میں رتھ کو برداشت کرنے پر مجبور تھا۔

رتھ سے اس کی شادی کو تینتیس برس ہو چکے تھے اور اب تو اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ اسے رتھ میں ایسی کیا کشش نظر آئی تھی کہ وہ اس سے شادی کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ اس کی شکل وصورت بھی ایسی نہیں تھی کہ وہ کسی مرد کو اپنی جانب متوجہ کر سکتی۔ اس کا جسم شروع سے ہی بے ڈول تھا۔ اسے بے تحاشا کھانے کی عادت تھی جس کی وجہ سے اس کے وزن میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا اور اب وہ چلتا پھرتا گوشت کا پہاڑ نظر آتی تھی۔ ممکن ہے کہ وائٹ اس کی بے پناہ خود اعتمادی سے متاثر ہو گیا ہو۔

شادی کے بعد پہلا سال بہت اچھا گزرا کیونکہ اس دوران فریقین کا اصل روپ پوری طرح کھل کر سامنے نہیں آتا۔ اگلے چار سال بھی وہ ایک دوسرے کو برداشت کرتے رہے پھر پہلی بیٹی لورا کی پیدائش کے بعد سارا منظر نامہ بدل گیا اور زندگی اس کے لیے ایک ڈراؤنا خواب بن کر رہ گئی۔ گزشتہ پچیس برسوں سے اس کی زندگی سے سکون واطمینان رخصت ہو چکا تھا۔ کیٹی کی پیدائش ان کی منصوبہ بندی کا حصہ نہیں تھی جس پر رتھ بے حد چراغ پا ہوئی اور اس نے علیحدہ سونا شروع کر دیا۔ وائٹ اگر آوارہ مزاج ہوتا تو اپنی جنسی بھوک مٹانے کے لیے کسی اور راستے کا انتخاب کر سکتا تھا مگر یہاں بھی اس کی کم ہمتی آڑے آ گئی اور وہ اپنی تقدیر پر راضی ہو کر بیٹھ گیا۔

اب باسٹھ سال کی عمر میں اس کی ایک ہی خواہش تھی کہ اس کا اپنا ایک کمرا ہو جہاں وہ سکون سے بیٹھ کر اپنی پسندیدہ کتابوں کا مطالعہ کر سکے۔ موسیقی سنے اور ٹیلی وژن پر اپنی دلچسپی کے پروگرام دیکھ سکے۔ رتھ کو سوپ اوپیرا، مزاحیہ پروگراموں اور کرائم شوز سے دلچسپی تھی۔ جنہیں وہ اپنے چالیس انچ کے فلیٹ اسکرین ٹی وی پر دیکھا کرتی تھی۔ حسبِ عادت اس نے یہ ٹیلی وژن سیٹ خریدتے وقت بھی وائٹ کو بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ جب بھی وہ ڈسکوری چینل یا پرانی بلیک اینڈ وائٹ فلمیں دیکھنے کی کوشش کرتا تو وہ فوراً ہی چینل تبدیل کر دیتی۔

ان تمام باتوں کے پیشِ نظر وہ شدت سے ایک کمرے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ اسی لیے جب اس سے برداشت نہ ہو سکا تو اس نے ایک روز رتھ کے سامنے اپنا مطالبہ پھر دُہرایا۔

"میں نے زندگی میں تم سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ پلیز انکار مت کرو۔"

"تمہیں الگ کمرے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" وہ سفاکی سے بولی۔

"میں اپنی ضرورت کو زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔"

"تاکہ تم اس کمرے میں چھپ کر بیٹھ جاؤ اور میں تمہیں نہ دیکھ سکوں۔"

"نہیں۔" اس نے زبان سے کہا لیکن دل میں سوچا کہ یہی سچ ہے۔ "اس میں ہم دونوں کا ہی فائدہ ہے۔ تم اپنے پسندیدہ پروگرام دیکھنا چاہتی ہو جبکہ میں مختلف پروگرام دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے علاوہ میری خواہش ہے کہ پرسکون ماحول میں اپنی پسندیدہ کتابوں کا مطالعہ کروں۔"

"کیا میں تمہیں پڑھنے سے روکتی ہوں؟"

"نہیں لیکن میں ٹی وی کی آواز سے ڈسٹرب ہوتا ہوں۔"

"گویا تم سمجھتے ہو کہ میں تمہیں پریشان کرنے کے لیے ٹی وی کی آواز اونچی رکھتی ہوں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ تم جانتے ہو کہ اب میری قوتِ سماعت پہلے سے کمزور ہوتی ہے۔ تمہیں اتنا بے پروا تو نہیں ہونا چاہیے۔"

اس عورت کے سامنے وائٹ کی ہر دلیل بے کار تھی۔ وہ اپنے آپ کو حق بجانب اور وائٹ کی خواہش کو فضول سمجھ رہی تھی۔ اس کے باوجود وائٹ نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی بات پر اصرار کرتا رہا۔

"تمہارے پاس تو لورا کا کمرا بھی ہے جہاں تم بیٹھ کر سلائی کرتی ہو۔ اگر میں اپنے لیے ایک علیحدہ کمرا مانگ رہا ہوں تو اس میں کیا قباحت ہے؟"

"میں تمہیں کیٹی کے کمرے کو کسی مرد کے غار میں تبدیل کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔"

"کیا..... کیا کہا تم نے؟" وہ اس نئی اصطلاح پر چونک گیا۔

"تم نے سنا نہیں۔ مرد کا غار، آج کل اس کے لیے یہی لفظ استعمال ہو رہا ہے۔"

"مجھے صرف ایک خلوت خانہ چاہیے جہاں مجھے ڈسٹرب کرنے والا کوئی نہ ہو۔ تم نہ جانے اسے کیا رنگ دے رہی ہو۔"

"دونوں کا ایک ہی مفہوم ہے۔ ایسا کمرا جسے مرد اندر سے بند کر کے بیٹھ جائیں اور اپنے آپ کو بیویوں اور ذمے داریوں سے دور کر لیں۔ اس کے علاوہ تمہاری یہ بھی خواہش ہوگی کہ بند کمرے میں بیٹھ کر کمپیوٹر پر عورتوں کی عریاں تصاویر دیکھ سکو۔"

"مجھے کمپیوٹر نہیں چاہیے اور نہ ہی میں اس طرح کی تصویریں دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے تو صرف ایک آرام دہ کرسی، ایک چھوٹا ٹی وی اور ایک سی ڈی پلیئر....."

"ہم یہ فضول خرچی برداشت نہیں کر سکتے۔"

"میں یہ سب چیزیں گھر کی فالتو اشیا فروخت کر کے رعایتی سیل سے خریدوں گا۔"

"ہمارے گھر میں ایسی کوئی فالتو چیز نہیں جسے بیچ کر تم رقم حاصل کر سکو۔"

"رتھ پلیز، مان جاؤ۔"

"نہیں۔" اس نے قطعی لہجے میں کہا۔

اگلے روز رتھ نے کیٹی کے کمرے کی صفائی کی۔ کھڑکیوں کے پردے برابر کیے جہاں سے عقبی صحن صاف نظر آتا تھا اس کے بعد اس نے مطمئن ہو کر کمرے کا جائزہ لیا پھر دروازے کو تالا لگا کر چابی اپنی جیب میں رکھ لی اور دل ہی دل میں بولی۔ "اب ٹھیک ہے۔"

یہ اس کی سوچ تھی جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ رتھ سوچ رہی تھی کہ اس نے کمرے کو تالا لگا کر اسے وائٹ کی دسترس سے دور کر دیا ہے جبکہ وائٹ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا کیونکہ اس نے آج تک رتھ کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کیا تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اگر اس نے ایسا کیا تو اس کا انجام کیا ہوگا لیکن اس بار وہ ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر یہ کمرا حاصل کرنے کے لیے پرعزم تھا۔ اگر وہ اس کی اجازت نہیں دیتی تو اس کے بغیر ہی وہ اس کمرے پر قبضہ کر لے گا چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی ہو اور اگر ایک بار وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو گیا تو بعد میں رتھ کے شور شرابے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

اسے اپنا منصوبہ تیار کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اب اسے ایک ایسی مہم سر کرنا تھی جس میں خطرے کا امکان بہرحال موجود تھا۔

رتھ گھر کا سامان خود ہی لے کر آتی تھی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وائٹ خریداری میں بہت دیر لگاتا ہے اور عام طور پر غیر ضروری خوراک اور دوائیں بھی خرید لاتا ہے۔ اس بار جب وہ گھر کا سودا لینے گئی تو وائٹ نے کیٹی کو فون کر کے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ کیٹی کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ اس نے وائٹ کی حوصلہ افزائی کی۔ کیٹی اپنی ماں سے بہت مختلف تھی اور اسے احساس تھا کہ اس کے باپ کو واقعی ایک الگ کمرے کی شدید ضرورت ہے۔ ویسے بھی اس کا گھر واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس لیے اس نے باپ کو اپنا کمرا استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔

وائٹ کے لیے اگلا مرحلہ کیٹی کے کمرے کی چابی تلاش کرنے کا تھا جس میں اسے کوئی مشکل پیش نہیں آئی کیونکہ رتھ نے اس چابی کو چھپانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ اس کی سلائی مشین کی میز والی دراز میں رکھی ہوئی تھی۔ وائٹ نے فی الوقت اسے وہیں چھوڑ دیا اور مناسب وقت کا انتظار کرنے لگا۔

رتھ ہر ہفتے کی صبح کو اپنی بیوہ بہن ایلن سے ملنے بے پورٹ جاتی اور اس کی واپسی عموماً شام پانچ بجے تک ہوتی۔ وائٹ نے پہلے سے ہی ایک قفل ساز سے بات کر رکھی تھی۔ اس نے چابی کی مدد سے کیٹی کے کمرے کا دروازہ کھولا اور چابی کو واپس اپنی جگہ پر رکھ دیا۔ اس کے بعد قفل ساز کو بلا کر ہدایت کی کہ وہ بالکل ویسا ہی نیا قفل دروازے میں لگا دے۔ یہ کام مکمل ہو جانے کے بعد اس نے نئے تالے کی چابی اپنی جیب میں لگالی۔ اس کمرے کی صفائی مہینے میں ایک بار ہوا کرتی تھی اور وائٹ کو یقین تھا کہ رتھ چار ہفتے بعد ہی اس کمرے کا رخ کرے گی۔

اگلے چند ہفتوں کے دوران جب بھی رتھ گھر سے باہر گئی۔ وہ اس کمرے میں جا کر اپنا کام شروع کر دیتا۔ سب سے پہلے اس نے کیٹی کی چھوڑی ہوئی اشیا کو ڈبوں میں بند کر کے گیرج میں منتقل کیا۔ کیونکہ کمرے کی کھڑکی پر بھاری

www.pdfbooksfree.pk

پردہ پڑا ہوا تھا اس لیے اس بات کا کوئی امکان نہ تھا کہ رتھ روز گارڈن میں چہل قدمی کے دوران کمرے کے اندر کا منظر دیکھ پاتی۔

سات دن گزرنے کے بعد وائٹ نے اپنے ایک پرانے دوست چارلی کی خدمات حاصل کیں اور دونوں نے مل کر کمرے کا بقیہ سامان جس میں بستر، نائٹ اسٹینڈ، الماری اور لکھنے کی میز شامل تھی ایک خیراتی ادارے کو عطیہ کر دیا۔ اب وہ کمرا مکمل طور پر خالی ہو چکا تھا۔ اس کے بعد چارلی کے ساتھ مل کر گیراج میں رکھے ہوئے نصف درجن باکس کمرے میں منتقل کیے جن میں اس کی کتابیں اور میگزین وغیرہ رکھے تھے اور جنہیں رتھ نے کاٹھ کباڑ قرار دے کر گیراج میں رکھوا دیا تھا۔ چارلی کو بجلی کے کام سے بھی واقفیت تھی چنانچہ اس نے ٹی وی سیٹ کے لیے کیبل کا بھی بندوبست کر دیا۔

اگلے ہفتے وائٹ نے سستی اشیا کے اسٹور سے ایک چھوٹا ٹی وی سیٹ اور سی ڈی پلیئر خریدا اور رتھ کے گھر واپس آنے سے پہلے یہ چیزیں کمرے میں رکھ کر اسے مقفل کر دیا۔ اب تک اس کا منصوبہ بے حد کامیاب جا رہا تھا اور رتھ کے فرشتوں کو بھی علم نہ ہو سکا کہ اس کی غیر موجودگی میں وائٹ کیا کچھ کرتا پھر رہا ہے۔ وائٹ کے پاس اپنی کارروائی کے لیے صرف ہفتہ کا دن ہی ہوتا تھا جب رتھ اپنی بیوہ بہن سے ملنے کے لیے جاتی تھی۔ چنانچہ اگلے دو ہفتوں میں اس نے چارلی کی مدد سے ایک کرسی، دو درمیانہ سائز کے کتابوں کے شیلف اور ایک چھوٹا سا قالین خریدا۔ یہ تینوں چیزیں دیکھنے میں قیمتی لگتی تھیں لیکن سستی چیزوں کے اسٹور پر بہت کم داموں میں مل گئیں۔

جب تمام چیزوں کا انتظام ہو گیا تو اس نے اطمینان سے بیٹھ کر اس کمرے کا جائزہ لیا۔ بہ ظاہر اسے کوئی کمی نظر نہیں آئی۔ اس کی ضرورت کا سارا سامان موجود تھا اور اگر کوئی کمی رہ گئی تھی تو اسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی کیونکہ یہ اس کا اپنا کمرا تھا جسے وہ اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکتا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب رتھ سے چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ اس کمرے کو جلد از جلد اپنے استعمال میں لانا چاہتا تھا اور رتھ کے علم میں لائے بغیر ایسا ممکن نہیں تھا۔ وہ اسے دکھانا چاہتا تھا کہ اس نے کتنی سادگی اور کفایت شعاری سے کام لیتے ہوئے اس کمرے کو اپنے استعمال کے قابل بنایا ہے پھر شاید وہ زیادہ ہنگامہ نہ کرے لیکن یہ محض اس کا خیال تھا۔

جونہی رتھ نے اس کمرے میں قدم رکھا۔ اس کے حلق سے ایک چیخ برآمد ہوئی اور اس کا بھاری بھرکم جسم لمحہ بھر کے لیے ساکت ہو گیا پھر وہ اپنی جگہ سے گھومی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کمرے کا جائزہ لیتی رہی پھر غراتے ہوئے بولی۔

''مکار، فریبی! تمہیں یہ سب کرنے کی جرأت کیسے ہوئی؟''

''رتھ، پلیز! زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' وہ گڑگڑاتے ہوئے بولا۔

''میں پریشان نہیں ہوں بلکہ مجھے غصہ آ رہا ہے۔ تم نے میری غیر موجودگی میں کیٹی کے کمرے کو مرد کے غار میں تبدیل کر دیا جبکہ میں نے تمہیں منع کیا تھا۔''

''میں تمہاری غیر موجودگی میں کبھی یہ کام نہ کرتا اگر تم سمجھ لیتیں کہ میرے لیے اپنے کمرے کی کیا اہمیت ہے کیا تم نہیں سمجھتیں کہ اب یہ کمرا پہلے سے بہتر حالت میں نظر آ رہا ہے۔''

''مجھے تو بہت ہی برا لگ رہا ہے۔ یہ فضول سا قالین کہاں سے اٹھا لائے۔ میرا خیال ہے کہ تم نے اس کی اچھی خاصی قیمت ادا کی ہوگی۔''

''نہیں۔ یہ خاصا سستا مل گیا۔''

''اور تم نے کیٹی کی چیزوں کا کیا، کیا؟''

''فرنیچر کے علاوہ تمام چیزیں گیراج میں رکھوا دی ہیں۔''

''اور شاید تم نے وہ فرنیچر کسی خیراتی ادارے کو دے دیا ہوگا۔''

''ہاں، وہ بہت پرانا اور بوسیدہ ہو گیا تھا۔ اسے رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔''

وہ ایک بار پھر غراتے ہوئے بولی۔ ''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ وائٹ پوٹر، جب کیٹی کو معلوم ہوگا تو وہ بہت ناراض ہوگی۔''

''وہ پہلے سے سب کچھ جانتی ہے۔ میں نے اس بارے میں اسے فون کر کے بتا دیا تھا اور اسے اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں۔ بلکہ اس نے میرے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا تھا۔''

''مجھے یقین نہیں آ رہا۔''

''یہ سچ ہے۔'' وائٹ نے کہا۔ ''اسے اپنی چھوڑی ہوئی چیزوں کی کوئی پروا نہیں ہے اور نہ ہی اس کا واپس آنے کا کوئی ارادہ ہے۔ یہ بات ہم دونوں ہی اچھی طرح جانتے ہیں۔''

''میں کچھ نہیں جانتی۔ بس اتنا معلوم ہے کہ تم نے مجھے شکست دینے اور میرے مقابلے پر آنے کی کوشش کی ہے۔ فوری طور پر اپنا یہ کاٹھ کباڑ یہاں سے ہٹاؤ اور کیٹی کا جو بھی سامان باقی رہ گیا ہے۔ وہ یہاں رکھوا دو۔''

www.pdfbooksfree.pk

عام طور پر ایسی صورت حال میں وائٹ کی جانب سے کوئی مزاحمت نہیں ہوتی تھی لیکن اس بار ایسا نہیں ہوا، وہ اس کمرے کے معاملے میں حد درجہ جذباتی تھا اس لیے مخالفت پر اتر آیا اور اس نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''نہیں۔''

''کیا، کیا کہا تم نے؟'' رتھ کو اس جواب کی توقع نہیں تھی۔

''میں نے کہا نہیں، یہ کمرا میرا ہے اور اب یہ اسی حالت میں رہے گا۔''

رتھ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وائٹ کا یہ روپ پہلی بار اس کے سامنے آیا تھا۔ وہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔ ''میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کرسکتی۔''

وائٹ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور دروازہ بند کر کے اپنے آپ کو کمرے میں بند کرلیا۔

اگلے چند دنوں کے دوران رتھ نے اس پر دباؤ ڈالنے کے لیے ہر حربہ استعمال کرلیا۔ دھمکیاں دیں، آنسو بہائے، اس کے لیے کھانا پکانے اور کپڑے دھونے سے انکار کردیا لیکن وائٹ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ اس دباؤ کا مقابلہ نہ کر پاتا لیکن کمرے کے معاملے میں اس نے جھکنے سے انکار کردیا۔ جب رتھ کی طویل تقریر اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوجاتی تو وہ اپنے آپ کو کمرے میں بند کرلیتا اور کانوں پر ہیڈ فون چڑھا کر اپنی پسندیدہ موسیقی سے لطف اندوز ہونے لگتا۔ رتھ دروازہ پیٹتی اور چیختی چلاتی رہتی اور جب تک اسے یہ اندازہ نہ ہوجاتا کہ رتھ کا غصہ آسمان کی حدود کو چھونے والا ہے، وہ دروازہ نہ کھولتا۔

جب وہ کمرے میں نہ ہوتا تو اس کو تالا لگا کر رکھتا جس کی چابی اس کی چین میں تھی۔ رات کو سوتے وقت وہ اس چین کو اپنے تکیہ کے نیچے رکھ دیتا۔ اسے ڈر تھا کہ سوتے میں کہیں رتھ چابی تلاش کرنے کی کوشش نہ کرے۔ رفتہ رفتہ رتھ نے اس معاملے پر خاموشی اختیار کرلی لیکن وہ بے وقوف نہیں تھا اور جانتا تھا کہ یہ عارضی جنگ بندی ہے۔

اس نے زیادہ سے زیادہ وقت اپنی خلوت گاہ میں گزارنا شروع کردیا۔ وہ زیادہ تر موسیقی سنتا یا اپنے پسندیدہ مصنفوں کی کتابیں پڑھتا رہتا۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ اسے دل کا دورہ نہیں پڑ گیا۔ وہ صبح کے وقت اپنے ناشتے کے لیے انڈا بنا رہا تھا کہ اسے سینے میں درد محسوس ہوا۔ پہلے تو رتھ یہی سمجھی کہ اسے گیس کی تکلیف ہے لیکن جب وائٹ کے چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے تو وہ اسے اسپتال لے گئی جہاں ڈاکٹروں نے تصدیق کردی کہ اسے دل کا دورہ پڑا تھا۔ اسے مزید ٹیسٹوں کے لیے تین دن اسپتال میں رہنا پڑا۔ ڈاکٹروں نے مکمل تشخیص کے بعد بتایا کہ یہ دورہ معمولی نوعیت کا تھا اور اسے اب اپنے معمولات زندگی میں تبدیلی لانا ہوگی۔

اسپتال میں قیام کے دوران رتھ اسے دیکھنے نہیں آئی۔ البتہ اس کا دوست چارلی باقاعدگی سے اس سے ملنے کے لیے آتا رہا۔ جس دن اسے اسپتال سے رخصت کیا جا رہا تھا۔ رتھ اسے ساتھ لے جانے کے لیے آگئی۔ وائٹ نے محسوس کیا کہ راستے بھر اس کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی جسے وہ سمجھ نہ سکا لیکن گھر پہنچتے ہی اس مسکراہٹ کا مفہوم سمجھ میں آگیا۔ جونہی اس نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تو اندر کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کی خلوت گاہ اجڑ چکی تھی اور خالی کمرا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

اس نے گھوم کر دیکھا۔ رتھ اس کے پیچھے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے کھڑی ہوئی تھی اور اس کے چہرے پر ایک اطمینان بھری مسکراہٹ نظر آرہی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ رتھ نے بھی اس کمرے کی چابی حاصل کرنے کے لیے وہی طریقہ اپنایا ہے جس پر وہ پہلے ہی عمل کر چکا تھا۔ یعنی اس کی غیر موجودگی میں چابی چرائی، کمرے کا تالا کھولا اور چابی دوبارہ چین میں ڈال دی۔

''میرا کمرا۔'' وہ بہ آواز بلند بولا۔ ''تم نے میرا کمرا اجاڑ دیا۔''

''احمقانہ باتیں مت کرو۔ میں نے صرف کمرے کی صفائی کی ہے۔''

''اور میرا سامان، ٹی وی، کتابیں وہ سب کہاں ہیں؟''

''وہ سب ناکارہ چیزیں تھیں۔ میں نے انہیں باہر رکھوا دیا۔''

''کہاں...... تم نے وہ سب چیزیں کہاں پھینک دیں؟''

''ظاہر ہے کہ گیراج میں۔'' وہ اطمینان سے بولی۔ ''ناکارہ اشیا کے رکھنے کے لیے وہی ایک مناسب جگہ ہے۔''

یہ کہہ کر وہ مڑی اور مسکراتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔ وائٹ اس کے پیچھے پیچھے گیا اور چولہے کے سامنے کھڑے ہو کر اس سے بحث کرنے لگا۔ اس کے ہاتھوں میں رعشہ طاری تھا اور رتھ نے اس سے پہلے کبھی اس کو اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔

''تمہیں اس کا کوئی حق نہیں تھا۔'' وہ غصے سے بولا۔

''پہل تم نے کی تھی۔ اگر تم چوری چھپے کیٹی کے کمرے کو تباہ کرسکتے ہو تو مجھے بھی یہ حق پہنچتا ہے۔''

''یہ کیٹی کا نہیں، میرا کمرا ہے۔''

''نہیں۔ اگر تم دوبارہ اسے اپنی خلوت گاہ بنانے کے بارے میں سوچ رہے ہو تو اسے بھول جاؤ۔ یہ کمرا اب میرا ہے۔''

''کیا؟''

''تم نے سنا نہیں۔ یہ کمرا اب میرا ہے۔ اب یہ پرانی حالت میں تو نہیں آسکتا لہٰذا میں نے اس میں اندرونی باغ لگانے کا فیصلہ کیا ہے۔ جب کھڑکیوں کو کھول دیا جائے گا تو پودوں کو مناسب روشنی اور ہوا ملتی رہے گی۔''

''نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔'' وائٹ چلایا۔

''ہاں۔'' وہ بہ دستور مسکرا رہی تھی۔ ''یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔''

اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ پھر اس نے کسی کے زور سے گرنے کی آواز سنی۔ اب دھند چھٹ چکی تھی اور رتھ اس کے قدموں کے پاس فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ میں اسٹیل کے کڑچھے کا وزن محسوس کیا۔ اسے یاد نہیں آرہا تھا کہ کب اس نے یہ کڑچھا اٹھایا اور رتھ کے سر پر دے مارا لیکن وہ یہ کام کر چکا تھا اور کڑچھے کی ضرب سے رتھ کے سر کا بایاں حصہ پچک گیا تھا۔

اسے فوری طور پر صدمہ، ندامت اور دہشت کا احساس ہوا لیکن یہ کیفیت زیادہ عرصہ نہ رہی اسے ایک عجیب سا اطمینان محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے کڑچھا دوبارہ چولہے پر رکھا اور جھک کر رتھ کی نبض دیکھنے لگا۔ پھر وہ اپنے کمرے میں گیا اور خود کو اندر بند کرلیا۔

وہ جانتا تھا کہ اسے پولیس، رتھ کی بہن یا چارلی کو فون کردینا چاہیے یا خود پولیس اسٹیشن جا کر اپنے جرم کا اعتراف کرلے لیکن وہ کوشش کے باوجود اس خالی کمرے سے باہر نہیں آسکا۔ دو دن بعد جب ایلن وہاں آئی تب بھی وہ کمرے کے فرش پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا۔

وائٹ نے رضاکارانہ طور پر اپنے جرم کا اعتراف کرلیا۔ اس نے اپنی بیوی کو قتل کرنے کی جو وجہ بتائی اس پر سراغ رساں یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھے لیکن جب اس نے تفصیل سے بتایا کہ کس طرح رتھ نے اس کی غیر موجودگی میں اس کی خلوت گاہ کو اجاڑا جو اس کی ویران زندگی میں بہت اہمیت رکھتی تھی تو ان کی سمجھ میں سب کچھ آگیا۔

اس پر فردِ جرم عائد ہوچکی تھی۔ ٹام اور کیٹی اس سے جیل میں ملنے کے لیے آتے رہتے تھے جبکہ لورا ابھی اس کی خیریت دریافت کرتی رہتی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اسے یہ جرم کرنے پر مجبور کیا گیا تھا لیکن وہ اس کی نیم دلی سے حمایت کر رہے تھے۔ وہ اس بات پر بھی ناراض تھے کہ جب انہیں باپ کے سہارے کی ضرورت تھی تو وہ ان سے دور رہا اور انہیں مکمل طور پر رتھ جیسی ظالم ماں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

مقدمے کی کارروائی کے دوران نوجوان وکیل صفائی نے وائٹ کا دفاع کرنے کی بھرپور کوشش کی اور جیوری کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے ٹام اور چارلی کو بہ طور گواہ پیش کیا تاکہ وہ وائٹ کے اچھے کردار کی گواہی دے سکیں لیکن وائٹ کے خلاف ناقابلِ تردید ثبوت موجود تھے لہٰذا جیوری نے اسے کوئی رعایت دیے بغیر مجرم قرار دے دیا۔ جج نے اسے بیس سال قید کی سزا سنائی جو دوسرے لفظوں میں اس کے لیے عمر قید ہی تھی۔ البتہ اس کی عمر، صحت اور سابقہ ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے اسے ایسی جیل میں رکھنے کی سفارش کی گئی جہاں جیل کے اندر اس کی آزادانہ نقل و حرکت پر کوئی پابندی نہیں تھی۔

اس کا خیال تھا کہ وہ جیل میں خوش نہیں رہ سکے گا لیکن اس کے برعکس ہوا۔ اس نے بہت جلد اپنے آپ کو وہاں کے ماحول میں ڈھال لیا اور چند ہی دنوں میں اپنے آپ کو آرام دہ محسوس کرنے لگا۔ شروع شروع میں اسے ایک دوسرے قیدی کے ساتھ رہنا پڑا لیکن اس کے عمدہ برتاؤ، چال چلن اور رکھ رکھاؤ کو دیکھتے ہوئے جلد ہی ایک الگ کوٹھری میں منتقل کردیا گیا اور ٹیلی وژن سیٹ اور سی ڈی پلیئر رکھنے کی اجازت بھی مل گئی۔ کچھ عرصہ بعد اسے آرام کرسی اور کتابیں بھی مل گئیں۔ کچھ مزید کتابیں اس نے چارلی سے بھی منگوالیں۔ اس کوٹھری کا سائز کم و بیش اس کے کمرے جتنا ہی تھا۔ وہ کھانا کھانے، لائبریری جانے اور ورزش کرنے کے لیے کوٹھری سے باہر آتا جبکہ بقیہ وقت فلمیں دیکھنے، کتابیں پڑھنے اور موسیقی سننے میں صرف ہوجاتا۔ یہاں اس کی تنہائی میں مخل ہونے والا کوئی نہ تھا۔ شاید اسے اتنا سکون اور آرام اپنے گھر میں بھی نہ ملتا لیکن یہ کوٹھری ہر لحاظ سے اس کے لیے موزوں تھی۔ وائٹ پوٹر کو پہلی بار احساس ہوا کہ اسے وہ خلوت گاہ مل گئی ہے جس کی ہمیشہ اس نے تمنا کی تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

ناصر ملک

مسافر

قسط نمبر:10

گل وگلزار سے راہ پرخار تک ایک مسافر بے نوا کی روداد حیات

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان مسافر... زندگی مسافت... اور اعمال زادِ سفر ہوتے ہیں... کسی کو انسانیت کے لبادے سے نکل کر پتھر کی صورت ڈھل جانے میں صدیاں نہیں لگتیں... اور کہیں آنکھوں میں اشک نہ ہونے کے باوجود ہر ادا، ہر چہرہ اشکبار ہونے کا احساس دلاتا ہے... وہ بھی ایک خانماں خراب، بے سہرا اور آبلہ پائی کے عذاب میں مبتلا مسافر تھا... جو دنیا کے چلن سے آگاہ تھا، جسے ہتھیاروں کے اوچھے ہتھکنڈوں کا ادراک تھا مگر پھر بھی مائل بہ تغیر تھا کیونکہ وہ جانتا تھا... جب بند آنکھوں سے آنسو رواں ہوں اور ہونٹ ساکت ہوں تو ایسے میں ان ساکت ہونٹوں کے درمیان دل کی لرزش مچلا کرتی ہے... خاموش فضائوں میں طوفان چھپے ہوتے ہیں... دریا کی روانی کتنی کہانیوں کو بہا لے جاتی ہے... ایسے میں مسافت طویل... بہت طویل ہوجاتی ہے مگر مسافر ہر موڑ پر ایک نئی داستان رقم کرکے آگے بڑھتا جاتا ہے... کبھی کردار اس کے تعاقب میں ہوتے ہیں اور کبھی وہ خود اپنی تلاش میں کہیں گم ہوجاتا ہے... کبھی مل جانے کی خوشی، کبھی احساسِ زیاں... سوختہ جذبات میں تلاطم برپا کردینے والے واقعات اور معاشرتی سردرویّوں پر مشتمل حیرت انگیز انکشافات کا طویل سلسلہ۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

زندگی ایک سفر ہے اور ہم سب مسافر ہیں، راہ کی کٹھنائیوں سے بے خبر اپنے سفر پر رواں ہیں۔ داستان سفر شروع کرنے سے پہلے اپنا تعارف ضروری ہے۔ میرا نام شہریار ہے جسے لوگ پیار سے شہرا کہتے ہیں۔ میرا گھرانا عالی نسب غریب خاندان تھا جو چار افراد، میں، والد امام دین عرف سوہنا خان، والدہ رضیہ بی بی عرف رجو اور چھوٹی بہن پروین پر مشتمل تھا اور جنوبی پنجاب کے قصبے نور پور میں مقیم تھا کہ ایک روز جب میری عمر پانچ برس تھی ایک خونچکاں واقعے میں میرے والدین کو بے دردی سے قتل کردیا گیا جس کے بعد میرے چچا چراغ دین اور چچی نے ہمیں اپنا لیا اور اپنے تین بچوں ہی کی طرح ہماری تربیت کی۔ گاؤں ہی میں پھوپی کبریٰ رہتی تھی جنہوں نے بچپن ہی میں اپنی بیٹی غزالہ سے میرا رشتہ طے کردیا تھا۔ چچا نے مجھے تعلیم دلائی، میں نے ملتان سے گریجویشن کیا اور اسی دوران ایک سیاسی پارٹی کے اسٹوڈنٹ ونگ میں ایک اہم عہدے پر فائز رہا اور ہتھیاروں کے استعمال و دیگر علوم میں مہارت حاصل کی۔ پھر اس کے بعد میں نور پور واپس آگیا۔ گاؤں میں دوستوں میں امیر نواز بھی شامل تھا جو کہ گاؤں کے نمبردار حیات خان کا بیٹا تھا۔ میں

www.pdfbooksfree.pk

ان کے حسابات کی منشی گیری اور دیگر چھوٹے موٹے کام بھی کر دیا کرتا تھا میرا دوسرا دوست اللہ بخش لوہار کا بیٹا خالد عرف کھالا تھا جو تعلیم یافتہ تو نہ تھا لیکن حیات خان کی ویگن چلاتا تھا اور سواریاں لے کر قریشی موڑ تک جاتا تھا، اسی نے مجھے ڈرائیونگ سکھائی تھی جبکہ تیسرے دوست ڈاکٹر منصور علی شاہ عرف شاہ جی تھے جو گاؤں کے سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر کی حیثیت سے تعینات تھے گاؤں میں ان کی بڑی عزت تھی کیونکہ اس سے پہلے کوئی ڈاکٹر زیادہ عرصے گاؤں میں نہیں ٹھہرتا تھا۔ میں زیادہ وقت ان کی صحبت میں گزارتا تھا۔ وہ ایک سلجھے ہوئے مخلص مگر کچھ قنوطی انسان تھے لیکن نڈر اور بہادر۔ میں ان سے عملی تربیت بھی حاصل کر رہا تھا اس کے علاوہ مجھے ان کے ہاں سے کتابیں بھی پڑھنے کو مل جاتی تھیں۔ ایک درزی مراد بخش دیوانہ سے بھی دوستی تھی جو کہ شاعر بھی تھا اور اس کے درد بھرے دوہڑے کافی اثر رکھتے تھے۔ خالد عرف کھالا سردار حیدر خان جو کہ ایک سیاسی لیڈر تھا اور حیات خان کا سرپرست بھی تھا، کی بیٹی اسما کے یکطرفہ عشق میں مبتلا ہو گیا اور اپنی قلبی کیفیت کا مجھ سے اظہار کیا، میں نے اسے سمجھایا لیکن وہ اپنی روش پر قائم رہا۔ گاؤں کے بڑوں میں نمبردار حیات خان کے علاوہ اس کا کزن وریام خان اور اس کا بھائی سردار بخت خان بھی تھا جو سب سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ وریام خان کی بیٹی کی شادی کے موقع پر سردار حیدر خان کی بیٹی اسما کی طبیعت خراب ہوئی تو ہرکارہ ڈاکٹر شاہ جی کو بلانے کے لیے دوڑایا گیا لیکن اس نے آنے سے انکار کر دیا جس پر وریام خان سخت چراغ پا ہوا اور اس کی حاکمانہ انا کو سخت ٹھیس پہنچی۔ چونکہ وہ ایک منتقم مزاج شخص تھا اس لیے مجھے خدشہ تھا کہ وہ کوئی انتقامی سازش ضرور کرے گا جو کہ شاہ جی کے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ میں نے کھالے سے مشورہ کیا اور ہم دونوں نے شاہ جی کی رہائش گاہ کی نگرانی کی لیکن شاہ جی بھی غافل نہیں تھا انہوں نے پیش بندی کر رکھی تھی، یہ سازش ناکام ہو گئی جس میں بخت خان معاون ثابت ہوا۔ اس کے بعد میرے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہوا۔ ان تمام واقعات کے تناظر میں وریام خان نے شاہ جی سے میری حمایت پر مجھے سرزنش کی میں نے سوچا کہ حیات خان سے ان کی شکایت کروں گا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ میں شاہ جی کی صحبت چھوڑ دوں۔ گاؤں کے ماسٹر جی کی بیٹی جس کے پیر میں لنگ تھا اور وہ شاہ جی کے زیر علاج رہی تھی، ان کے عشق میں مبتلا ہو گئی زیناں نے میرے ذریعے شاہ جی کو وہ خط دے دیا لیکن شاہ جی نے اس کا جواب نہیں دیا۔ شاہ جی کے خلاف ہونے والی سازش سے آگاہ کرنے کے لیے حیدر خان کی بیٹی صدف نے ایک رقعہ کھالے کی بہن خالدہ کے ہاتھ بھیجا تھا۔ اسی باعث خالدہ نے جو کہ ابھی جوانی کی خطرناک عمر سے گزر رہی تھی، غلط تاثر لے لیا اور ایک دن بہانے سے اپنے گھر بلا کر مجھ سے اظہار الفت کرنا چاہا اور مجھ سے لپٹنا چاہتی تھی کہ میں پیچھے کی جانب گرا تو پیچھے رکھے صندوق کی نوک میری ریڑھ کی ہڈی میں چبھی اور میرا سارا جسم مفلوج ہو گیا۔ اسی دوران کھالا بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو مجھ پر چڑھ دوڑا۔ اس نے میرے جسم کو خنجر کے ذریعے زخمی کر دیا اور آخری وار کرنا چاہتا تھا کہ اسے میری حالت کا احساس ہوا اور وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ گاؤں میں، سب کھالے پر لعن طعن کر رہے تھے میں نے اسے معاف کر دیا۔ اسی دوران میں گاؤں میں موجود سائیں جیت کے مزار پر مشکوک لوگوں کی آمد اور سرگرمیوں کے بارے میں سردار بخت خان نے ہم لوگوں کو مطلع کیا۔ سائیں کا بیٹا دل جیت شاہ اس آستانے پر بیٹھا کرتا تھا۔ بخت خان نے ہی مجھے معقول معاوضے پر اپنی بیٹی ملکہ کو پڑھانے پر مامور کر لیا۔ یہ معاملات جاری تھے کہ کھالے نے بتایا کہ اسما نے اسے شہر میں ایک مشہور پارک میں بلایا ہے۔ میں پریشان تو ہوا لیکن اس کے ساتھ جانے پر رضامند ہو گیا۔ اسما سے ملاقات کے دوران لمبے بالوں والا ہیرو ٹائپ نوجوان وہاں آ گیا اور ان دونوں کے درمیان کسی بات پر لڑائی شروع ہو گئی۔ معاملہ خون خرابے تک پہنچ گیا۔ اسی دوران کھالے کے ہاتھوں اس نوجوان موبی کا قتل ہو گیا۔ کھالا تو بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا لیکن میں پولیس کے ہاتھ لگ گیا اور تھانے پہنچا دیا گیا جہاں میری ملاقات مخصوص لب و لہجہ رکھنے والے امیر شاہ عرف میرو شاہ سے ہوئی جس نے مجھے حوصلہ دیا کہ اس کی میڈم مجھے چھڑوا لے گی اور ہوا بھی یہی، میڈم شکیلہ نے مجھے چھڑوا لیا اور میں اس کے ٹھکانے پر پہنچ گیا میڈم شکیلہ توقع کے برعکس نہایت خوبصورت اور نوجوان لڑکی تھی لیکن اس کا اثر و رسوخ بہت تھا۔ میں نے اسے اپنی تمام روداد سے آگاہ کیا۔ اس نے مجھے بھرپور مدد کی یقین دہانی کرائی وہ نور پور کے حالات سے بھی واقف تھی۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ شامل ہونے کی پیشکش کی جسے میں نے قبول کر لیا۔ یہاں سے فارغ ہو کر نور پہنچا تو ایک سانحہ میرا منتظر تھا۔ چاچی نے روتے ہوئے بتایا کہ پروین غائب ہے۔ کھالا بھی لاپتا تھا، ایسے میں دیوانے نے مجھے دلاسا دیا اور امیر نواز پر شک کا اظہار کیا کیونکہ وہ بھی غائب تھا۔ میں میڈم شکیلہ کے پاس پہنچا اور اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ میڈم نے مجھ سے کہا کہ اس سلسلے میں دل جیت بتا سکتا ہے اور یہ مجھ پر منحصر ہے کہ میں اس سے کس طرح اگلواتا ہوں۔ میرو شاہ نے مجھے ہتھیار فراہم کیے اور میں زمانہ طالب علمی کی ٹریننگ آزمانے کے لیے دل جیت کے ٹھکانے پر پہنچ گیا اور اسے دردناک موت سے ہمکنار کیا اور قتل کا نشان مٹانے کے لیے اس کی لاش کو ڈیرے پر جلا ڈالا۔ دل جیت کے انکشاف کے مطابق پروین حیدر خان کے قبضے میں تھی۔ میری کارکردگی سے میڈم بہت خوش تھی اور مجھ پر غیر معمولی طور پر مہربان بھی۔ لیکن اس تمام عرصے میں، میں اپنے والدین کے قتل کو نہیں بھولا تھا۔ میڈم کے اڈے پر میری ملاقات سونیا نامی لڑکی سے ہوئی جس نے بتایا کہ وہ مجھے ایک چیز دکھانا چاہتی ہے اور اپنے کمرے میں لے گئی۔ وہاں ایک لڑکی بے ہوش پڑی تھی۔ میں نے اسے دیکھا تو چونک گیا، وہ اسما تھی، سردار حیدر خان کی بیٹی۔ پھر میڈم نے مجھے تفصیل سے آگاہ کیا اور مختلف محاذوں پر اپنے آدمیوں کو ہدایات دینے لگی کہ اسے اطلاع ملی کہ اڈے پر حملہ ہو گیا ہے۔ میں اس سے ملنے پہنچا تو وہ کمپیوٹر روم میں تھی اور مختلف اسکرینز پر مناظر کو دیکھ رہی تھی کہ ایک منظر میں حملہ آور پر ہماری نظر پڑی۔ اس کے چہرے کا رخ جب واضح ہوا تو میں اسے دیکھ کر شدت سے چونک اٹھا۔ اسکرین پر نظر آنے والا میرا جگری دوست کھالا تھا جو استاد ببلو کے گینگ کے ساتھ میڈم کے ٹھکانے میں داخل ہوا تھا لیکن میڈم نے خاص حکمت عملی کے تحت بازی پلٹ دی اور کھالا اس کی قید میں آ گیا۔ میڈم نے حیدر خان کی بیٹی اسما کو اغوا کرا لیا تھا اور اس کے عوض پروین کا مطالبہ کیا۔ اسما نے مجھے پہچان لیا اور مجھے غیرت دلانے کی کوشش کی لیکن میں مجبور تھا۔ اسی دوران میرے ایما پر میڈم نے کھالے کی مجھ سے ملاقات کرا دی لیکن کھالا اسما کو قید میں دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا۔ ایک زبردست مقابلے کے بعد میں نے اسے ڈھول جانے پر مجبور کر دیا۔ آخرکار طے یہ ہوا کہ ہم براہ راست حیدر خان کے ڈیرے پر پروین کے حصول کے لیے دھاوا بولیں گے۔ ہماری ٹیم کا سربراہ پیا نامی ایک تجربے کار شخص تھا۔ راستے میں ہمیں زخمی حالت میں وحید ملا۔ ہم ڈیرے پر پہنچے لیکن وہاں ہمارے لیے کوئی اچھی خبر نہ تھی، وحید کے ذریعے معلومات کے مطابق دلجیت کے آستانے پر ان دونوں بہن بھائیوں کو بے ہوشی کی حالت میں اغوا کر کے ڈیرے پر لایا گیا تھا لیکن قید کے دوران وحید کو تشدد کر کے مردہ

جان کر پھینک دیا گیا جبکہ کسی نامعلوم فرد نے ہماری آمد سے قبل ڈیرے پر پہنچ کر وہاں موجود افراد کو ہلاک کر کے پروین، عاشی اور ایک مرد جو غالباً امیر نواز تھا، اپنے ساتھ لے گیا لہٰذا ہم یہاں سے خالی ہاتھ واپس آئے۔ میڈم نے مشورہ دیا کہ مجھے اپنے رشتے داروں کو نور پور سے نکال لانا چاہیے لہٰذا ہم نور پور پہنچے لیکن، ہم سے پہلے ہی ہمارے گھر پر نامعلوم افراد ہمارے گھر کو جلانے پہنچ چکے تھے۔ ایک خونی کارروائی کے دوران ہم نے ان پر غلبہ حاصل کیا۔ میں اپنی بہنوں کو لے کر اپنی گاڑی تک پہنچا اور پیا کا انتظار کرنے لگا لیکن جب وہ وہاں پہنچا تو خالی ہاتھ تھا، اسے یوں مایوس دیکھ کر مجھے دھچکا لگا۔ چاچا اور چاچی کو لانے میں ناکام رہا۔ لیکن موجو کو لے آیا تھا۔ ہم اس جزوی کامیابی کے بعد واپس پہنچے جہاں ملتان کی حدود میں ہمارے لیے رہائش کا بندوبست کیا گیا تھا اور ایک سابق فوجی ہماری خدمت پر مامور تھا۔ کھالا بہروپ بدل کر نور پور سے یہ معلومات لے کر آیا کہ میرے گھر میں خون خرابے کی ذمے داری مجھ پر ڈال دی گئی تھی جائداد کی خاطر، بخت جان پھوپی اور غزالہ کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ یہاں پیا نے میری تربیت کی اور مجھے فارم ہاؤس میں میڈم سے ملاقات کا حکم ملا لیکن یہ ملاقات ایک خونی مقابلے کی صورت تھی جس میں، میں بہ مشکل تمام غالب رہا یہ میڈم کے امتحان لینے کا ایک طریقہ تھا۔ اسی دوران چند نامعلوم حملہ آوروں نے فارم ہاؤس پر حملہ کر دیا۔ ایک خونریز مقابلے کے بعد ہم انہیں ہلاک کرنے میں کامیاب ہوئے۔ واپسی کے سفر میں ہم جب گاڑی میں بیٹھے تو عقب سے ہم پر ہتھیار تان لیے گئے۔ میڈم نے نہایت ڈرامائی انداز میں ان دونوں کو قابو کر لیا تعارف کرانے پر معلوم ہوا کہ وہ دونوں نامی گرامی ڈاکو تھے۔ یہاں سے فارغ ہو کر ہم ٹھکانے پر پہنچے۔ کھالا میرا ساتھ چھوڑ گیا۔ میڈم شکیلہ نے مجھے اسما کو اس کے خریدار حیدر خان کے سرپرست میاں دلبر حسین کے سپرد کر کے رقم وصول کرنے کی ذمہ داری دی اور ایک شخص کو میرے ساتھ کر دیا۔ ہم اسما کو لے کر جب دلبر حسین کے گرگے رنگو قسائی کے اڈے پر پہنچے تو اسے دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا وہ چہرہ دیکھ کر میرے سارے زخم تازہ ہو گئے لیکن میں نے انتقام کو دوسرے وقت کے لیے چھوڑ دیا اور کئی رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے رقم لے کر میڈم کے پاس پہنچ گیا۔ میڈم بہت خوش تھی۔ اس نے رنگو قسائی کے سلسلے میں میری مدد کا وعدہ کیا وہاں سے بس میں گھر جا رہا تھا کہ اچانک مجھے اغوا کر لیا گیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

یہ آواز سن کر میرے جسم میں جیسے کرنٹ سا دوڑ گیا۔

”کیوں؟ کیا اپنی بہن کے یار کو پہچاننا مشکل ہو گیا ہے سالے؟“ میرے کانوں میں اس کی زہریلی آواز پڑی۔ یوں لگا جیسے اس نے پگھلا ہوا سیسہ میرے کانوں میں انڈیل دیا ہو۔

اسے پہچاننے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ کھالے کے ہاتھوں حادثاتی طور پر قتل ہونے والے محبوب الحسن عرف موبی کا جگری یار اور دست راست، زور آور تھا۔ پہلی مرتبہ وہ جھیل کے گیٹ پر مجھ سے ٹکرایا تھا جب میں اور کھالا، خانزادی اسما سے ملنے کے لیے ملتان آئے تھے۔ میں نے اُس کی خاصی ٹھکائی کی تھی۔ دوسری مرتبہ وہ مجھ سے ابتدائی شب کے اندھیرے میں ڈیرا اڈا کی ایک مارکیٹ کے باہر ملا تھا۔ اس کے ساتھ ڈرائیور اور ایک جرسی والا شخص بھی تھا۔ دونوں مجھے اغوا کرنا چاہتے تھے مگر میں انہیں زخمی کرنے کے بعد فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ تیسری مرتبہ اس سے میری ملاقات تھانیدار اظہر کی دفتری عدالت میں ہوئی تھی جہاں سے مجھے میڈم شکیلہ اور میرو شاہ نے رہائی دلوائی تھی۔ اس نے میرو شاہ کی موجودگی میں یخنی فروش کے قریب گاڑی روک کر دھمکی دی تھی کہ وہ مجھے دیکھ لے گا اور آج اس نے اپنی دھمکی پر عمل کر لیا تھا۔

وہ کینہ توز نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کی گالی نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔ میں نے دانت پیسے اور سرد لہجے میں کہا۔ ”تم اچھا نہیں کر رہے ہو زور آور! میں نے سوچا تھا کہ تمہارے اور میرے بیچ معاملہ ختم ہو گیا ہے مگر آج تم نے یہ حرکت کر کے ثابت کر دیا ہے کہ تم نہایت کینہ پرور اور ناقابلِ معافی شخص ہو۔“

اس کا بلند قہقہہ گاڑی میں گونج اُٹھا۔ اپنی ران پر زوردار ہاتھ مار کر بولا۔ ”یعنی اَبھی عقل نہیں آئی تمہیں...... مجھے دھمکانے لگے ہو...... یعنی زور آور کو...... واہ سالے واہ! مگر خیر...... یہ تو ہوتا ہی ہے۔ موت سامنے آتی ہے تو بڑے بڑوں کے حواس ٹھکانے نہیں رہتے اور اول فول بکنے لگتے ہیں۔ میں تمہاری ذہنی کیفیت کو سمجھ رہا ہوں۔“

خوف اور پریشانی کا ابتدائی مرحلہ بیت گیا تھا اور میں اس کی تحویل سے نکلنے کے لیے موقعے کے انتظار میں ذہن دوڑانے لگا تھا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ میں قطعاً خوف زدہ نہیں تھا کیونکہ زور آور کے بازوؤں کا زور میں نے دیکھ رکھا تھا۔ اس کی منتقم مزاجی کو بھی آزما چکا تھا۔ اس نے موبی کے قتل کو ابھی تک بھلایا نہیں تھا۔ وہ خطرناک شخص تھا اور میرا جلد از جلد اس سے چھٹکارا پانا ضروری تھا۔

میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے بے خوفی سے پوچھا۔ ”تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

وہ تین مرتبہ دانتوں پر دانت مار کر ’ٹک ٹک‘ کی آواز پیدا کرنے کے بعد گنگنایا۔ ”تجھے قتل کیا جائے، یا کہ معاف کیا جائے...... تو ہی بول تیرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے...... تجھے قتل کیا جائے......“

اس کی تضحیک آمیز گنگناہٹ اور فاخرانہ مسکراہٹ پر میرا خون کھول اُٹھا۔ جی چاہا کہ زوردار مکا مار کر اُس کا واہیات منہ توڑ دوں مگر بہ دقت تمام خود کو سنبھالا اور کہا۔ ”میرے سوال کا

www.pdfbooksfree.pk

جواب دو، خان صاحب بننے کی کوشش نہ کرو۔"

اس نے ٹھٹک کر مجھے دیکھا۔ میرا جملہ اُسے برا لگا تھا۔ مسکراہٹ غائب ہوگئی اور آنکھوں سے خشونت ٹپکنے لگی، بولا۔ "بھتنی کے! ایسی جلدی بھی کیا ہے؟ آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔" تھوڑے سے توقف کے بعد پھر زہریلی مسکراہٹ کے جلو میں بولا۔ "نہیں یار! ڈرنا نہیں، زیادہ فکر مند نہیں ہونا..... میں تمہیں قتل نہیں کروں گا۔ بھلا کوئی اپنے مہمانوں سے ایسا سلوک بھی کرتا ہے..... یار! بس تھوڑا سا موج میلا کریں گے، گزرا زمانہ بچپن کا یاد کریں گے پھر تم جہاں کہو گے، وہاں پہنچا دیں گے..... بس!"

میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے کہیں محفوظ جگہ پر لے جا کر تشدد کا نشانہ بنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ بہ حکایت دیگر، وہ ان چوٹوں کا حساب لینا چاہتا تھا جو اُسے میرے ہاتھوں پہنچی تھیں۔ وہ اپنے یار کے قاتل تک پہنچنے کے لیے بے چین تھا اور اپنی بے چینی کو دور کرنے کے لیے کھالے کا پتا ٹھکانا معلوم کرنا چاہتا تھا۔

میں نے کن انکھیوں سے اپنے بائیں ہاتھ بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھا۔ وہ پوری طرح چوکس تھا۔ ایسے ہی وقت میں میرے موبائل فون کا بزر بجا۔ زور آور چونکا اور اُس نے ہاتھ بڑھا کر میری جیب سے فون سیٹ نکال لیا۔ چند لمحوں تک اُسے دیکھتا رہا پھر اس نے 'پاور ڈ آف' کر کے فرنٹ سیٹ کی طرف اُچھال دیا۔

اس نے بڑی مضبوطی سے پستول کو پکڑ کر گھٹنوں میں دبے رکھا تھا۔ میں اگر اُس سے پستول چھیننا چاہتا تو نہیں چھین سکتا تھا۔ اس کوشش میں میرے پہلو سے لگی ہوئی خوف ناک گن کی نال گولی اگل کر مجھے ہمیشہ کے لیے خاموش کرا سکتی تھی۔ میں نے فی الحال مزاحمت نہ کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور اگلی سیٹوں کے درمیان سے فرنٹ اسکرین کے پار رواں دواں ٹریفک کو دیکھنے لگا۔

آٹھ نمبر چنگی کے مین چوک پر پہنچ کر ڈرائیور نے دائیں ہاتھ نواب پور روڈ کی جانب ٹرن لیا اور کار کی رفتار بڑھا دی۔ کچھ دیر بعد کھیڑا آبادی گنجان آبادی ختم ہوگئی اور قدرے کھلا علاقہ شروع ہوگیا۔ سڑک کے اطراف میں لکڑی کے ٹال، اینٹوں کے بھٹے اور آرے دکھائی دینے لگے۔ پھر کم گنجان آبادی بھی ختم ہوگئی۔ اِکا دُکا دکانوں اور مکانوں کا سلسلہ چل نکلا۔ وہ مجھے شہر سے باہر، مضافات میں واقع اپنے کسی خفیہ ٹھکانے پر لے جا رہے تھے۔

گاڑی میں خاموشی طاری تھی۔ وہ تینوں میری مفاہمانہ خاموشی کو غنیمت جان کر خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ کوئی پانچ سات کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ڈرائیور نے بائیں ہاتھ نکلنے والی لنک روڈ پکڑ لی۔ میل بھر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے یہ پکی سڑک بھی چھوڑ دی اور دو بھٹوں کے درمیان واقع کچے اور زگ زیک راستے پر کار ڈال دی۔ راستہ مٹی اور دھول سے اَٹا ہوا تھا۔

میں نے گردن موڑ کر ونڈ اسکرین کے پار دیکھنے کی کوشش کی تو اُڑتی ہوئی دھول کے دبیز بادل کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے زور آور کو دیکھا جو بے فکری سے سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے رہا تھا۔ اس وقت وہ حلیے اور چہرے کے تاثرات سے ایکشن فلموں کا ولن معلوم ہوتا تھا۔ اگر وہ اپنی نوک پلک سنوارتا اور حلیہ درست رکھتا تو ہینڈسم قرار دیا جا سکتا تھا۔

میرا ذہن بڑی برق رفتاری سے کام کر رہا تھا اور درپیش آنے والے نامساعد حالات سے نبرد آزمائی کا لائحۂ عمل تیار کرنے میں مصروف تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ زور آور خطرناک ارادے رکھتا تھا۔ اگر اُسے معمولی پوچھ گچھ اور مار پیٹ کا شوق چرّاتا تو وہ مجھے شہر سے دور اِس ویرانے میں نہ لاتا بلکہ وہیں دو چار ہاتھ رسید کر کے چھوڑ دیتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ دو مرتبہ شکست سے دو چار ہونے کے بعد بہت محتاط ہو گیا تھا اور مجھے سبق سکھانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

میں میڈم شکیلہ کی کوٹھی اور اپنے گھر کے بیچ اس طرح اغوا کیا گیا تھا کہ نہ میڈم کو میرے بارے میں کچھ علم ہوا ہوگا اور نہ میرے گھر والوں کو میری خبر ہوگی۔ مجھ تک کسی امداد کا پہنچنا محض خام خیالی تھا۔ میں ابھی اسی ادھیڑ بن میں مستغرق تھا کہ کار ایک دیہاتی طرز کے تعمیر شدہ مکان کے بڑے سے دروازے پر رُک گئی۔ دھول کا گہرا بادل جو چلتی کار کے تعاقب میں دوڑا آ رہا تھا، چند لمحوں میں ہی کار کے گرد پھیل گیا۔ بہ صد کوشش بھی آس پاس کی کوئی چیز دکھائی نہ دی۔ جب دھول ہوا میں تحلیل ہوئی، تب زور آور نے اپنے ساتھی کو نیچے اُترنے کا حکم دیا اور کہا۔ "صفی! اس الو کے پٹھے کا دھیان رکھنا۔ معمولی سی حرکت بھی کرے تو بے دریغ گولی مار دینا۔"

مجھے گن پوائنٹ پر رکھنے والے کا نام غالباً صفدر تھا جسے مختصر کر کے یا بگاڑ کر 'صفی' کر دیا گیا تھا۔ زور آور کے اُترنے کے بعد اُس نے مجھے اسی دروازے سے اُترنے کا حکم دیا۔ زور آور چند قدموں کے فاصلے سے مجھ پر پستول تانے کھڑا تھا۔

میرے اُترنے کے بعد صفی بھی کار سے نکل آیا اور گن کی نال میری ریڑھ کی ہڈی سے لگائے دھکیلتا ہوا مکان کے

دیسی ساخت کے چوبی دروازے کی طرف بڑھا۔ زور آور میری داہنی جانب چند قدموں کے فاصلے پر محتاط انداز میں چل رہا تھا۔ میں نے مکان پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ کبھی دیواریں پختہ اور بے رنگ تھیں۔ سیمنٹ کا سیاہی مائل رنگ دھول کی تہوں نے چھپا رکھا تھا۔ مکان کے قرب و جوار میں کوئی آبادی نہیں تھی۔ اس علاقے میں اینٹیں بنانے والے بھٹوں کی بہتات تھی مگر اس مکان کے قریبی بھٹے کا فاصلہ بھی کم و بیش چار سو گز تھا۔ میں دروازے کے سامنے پہنچ کر رُکا تو صفی نے سخت لہجے میں کہا۔ "دروازہ کھلا ہے۔ اندر چلو۔"

میں نے کن انکھیوں سے زور آور کو دیکھا۔ وہ دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ دونوں کی بے حد محتاط روی نے مجھے بے بس کر کے رکھ دیا تھا۔ میں نے دروازہ دھکیلا اور اندر داخل ہوگیا۔ وسیع صحن کچا تھا۔ ایک چھوٹا اور دو بڑے کمرے، غسل خانے اور ٹنکے پر مشتمل اس مکان کی تعمیر کا انداز مقامی اور خالصتاً دیہاتی تھا۔

صفی نے حکم دیا۔ "اُس کمرے میں چلو۔"

تینوں کمروں کے دروازے چوپٹ کھلے ہوئے تھے۔ درمیانی کمرے میں کسی کے موجود ہونے کا احساس ہو رہا تھا جبکہ کسی مشین کے چلنے کی مدھم سی آواز بھی کانوں میں پڑ رہی تھی۔ مجھے جس کمرے کی طرف دھکیلا جا رہا تھا، میرے اندازے کے مطابق وہ خالی تھا۔ غیر معمولی بھاری چوکھٹ والا دروازہ عبور کرتے ہی میرا اندازہ یقین میں بدل گیا۔ کمرے میں نہ تو کوئی شخص موجود تھا اور نہ ساز و سامان۔ کمرے کے عین وسط میں پہنچا ہی تھا کہ اچانک میری کنپٹی پر زوردار دھماکا ہوا۔ آنکھوں کے آگے ایک لمحے کو سورج چمکا پھر دبیز اندھیرا چھا گیا۔ کم بخت صفی نے شاید پوری قوت سے گن میری کنپٹی پر دے ماری تھی۔

میں نے بے اختیار اپنا سر دونوں ہاتھوں میں سختی سے بھینچ لیا۔ بے ہوش ہو کر گرنے سے پہلے میں نے سر جھٹکنے کی پوری کوشش کی مگر یوں محسوس ہوا جیسے میرا سر منوں بھاری ہوگیا ہو اور آنکھوں کی بینائی نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہو۔

نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ شاید بقیہ دن اور پوری رات گزر گئی تھی کیونکہ جب میری آنکھ کھلی، میرے سامنے کھلے ہوئے دروازے کے باہر دن کا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ میں اسی کمرے کی عقبی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔ میرے بدن پر ایک میلی کچیلی، مختلف رنگوں سے تھگڑی اور بدبودار رضائی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے رات کے گزرنے کا اندازہ اسی رضائی سے کیا تھا۔ ہوش میں آنے کے کافی دیر بعد تک میں بے حس و حرکت پڑا رہا۔ جب میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بحال ہوئی، میں نے سر کو دائیں بائیں حرکت دی۔ میرے منہ سے بے اختیار کراہ خارج ہوگئی اور داہنی کنپٹی پر جاگنے والی درد کی تیز لہر نے میری آنکھوں میں نمی اُتار دی۔ میں نے کنپٹی کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا تو پتا چلا کہ میرے دونوں ہاتھ میری پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ کوشش کے باوجود ہاتھ کو آزاد نہ کروا پایا تو میں نے اُٹھنے کی کوشش کی۔ یہ احساس بڑا تکلیف دہ تھا کہ میرے دونوں پاؤں بھی بندھے ہوئے تھے۔ ٹھٹھوں کو مسلسل ہلاتے ہوئے رضائی کو ایک طرف سرکایا۔ پیروں کو دیکھا۔ جوتے غائب تھے جبکہ ٹخنوں پر انگلی کے برابر موٹی سوتی رسی کے کئی بل پڑے ہوئے تھے۔ رسی کی گانٹھ عقبی سمت میں تھی جو دکھائی نہیں دے رہی تھی مگر غیر معمولی بڑے ابھار کی بدولت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے پیروں کو حرکت دیتے ہوئے رسی کو ڈھیلا کرنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ کم بختوں نے بڑے ماہرانہ انداز سے مجھے رسی میں جکڑا تھا۔

میں نے گھٹنے اکٹھے کیے، پھر پیروں کے بل اُٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تو سر میں دھمک پڑنے لگی اور آنکھوں کے آگے اندھیرا پھیلنے لگا۔ تھک کر دیوار کے ساتھ سر ٹکا کر، بے بسی سے آنکھیں موند کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ درد کی شدت سے عیاں تھا کہ کنپٹی پر آنے والی چوٹ خاصی گہری اور خطرناک تھی۔

میں وقفے وقفے سے اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کوئی نصف گھنٹے کی اِس تکلیف دہ کسرت کے بعد پیروں کے بل بیٹھنے میں کامیاب ہوگیا۔ سر کا درد بھی کچھ کم ہو کر قابلِ برداشت ہوگیا تھا۔

کھلے دروازے میں سے دکھائی دینے والے صحن کے حصے میں کوئی شخص اب تک آتا جاتا دکھائی نہیں دیا تھا۔ کسی مشین کے چلنے کی مخصوص اور مسلسل آواز کے علاوہ کوئی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے مکان میں میرے سوا کوئی ذی نفس موجود نہ ہو۔ پیروں کے بل بیٹھنے میں کامیابی کے بعد میں نے گھٹنے کچے فرش پر ٹکائے اور پیچھے کی طرف جھک کر بندھے ہوئے ہاتھوں کو پیروں میں بندھی ہوئی رسی کی گانٹھ تک پہنچانے کی کوشش کی۔ جونہی میری انگلیوں نے گانٹھ کو محسوس کیا، میری جان میں جان آئی۔ میں نے رسی کو ٹٹول ٹٹول کر گانٹھ کی نوعیت کو سمجھا اور کھولنے پر تمام قوت صرف کر دی۔ عمر بھر کی کاشتکارانہ ریاضت کام آئی اور میں تھوڑی دیر میں ہی اپنے پیروں کو

www.pdfbooksfree.pk

آزاد کرانے میں کامیاب ہوگیا۔

پھر میں نے پیروں کو جھٹک کر رسی کے الجھاووں سے نجات حاصل کی اور کھڑا ہوگیا۔ میری ٹانگیں کپکپا رہی تھیں اور سر بُری طرح چکرا رہا تھا۔ میں نے ہمت کر کے ایک قدم بڑھایا مگر آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ خود کو سنبھال کر آہستگی سے چند قدم چلا۔ تیورا کر گرنے لگا تھا مگر دیوار سے کندھا ٹکا کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ مجھے اس تکلیف دہ کیفیت سے نکلنے کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔

پیاس کا جانکاہ احساس ہوا۔ حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے تھے۔ ناگاہ نظر داہنے کندھے پر پڑی۔ دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میرا کندھا، بازو اور قمیص کا اگلا حصہ خون سے رنگا ہوا تھا۔ خون کافی مقدار میں بہا تھا جو زیادہ وقت گزرنے پر جم کر سیاہی مائل ہوگیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا ورنہ کنپٹی پر اس شدت سے لگنے والی چوٹ کے نتیجے میں انسان کا زندہ رہنا محال ہوتا ہے۔ زور آور کے ساتھی کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گن کی ساخت اُس کے غیر معمولی وزنی ہونے کا پتا دیتی تھی۔ اس نے مجھے گن کا دستہ مارتے ہوئے شاید اپنی تمام تر توانائی صَرف کر دی تھی۔

چند قدموں کی محتاط مسافت نے ہی مجھے نڈھال کر دیا اور میں دیوار کی جڑ میں بیٹھ کر بُری طرح ہانپنے لگا۔ سانسیں معتدل ہوئیں تو میں پھر اُٹھ کر چند قدم چلا اور تھک کر بیٹھ گیا۔ باری باری دونوں ہاتھوں کو رسی سے نکالنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ملی۔ پھر چلنے کی کوشش کی۔ میں نے یہ عمل نہ جانے کتنی مرتبہ کیا۔ جسم سے کافی مقدار میں خون بہہ گیا تھا اور میرے اندازے کے مطابق میں کم و بیش چوبیس گھنٹے بے ہوش رہا تھا جس کی وجہ سے جسم پر نقاہت طاری تھی۔ مجھے جلد از جلد یہاں سے نکلنا تھا ورنہ میں اس حالت میں زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

جب میں ایک دیوار سے دوسری دیوار تک چلنے کے قابل ہوگیا، تب میں نے دروازے سے جھانک کر باہر دیکھا۔ صحن خالی تھا۔ حویلی کا چوبی دروازہ بند تھا مگر غیر مقفل تھا اور اندر والی چٹخنی کھلی ہوئی تھی۔ یہ اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ باہر سے بند تھا یا کھلا۔

میں نے ایک قدم باہر رکھا اور طائرانہ جائزہ لیا۔ اس حالت میں صحن عبور کر کے حویلی کے دروازے تک جانے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا کیونکہ کمرے میں موجود شخص کی نظروں میں آ کر میں کسی وقت پکڑا جا سکتا تھا۔ بعید نہ تھا کہ دیکھتے ہی گولی مار دی جاتی۔ مجھے جسم پر طاری غیر معمولی نقاہت نے خبردار کر دیا تھا کہ میں ایسی حالت میں زور آور یا صفی سے دوبدو لڑائی میں غلبہ حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے ان کی نظروں میں آئے بغیر یہاں سے نکلنے کی تدبیر کرنی تھی۔

میرے بائیں ہاتھ پر چھ سات فٹ اونچی پختہ چہار دیواری تھی۔ میں اگر اس دیوار کو پھاند کر باہر نکلتا تو کمرے میں موجود لوگ مجھے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ دیوار پر چڑھنا اور دوسری طرف کودنا میرے لیے مسئلہ نہیں تھا مگر بدقسمتی یہ تھی کہ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ ہاتھوں کی مدد کے بغیر دیوار پر چڑھنا ممکن نہیں ہوتا۔

یک لخت ایک خیال سوجھا۔ جلدی سے کمرے میں آیا اور دیوار میں بنی ہوئی کنکریٹ کی الماری کے ایک تیز دھار کونے پر کلائیوں میں بندھی ہوئی رسیوں کو رگڑنے لگا۔ میں نے یہ احتیاط برتی تھی کہ رگڑ کا یہ عمل ایک رسی کے ایک ہی مقام پر کیا جائے۔ سوتی رسی جلد گھس جاتی ہے۔ میری کوشش بارآور ثابت ہوئی اور سفید رنگ کی سوتی رسی ایک جگہ سے گھس کر ٹوٹ گئی۔ چند جھٹکوں کے بعد میرا ایک ہاتھ آزاد ہوگیا۔ دوسرا ہاتھ چھڑانے میں محض چند سیکنڈ لگے۔ کمرے کی سرسری تلاشی لی۔ مجھے نہ تو اپنے جوتے ملے اور نہ ہی موبائل فون۔

میں نے دونوں بانہیں پھیلائیں، ہاتھوں کو جھٹک کر دورانِ خون بحال کیا اور بغیر کوئی وقت ضائع کیے دروازے سے نکل کر دبے پاؤں چلتا ہوا حویلی کی چار دیواری تک پہنچ گیا۔ سر میں بہ دستور درد ہو رہا تھا اور مسلسل باور کرا رہا تھا کہ میں نارمل نہیں ہوں۔ کسی بھی وقت گر سکتا ہوں۔ یہ میری قوتِ ارادی کا امتحان تھا اور زندگی کی خواہش قوتِ ارادی کے حلق میں طاقت بخش سیرپ ٹپکا رہی تھی۔

زور آور مجھے بے ہوشی کی حالت میں باندھ کر کچھ زیادہ ہی بے پروا ہوگیا تھا، اس لیے اُس نے نہ تو کمرے کا دروازہ باہر سے بند کیا تھا اور نہ کسی کو مجھ پر پہرے دار مقرر کیا تھا۔ اس کی حماقت اور بڑھی ہوئی خود اعتمادی نے مجھے فرار کی راہ مہیا کر دی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ دیوار کی منڈیر پر ٹکائے۔ ایسے ہی وقت میں سر میں تیز دھماکا ہوا۔ یوں لگا جیسے میرا سر شیشے کا بنا ہوا اور ٹھوکر سے پھٹ گیا ہو...... میں نے منڈیر چھوڑ دی اور سر تھام لیا۔ دائیں کان کے انچ بھر اوپر پٹی بندھی ہوئی تھی اور پٹی کے نیچے بڑا سا اُبھار محسوس ہو رہا تھا۔ شاید میرے خون کا تیز بہاؤ دیکھ کر زور آور اور صفی کو مجھ پر ترس آ گیا تھا یا وہ مجھے مارنا نہیں چاہتے تھے، اِس لیے انہوں نے بے ڈھنگے سے انداز میں پٹی کر دی تھی۔ یہی بہت تھا۔

چند لمحوں بعد میرے اوسان بحال ہو گئے تو میں نے جبڑے بھینچ کر منڈیر تھام لی۔ غیر معمولی نقاہت کی وجہ سے مجھے دیوار پر چڑھنے کے لیے اپنی باقی تمام تر توانائی بروئے کار لانا پڑی تھی۔ اس جدوجہد میں میری سانس پھول گئی تھی۔ اگر میں زخمی نہ ہوتا تو لمحہ بھر میں ایسی دیوار پر چڑھ سکتا تھا کیونکہ یہ میرا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

دیوار پر کسی چوپائے کی طرح ہاتھوں پیروں کے بل بیٹھ کر میں نے دونوں اطراف کا جائزہ لیا۔ تین چار سو گز کے فاصلے پر اینٹوں کے بھٹے پر مزدور کام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ دور سڑک پر اِکا دُکا گاڑیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں مگر فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ بہت چھوٹی چھوٹی نظر آتی تھیں۔ جس راستے سے مجھے یہاں لایا گیا تھا، وہ خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کہیں پر بھی زور آور سے مڈبھیڑ ہو سکتی تھی۔ مجھے بھٹے کی طرف سے سڑک پر پہنچنا تھا۔ میری دانست میں یہ راستہ نسبتاً محفوظ اور مختصر تھا۔ میں نے خود کو سنبھال کر ناہموار زمین پر چھلانگ لگا دی۔ جونہی میرے پاؤں زمین سے ٹکرائے، یوں محسوس ہوا جیسے میرے سر پر بم پھٹ گیا ہو۔ درد کی کٹیلی لہر نے آنِ واحد میں میرا ذہن ماؤف کر کے رکھ دیا۔ میں نے اپنا سر تھامنے کی کوشش کی مگر میرے بازوؤں کی سکت جواب دے گئی اور میں تیزی سے نیم ڈھلوانی جگہ پر لڑھکتا گیا اور ایک چھوٹے سے گڑھے میں جا گرا۔ کوئی پانچ منٹ تک میں خالی الذہنی کی کیفیت میں چاروں شانے چت پڑا رہا۔

اس مایوس کُن کیفیت میں کافی دیر گزر گئی۔ سر درد میں کمی ہوئی تو میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اردگرد دیکھا۔ میدان صاف تھا۔ میری خوش بختی عروج پر تھی ورنہ عمومی طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ اغوا کرنے والے ایسی بے پروائی کا مظاہرہ نہیں کرتے جس طرح کی احمقانہ بے پروائی کا مظاہرہ زور آور اور صفی نے کیا تھا۔ اس کی کار کی ڈگی کا کچھ حصہ بڑے دروازے کے پَرے دیوار سے جھانکتا ہوا نظر آیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ مکان کے اندر موجود تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ انہیں ڈرائیور شہر میں یا کسی اور جگہ پر چھوڑ کر واپس چلا آیا ہو۔

میں شکار پر نکلنے والی بلی کی طرح آہٹ پیدا کیے بغیر دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا مکان کے پچھواڑے کی طرف آیا۔ ایک چھوٹی سی پگڈنڈی اینٹوں کے لیے بنائے گئے بڑے چھوٹے گڑھوں کے بیچ بھٹے تک جاتی ہوئی دکھائی دی۔ میں اس پر چل پڑا۔ ہر قدم پر سر میں دھمک پڑتی تھی اس لیے میری رفتار خاصی سست تھی۔ تقریباً سو فٹ دور جا کر میں نے مڑ کر مکان کی طرف دیکھا۔ میرے تعاقب میں کوئی نہیں تھا۔ یعنی کسی کو بھی میرے نکل بھاگنے کا علم نہیں ہوا تھا۔

جوں جوں میں اس مکان سے دور ہوتا جا رہا تھا، میرے سر کا درد کم ہوتا جا رہا تھا۔ شدید سردی میں زمین پر گزاری گئی رات نے میرے جسم کو اکڑا کر رکھ دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دھوپ میں چلنے سے دورانِ خون بہتر ہو رہا تھا اور بدن کی ٹکور ہو رہی تھی۔ بھٹے کے برابر میں پہنچ کر میں بائیں ہاتھ مڑ گیا کیونکہ بھٹے کے قریب ایک قدرے بلند جگہ پر کئی تھیرے اینٹیں تیار کرنے میں مصروف تھے۔ میرا حلیہ ایسا تھا کہ وہ مجھے دیکھتے ہی مشکوک ہو جاتے اور شور مچا دیتے۔ یہ بھی بعید نہیں تھا کہ مجھے پکڑ کر بھٹے کی انتظامیہ کے پاس لے جاتے جو مجھے پولیس کی تحویل میں دے آتی۔ میں ایک مصیبت سے نکل کر دوسری میں پھنسنا نہیں چاہتا تھا، اِس لیے میں نے ایک لمبا چکر کاٹا اور ڈیڑھ دو سو فٹ لمبے اور پانچ فٹ کے لگ بھگ گہرے گڑھے میں سے گزر کر سڑک کی طرف بڑھا۔ بھٹوں کی وجہ سے چہار سُو سطح زمین میں چھ سات فٹ تک کی ناہمواری موجود تھی۔ کوئی خطہ چار فٹ گہرا تھا، کوئی چھ فٹ تو کوئی دو تین فٹ بلند...... پندرہ منٹ بعد میں رابطہ سڑک پر پہنچ گیا۔ اب مجھے کسی سے شہر کے لیے لفٹ لینا تھی۔ یہ گر مشکل نہیں تو آسان کام بھی نہیں تھا۔ لوگ تو بے ضرر دکھائی دینے والے اجنبیوں کو لفٹ دینے سے ڈرتے ہیں جبکہ میں اجنبی ہونے کے ساتھ ساتھ شدید زخمی بھی تھا۔

میں نے یکے بعد دیگرے شہر کی مخالف سمت میں جانے والے دو موٹر سائیکل سواروں کو رکنے کا اشارہ کیا۔ ارادہ تھا کہ ان سے شہر جانے والی سڑک پر پہنچانے کی درخواست کروں گا۔ وہ آہستہ ہوئے، قریب پہنچ کر مجھے دیکھا اور پھر ریس دبا کر آگے نکل گئے۔

شہر کی طرف جانے والے ایک اونٹ ریہڑے والے نے دور سے پوچھا اور ”خیر تاں ہے جوان...... کیوں رَت نال رنگیا کھڑا ایں؟“

(خیریت تو ہے جوان! کیوں خون سے رنگے کھڑے ہو؟)

میں نے سرائیکی میں اُسے بتایا کہ مجھے اینٹوں پر گرنے سے سر میں سخت چوٹ آ گئی ہے اور شہر کے اسپتال جانا چاہتا ہوں مگر کوئی سواری نہیں مل رہی۔

اسی اثنا میں اس نے میرے سامنے ریہڑا روک دیا۔ پھر ہمدردی سے بولا۔ ”آ بیہہ گھِن سوہنا...... شہر آلی سڑک تائیں میڈے کٹھے جل پیا، اُتھوں لاری تے بیہہ وَنجیں۔“

(سوہنا! آ کر بیٹھ جاؤ۔ شہر والی سڑک تک میرے ساتھ چلو، وہاں سے بس میں سوار ہو جانا)

www.pdfbooksfree.pk

اس نے چار ٹائروں والے ریہڑے پر کچی اینٹیں لاد رکھی تھیں جنہیں کسی بھٹے پر اتارنے جارہا تھا۔ اس نے مجھے سہارا دے کر ریہڑے پر سوار کرایا اور اپنے ساتھ اینٹوں پر بٹھالیا۔ وہ پیدائشی مزدور تھا اور محض چالیس کی عمر میں پہنچ کر بوڑھا ہوگیا تھا۔ مزدوروں کی زندگیاں جلد تھک کر اپنی چادر جھریوں کے حوالے کردیتی ہیں۔

اس نے مجھ سے چوٹ آنے کا ماجرا دریافت کیا تو میں نے ایک من گھڑت کہانی سنادی جسے سن کر وہ بڑے دکھ سے بولا۔ ”مزدوری بھی اس دور میں مشکل سے ملتی ہے۔ پسینے کے ساتھ خون بھی بہانا پڑتا ہے۔ مالک کو کام سے غرض ہوتی ہے۔ اسے ذرا ترس نہیں آتا۔ کیا تھا جو تمہیں کار میں بٹھا کر شہر لے جاتا اور پٹی کروادیتا۔ سچا سائیں بھی ایسے بے رحم لوگوں کی جھولیاں بھرتا رہتا ہے۔“

میری کہانی نے اُس کا کوئی زخم کرید کر عیاں کردیا تھا۔ وہ تاسف بھرے لہجے میں بول رہا تھا۔ ”میں صبح سے شام تک اینٹیں ڈھوتا ہوں تب کہیں جاکر دو وقت کی روٹی نصیب ہوتی ہے۔ پر اللہ کا شکر ہے۔ وہ کھانے کو دے رہا ہے۔ یہی بڑی بات ہے۔ پتا نہیں ہماری اتنی نیکیاں بھی ہیں یا نہیں۔“

میں بولنا نہیں چاہتا تھا مگر اس کا خلوص اور ہمدرد رویہ مجھے جواب دینے پر مجبور کردیتا تھا اور ’ہاں، ہوں‘ میں جواب دیتا رہا۔ بھٹوں کے بیچ والی کچی سڑک کو دیکھ کر مجھے زور آور یاد آگیا جو مجھے باندھ کر، میری طویل بے ہوشی سے مطمئن ہوکر شہر چلا گیا تھا۔ دل کو دھڑکا سا لگا کہ اس سے راستے میں کہیں مڈبھیڑ ہوسکتی تھی۔

اگر میرے فرار کے وقت وہ مکان کے اندر تھا تو اسے کسی نہ کسی وقت میرے تعاقب میں نکلنا تھا۔ یہ طے تھا کہ جونہی اُسے میرے فرار کا علم ہوگا، وہ بھوکے بھیڑیے کی طرح میرے پیچھے بھاگے گا اور نظر آنے پر مجھے دبوچ لے گا۔ میں اُس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ میرے بھاگ نکلنے پر وہ بری طرح مشتعل ہوچکا ہوگا اور مجھ پر بدترین تشدد کرے گا۔

زمین زیادہ ٹھنڈی نہیں تھی مگر میرے ننگے پیروں کو یخ بستہ محسوس ہورہی تھی۔ محسوس ہوا کہ میرا جسم بخار پکڑ چکا تھا۔ پیاس اور بھوک بھی شدت سے محسوس ہورہی تھی مگر میں اس وقت سوائے انتظار کے کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ زور آور نے میرا موبائل فون چھین لیا تھا ورنہ میں میروشاہ یا پیاجی کو فون کرکے بلوا سکتا تھا۔

بہ طور احتیاط میں اینٹوں پر اس انداز میں لیٹ گیا کہ کراسنگ کرنے والی گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی نگاہ میں نہ آسکوں۔ لیٹنے کی وجہ سے مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ کچھ دیر بعد ریہڑے بان نے کہا۔ ”اتر جاؤ جوان! شہر والی سڑک آگئی ہے۔ جاکر اس طرف کھڑے ہوجاؤ۔ لاری یا ویگن آئے تو اس پر چڑھ جانا۔“

ساتھ ہی اُس نے ریہڑا روک کر مجھے کمال محبت سے سہارا دے کر نیچے اُتارا اور اونٹ کو ہانک کر بلند آواز میں بولا۔ ”اللہ دی امان ہووی سوہنا! غریب داوس ایہو جتنا ہا......“

(غریب کی استطاعت یہی تھی)

میں سڑک عبور کرکے دوسرے کنارے پر آن کھڑا ہوا۔ گزشتہ دن زور آور نے یہیں سے ٹرن لیا تھا۔ خیال آیا کہ مجھے وہاں نہیں ٹھہرنا چاہیے۔ زور آور یا اس کا کوئی ساتھی کسی بھی وقت یہاں سے گزرتا تو میں نظروں میں آسکتا تھا۔ احتیاط کے پیش نظر میں سڑک سے کوئی پانچ سات قدم دور ایستادہ ایک غیر معمولی پھیلاؤ والے پرانے کیکر کے تنے کے عقب میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ وہاں سے مجھے شہر کی مخالف سمت سے آنے والی ٹریفک دکھائی دیتی تھی مگر شہر سے آنے والا شخص مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

میں اس وقت دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ زور آور کے آنے اور مجھے دیکھ کر رُکنے سے پہلے ہی کوئی بس آجائے جس میں بیٹھ کر میں شہر سدھار جاؤں۔ ہر انسان اپنے تحفظ اور فائدے کی دعا مانگتا ہے۔ کبھی دعا قبولیت کی سند حاصل کرلیتی ہے اور کبھی عرش سے ناکام لوٹ آتی ہے۔ دینے والا قدرت کے ساتھ ساتھ حکمت رکھتا ہے۔ جانتا ہے کہ کس کو کیا دینا ہے اور کیا نہیں دینا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ میری دعا کے قبول نہ ہونے میں کیا حکمت پوشیدہ تھی مگر میں نہیں جانتا تھا۔ تب میری آنکھوں کے سامنے ایک بار پھر اندھیرا چھا گیا جب ڈارک بلو کلر کی کار مکان کی طرف سے آئی، ٹرن لے کر شہر کی طرف جاتے جاتے رُک گئی اور اس میں سے زور آور نکل کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا میری جانب بڑھتا چلا آیا۔ میری ساری خوش گمانی مٹی کا ڈھیر ثابت ہوئی کیونکہ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ اسی ٹریک سوٹ میں ملبوس تھا جو اُس نے کل پہن رکھا تھا۔

اسے دیکھ کر میں بے اختیار اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ دہشت زدہ ہونے کے ساتھ ساتھ حیران بھی تھا کہ اُس نے مجھے کیسے دیکھ لیا تھا؟

اگر اس کے ہاتھ میں وہ منحوس گن نہ بھی ہوتی جو صفی نے میری کنپٹی پر ماری تھی، میں تب بھی بھاگنے کی ہمت نہیں

www.pdfbooksfree.pk

کرسکتا تھا اس لیے کیکر کے تنے کے ساتھ چمٹ کر کھڑا رہا۔ وہ بے خوفی سے میرے بالکل قریب آ گیا اور خلاف توقع مسکرا کر بولا۔ ''شکر ہوا کہ تم مجھے اُس خلا میں سے نظر آ گئے ورنہ مجھے تمہاری تلاش میں سارا شہر کھنگالنا پڑتا۔'' اس نے سڑک کی جانب ایک ہاتھ کا اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ مکان کی طرف سے آنے والی سڑک اور بڑی سڑک کے کنارے اُگی ہوئی بے ترتیب جھاڑیوں میں قدرتی طور پر ایک خلا بنا ہوا تھا جس کے سبب لنک روڈ پر آنے والے شخص کی نگاہ چند ثانیے کو کیکر کے تنے پر پڑتی تھی۔ اس نے مجھے وہیں سے دیکھ لیا تھا۔

وہ بولا۔ ''چلو شاباش! میری کار کی طرف..... میں تمہاری جدائی زیادہ دیر تک برداشت نہیں کرسکتا پیارے.....''

میں نے مدھم آواز میں کہا۔ ''زور آور! تمہاری مجھ سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ جاؤ! مجھے چھوڑ دو۔ میرا شہر میں پہنچنا بہت ضروری ہے۔''

اس نے مخصوص انداز میں دانت بجائے اور زہریلے لہجے میں کہا۔ ''دشمنی نہیں ہے..... ہیں؟ پھر یہ ماراماری کیوں ہو رہی ہے؟'' اس نے گن کی نال کا رُخ میرے سینے کی طرف کیا اور اچانک دانت پیس کر درشت لہجے میں کہا۔ ''کتے کے بچے! اگر تم میرے ساتھ نہیں چلتے تو پھر اُوپر جاؤ..... جنت میں یا جہنم میں.....''

میں نے زچ ہو کر کہا۔ ''آخر تم مجھ سے چاہتے کیا ہو؟''

اس نے جواب دینے کے بجائے گن کی لاک پن ہٹائی اور غرایا۔ ''چل رہے ہو یا.....؟''

میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور ناچار چل پڑا۔ وہ گھوم کر میرے عقب میں آیا اور میری کمر سے گن کی نال ٹکا کر میرے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ چکنی مٹی میں دھنسی ہوئی ایک اینٹ کی نکلی ہوئی نوکیلی نکڑ سے زور آور کو ٹھوکر لگی۔ وہ 'اوہ' کی آواز نکال کر بُری طرح لڑکھڑایا۔ مجھے اس کے گرنے کا فوراً اندازہ ہو گیا تھا اس لیے جھٹ سے پلٹ پڑا۔ دیکھا کہ وہ ہاتھوں کے بل زمین سے اُٹھ رہا تھا۔ میرے لیے مزاحمت کا سنہرا موقع یہی تھا۔ میں نے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر پوری قوت سے اُس کے منہ پر لات دے ماری۔ میرے برہنہ پاؤں کا بالائی حصہ اس کی ٹھوڑی پر لگا۔ وہ فٹ بھر اونچا اُچھلا اور پہلو کے بل ڈھلوان پر گرا اور لڑھک گیا۔ چوٹ تو مجھے بھی آئی تھی اور یوں لگا تھا جیسے پورے بدن میں برقی لہر دوڑ گئی ہو مگر قابل برداشت تھی۔ میں نے سرعت سے اُٹھنے کی کوشش میں مگن زور آور پر چھلانگ لگا دی۔ میرے دونوں گھٹنے اُس کی کمر پر لگے۔ وہ کراہ کر پیٹ کے بل دوبارہ زمین پر گر گیا۔ کیکر کے کانٹوں کی ایک سوکھی شاخ زمین پر پڑی تھی جس کے نوکیلے کانٹے اُس کے پیٹ اور چھاتی میں چبھ گئے۔ وہ دہاڑا اور پہلو کے بل کروٹ لے کر اپنی گن سنبھالنے لگا۔

وہ میرا نشانہ لینا چاہتا تھا مگر مجھ پر دیوانگی طاری تھی۔ میں نے بیٹھے بیٹھے دونوں ٹانگیں ہوا میں بلند کیں اور اُس کی ٹانگوں کے بیچ دونوں ایڑیاں دے ماریں۔ وہ بلبلا کر اُٹھ بیٹھا اور کراہنے لگا۔ میں نے اس کی لمحاتی غفلت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے گن پر ہاتھ ڈال دیا۔

مجھے کار میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے صفی کی طرف سے بھی خطرہ لاحق تھا جو ابھی تک میدان میں نہیں اُترا تھا مگر وہ کسی بھی وقت میرے عقب میں آ کر مجھے بے بس کرسکتا تھا۔

زور آور نے جھٹکا دے کر گن چھڑانا چاہی مگر کامیاب نہیں ہوا۔ میں نے دوسرے ہاتھ کا مکا اُس کی چھاتی پر مارا اور عین اُسی لمحے گن کو جھٹکے سے اپنی جانب کھینچا۔ وہ غافل نہیں تھا اس لیے گن اُس کی گرفت سے نہ نکل پائی۔ میں نے جھنجلا کر اُس پر دیوانہ وار چڑھائی کرتے ہوئے مکوں کی اندھا دھند یلغار کر دی۔ قریب تھا کہ میں اُس سے گن چھیننے میں کامیاب ہو جاتا مگر اُس کا ہوا میں لہراتا ہوا ہاتھ اچانک میری کنپٹی کے عین زخم پر آن لگا۔ یہ میری بدقسمتی تھی ورنہ میں اسے مدافعانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور کر چکا تھا۔ جونہی اُس کا ہاتھ میرے زخم پر پڑا، درد کی کٹیلی لہر میرے رگ و پے میں پھیل گئی۔ لمحہ بھر میں میرا وجود بے جان ہو گیا اور میں کوٹھوں کے بل زمین پر گر گیا۔

زور آور کے ہاتھوں سے پھسلتی ہوئی گن پر میری گرفت ختم ہو گئی اور میں بُری طرح تڑپنے لگا۔ زور آور کو سنبھلنے کے لیے یہ مہلت کافی تھی۔ اس نے میری رانوں اور پسلیوں میں گن کے بٹ کی کئی خربیں لگائیں جن کی تکلیف سر کے زخم کی دھن میں دب کر رہ گئی۔ اشتعال کم ہوا تو اُس نے کپڑے جھاڑے اور مجھے گریبان سے پکڑ کر گاڑی کی طرف گھسیٹنا شروع کر دیا۔ میں بلند آواز میں کراہ رہا تھا اور اُس سے اپنا گریبان چھڑانے کی بے جان کوشش کر رہا تھا۔

میری بدقسمتی تھی کہ اس دوران وہاں سے کسی کا گزر نہیں ہوا تھا۔ یہ میری خام خیالی ہی تھی کہ ادھر آن نکلنے والا کوئی میری مدد کرے گا وگرنہ لوگ پرائے پھٹڑے میں ٹانگ نہیں اڑاتے بلکہ آنکھیں پھیر کر بھاگ جاتے ہیں۔

زور آور مجھے گھسیٹتا ہوا سڑک تک لایا۔ اس دوران کار ریورس ہو کر موڑ کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ جونہی عقبی دروازہ کھول کر زور آور نے مجھے گاڑی میں ٹھونسا، صفی استہزائیہ قہقہہ اُچھال کر بولا۔ ''بڑے ڈھیٹ انسان ہو۔ میں نے تو سمجھا تھا کہ دس پندرہ دنوں تک حرکت کے قابل نہیں رہو گے مگر تم نے مکان سے بھاگ کر کمال کر دکھایا ہے۔ چلوں زور آور؟''

''چلو ڈیئر! دیر ہو رہی ہے۔'' زور آور نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔

میری آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے دائرے بن رہے تھے اور سمٹ کر نقطے کی شکل اختیار کر کے غائب ہو رہے تھے۔ درد کم ہو گیا تو پسلیاں دکھنے لگیں۔ میں نے دانت بھینچ لیے۔ گاڑی چل پڑی۔ میں نے زور آور کی طرف دیکھا۔ وہ بہ ظاہر بے پروا دکھائی دے رہا تھا مگر میں جانتا تھا کہ وہ میری طرف سے لمحہ بھر کے لیے بھی غافل نہیں تھا۔ اس کی گن کی نال کا رُخ میری جانب تھا اور اس کی انگلی ٹرائیگر پر دباؤ ڈالنے کے لیے بے چین تھی۔

میں ایک مرتبہ پھر محنت کے بعد بھی اس کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ دکھ ہوا کہ میری دوسری محنت بھی اکارت چلی گئی تھی۔ تبھی سیٹ پر سر ٹکایا اور آنکھیں موند لیں۔ مجھ پر یک لخت نقاہت اور مایوسی نے شدید حملہ کیا تھا۔ وہ دونوں آپس میں میرے فرار کے بارے میں باتیں کر رہے تھے اور میں سنی ان سنی کر رہا تھا۔ ایسے ہی وقت میں ڈیش بورڈ پر پڑے ہوئے موبائل فون کا بزر بجا۔ صفی نے ہاتھ بڑھا کر موبائل اُٹھایا، کال ریسیو کی اور بولا۔ ''ہاں استاد! بتایا تو تھا کہ کام ہو گیا ہے۔ پھر کیوں فکرمند ہو؟''

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ''یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ آج آؤ، کل یا ہفتہ بعد..... اگر تم چاہو تو ابھی شہر سے نکل پڑو۔ مال تیار ہے۔ تمہیں یہاں رُکنا نہیں پڑے گا۔''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا پھر فون بند کر دیا گیا۔ صفی نے منہ بنا کر فون سیٹ ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔

زور آور نے پوچھا۔ ''استاد کا فون تھا؟''

''ہاں! اسی کی زبان کھجلا رہی ہے۔ خود تو آج تک کچھ کر نہیں پایا مجھے سمجھا رہا تھا کہ یہ بڑا خطرناک شخص ہے..... ہاہ! وہ نہیں جانتا کہ جسے خطرناک شخص قرار دے رہا ہے وہ اس وقت زور آور کے قدموں میں بدسل کتے کی طرح دُم دبائے بیٹھا ہے۔''

زور آور نے تضحیک آمیز نظروں سے مجھے دیکھا اور کہا۔ ''شاید تمہیں یہ غلط فہمی ہے کہ مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔ موبی کے قاتل کے بارے میں..... ہیں؟ سنو! تمہارے پاس ایٹم بم بنانے کا نسخہ نہیں ہے جس کی مجھے ضرورت ہو۔''

میں نے تعجب سے پوچھا۔ ''تو پھر مجھے اغوا کیوں کیا ہے تم نے؟''

وہ زہر خند انداز میں مسکرایا اور بولا۔ ''شہریار! مجھے علم نہیں تھا کہ تم اتنے قیمتی شخص ہو۔ تمہارا ایک چاہنے والا بڑا بے تاب ہو رہا ہے تمہیں دیکھنے اور اپنا مہمان بنانے کے لیے۔ اس کا زور نہیں چلا تو اُس نے تمہیں مجھ سے خرید لیا۔ جانتے ہو کتنے میں؟''

مجھے ذہنی جھٹکا سا لگا۔ حیرت سے دریافت کیا۔ ''کتنے میں؟''

''دس پیٹیوں میں..... میرا مطلب ہے کہ پورے دس لاکھ میں سودا ہوا ہے۔'' اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ ''دس پیٹیاں اِدھر، تم اُدھر..... کہو! کیا خوب سودا نقد ہے، اِس ہاتھ دے، اُس ہاتھ لے۔''

''کون ہے وہ؟ میرا مطلب ہے میرا سودا کرنے والا کون ہے؟''

وہ بولا۔ ''جلد پتا چل جائے گا۔''

وہ فاتحانہ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا اور میری استعجاب انگیز صورت سے حظ کشید کر رہا تھا۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''زور آور! میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تم نے اب میرے الفاظ کی تائید کر دی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ کون اتنی بڑی رقم کے عوض مجھے حاصل کرنا چاہتا ہے مگر یہ واضح ہے کہ وہ میرا بہی خواہ نہیں ہے، میرا دوست نہیں ہے۔ وہ میرا دشمن ہے اور اچھا سلوک نہیں کرنا چاہتا۔ میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوگا، دیکھا جائے گا مگر تم کان کھول کر سن لو۔ تم نے اپنے لیے بہت بڑی مصیبت خرید لی ہے۔ میں کون ہوں، میرے پیچھے کون لوگ ہیں، یہ تمہیں بخوبی علم ہے۔''

اس نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''ارے واہ بھئی واہ! زور آور کو دھمکی دیتے ہو، اسے جسے دیکھ کر ہوا اپنا رُخ بدل لیتی ہے۔ میری خواہش ہوگی کہ تم ایک مرتبہ پھر میرے سامنے آؤ اور میں تمہاری سپاری پکڑوں..... رہی بات میرو شاہ کی، تو تم بھی کان کھول کر سن لو۔ اس حرام زادی شکیلہ کی وجہ سے میں اُسے رعایت دیتا آیا ہوں۔ وہ مجھے..... ہائے..... بہت اچھی لگتی ہے۔ ایک دن میری

www.pdfbooksfree.pk

بانہوں میں جھولے گی، اِسی امید پر اس کتے کے پلّے پر ہاتھ نہیں ڈالا ورنہ وہ کیا اور اُس کی اوقات کیا.....''

میں نے اُسے تاؤ دلایا۔ ''اگر یہی بات ہے تو پھر مجھے میرا یا اپنا موبائل فون دو، میں اُسے کال کرتا ہوں اور تمہارے بارے میں بتاتا ہوں۔''

وہ بہت مکار ذہن کا مالک تھا۔ دانتوں کو مخصوص انداز میں بجانے کے بعد گویا ہوا۔ ''تمہاری خواہش ضرور پوری کروں گا مگر وقت آنے پر.....ابھی نہیں۔''

کار نے اینٹوں کے بھٹوں کے درمیانی راستے پر ٹرن لیا۔ مجھے قسمت وہاں لے کر جا رہی تھی جہاں سے میں اپنی قوتِ ارادی کے بل پر نکل آیا تھا۔ زور آور کی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی اور بے پروائی کے سبب مجھے نکلنے کا موقع ملا تھا۔ وہ دوبارہ مجھے موقع دینے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اُسے سمجھانے اور دھمکانے کی کوشش کی تھی مگر اس کی آنکھوں پر دس لاکھ روپے کی پٹی بندھی تھی۔

دُھول اُڑاتے راستے پر کار ہچکولے لے رہی تھی اور میں اُس تاجر دشمن کے بارے میں سوچ رہا تھا جس نے زور آور کو میرے اغوا کے لیے دس لاکھ روپے کی خطیر رقم دی تھی۔ ظاہر تھا کہ میاں دلبر حسین اور اس کے غنڈے رنگو قسائی کے علاوہ کون ہو سکتا تھا؟ میری وجہ سے اُنہیں نہ صرف دو کروڑ روپے کا نقصان اٹھانا پڑا تھا بلکہ انہیں اپنے تین قیمتی بندوں اور نئی سرف پک اَپ سے بھی ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ جو شخص اپنی جنسی تسکین کی خاطر کروڑوں روپے لٹا سکتا تھا وہ اپنی اَنا کی تسکین پر دس لاکھ خرچ کرتے ہوئے کیوں تذبذب کا شکار ہوگا۔

کار دھول سے اَٹے ہوئے مکان کے چوبی دروازے پر رُک گئی۔ زور آور نے مجھے کار سے اُترنے کا اشارہ کیا اور گن پوائنٹ پر رکھ کر مکان کے اندر لے آیا۔ صحن میں کھڑا ہو کر زور سے چلایا۔ ''دو چارپائیاں نکال دو، ادھر صحن میں۔''

جس کمرے میں سے مشین کے چلنے کی آواز سنائی دے رہی تھی، اس سے ایک پینتیس چالیس سالہ شخص برآمد ہوا۔ اس کا لباس نہ صرف میلا تھا بلکہ مختلف رنگوں سے لتھڑا ہوا تھا۔ وہ اپنے مخصوص حلیے سے پرنٹنگ مشین پر کام کرنے والا کاریگر لگتا تھا۔ اس نے نسبتاً چھوٹے کمرے سے باری باری دو چارپائیاں نکالیں، دیوار کے قریب متوازی بچھائیں اور زور آور سے مودبانہ انداز میں مزید کسی خدمت کا حکم چاہا۔

زور آور میری طرف اشارہ کر کے بولا۔ ''اسے پانی پلاؤ۔''

وہ نلکے سے میرے لیے سلور کے ایک رنگ زدہ گلاس میں پانی بھر لایا۔ مجھے زور کی پیاس لگی ہوئی تھی۔ میں نے گلاس لبوں سے لگایا اور چاہا کہ ایک ہی گھونٹ میں حلق سے اُتار دوں مگر خشک حلق نے مزاحمت کر دی۔ زبردست اُچھو لگ گیا۔ کھانسی کا دورہ سا پڑا۔ کھانستے ہوئے سر میں شدید اور نہایت تکلیف دہ ٹیسیں اُٹھیں۔ گلاس میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور پانی زمین پر بہہ گیا۔

زور آور بڑے غور سے مجھے دیکھ رہا تھا، نفرت آمیز لہجے میں بولا۔ ''سکون سے نہیں پی سکتے تھے کیا؟ اوئے جاؤ! ایک گلاس اور بھر لاؤ اس جانور کے لیے۔''

وہ پھر گلاس بھر لایا۔ میں نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرے۔ معدے میں عجیب سی اینٹھن ہوئی۔ غیر معمولی طویل دورانیہ بھوک اور پیاس کے عالم میں گزرا تھا جس کی وجہ سے شاید جسم کا نظام درہم برہم ہو گیا تھا۔

زور آور طنزیہ مسکراہٹ اُچھال کر بولا۔ ''تمہاری شکل بتاتی ہے کہ تم خاصی تکلیف میں ہو۔''

میں نے اُسے دیکھا مگر کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے مجھے چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر میرے سامنے چند قدموں کے فاصلے پر پڑی ہوئی دوسری چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ایسے میں صفی اُس کے پیچھے سیکیورٹی گارڈ کی طرح چوکس کھڑا تھا۔

''کیا سر کا زخم درد کر رہا ہے؟''

میں نے آہستہ سے سر ہلایا۔

وہ بولا۔ ''لگتا ہے کہ تمہیں بخار ہو گیا ہے، ہیں؟''

''ہاں! ٹمپریچر بھی ہے۔''

اس نے گلاس تھامے کمرے کی طرف جاتے ہوئے شخص کو آواز دی۔ وہ قریب آ کر مودبانہ انداز میں کھڑا ہوا تو زور آور نے کہا۔ ''ہمارے لیے چائے بنا لاؤ۔ کیا تمہارے پاس بسکٹ ہیں؟''

وہ بولا۔ ''بسکٹ تو نہیں ہیں البتہ ہم نے ناشتے کے لیے پاپے رکھے ہوئے ہیں۔ اگر کہیں تو وہ لے آتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، لے آؤ۔ کوئی گولی شولی بھی لیتے آنا، درد بخار کی۔''

وہ چلا گیا تو زور آور مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''اگر چاہو تو چارپائی پر لیٹ جاؤ۔''

اس کی آواز سے طنز کے ساتھ ساتھ ترحم کا موہوم سا

جذبہ بھی جھانک رہا تھا۔ میں نے اُس کی پیشکش سے فائدہ نہیں اُٹھایا اور بیزاری سے آنکھیں موند لیں۔

وہ اور صفی آپس میں محوِ گفتگو ہو گئے۔ مشین مین چائے تیار کر لایا۔ اس نے دیہاتی طرز کا پیالہ اور چند پاپے میرے پہلو میں چارپائی کے بان پر رکھ دیے۔ دوسرے چکر میں پانی اور پیراسیٹامول کی گولیاں لے آیا۔ میں نے دو گولیاں حلق میں پانی کے ساتھ اُتار لیں۔ میرے جسم کو اس وقت ان کی اشد ضرورت تھی۔ پھر میں نے ایک 'پاپا' اُٹھایا، چائے میں ڈبویا اور پچھلے تجربے کے پیشِ نظر تھوڑا سا منہ میں ڈالا۔ منہ کا ذائقہ عجیب تھا اس لیے پاپا بھی بدمزہ لگا۔ چائے کا گھونٹ بھرا، وہ بھی بے مزہ لگی۔ میں نے اوپر تلے تین چار پاپے پیٹ میں اُتار لیے اور چائے کا پیالہ خالی کر دیا۔

زور آور بڑے انہماک سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ایسے ہی وقت میں صفی کے موبائل پر کال آئی۔ اس نے اسکرین کو دیکھا، پھر زور آور سے مخاطب ہوا۔ ''استاد کا فون ہے، کیا کہوں اُسے؟''

زور آور بولا۔ ''اسے کہہ دو کہ مال تیار ہے۔ کسی بھی وقت آ کر وصول کر لے۔ اُسے سمجھا دو کہ بہتر یہی ہے کہ وہ ابھی آ جائے تاکہ ہم ابھی فارغ ہو جائیں۔''

صفی نے کال ریسیو کی۔ کان میں بولنے والے کو سن کر بولا۔ ''استاد! کام ہو گیا ہے۔ زور آور جس کام کا تہیہ کرتا ہے، اسے مکمل کر کے ہی دم لیتا ہے۔ تم مال لینے کے لیے آ جاؤ۔ اور ہاں! یاد سے باقی کی آدھی رقم بھی ساتھ لے آنا۔ پوری پانچ پیٹی مال.....''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا جسے سن کر وہ کھل کر ہنسا اور اوباشانہ انداز میں بولا۔ ''ایسے طعنے نہ دیا کرو بڑے استاد! ہم سب لوگوں کا دین دھرم پیسا ہے۔''

ساتھ ہی اُس نے کال منقطع کر دی اور زور آور سے مخاطب ہوا۔ ''وہ سالا یوں خوش ہو رہا ہے جیسے خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔''

''کب آ رہا ہے؟''

''آدھے گھنٹے میں پہنچنے کا کہہ رہا ہے۔''

زور آور نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ میں نے دیکھا کہ اُس کا حلیہ پہلے سے تبدیل ہو کر موبی جیسا ہو گیا تھا۔ لمبے سیاہ بال جنہیں گردن کے پیچھے پونی یا کلپ میں باندھ رکھا تھا، لمبی قلمیں اور کلین شیو چہرہ..... کھلی شرٹ سے جھانکتا ہوا کسرتی بدن، گلے میں جھولتا ہوا سنہرا لاکٹ جو سونے کا معلوم ہوتا تھا جبکہ داہنی کلائی میں غیر معمولی موٹائی والا کڑا..... دو تین مرتبہ اُس سے پنجہ آزمائی مرحلہ درپیش آیا تھا اور میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ نام کا ہی زور آور نہیں تھا بلکہ اس کے فولادی اعصاب میں غضب کا زور چھپا ہوا تھا۔

پیٹ میں کچھ پڑے تو پرماتما کی سوجھتی ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ جسم میں کچھ توانائی آئی تو ذہن نے تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ سر کا درد بدستور بے چین کر رہا تھا۔ میں نے زور آور اور صفی کو باری باری دیکھا۔ دونوں نے مختلف انداز میں مجھے کور کر رکھا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ میں دونوں کو ایک ہی وقت میں ڈاج دے کر بچ نکلتا۔ زور آور نے شاید میری قلبی کیفیت بھانپ لی تھی، تبھی زہریلی ہنسی ہنسا۔ ''شہریار! شراب بڑی ظالم چیز ہے۔ تمہاری طرف سے بے فکر ہونے کے بعد ہم نے کچھ زیادہ ہی پی لی تھی۔ گہری نیند سو گئے تھے۔ تبھی تمہیں بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا۔ مگر اب ہم جاگ رہے ہیں۔ اگر تم بہادری دکھانے کا ارادہ رکھتے ہوئے تو شوق سے کر گزرو، جو کرنا چاہتے ہو۔ ایسی صورت میں، میں تمہیں زندگی کی ضمانت نہیں دوں گا۔''

میں نے کہا۔ ''شکریہ! میں اپنے خریدار کو زندہ آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''تمہاری میڈم کا کیا حال ہے؟''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اختصار سے جواب دیا۔

''کیا تم نے اُس کا گروپ جائن کر لیا ہے؟''

میں نے اُسے سرد نگاہوں سے گھورا، کہا۔ ''میں اس سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتا۔''

''ہوں.....'' اس نے ہنکارا بھرا، بولا۔ ''کسی دن وہ ایسے ہی شکل پر بے بسی سجائے میرے قدموں میں بیٹھی ہو گی جیسے تم بیٹھے ہو۔ وہ بھی زندگی کی بھیک مانگے گی۔ کیوں صفی؟''

صفی نے جھٹ سے کہا۔ ''وہ دن زیادہ دور نہیں ہے زور آور!''

میرے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری ''خواب دیکھنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔''

وہ مسکرایا۔ ''اگر تم اس وقت تک زندہ رہے تو ضرور دیکھ لو گے کہ میں نے خواب دیکھا تھا یا اپنا پختہ ارادہ ظاہر کیا تھا۔ ویسے بھی زور آور کے آگے اُس حرافہ کی.....''

میرا دماغ سلگ اُٹھا۔ میں نے تنبیہی انداز میں انگلی اُٹھائی اور کرخت لہجے میں کہا۔ ''اس کے بارے میں ایک لفظ بھی اپنی گندی زبان پر نہ لانا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔''

اس نے ٹھٹک کر مجھے بے یقینی سے دیکھا پھر بلند قہقہہ لگایا، ہنستے ہنستے بولا۔ ''ابے دیکھ صفی! یہ..... ہاہا..... یہ بھٹنی کا،

www.pdfbooksfree.pk

سالا..... یہ مجھے کیا کہہ رہا ہے..... ہا ہا..... سنو! میں نے جھوٹ بولا ہے۔ وہ حرافہ نہیں ہے..... بڑی نیکوکار اور پارسا خاتون ہے۔ فلاحی کام کرتی ہے وہ..... اس جیسے ان گنت یتیموں کو بھی پالتی ہے..... ہا ہا!''

میرے تن بدن میں آگ بھڑکی۔ جی چاہا کہ سود و زیاں کے شمار کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے اس کی نکابوٹی کر دوں۔ یہ وقت خود پر قابو پاتے ہوئے درشت انداز میں کہا۔ ''دیکھو زور آور! وہ کیا کرتی ہے؟ وہ کیسی ہے؟ یہ فضول باتیں ہیں۔ تم جانتے ہو کہ وہ میری باس ہے۔ یہ بھی جان لو کہ میں اس کے خلاف کوئی لفظ سننا گوارا نہیں کرتا۔''

وہ مزہ لے کر بولا۔ ''صرف باس؟ بھئی وہ تو خوب صورت جوانی دیکھ کر لچانے والی عورت ہے۔ ہوسکتا ہے اُس نے تمہیں بھی ایک آدھ بوسہ دے کر شباب کی لولی پاپ چوسنے پر لگا دیا ہو..... کیوں صفی! ایسا ہی کرتی ہے ناں وہ..... تبھی تو اُس کے کتے اس کے پیروں کو چاٹتے رہتے ہیں۔ ایک دن موت کا ذائقہ چاٹ کر ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو جاتے ہیں مگر اسے چھوڑتے نہیں۔ تمہارا انجام بھی ایسا ہی ہوگا تیس مار خان..... دیکھ لینا..... زور آور جھوٹ نہیں بولتا۔''

میڈم کوئی پارسا عورت نہیں تھی۔ ایک بہت بڑے گینگ کی چیف باس تھی۔ اس کے اشارے پر بیسیوں افراد جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں نکل آتے تھے۔ اس کی مٹھی میں ان گنت ہوس کے پجاری سرکاری افسر دبے ہوئے تھے جن کی ہوس کے جبڑوں میں وہ مختلف ذائقوں کا جنسی راتب ڈالتی تھی اور تھیلی پر سرسوں جمالیتی تھی مگر زور آور کے منہ سے اُس کا یوں تذکرہ میرے تن بدن میں آگ لگا چکا تھا۔

میں نے سر میں مسلسل دھڑکنے والے ہولناک درد کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے برقی مستعدی سے زور آور پر چھلانگ لگا دی۔ اُسے میری طرف سے ایسی دلیرانہ حرکت کی توقع نہیں تھی تبھی اس کی گن سے گولی نہیں نکل سکی اور میں اُس پر جا پڑا۔ میرا گھٹنا اُس کی چھاتی پر لگا اور وہ چارپائی پر کمر کے بل گر گیا۔ اس کا سر چارپائی کی بانہہ پر لگا۔ چوٹ خاصی شدید تھی جس کی وجہ سے اُس کے حلق سے کراہ کے ساتھ مغلظات ابل پڑیں۔

میں نے اُسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر مکوں اور گھٹنوں کی مسلسل ضربوں پر رکھ لیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ نہ صرف چت ہو گیا بلکہ اس کے ہاتھ سے گن چھوٹ گئی جسے میں نے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اپنی تحویل میں لے لیا۔ صفی مجھ پر بہ آسانی فائر کر سکتا تھا مگر شاید اس نے اس ڈر سے گولی نہیں چلائی تھی کہ زور آور کو نہ لگ جائے۔

زور آور کو بے بس دیکھ کر وہ پستول لہراتا ہوا چارپائی کے قریب آیا اور مجھے گالی دے کر غرایا۔ ''نیچے اُتر و ورنہ گولی مار دوں گا۔''

میں اس دوران میں نہ صرف زور آور کی چھاتی پر بیٹھ چکا تھا بلکہ میں نے عجیب ساخت کی گن کی نالی اس کی پیشانی پر عین دونوں آنکھوں کے درمیان رکھ دی تھی۔ میں نے بے حد سرد لہجے میں کہا۔ ''پستول پھینک دو ورنہ.....''

صفی اور زور آور کے چہرے ایک دم متغیر ہو گئے۔ صفی ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور پھٹی پھٹی نظروں سے پلٹی ہوئی بساط کو دیکھنے لگا۔ میں غرایا۔ ''میں نے کہا ہے کہ پستول پھینک دو ورنہ زور آور کی کھوپڑی میں سوراخ ہو جائے گا۔''

زور آور نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔ ''صفی! اس کی بات مان لو۔''

میری تمام تر توجہ زور آور پر مرکوز تھی۔ وہ لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا اور مجھ پر نظریں ثبت کیے بے حس و حرکت لیٹا ہوا تھا۔ مجھے یہ خوش گمانی نہیں تھی کہ وہ دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ وہ موقع کے انتظار میں تھا جبکہ میں اسے کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

جونہی صفی نے پستول اپنے پیروں میں زمین پر پھینکا، میں نے کہا۔ ''دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔''

اس نے میرے حکم کی تعمیل کی۔ ایسے ہی وقت میں مکان کے باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز ابھری۔ یہ سوچ کر کہ میرے خریدار پہنچ گئے ہیں، میرے جبڑے بھنچ گئے۔ میرے پاس وقت کم رہ گیا تھا۔ میں نے زور آور کی چھاتی سے اُترنا چاہا مگر عین اسی وقت صفی اپنے پستول کی طرف لپکا اور اس نے بے خوفی سے اُٹھا لیا۔ اس کی یہ احمقانہ حرکت میری سمجھ میں تب آئی، جب میں نے اپنے آپ کو بری طرح پھنسا ہوا پایا۔ میں اگر اس پر فائر کرتا تو زور آور میری گرفت سے نہ صرف نکل جاتا بلکہ گن پر ہاتھ بھی ڈال دیتا۔ اگر اسی پوزیشن میں بیٹھا رہتا تو پھر باہر سے آنے والے میرے سر پر پہنچ جاتے۔

زور آور میری ذہنی کشمکش کو بھانپ کر زہریلے انداز میں مسکرایا۔ ''اب کیا ہوگا شہر یار! تم مجھے گولی مار کر بھی یہاں سے زندہ نہیں نکل سکتے۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ گن پھینک دو۔''

مجھے فیصلہ کرنے میں محض ایک لمحہ لگا اور میں نے بجلی کی سی تیزی سے ہاتھ کو حرکت دی اور صفی کا نشانہ لے کر فائر کر

دیا۔ ساتھ ہی میں بائیں ہاتھ لڑھک گیا۔ بہ یک وقت دو چیخیں فضا میں بلند ہوئیں اور میں اسپرنگ کی طرح اُچھل کر چارپائی سے اتر گیا۔ میری چلائی ہوئی گولی صفی کے پیٹ میں اتر گئی تھی اور وہ پستول پھینک کر دونوں ہاتھ پیٹ پر رکھے دُہرا ہو گیا تھا۔ دوسری چیخ زور آور کے حلق سے نکلی تھی۔ صفی کی چلائی ہوئی گولی اُس کی ران میں سوراخ کر گئی تھی اور وہ چارپائی پر گھٹنے سے دوتین انچ اوپر ران کو دونوں ہاتھوں میں بھینچ کر تڑپ رہا تھا۔

میں نے صفی کے جھکے ہوئے سر کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ اس کے منہ سے دردناک کراہ خارج ہوئی اور وہ اوندھے منہ زمین پر گر کر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اس کی کہانی ختم ہو گئی تھی۔ میں نے زور آور کی طرف گن کا رُخ کیا۔ وہ اس دوران چارپائی پر میری جانب منہ کر کے دوزانو بیٹھ گیا تھا۔

میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''نیچے اُتر آؤ جانِ من! یہ نہ ہو کہ مجھے مجبوراً تمہارے سر میں بھی سوراخ کرنا پڑے۔''

اس کا رنگ اڑا ہوا تھا اور دانت بھنچے ہوئے تھے۔ وہ درد کی شدت کو دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آہستہ سے نیچے اُترا۔ کھڑا ہوا پھر بے ساختہ جھک گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ ران پر رکھا ہوا تھا۔

مجھے وقت کے زیاں کا احساس بے کل کر رہا تھا، تبھی غرا کر کہا۔ ''یہ ڈراما بازی بند کرو زور آور..... سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔''

وہ کھڑا ہوا۔ چند قدم دائیں ہاتھ چلا۔ پھر رُک گیا۔ صفی کو چند لمحوں تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ ایسے ہی وقت میں اس کی آنکھوں میں شاطرانہ چمک پیدا ہوئی۔ وہ مجھے خاطر میں لائے بغیر آنِ واحد میں آخری سانسیں لیتے ہوئے صفی پر جھکتا ہوا زمین پر بیٹھ گیا۔

مجھے اس کی چالاکی کی تب سمجھ آئی، جب وہ اچانک پلٹا اور مجھ پر پستول تان کر بولا۔ ''بس بابا! ہاتھ سر سے بلند کر لو۔''

میں نے دانت پیس کر ٹرائیگر دبانا چاہا مگر انگلی کی پوری قوت صرف کرنے کے باوجود ٹرائیگر نہ دبا تو مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ زور آور کی طنزیہ آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''یہ گن صرف دو گولیاں چلاتی ہے جو تم چلا چکے ہو۔ میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول میں اس وقت پانچ گولیاں ہیں جو تمہیں چھلنی کر سکتی ہیں۔ شاباش! ہاتھ اوپر اُٹھا لو۔''

اس دوران میں نے دو تین مرتبہ ٹرائیگر دبانے کی ناکام کوشش کر ڈالی۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی سرزد ہو گئی تھی۔ ایک تو مجھے اِس منحوس گن کے بارے میں معلومات نہیں تھیں کہ اس میں کتنی گولیاں تھیں۔ دوسرا مجھے یہ خیال نہیں رہا تھا کہ صفی کے ہاتھ میں پستول تھا جو میری نادانی کے سبب زور آور کے ہاتھ لگ گیا تھا۔

مجھ پر ہونے والا مایوسی کا اچانک اور غیر معمولی شدید حملہ بڑا اعصاب شکن تھا۔ میں نے جھنجلا کر ہاتھ میں پکڑی ہوئی وزنی گن اُسے کھینچ کر ماری۔ اس نے میرا وار جھکائی دے کر خطا کیا اور صفی کے آخری جھٹکے لیتے ہوئے وجود کے پاس پہلو کے بل بیٹھ گیا۔ اس نے ایک لمحے کو بھی مجھ پر سے نگاہ نہیں ہٹائی تھی۔ اس کے چہرے پر غم، برہمی اور تکلیف کے ملے جلے تاثرات تھے جن کی بدولت اس کی شکل خاصی خوف ناک ہو گئی تھی۔

میں اگر پستول کی پروا نہ کرتے ہوئے اُس پر چھلانگ لگا بھی دیتا تو فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے اس تک پہنچ نہیں سکتا تھا۔ ناچار مجھے اپنے ہاتھ سر سے بلند کرنا پڑے۔

ایسے ہی وقت میں حویلی کے دروازے پر دستک ہوئی۔ ساتھ ہی صفی کی جیب میں پڑا ہوا موبائل بجنے لگا۔ زور آور نے چیخ کر کہا۔ ''دیوار پھاند کر اندر آ جاؤ استاد.....''

میں نے بے ساختہ دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے سے چند قدموں کے فاصلے پر دیوار کی منڈیر پر ایک چہرہ دکھائی دیا۔ اس نے صحن میں ہونے والے بھیانک ڈرامے کو دیکھا، شاید کوئی نتیجہ اخذ نہ کر پایا اور بولا۔ ''زور آور! یہ کیا ہو رہا ہے؟''

زور آور نے بلند آواز میں کہا۔ ''استاد کو بتاؤ کہ سب ٹھیک ہے۔ کوئی خطرے کی بات نہیں ہے۔ اس لونڈے نے خرمستی دکھائی تھی۔ مجھ پر گولی چلا دی تھی۔ اب یہ ہینڈز اَپ ہے..... فوراً اندر آ جاؤ۔''

دیوار پر سے جھانکنے والے نے معاملے کی نوعیت اور سنگینی کو بھانپا اور غائب ہو گیا۔ چند لمحوں بعد وہ پھر دیوار پر نظر آیا۔ اس مرتبہ اس نے دیوار پھاندی اور بھاگ کر دروازے کی چٹخنی اُتار دی۔ دروازہ کھلتے ہی تین آدمی اندر گھس آئے۔ تینوں نے ہاتھوں میں شارٹ گنیں تھام رکھی تھیں جن کا رُخ ہماری جانب تھا۔

میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ چٹخنی کھولنے والے سمیت مکان میں آنے والوں کی تعداد چار تھی۔ ان میں سے کوئی بھی میرا واقف نہیں تھا۔ قیمتی سفید سوٹ میں ملبوس لمبا تڑنگا شخص سب سے آگے چل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بڑی میگزین والی رشین ساختہ ایس کے کے گن تھی۔ اس کی رینج کم تھی مگر نہایت خطرناک تھی۔ وہ نپے تلے قدموں سے چلتا

www.pdfbooksfree.pk

ہوا میرے قریب آن رکا۔ اس کی گن کی نال کا رُخ زمین کی جانب تھا جبکہ اُس کے ساتھیوں نے اپنی گنیں مجھ پر تان رکھی تھیں۔ ایک منحنی وجود کے مالک شخص کے ہاتھ میں گن کے علاوہ سیاہ رنگ کا ہینڈ بیگ لٹک رہا تھا۔

زور آور بولا۔ ''استاد! میری حالت خراب ہے۔ میرا ساتھی اِس مردود کے ہاتھوں قتل ہو گیا ہے۔ اچھا ہوا تم وقت پر آ گئے ہو۔ اسے اپنی تحویل میں لے لو، یہ بہت خطرناک ہے اور اس کی معصوم صورت پر بھروسا نہ کرنا۔''

استاد بڑی دلچسپی آمیز نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ تفہیمی انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ''زور آور! میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔''

اس کی بے حد سنجیدہ آواز سن کر مجھے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے موت کی سی سنگینی رکھنے والی یہ آواز پہلے بھی کہیں سن رکھی تھی۔ کہاں اور کب؟ یہ یاد نہ آیا۔ اس کے ساتھیوں نے مجھے بڑے ماہرانہ انداز میں اپنے گھیرے میں لے لیا جبکہ وہ نپے تلے انداز میں چلتا ہوا زور آور کی طرف گیا۔ اس کے قریب پیروں کے بل بیٹھ گیا اور صفی کی نبض چیک کرنے کے بعد مایوسی سے سر نفی میں ہلا کر بولا۔ ''یہ تو ٹھنڈا ہو گیا ہے زور آور! تم سناؤ، تم ایسے کیوں بیٹھے ہو؟''

''مجھے ٹانگ میں گولی لگی ہے استاد! اسی کم بخت نے ماری ہے۔'' وہ جبڑا بھینچ کر درد کو برداشت کرتے ہوئے بولا۔ ''بس ایک لمحے کو اس پر سے توجہ ہٹی تھی اور اس نے اپنا کام دکھا دیا۔ چونکہ اسے زندہ سلامت تمہارے حوالے کرنا تھا اِس لیے میرے ہاتھوں سے بچ گیا ورنہ صفی سے پہلے اس کی روح پرواز کرتی۔''

''کیا تم چل سکتے ہو؟'' استاد نے پوچھا۔

زور آور ہتھیلیوں کے بل زمین سے تھوڑا اوپر اُٹھا اور بولا۔ ''میری گاڑی اور ڈرائیور یہاں موجود ہیں۔ تم میری فکر نہ کرو اور مال کی قیمت پکا کر لے جاؤ۔ آہ! بڑا جگری یار تھا میرا..... صفدر..... میرا صفی..... پُر زندگی بڑی بے وفا چیز ہے۔ کبھی تو ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ کبھی اچانک بجھ جاتی ہے..... موم بتی کی طرح..... پُر استاد! جس وقت یہ لونڈا تیرے کام کا نہ رہے، اس وقت میرے کو بول دینا۔ میں اسے اپنے پاس لے آؤں گا۔ بہت حساب کتاب ہیں اس کی جانب میرے..... لے جاؤ اسے!''

استاد نے گردن موڑ کر میرے دائیں ہاتھ کھڑے شخص کو مخاطب کیا۔ ''ملغانی! اسے سہارا دے کر چارپائی پر بٹھاؤ اور پانچ لاکھ روپے اسے دے دو۔ ادھر مشین والے کمرے میں اس کے آدمی ڈر کر دبکے بیٹھے ہیں، انہیں جا کر کہہ دو کہ اِسے فوراً شہر لے جائیں ورنہ گولی کا زخم خراب ہو جائے گا۔''

'ملغانی' کا لفظ سنتے ہی میری آنکھیں پھیل گئیں۔ مجھے یاد آ گیا کہ استاد کی آواز میں نے پہلے کہاں سن رکھی تھی اور وہ کون تھا؟ میں بہت بڑی مصیبت میں پھنس چکا تھا۔ وہ استاد ببلو تھا۔ جب وہ فون پر میڈم شکیلہ کو دھمکیاں دے رہا تھا اور خانزادی کا مطالبہ کر رہا تھا، میں میڈم کے پاس موجود تھا۔ تب اُس کی آواز میں نے پہلی مرتبہ سنی تھی۔ کھالے نے مجھے اس کے دستِ راست ملغانی کے بارے بتایا تھا جس کے توسط سے وہ استاد ببلو کے گروپ میں شامل ہوا تھا کہ وہ بہت خطرناک آدمی تھا۔ کھالے، پیاجی اور میر وشاہ، تینوں نے مجھے یہی بتایا تھا کہ استاد ببلو بہت ظالم اور سخت اعصاب کا مالک شخص تھا۔ آج اُسے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ تینوں کی رائے غیر حقیقی نہیں تھی۔ اس کی شخصیت میں موت کا سا ٹھہراؤ تھا جو بہت کم لوگوں کا وصف ہوتا ہے۔

اس کی شخصیت کسی بھی لحاظ سے اُس کے پیشے سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ سیاہ اور سفید بال جنہیں اُس نے بڑے سلیقے سے بغیر مانگ نکالے پیچھے کی جانب ڈال رکھا تھا، سفید و سیاہ مونچھیں اور شیو زدہ ابھرے ابھرے گال..... وہ دیکھنے میں بڑا سیاست دان یا سرکاری آفیسر لگتا تھا۔ میں نے اگر اس کے کرتوتوں کے بارے میں سن نہ رکھا ہوتا تو مجھے پہلا گمان یہی گزرتا کہ وہ پولیس کا اعلیٰ آفیسر ہے۔

ملغانی نے سہارا دے کر زور آور کو کھڑا کیا اور بغلوں میں ہاتھ دے کر چلاتا ہوا اس چارپائی تک لے گیا جس پر کچھ دیر پہلے میرا اور اُس کا دنگل ہوا تھا۔ آرام سے بٹھانے کے بعد اپنے ساتھی کے پاس آیا، اس سے ہینڈ بیگ پکڑا اور پلٹ کر زور آور کے پاس گیا۔ ہینڈ بیگ اُس کی جھولی میں رکھتے ہوئے بولا۔ ''پیارے! اس میں تمہاری مطلوبہ پانچ پیٹیاں موجود ہیں۔ پانچ پہلے آ چکی ہیں۔ چاہو تو گن لو، چاہو تو مجھ پر اعتماد کر لو۔ تمہاری مرضی ہے۔''

زور آور نے اُس پر اعتماد نہیں کیا۔ جان جوکھوں میں ڈال دی جائے تو کسی پر بھروسا کرنے کو دل نہیں مانتا۔ اس نے بیگ کی زپ کھولی۔ نوٹوں کی گڈیاں نکالیں، پرکھیں اور واپس بیگ میں رکھ کر زپ بند کر دی پھر اطمینان بھرے انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ''ناراض نہ ہونا یار ملغانی! اس دھندے میں پڑنے کے بعد اپنے باپ پر بھی اعتبار کرنے کو جی نہیں مانتا۔''

اس دوران استاد ببلو میرے مقابل آن کھڑا ہوا۔ اس

کی سرد نگاہیں میرے وجود کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ نظروں ہی نظروں میں مجھے تول لینے کے بعد بولا۔ ''تمہارا نام شہریار ہے؟''

میں نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہا۔ ''ہاں! مگر تم لوگوں کو مجھ سے کیا دشمنی ہے؟''

اس نے کہا۔ ''تم جانتے ہو۔'' پھر اپنے ایک ساتھی سے جحکمانہ انداز میں مخاطب ہوا۔ ''گاڑی سے کلپ نکال لاؤ۔ ہری اَپ.....''

زور آور ٹشین روم کی طرف منہ کر کے کسی کو بلا رہا تھا۔ وہی ٹشین مین جس نے مجھے پانی اور چائے پلائی تھی، باہر نکلا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب آ گیا۔ خوف زدہ نظروں سے صفی کی لاش کو دیکھتے ہوئے زور آور کے سامنے سہمے سہمے انداز میں کھڑا ہو کر ہدایات سننے لگا۔

استاد ببلو نے مجھے دہشت زدہ کرنے کے لیے سخت لہجے میں کہا۔ ''شہریار! اگر تم میرے ساتھ تعاون کرو گے تو زندہ رہو گے وگرنہ میں رُو رعایت کا قائل نہیں ہوں۔''

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس سے پہلے زور آور نے بھی مجھے یہی دھمکی دی تھی۔ اسی اثنا میں اس کا ماتحت دو عدد بڑے سائز کے آہنی کلپ لے آیا۔ یہ ہتھکڑی کی جدید شکل کے آہنی آلات تھے جنہیں میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اس نے میرے ہاتھ پیچھے کھینچے اور کلپ میں ڈال کر کوئی بٹن دبا دیا۔ 'کلک' کی آواز کے ساتھ ہی میری آزادی سلب ہو گئی۔ میں نے ہاتھوں کو حرکت دے کر اس کلپ کی گرفت کی پختگی کا اندازہ کر لیا۔ اس سے چھٹکارا پانا ناممکن نہیں تو بہت زیادہ مشکل ضرور تھا۔ کلپ لگانے والے نے بڑے ماہرانہ انداز میں میرے لباس کی تلاشی لی۔ پھر قدرے بلند آواز میں بولا۔ ''استاد جی! مال ایک دم اوکے ہے، پیک کر دیا ہے، اب کیا حکم ہے؟''

استاد کے بجائے ملغانی بولا۔ ''اسے باہر لے چلو۔ پیچھے ڈال دو۔ ایک آدمی اس کے ساتھ بیٹھ جائے گا۔''

''پیروں میں کلپ ڈالنا ہے؟''

''ڈال دو.....'' ملغانی نے نخوت سے کہا۔ پھر وہ اور استاد ببلو زور آور کے پاس جا کھڑے ہوئے جبکہ بقیہ دونوں افراد نے مجھے باہر کی سمت دھکیلنا شروع کر دیا۔ دروازے کے عین سامنے سفید رنگ کی بڑی مٹسوبشی پجیرو کھڑی تھی۔ اس کے فرنٹ بمپر پر سبز رنگ کی تختی نصب تھی جس پر 'سمر صوبائی اسمبلی' کے سنہرے الفاظ چمک رہے تھے۔

ایک نے بیک ڈور کھولا۔ دوسرے نے مجھے دھکا دیا اور مجھے چھاتی کے بل بمپر پر گرا دیا۔ میرے جسم کا بالائی حصہ گاڑی کے فرش پر جبکہ ٹانگیں زمین پر تھیں جب دونوں میں سے ایک نے بڑی پھرتی سے کلپ میرے پیروں میں ڈال کر لاک کر دیا۔ پھرتی اور بڑی بے دردی سے مجھے ٹانگوں سے پکڑ کر فرش پر دھکیل دیا۔ شکر ہوا کہ پجیرو کے فرش پر دبیز قالین موجود تھا ورنہ میری چھاتی اور منہ چھل جاتے۔

انہوں نے اس پر اکتفا نہ کیا بلکہ ایک چھوٹے سائز کی ترپال میرے وجود پر ڈال دی۔ یوں لگا جیسے میرا دنیا سے یکسر رابطہ کٹ گیا ہو۔ ان میں سے ایک میرے ساتھ عقبی حصے میں فرش پر بیٹھ گیا جبکہ دوسرے نے دروازہ بند کر دیا۔

میری چھٹی حس نے سمجھا دیا کہ میں شدید خطرات سے دوچار ہو چکا تھا۔ استاد ببلو اور ملغانی سردار حیدر خان کے پالتو غنڈے تھے۔ اسی کے حکم پر مجھے زور آور کے ذریعے اغوا کرا کے کہیں لے جا رہے تھے۔ دونوں بہت خطرناک تھے۔ جو گینگ میڈم شکیلہ پر اندھا دھند حملہ آور ہونے کی جرأت رکھتا ہو، اس کے دائرۂ تحمل کے بارے میں مجھے کوئی خوش فہمی لاحق نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے یقین کی حد تک اندازہ تھا کہ وہ مجھے سردار حیدر خان کے سامنے پیش کرنے والے تھے۔

میرے ذہن میں ڈاکٹر منور علی شاہ کے پاس رات کے اندھیرے میں غنڈوں اور پولیس کے ہمراہ بھیجی جانے والی عورت سے لے کر سی ٹو میں اسما سے ہونے والی ملاقات اور مابعد بیلے والی حویلی پر شب خون اور نور پور میں سردار حیدر خان کے بھیجے ہوئے غنڈوں کی بربریت یاد آئی۔ وہ غنڈے جنہوں نے نہ صرف میرے چاچا اور چاچی کو بے دردی سے قتل کر دیا تھا بلکہ میرے بسے گھر کو آنِ واحد میں تیل چھڑک کر جلا دیا تھا، آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ اسما کو میں اپنے ہاتھوں میاں دلبر حسین کے ڈیرے پر چھوڑ آیا تھا۔ سردار حیدر خان کے نزدیک اس عظیم جرم سمیت میرے جرائم کی فہرست بہت طویل تھی۔ وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ اس کا مجھے اندازہ تھا اور کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔ تبھی میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

میرے ہاتھ پشت پر کلپ میں جکڑے ہوئے تھے۔ پیر بھی بندھے ہوئے تھے۔ ایک مردود میرے سر پر سوار تھا۔ اس کے ہاتھ میں لوڈڈ گن تھی جس کی نال میری چھاتی پر موت کی آخری تحریر لکھنے کو بے تاب تھی اس لیے میں مزاحمت یا خود کو آزاد کرانے کی کوئی کوشش کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہا تھا۔

ہلتے جلتے ہوئے میں نے ہاتھوں کو حرکت دیتے ہوئے

www.pdfbooksfree.pk

کلپ کی مضبوطی کا اندازہ کر لیا تھا۔ چونکہ مجھے اُس کے فنکشن کا علم نہیں تھا، اس لیے اسے کھولنے کی کوشش بے سود تھی۔ وہ جانے چابی سے کھلتا تھا یا کسی خفیہ بٹن سے، معلوم نہیں تھا۔ میں اس انداز سے لیٹا ہوا تھا کہ مجھے اپنے پیر اور پیروں میں کلپ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایک طرح سے مایوس ہو کر میں نے طویل سانس لی اور اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ دیا کہ میں سوائے سوچنے کے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد استاد بہلو اور ریاض ملغانی مکان سے باہر آئے۔ دروازے کھلنے، پھر بند ہونے اور انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی اور مجھے بھیانک انجام کی طرف لے جانے والا سفر شروع ہو گیا۔

میں میڈم شکیلہ کی کوٹھی سے نکل کر عجیب حالات سے دوچار ہوا تھا۔ کسی کو مجھ پر ٹوٹنے والی قیامت در قیامت کی خبر نہیں ہوئی تھی۔ جب مجھے خود علم نہیں تھا کہ مجھے کہاں لے جایا جا رہا تھا اور میرے ساتھ کیا، کیا جانے والا تھا تو کسی اور کو کیا علم ہو سکے گا، یہ صورت حال بڑی مایوس کن تھی۔ میں گھر میں بتا کر آیا تھا کہ مجھے دیر سویر ہو سکتی ہے۔ ایک سے زیادہ دن بھی لگ سکتے ہیں۔ میڈم نے مجھے آرام کرنے کے لیے چھٹیوں سے نوازا تھا۔ وہ تب میرا پتا کرتی، جب مجھے کسی مشن پر بھیجنا مقصود ہوتا۔ تب تک حیدر خان نے میرے بدن کے ریشے ادھیڑ کر رکھ دینے تھے۔

مجھ پر ڈالی گئی ترپال خاصی موٹی تھی۔ جہاں اس نے میرے جسم کو بے حد گرمی دے کر حدت آمیز سکون بخشا تھا، وہیں اُس نے مجھے ہر نظر سے پوشیدہ کر دیا تھا۔ مجھے گاڑی کے پختہ سڑک پر چڑھنے، شہر کی طرف ٹرن لینے اور پھر بڑی سڑک پر چڑھنے کا احساس تو ہوا مگر بعد میں کوئی اندازہ نہیں ہو سکا کہ استاد بہلو مجھے کہاں لے جا رہا تھا۔

مہنگی گاڑیوں کو کسی ناکے پر نہیں روکا جاتا۔ اس مقبوضہ بجیرو کے آگے تو 'ممبر صوبائی اسمبلی' کی سبز نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی جسے رُکنے کا اشارہ کرنے کے جرم میں وردی پوشوں کی پیٹیاں اُتار لی جاتی ہیں۔ مجھے چیکنگ کے نام پر تلاشی اور مدد کا سہارا ابھی میسر آنے والا نہیں تھا۔

سفر میں گھنٹا گزر گیا یا شاید دو گھنٹے گزر گئے تھے، جب گاڑی نے پختہ سڑک چھوڑ دی اور ناہموار کچے راستے پر چل پڑی۔ چونکہ وقت کا اندازہ نہیں تھا اِس لیے میں سفر کی طوالت کا اندازہ بھی نہیں کر سکا تھا۔ پھر اچانک گاڑی رُک گئی اور دروازے کھلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں اپنے قاتلوں کی برات کے ساتھ منزل پر پہنچ چکا تھا۔

کچھ دیر بعد پجیرو کا بیک ڈور کھلا اور مجھے پیروں سے پکڑ کر ترپال سمیت نیچے گھسیٹ لیا گیا۔ پھر اِسی حالت میں گھسیٹتے ہوئے کہیں لے جایا گیا۔ میری کمر میں کئی چھوٹے بڑے کنکر اور کانٹے چبھے مگر میری آہ و بکا شاید کسی کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی۔ یہ مرحلہ بھی آخر کار عبور ہو گیا۔ جونہی میری ٹانگیں چھوڑی گئیں، دھڑام سے زمین پر گر گئیں۔

چند لمحوں بعد چوبی دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی جس سے اندازہ ہوا کہ میں کسی کمرے میں لا پھینکا گیا ہوں۔ ترپال میں لپٹا ہوا زمین پر پڑا تھا اور میرے وجود میں اتنی سکت نہیں تھی کہ ترپال سے نکل جاتا یا اسے ایک طرف سرکا دیتا۔ میرے ہاتھ میرے اپنے وجود کے وزن سے دُکھ رہے تھے۔ کلپ کی کوئی نوک کلائی میں چبھ رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کلائی پر سے ماس اُتر گیا تھا۔

اس جاں کنی کی کیفیت میں کافی دیر گزر گئی۔ پھر دروازہ کھلا، قدموں کی آہٹ مجھ تک آئی اور چند لمحوں بعد میرے اوپر سے ترپال کھینچ لی گئی۔ میں نے کم روشنی کے باوجود استاد بہلو کو پہچان لیا۔ کھلے دروازے میں اس کے دو ماتحت گنیں اُٹھائے چوکس کھڑے تھے۔

استاد بہلو چند لمحوں تک میری آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر بھاری اور دل دہلانے والی سنجیدہ آواز میں بولا۔ ''شہر یار! تم موت کی ایسی کال کوٹھڑی میں پہنچ گئے ہو جہاں سے ضدی اور احمق بھی زندہ نہیں نکل سکتے۔ عقل مند موقعے کی نزاکت کو دیکھ کر مفاہمت کر لیتے ہیں اور اپنی زندگی بچا لیتے ہیں۔ مجھے چند سوالوں کے جواب چاہئیں۔ درست جواب دو گے تو زندہ چھوڑ دوں گا۔ جھوٹ بولو گے تو زمین میں زندہ گاڑ دوں گا۔ مجھے بتانا تھا، بتا دیا، آگے تمہاری مرضی کہ تم اپنے لیے کس راہ کا انتخاب کرتے ہو۔''

میرا دماغ تشویش اور خوف ناک اندیشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ غیر اختیاری طور پر میں نے اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔ میرا خدشہ درست ثابت ہوا تھا۔ یہ وہی کمرا تھا جہاں مجھے دوپٹے سمیت پروین کو یہاں پر رکھے جانے کے ثبوت ملے تھے۔ چوڑیوں کے چند ٹکڑے بھی ہاتھ لگے تھے۔ یعنی استاد بہلو جسے موت کی کوٹھڑی کا نام دے رہا تھا، یہ بیلے کے قلب میں واقع سردار حیدر خان کی وہی حویلی تھی جس پر میں ایک ناکام حملہ کر چکا تھا۔

میں دو چارپائیوں کے بیچ میں فرش پر اپنے اغوا کاروں کے رحم و کرم پر پڑا تھا۔ آنکھیں جھپکے بغیر اُستاد بہلو کو کئی ثانیوں تک دیکھا پھر اپنی آواز کو مستحکم بنانے کی اپنی سی کوشش کرتے

ہوئے کہا۔ ''تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''دنیا مجھے استاد بہلو کے نام سے جانتی ہے، تمہاری میڈم بھی۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تم بھی مجھے جانتے ہو گے۔ کیا میں درست کہہ رہا ہوں؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں! میں تمہیں جانتا ہوں مگر صرف نام کی حد تک۔ آج پہلی مرتبہ تمہیں دیکھا ہے۔ حیران ہوں کہ ایسا کیا پوچھنا ہے تمہیں مجھ سے جس کے لیے تم نے اتنا تردد کیا ہے.....''

اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا، بولا۔ ''کیا تم میرے ساتھ تعاون پر آمادہ ہو؟''

اس کی سنجیدہ آواز سماعت میں اُتر کر دل تک گھسی جاتی تھی۔ یہ خوبی معدودے چند لوگوں کو قدرت کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔

میں نے کہا۔ ''میں کوشش کروں گا کہ تمہیں شکایت کا موقع نہ دوں۔''

وہ میرے قریب آیا اور چارپائی کی بانہہ پر ٹک گیا۔ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''چھوٹی خانزادی کہاں ہے؟''

''چھوٹی خانزادی؟'' میں تعجب سے بولا۔ ''کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں؟''

''سردار حیدر خان کی بیٹی..... جسے تمہاری میڈم نے اغوا کر کے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔'' اس کے چٹان جیسے بے تاثر چہرے کی درشتی میں اضافہ ہو گیا، بولا۔ ''یہ پہلا سوال ہے۔ دوسرا سوال یہ ہو گا کہ تمہاری بہن کہاں ہے؟ تیسرا سوال سائیں دل جیت شاہ کو کس نے اور کیوں اغوا کر رکھا ہے جبکہ میرا تم سے چوتھا سوال یہ ہو گا کہ تم کہاں رہتے ہو؟''

اس نے تھوڑا سا توقف کیا، پھر بولا۔ ''اگر تم مجھے ان سوالوں کے ٹھیک جواب دے دو تو ہو سکتا ہے کہ میں تمہیں زندہ چھوڑ دوں ورنہ تم خان صاحب کے غصے کا شکار ہو جاؤ گے۔''

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے انہی سوالوں کی توقع تھی جو میرے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح انڈیل دیے گئے تھے۔ قدرے بے بسی سے کہا۔ ''مجھے کچھ وقت دو۔ پھر جو کچھ جانتا ہوں، بتا دوں گا۔ سچ سمجھنا یا جھوٹ..... یہ تم لوگوں کی دانست پر موقوف ہو گا۔ اور ہاں استاد بہلو! مجھے زندگی کا لالچ نہ دو۔ میں سردار حیدر خان کو جانتا ہوں۔ اسے میری ایک سانس بھی ناگوار گزرے گی۔''

اس نے کندھے اُچکائے اور بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ تم اچھی طرح سوچ لو۔ میں پھر جا رہا ہوں۔ رات کو لوٹوں گا۔''

پھر چارپائی سے اُٹھ کر دروازے کی طرف گیا اور کسی کو مخاطب کرتے ہوئے قدرے آہستگی سے بولا۔ ''اِسے چارپائی پر ڈال کر لحاف میں لپیٹ دو۔ سردی سے کانپ رہا ہے۔ ہو سکے تو اِسے چائے پانی بھی پلا دُو اور میرے آنے تک اس کا دھیان رکھو۔''

وہ چلا گیا۔ اس کے ماتحت ساتھیوں نے مجھے بے دردی سے اُٹھایا اور چارپائی پر پٹخ دیا۔ بان کی بنی ہوئی چارپائی پر کوئی گدا یا چادر نہیں بچھائی گئی تھی۔ یعنی اُترنے والی رات کی تمام خنکی مجھے اپنے بدن میں اُتارنا تھی۔ پچھلی رات میں نے سیر میں آنے والی چوٹ کی وجہ سے بے ہوشی میں گزاری تھی۔ تبھی رگ و پے میں داخل ہونے والی سردی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ آج ہوش میں تھا۔ سردی کا جان لیوا احساس سردی اُترنے سے پہلے ہی بیدار ہو چکا تھا اس لیے متفکر ہو رہا تھا۔

کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد دونوں کمرے میں آئے۔ ایک نے گن تھام رکھی تھی جبکہ دوسرے نے اپنے ہاتھ میں چائے کا پیالہ اٹھا رکھا تھا۔ یہ وہی تھا جس کے ہاتھ سے ملغانی نے ہینڈ بیگ لے کر زور آور کی جھولی میں رکھا تھا۔

اس نے پیالہ چارپائی کی بانہہ پر ٹکایا اور میرے عقب میں آ کر کلپ کھول دیا۔ ہاتھ آزاد ہونے کے بعد بھی کئی ثانیوں تک کوشش کے باوجود حرکت نہ کر پائے۔ جب شریانوں میں دورانِ خون بحال ہوا تو میں نے چائے کا پیالہ اٹھا لیا۔ گرم گرم دودھ پتی اور میلے کچیلے مگر خاصے بھاری لحاف نے میرے بدن میں کچھ حرارت پیدا کی اور توانائی دی۔ مجھے واش روم جانے کی حاجت ہوئی۔ انہوں نے اجازت تو دے دی مگر پیروں کا کلپ کھولنے سے انکار کر دیا۔ ناچار مجھے ان کا سہارا لے کر چڑے کی طرح پھدکنا پڑا۔ وہ مجھے بازوؤں سے پکڑ کر پھدکاتے ہوئے صحن کی بیرونی دیوار سے ملحقہ واش روم میں لے گئے۔

شام کے سائے رختِ سفر لپیٹ رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں اندھیرا چھانے والا تھا۔ میں نے کمرے کو پہچاننے میں غلطی نہیں کی تھی کیونکہ یہ وہی حویلی تھی۔ غیر اضطراری طور پر میری نگاہ برآمدے میں واقع کچن کم اسٹور کی طرف اُٹھی جس میں مجھ سے پہلے یہاں پہنچنے والے کسی سفاک شخص نے چار جیتے جاگتے انسانوں کو رسیوں کے پھندے دے کر ہلاک کر دیا تھا اور سب کو اسٹور میں اوپر نیچے رکھ دیا تھا۔ اپنے ہاتھوں قتل کیے گئے جسموں کو یوں اُٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا اور اوپر نیچے ترتیب کے ساتھ رکھنا بڑا دل

www.pdfbooksfree.pk

گردے کا کام تھا جو اُس نے میرے اور پپا جی کے اندازے کے مطابق تن تنہا سرانجام دیا تھا۔ میں جس دنیا میں جی رہا تھا، وہاں کی سنگدل فضا میں بھی ایسا کرنا محال تھا۔

میں نے واش روم تک جاتے ہوئے حویلی کا جائزہ لے لیا تھا۔ کوئی بھی قابلِ ذکر تغیر دکھائی نہیں دیا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا اُس رات میں نے اور کھالے نے چھت پر کھڑے ہو کر دیکھا تھا۔ سکوت کو بھانپ کر لگائے گئے اندازے کے مطابق اس وقت حویلی میں سوائے استاد بلو کے، وہی افراد یہاں موجود تھے جو مجھے زور آور سے وصول کر کے یہاں لائے تھے۔ اگر کوئی اور موجود تھا بھی تو وہ مجھے نظر نہیں آیا تھا اور نہ ہی اُس کی آواز میرے کانوں میں پڑی تھی۔

حویلی کے باہر سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں جو میرے کانوں کے پردوں پر ہتھوڑوں کی طرح لگ رہی تھیں۔ بندھے ہوئے پیروں کی وجہ سے مجھے واش روم میں نہایت تکلیف دہ صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا مگر مجبوری تھی۔ میں نے اس دوران آہنی کلپ پر موجود کسی خفیہ بٹن کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ جیسے تیسے حاجت پوری کر کے نکلا تو دونوں کو دروازے پر چوکس کھڑے پایا۔ دبلے پتلے شخص نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ کمرے میں پہنچا کر اُس نے ہاتھوں کو پھر کلپ میں جکڑ دیا۔ رفتہ رفتہ میرے جسم کی توانائی بحال ہو رہی تھی۔

چونکہ زور آور نے مجھے ان کی تحویل میں دیتے ہوئے بہت خطرناک شخص قرار دیا تھا اِس لیے دونوں پہرے دار بہت چوکنے تھے۔ موچھوں والا کمرے سے چلا گیا تھا جبکہ ضرورت سے کہیں زیادہ اسمارٹ پہرے دار ایک چارپائی چھوڑ کر دوسری چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ باوجود اِس کے کہ میں زخمی اور بندھا ہوا تھا، اس نے مجھے مسلسل گن پوائنٹ پر رکھا ہوا تھا۔

شام کا دھندلکا رات کے اندھیرے میں تبدیل ہو گیا۔ چاند فلک پر جگمگا رہا تھا جس کی روشنی اندھیرے کو بھرپور تسلط جمانے کا موقع نہیں دے رہی تھی۔ میرے پہرے دار نے دیا سلائی جلائی اور الماری میں پڑی ہوئی میلے شیشے والی لالٹین روشن کر دی۔ لالٹین کی پیلی روشنی کمرے میں پھیل گئی اور ماحول بڑا عجیب، سوگوار اور پُراضطراب بن گیا تھا۔

میں جانتا تھا کہ مجھے یہاں سے کسی نہ کسی طرح نکلنا تھا وگرنہ بھیانک تشدد اور بے بسی کی موت کا شکار ہونا تھا۔ پپا جی نے ٹریننگ دیتے ہوئے، فارم ہاؤس پر مجھے سمجھایا تھا کہ کبھی تذبذب، پریشانی اور خوف کو اپنے اعصاب پر سوار مت ہونے دینا ورنہ زندہ رہنے کے چانس گنوا کر موت سے پہلے ہی مر جاؤ گے۔ میں اپنے تئیں ذہن پر دہشت اور مایوسی کی یلغار کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا مگر پوری طرح کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔

کافی دیر گزر چکی تھی جب حویلی کے باہر کوئی گاڑی آن رُکی۔ پھر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ چند لمحوں بعد سردار حیدر خان دروازے میں کھڑا دکھائی دیا۔ میں نے اُسے اُس کے مخصوص حلیے کی وجہ سے پہچانا تھا وگرنہ اندھیرے کی وجہ سے اُس کے چہرے کے خطوط دکھائی نہیں دیتے تھے۔ وہ عمومی طور پر آف وائٹ بوسکی یا کرنڈی میں ملبوس رہتا تھا۔ گہرے کیلیجی یا کالے رنگ کی واسکٹ اور ایرانی شال بھی اس کے روزمرہ کے لباس کا حصہ تھیں۔ اس وقت بھی وہ اِسی لباس میں تھا۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد دھیرے دھیرے چلتا ہوا میرے دائیں پہلو میں آن کھڑا ہوا جبکہ استاد بلو اور ملغانی چارپائی کی پائنتی کی جانب ٹھہر گئے۔

میری تمام تر بربادیوں کا ذمے دار یہی شخص تھا جو اِس وقت سینہ تانے میرے سامنے فاتحانہ انداز میں کھڑا تھا۔ اُسے خون میں نہلانا میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ خواہش اپنے ہی خون میں نہا گئی اور میرے ہونٹ بے بسی سے بھنچ گئے۔ میں جو اُسے چشمِ تصور میں زندگی کی بھیک مانگتا ہوا دیکھا کرتا تھا، اِس وقت اسی کے رحم و کرم پر بے بس پڑا تھا۔ کھالا سچ کہا کرتا تھا کہ یہ دنیا پیسے والوں کی ہے۔ یہاں وہی جیت جاتا ہے جو پانی کی طرح پیسا بہانے کا ہنر جانتا ہے۔ بڑا خان جیت گیا تھا اور میں...... اپنے زخموں کا لہو چاٹ رہا تھا...... ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹ رہا تھا......

چونکہ لالٹین اور میرے درمیان سردار حیدر خان کا وجود حائل تھا، اِس لیے اس کا چہرہ دکھائی نہیں دیتا تھا مگر مجھے اندازہ تھا کہ اُس کی آنکھیں اِس وقت شعلے اگل رہی تھیں۔ جبڑوں کے اعصاب بڑی تیزی سے تھرک رہے تھے۔ کئی ثانیے ایسے ہی گزر گئے۔ اچانک اُس نے اپنی بھاری اور کڑک دار آواز میں غلیظ گالی دیتے ہوئے ٹھیٹھ سرائیکی میں کہا۔ ”بڑا لاٹ خان بنتا تھا...... ہوں...... اچھی نسل کا کتا پیروں میں دم ہلاتا رہتا ہے تبھی اچھا لگتا ہے۔ گندی نسل اپنے مالک پر بھونکنے سے باز نہیں آتی، تبھی مٹ جاتی ہے۔ ہمارے کتے ہماری طرف بوتھی اُٹھائیں تو انہیں فائر مار دیا جاتا ہے یا کچلا ڈال کر ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ تم بھی گندی نسل کے کتے ہو۔“

میں نے بہ وقت تمام اپنے کھولتے ہوئے خون کو زہر اگلنے سے روکا اور کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ چند لمحوں کے توقف سے بولا۔ ”بتا اوئے بھتنی کے بچے! خانزادی کہاں ہے؟“

میں نے اپنے ذہن میں گزشتہ حالات کی تجزیاتی فلم چلا کر فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھے کیا بتانا تھا اور کیا چھپانا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”اسما......“

وہ ایک دم تڑپا اور غرایا۔ ”اپنی گندی زبان سے خانزادی کا نام مت لو ورنہ اَبھی زبان کاٹ دوں گا۔“

میرا دماغ گھوما مگر کچھ نہ کر پانے کی حالت میں پڑا ہونے کی وجہ سے خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا، بولا۔ ”وہ میاں دلبر کے پاس ہے۔“

”کیہڑا (کون) میاں دلبر؟“ اس نے سانپ کی طرح بل کھایا۔

”میاں دلبر حسین...... میں اس کے بارے میں بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ لاہور کے علاقے کا کوئی مشہور سیاست دان ہے۔“ میں نے اُس کے غصے کی پروا نہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

اس کے لبوں پر قفل لگ گیا۔ یک ٹک مجھے پھر استاد بلو کو دیکھنے لگا پھر پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بولا۔ ”بلو! ایہہ میں کیا سنداں پیاہاں؟“

(بلو! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟)

بلو کی سرد آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”آپ جو پوچھنا چاہتے ہیں، پوچھیں۔ آپ کے بعد اس کے بیان کی پرکھ کرنا میرا کام ہے۔“

حیدر خان میری جانب مڑا اور دہاڑا۔ ”اگر تم نے جھوٹ بولا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ میاں صاحب کا خانزادی والے معاملے سے کیا تعلق ہے؟“

میرے اندر آگ دہک رہی تھی مگر لہجے کو مودبانہ رنگ دیتے ہوئے بولا۔ ”اس نے خانزادی کو دو کروڑ روپے میں خریدا تھا۔“

”کیوں؟“

”یہ تو میں نہیں جانتا۔ اس نے یہی کہا تھا کہ وہ سردار حیدر خان کے ایما پر یہ سودا بازی کر رہا ہے۔“

حیدر خان کے منہ سے مغلظات کا طوفان اُمڈ آیا۔ اس نے میڈم، میاں دلبر حسین اور مجھے بے نقط سنائیں۔ اس دوران مجھے چار پانچ لاتیں بھی رسید کیں جو لحاف کی وجہ سے زیادہ موثر ثابت نہ ہوئیں۔ استاد بلو نے اپنے منہ پھٹ فرعون کا غصہ ٹھنڈا کیا اور سرد لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ ”شہر یار! اگر تمہاری کوئی بات بھی غلط ثابت ہوئی تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ یہ سوچ کر بولو۔ تمہاری کہی ہوئی بات کو میں پرکھوں گا اور اس کے بعد تمہاری زندگی کا فیصلہ کروں گا۔“

میں نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ میری زندگی کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ جو کچھ جانتا ہوں، بتا رہا ہوں۔“

اسے میری بے خوفی نے مضطرب کیا مگر وہ فوری طور پر اپنے آپ پر قابو پا گیا۔ میرو شاہ نے مجھے اس کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ اپنی قلبی کیفیت کو چہرے تک نہیں آنے دیتا۔ یہ اس کی بہت بڑی خوبی تھی جس کا مظاہرہ میں اپنی آنکھوں دیکھ چکا تھا۔

”خانزادی کو کون میاں دلبر کے پاس چھوڑنے گیا تھا؟“

میں نے کہا۔ ”میں......“

”کہاں؟“

”بورے والا میں۔“ مجھے سخی محمد کی بہم پہنچائی ہوئی معلومات یاد تھیں اور میں نے اپنی کہانی میں صداقت کا رنگ بھرنے کے لیے انہی معلومات کا سہارا لیا۔

”بورے والا شہر میں؟“ اس کی آواز پھٹنے لگی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ بہ دقت تمام اپنے آپ پر قابو پا رہا تھا۔

”نہیں...... کسی مضافاتی گاؤں میں۔“

”بدنسل کتے! اس گاؤں کا کچھ نام بھی تو ہوگا ناں...... کیا بورے والا شہر کے قریب واقع ہے؟“ خان نے پھاڑ کھانے والے انداز میں پوچھا۔

”نہیں...... بورے والا سے دور، دریائے ستلج کے کنارے پر واقع تھا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے گاؤں کے نام کا علم نہیں ہے۔“

”میاں صاحب نے خانزادی کو خود وصول کیا تھا؟“

”نہیں، میں نے میاں دلبر حسین کے حکم پر وہاں کسی ڈیرے پر اس کے کارندے تک خانزادی کو پہنچایا تھا۔“

”اُس کتے کا نام جانتے ہو؟“

”نہیں!“

”پھر تمہیں کیسے پتا چلا کہ خانزادی کو اُسی کے حوالے کرنا ہے؟“

”ہمارے درمیان کوڈ ورڈز طے کیے گئے تھے۔“ میں نے پوری کوشش کی کہ میرا چہرہ میرے جھوٹ کی چغلی نہ کرے۔

”اس ڈیرے کا محل وقوع بتاؤ۔“

میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ”میں پہلی مرتبہ وہاں گیا تھا۔ ڈرائیور کو راستے کا علم تھا۔“

www.pdfbooksfree.pk

"کیا تمہیں راستہ یاد ہے؟" وہ مجھ پر تھوڑا جھکا اور سانپ کی طرح پھنکارا۔ اس کے منہ سے شراب کی ناگوار بو آرہی تھی۔

"ہاں...... میں وہاں جا تو سکتا ہوں مگر لوکیشن کے بارے میں کچھ بتا نہیں سکتا۔" میرا جھوٹ اپنا اثر دکھا رہا تھا اور میرے سر پر مسلط فوری موت کو ٹالنے لگا تھا۔ میری دانست میں اَب وہ اسما تک رہنمائی اور اس کی بازیابی تک مجھے قتل کرنے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔

"خانزادی کو تمہاری کنجری مالکن نے اغوا کیوں کیا تھا؟" حیدر خان پھنکارا۔

میں نے کہا۔ "اس بات کا آپ کو علم ہے خان صاحب......"

اس نے ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر رسید کرتے ہوئے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا۔ "کھوتی دا پتر! میکوں ہر گالھ دا پتا ہے پَر میں تیڈے موں٘ھوں سنن منگداں۔"

(گدھی کے بچے! مجھے ہر بات کا علم ہے مگر میں تیرے منہ سے سننا چاہتا ہوں)

تھپڑ زوردار تھا مگر میرے منہ سے نکلنے والی تیز چیخ کی اصل محرک وہ تکلیف تھی جو زخم دُکھنے سے پہنچی تھی۔ میرا بدن جھٹکے لینے لگا اور منہ سے کراہیں خارج ہونے لگیں۔ اس نے اِسے میری اداکاری سمجھا اور دانت پیس کر غرایا۔ "ہک چاٹ نال اِی تڑفن پے گیا ہے نامرادا...... اوئے اِیندھی موت سڈا ڈیندی پئی ہے ببلو...... اِیں کو سمجھا گھن نی تاں کل دا مردا اَج مر پوسی......"

(نامراد ایک تھپڑ لگنے سے ہی تڑپنے لگا ہے۔ اس کی موت آوازیں دے رہی ہے ببلو! اسے سمجھا دو ورنہ کل کا مرتا آج ہی مر جائے گا)

اس نے فوراً بڑھ کر میری اُتری ہوئی پٹی کھینچ کر اپنی جگہ پر دوبارہ ایڈجسٹ کی اور مجھے دھمکانے کے بجائے برانگیختہ حیدر خان سے مخاطب ہوا۔ "خان صاحب! اس کے سر میں گہرا زخم ہے۔ وہ دکھ گیا ہوگا۔ آپ ذرا ہاتھ ہلکا رکھیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ مردود گزر جائے اور ہماری محنت ضائع ہو جائے۔"

"اوئے! اَب چپ کرو...... بتاؤ! تم نے اپنی بہن کو کہاں چھپا کر رکھا ہے؟" اس نے میرے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیلا۔ ایسا زخم کریدا جس پر میں ابھی تک کوئی مرہم نہیں رکھ پایا تھا۔

میں نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر میری جسمانی سکت جواب دے گئی۔ آنکھوں کے سامنے ایک سورج چمکا اور میں ہوش و خرد کی سرحدیں عبور کر گیا۔

میری بے ہوشی نے وقتی طور پر اس بپھرے ہوئے فرعون سے میری جان چھڑا دی تھی۔ رات کا نجانے کون سا پہر تھا جب میری آنکھ کھلی۔ کمرے میں دھواں پھیلا ہوا تھا جس کی وجہ سے گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ ساتھ والی چارپائی پر گزشتہ دن والے پہرے دار ایک پھول دار رضائی میں لپٹے بیٹھے تھے۔ کمرے کی ایک نکڑ سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ شاید پہرے داروں نے سردی سے بچاؤ کے لیے لکڑیوں کی آگ جلا رکھی تھی۔

میرے بدن پر لحاف موجود تھا۔ اس کے باوجود میں سردی سے کپکپا رہا تھا۔ مجھے اپنے سر کے بال گیلے محسوس ہوئے۔ میرا گریبان اور کالر بھی بھیگا ہوا تھا جس کی وجہ سے سردی کا احساس فزوں تر تھا۔ شاید وہ مجھے ہوش میں لانے کے لیے پانی چھڑکتے رہے تھے پھر ناکام ہو کر آج کا کام کل پر ٹال کر چلے گئے تھے۔

میرے جسم میں پیدا ہونے والی حرکت نے دونوں اونگھتے ہوئے پہرے داروں کو چوکنا کر دیا۔

میں نے کہا۔ "مجھے واش روم جانا ہے۔"

بڑی مونچھوں والے نے برہمی سے کہا۔ "اِس وقت؟ آرام سے پڑا رہ۔ باہر بڑی سردی ہے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے بھی سردی لگتی ہے مگر واش روم جانا ضروری ہے ورنہ......"

میری آواز میرے بدن کی طرح کانپ رہی تھی۔

اس نے میری ادھوری بات کو دھمکی سمجھا، تبھی غرا کر بولا۔ "کیا ورنہ...... کیا کرے گا تو؟"

میں نے بے بسی سے کہا۔ "میں تو کچھ نہیں کروں گا مگر وہ کچھ ہو جائے گا کہ تم لوگوں کا یہاں بیٹھنا محال ہو جائے گا۔"

وہ میری بات میں مضمر 'دھمکی' کو سمجھ گیا تبھی بُرا سا منہ بنا کر اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔ "چل اوئے جیدیا! اس کھوتے کے بچے نے تو مرنا ہی ہے، ہمیں بھی سردی میں مار کر دم لے گا۔"

جیدا مجھے گالی دیتے ہوئے رضائی سے نکل کر چارپائی سے اُترا اور سہارا دے کر بٹھاتے ہوئے بیزاری سے بولا۔ "تمہیں بھی اِس وقت ہی جاگنا تھا۔"

مارے سردی کے میرے دونوں گھٹنے پیٹ سے لگے ہوئے تھے۔ میں نے بے بسی سے کہا۔ "یار! ناراض کیوں ہوتے ہو؟ مجھے بھی اتنی سردی میں باہر نکلنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔"

وہ بھی چڑے کی طرح بے ہودہ انداز میں پھدکتے ہوئے......

اس نے کلپ کھولا۔ پھر دونوں نے مجھے پکڑ کر کمرے سے نکالا۔ باہر واقعی سردی حد سے زیادہ تھی۔ ٹھنڈی ہوا کا تھپیڑا بدن کو چیر گیا۔ میرے دانت بجنے لگے۔ وہ دونوں واش روم کے باہر رُک گئے جبکہ میں اندر چلا گیا۔ باہر چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ اندر اندھیرے کا راج تھا۔ ایک بار پھر وہ تکلیف دہ مرحلہ درپیش تھا جس سے میں ایک مرتبہ پہلے گزرا تھا۔ مضحکہ خیز انداز میں بیٹھ کر بھی میں نے کلپ کو ٹٹولنے کا عمل جاری رکھا۔ کم بخت عجیب ساخت کا تھا۔ اس کا میکنزم سمجھ میں آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ واش روم سے نکلا تو اپنی کپکپاہٹ پر کسی حد تک قابو پا چکا تھا۔

مختصر الوجود جیدے نے میرا ہاتھ پکڑا اور کمرے کی طرف کھینچا۔ ایک امید کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکی اور میں نے بڑی سرعت سے اسے جھٹکا دیا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مڑنے لگا تھا، تبھی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لڑکھڑا کر مجھ سے آن ٹکرایا۔ میں نے بجلی کی سی سرعت سے اس کی گردن کے گرد بازو حمائل کیا، اُسے کھینچ کر پہلو سے لگایا اور پلک جھپکنے کی سی دیر میں اپنا دایاں ہاتھ اُس کی گن پر ڈال دیا۔ وہ جب تک سنبھلتا، تب تک نہ صرف وہ میرے فولادی شکنجے میں جکڑا جا چکا تھا بلکہ اس کی گن بھی میری دسترس میں آچکی تھی۔

میرے غیر متوقع ردِعمل کو بھانپنے اور خود کو سنبھالنے میں اس کے ساتھی کو کچھ وقت لگا۔ اس دوران بساط پلٹی جا چکی تھی، میں غرایا۔ "گن نیچے پھینک دو ورنہ بھون کے رکھ دوں گا۔"

میری گرفت میں مچلنے والا جیدا جسمانی طور پر مجھ سے خاصا کمزور واقع ہوا تھا۔ وہ اپنی تمام تر کوشش کے باوجود خود کو چھڑانے میں ناکام ثابت ہوا تھا۔ اس نے اپنی کہنیاں میرے پیٹ اور کمر پر ماریں۔ تھک کر تھم گیا۔ اَب اسے سانس لینے میں بھی دقت پیش آنے لگی تھی۔ پھر ہولے ہولے کھانسنے لگا تھا۔ اس کا ساتھی مزاحمت کا فیصلہ کرنے میں ہچکچا رہا تھا۔ میں نے اُسے پہلے سے زیادہ درشت لہجے میں گن پھینکنے کا حکم دیا۔ اس نے بے بسی سے جیدے کو دیکھا اور کندھے اُچکا کر گن اپنے قدموں میں زمین پر رکھ دی۔ میں نے اپنے بازو کو زوردار جھٹکا دیا اور کہا۔ "یہاں کتنے لوگ موجود ہیں؟"

اس کے حلق سے آواز نہیں نکلی۔ لمبی مونچھوں والے نے کہا۔ "ہم دو آدمی ہیں۔"

مجھے ایک ذرا تعجب ہوا کیونکہ میرے اندازے کے مطابق دونوں کو یہیں موجود ہونا چاہیے تھا۔ ان کے علاوہ حویلی میں پہلے سے رہائش پذیر لوگوں کی یہاں موجودگی بھی ضروری تھی۔ میں نے پوچھا۔ "ببلو اور ملغانی کہاں ہیں؟"

وہ بولا۔ "دونوں بلوچ نگر گئے ہیں۔ بڑے خان کے ساتھ۔"

بلوچ نگر میں سردار حیدر خان کا محل واقع تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ اپنے آقا کے ساتھ محل کے پُرآسائش ماحول میں شب بسری کی غرض سے چلے گئے تھے۔

مجھے ان کی بات کا یقین کرنا پڑا۔ کیونکہ اگر کوئی اور حویلی میں موجود ہوتا یا گہری نیند سو رہا ہوتا تو میری آواز سن کر اَب تک کھچار سے نکل کر سامنے آچکا ہوتا۔ میں چاہتا تو دونوں کو شوٹ کر سکتا تھا مگر اِس احتیاط کے پیشِ نظر کہ فائر کی آواز مجھے کسی پریشانی سے دوچار نہ کر دے، میں نے گن پھینکنے والے کو چند قدم پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ وہ نہ سمجھتے ہوئے پیچھے ہٹا۔ میں نے جیدے کی گردن کو زوردار جھٹکا دیا اور چاہا کہ اس کی گردن کی ہڈی توڑ دوں مگر ایسا نہ ہوا۔ اس کی ہڈی تو بچ گئی مگر میرا کام ہو گیا۔ اس کے حلق سے نہایت ڈراؤنی خرخراہٹ نکلی اور بدن اچانک ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ جونہی میں نے اس کی گردن چھوڑی، وہ زمین پر بے جان انداز میں ڈھیر ہو گیا۔

اس خطرے کے پیشِ نظر کہ وہ بے ہوشی کی اداکاری نہ کر رہا ہو، میں نے گن کی نال کا کندہ پوری قوت سے اس کی کنپٹی پر دے مارا۔ اس کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی۔ وہ گہری بے ہوشی میں تھا یا زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔

میں نے اطمینان محسوس کیا اور گن کا رُخ چند قدم دور کھڑے ہوئے مونچھ بردار شخص کی طرف کر دیا جو حیرت پاش نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔

اس نے میرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گن کا رُخ اپنی جانب ہوتے دیکھا تو خوف کے مارے ہاتھ سر سے بلند کر لیے اور گھگیانے لگا۔

میں نے کہا۔ "یہ کلپ کیسے کھلتا ہے؟"

"پتا نہیں...... جیدا ہی کھولتا تھا۔" وہ منمنایا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ غلط بیانی نہیں کر رہا تھا۔ موت کو سامنے دیکھ کر جھوٹ بولنا بھی بڑا دل گردے کا کام ہوتا ہے۔ میں نے ڈپٹ کر کہا۔ "ٹھیک ہے۔ مجھے مردوں کو بلانے کا ہنر آتا ہے۔ تم اپنا رُخ دوسری جانب کر لو۔"

وہ پیروں پر گھوم گیا۔ میں پھدکتا ہوا اس کے عقب میں پہنچا اور گن کو نال سے پکڑ کر پوری قوت سے اُس کے سر پر

www.pdfbooksfree.pk

دے مارا۔ اس کے حلق سے چیخ برآمد ہوئی۔ وہ پلٹنا چاہتا تھا مگر دوسری ضرب نے اُسے موقع نہیں دیا۔ سر پھٹنے سے خون کا فوارا چھوٹ پڑا اور وہ لہراتے ہوئے زمین بوس ہوگیا۔

میں زمین پر بیٹھ گیا اور کلپ کو ٹٹول کر اس کا 'چور سوئچ' تلاش کرنے لگا۔ بہ صد کوشش بھی کہیں نہ ملا تو میں پریشان ہوگیا۔ دھیان کیا تو پتا چلا کہ اس منحوس کلپ کی ساخت ایسی تھی کہ میں اسے گولی مار کر توڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ گولی میرے کسی ٹخنے پر لگ سکتی تھی۔ اس سے نجات حاصل کرنا بھی ضروری تھا ورنہ میں دو قدم بھی نہیں چل سکتا تھا۔ میں نے ایک بار پھر کوشش کی۔ قسمت نے ساتھ دیا اور انگلیوں کو ایک ننھا سا ابھار محسوس ہوگیا۔ اُسے دبایا، دائیں بائیں کھسکایا، مگر کلپ نے نہ کھلنا تھا، نہ کھلا۔ پھر میں نے گن اپنے گھٹنے کے ساتھ لگا کر زمین پر کھڑی کی اور جلدی جلدی الٹے سیدھے ہاتھ مارنے لگا۔ ایسے میں اچانک کوئی بٹن دَب گیا اور 'کلک' کی آواز کے ساتھ ہی کلپ کھل گیا۔ میرے رگ وپے میں بجلی بھر گئی۔ گن اُٹھا کر اُچھلا اور حویلی کے دروازے کی طرف دوڑا۔

زندگی کی قوی امید نے میرے تن بدن میں نئی روح پھونک دی تھی۔ سچ کہتے ہیں کہ زندگی چیز ہی ایسی ہے۔ اپنے پاس بلاتی ہے تو مردہ قدموں میں بھی جان پڑ جاتی ہے۔ میں پھاٹک نما بڑے چوبی دروازے پر پہنچ کر ایک ذرا ٹھہرا۔ باہر سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ آوازیں بتا رہی تھیں کہ کتوں کی تعداد ایک سے زیادہ ہے۔ دو یا تین..... مجھے کتوں سے نمٹنا آتا تھا مگر اس وقت میرے جسم پر جما ہوا خون چپکا ہوا تھا۔ سر کا زخم بھی موجود تھا۔ کتوں کو خون کی بو نے دیوانہ کر دینا تھا۔ ایسی حالت میں کتوں پر قابو پانا بہت مشکل تھا۔ میں پلٹا اور برآمدے میں موجود سالخوردہ سیڑھی کی طرف بڑھا۔

ایسے میں مجھے بے ہوش پہرے داروں کا خیال آیا۔ وہ ہوش میں آ کر میرا تعاقب کر سکتے تھے، یہ بھی بعید نہ تھا کہ مڈبھیڑ ہونے پر وہ مجھے گولی مار دیتے۔ میں پلٹا اور تیزی سے جیدے کے قریب پہنچا۔ اس کی نبض چیک کی۔ اس کی زندگی کا چراغ گل ہو چکا تھا۔ بڑی مونچھوں والا زندہ تھا۔ میں نے اُسے اوندھا کیا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہوگیا، گن ایک طرف رکھی اور دونوں ہاتھوں کی کنگھی اُس کی ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر ایک زوردار جھٹکا دیا۔ 'کٹاک' کی زوردار آواز کے ساتھ ہی میرے حلق سے بھی دبی دبی چیخ نکل گئی۔ پوری قوت سے جھٹکا دینے کی وجہ سے میرے سر کا زخم پھر دُکھ گیا تھا۔

میں نے بہ وقت تمام خود کو منہ کے بل گرنے سے بچایا۔ اپنی برہنہ پائی کا خیال کوندے کی طرح ذہن میں لپکا۔ میں نے اس کی بھاری بھرکم نوروزی کھیڑی اُتار کر پہن لی۔ میری جیبیں خالی تھیں۔ اس امید پر کہ اس کے پاس رقم ہوگی، میں نے اس کی جیبیں کھنگالیں۔ چند نوٹ ہاتھ لگ گئے۔ یہی بہت تھے۔ انہیں گنے بغیر جیب میں ڈالا۔ خون آلود کپڑوں پر نگاہ پڑی۔ خیال آیا کہ کمروں کی سرسری تلاشی لوں۔ کوئی سوٹ مل جائے تو پہن لوں پھر ذہن میں تشویش دوڑ گئی۔ میں فضولیات کے چکر میں پڑ کر اپنے لیے خطرات مول لے رہا تھا۔

میں شارٹ گن اُٹھا کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ میں اور کھالا پہلی مرتبہ انہی سیڑھیوں کے ذریعے چھت سے اُتر کر صحن میں آئے تھے۔ بے خوفی سے جانی پہچانی سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آ گیا۔ یقین ہوگیا تھا کہ دو مردہ پہرے داروں والی خونیں حویلی خالی تھی اور مجھے روکنے والا کوئی زندہ نہیں بچا تھا۔ چاروں جانب پھیلی ہوئی چاندنی میں دیکھا بھالا منظر جگمگا رہا تھا۔ چونکہ میں نے بیلے والا راستہ دیکھ رکھا تھا اس لیے میں نے ادھر کا رُخ کرنا مناسب سمجھا۔ بلوچ نگر والے راستے پر جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

میں نے گن اپنی قمیص کے پلو سے باندھی اور نیچے اُتر آیا۔ مجھے کتوں کے ٹکراؤ کا اندیشہ تھا۔ ان کے بھونکنے کی آوازیں حویلی کے اگلے حصے کی طرف سے بلند ہو رہی تھیں مگر میں متفکر تھا کیونکہ کتوں کے سونگھنے کی حس بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ناہموار زمین پر درختوں کے بیچ سے گزرتا ہوا میں کھیت میں آ گیا۔ سامنے جھنگی تھی جہاں میں پہنچنا چاہتا تھا۔ چڑھے چاند کی دودھیا روشنی میں چلنا مشکل نہیں تھا مگر میرے بخار زدہ جسم پر نقاہت طاری تھی جبکہ مجھے سڑک تک پیدل چلنا تھا۔ سفر زیادہ اور پُرخطر تھا۔ بھیڑیوں اور آوارہ کتوں کا سامنا بھی ہوسکتا تھا۔

میں احتیاط سے چلتا ہوا جھنگی تک پہنچ گیا۔ کتوں کا خطرہ ٹل گیا اور میری رفتار قدرے تیز ہوگئی۔ سرد ہوا کے تھپیڑوں نے مجھے غلطی کا احساس دلایا۔ میں نے مردہ پہرے دار کے جوتے اُتار کر پہنے تھے مگر اُس کا کوٹ اُتارنے کا خیال نہیں آیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں سرکنڈوں اور جنگلی گھاس میں چھپے ہوئے پر پیچ راستے پر جنوب کی طرف سفر کر رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق ڈیڑھ سے کچھ اوپر کا عمل تھا۔ رات

بہت سرد تھی۔ دریا کے قرب کی وجہ سے فضا نم اور مرطوب تھی۔ سردی کے مارے میرے ہاتھ پیر سن ہو رہے تھے مگر میں رکنا نہیں چاہتا تھا تبھی مسلسل چل رہا تھا۔ خان کی حویلی بہت دور آ گیا تھا مگر پوری طرح چوکس تھا۔

اندازے کے مطابق میں نے نصف راستہ طے کر لیا تھا جب مجھ پر نقاہت اور یخ بستگی طاری ہونے لگی تھی۔ یلغار کی شدت غیر معمولی تھی۔ ہاتھوں اور پیروں کے بعد اب میرا دماغ بھی مکمل ہونے لگا تھا اور عجیب سی خالی الذہنی کی سی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ یہ بہت خطرناک بات تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں بارہا انتہائی سرد راتوں میں فصلوں کی آبیاری کی تھی۔ نہر کے پانی کو کھال کھال چلا کر فصلوں تک پہنچایا تھا۔ تب بھی ایسی کیفیت سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔

مجھے خدشہ لاحق ہوا کہ میں پکی سڑک تک پہنچنے میں شاید کامیاب نہیں ہوسکوں گا۔ یہ بے سروسامانی سفر میری قوتِ ارادی اور جسمانی استعداد سے زیادہ تھا۔ میں نے ایک موہوم سی اُمید کا سہارا لیا اور شیشم کے ایک قدرے بلند قامت درخت پر چڑھ کر اردگرد دیکھا۔ کسی گھر یا ڈیرے کے آثار دکھائی نہیں دیے۔ مغربی جانب کوئی دو میل دور دریا دکھائی دے رہا تھا۔ دریا کے کنارے کوئی بستی آباد نہیں تھی۔ میرے چاروں طرف کوندر اور جنگلی گھاس پھیلی ہوئی تھی۔ میں درخت پر ایک کرسی نما جگہ پر تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ کر ہاتھ مسلنے لگا۔ کاش! میرے پاس ماچس ہوتی تو میں گھاس پھونس کو آگ لگا کر اپنے منجمد ہوتے ہوئے جسم کو حرارت دے لیتا۔ مجھے ایک مرتبہ پھر اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا۔ حویلی سے نکلتے ہوئے میں قمیص یا کمبل اور دیا سلائی اپنے پاس رکھ سکتا تھا جس کا مجھے اس وقت ہرگز خیال نہیں سوجھا تھا۔ اس وقت تو مجھ پر محض حویلی سے جلد از جلد بھاگ نکلنے کی دھن سوار تھی۔

میں نے درخت پر بیٹھ کر بہت بڑی غلطی کی تھی۔ جلد ہی مجھے اپنی اس غلطی کا احساس ہوگیا۔ گھنے سرکنڈوں اور کوندر میں گھرے ہوئے راستے میں ہوا نہیں لگتی تھی۔ درخت پر بیٹھا تو یخ بستہ ہوا بدن سے پار ہونے لگی۔ میں زیادہ دیر تک یہاں بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ اپنے ذہن پر چھائی ہوئی مایوسی کی دبیز دھند کو نوچ پھینکنے کی کوشش کی اور زندگی کے آخری لمحے تک بقا کی جنگ لڑنے کا فی الفور فیصلہ کر لیا۔ قمیص کا عقبی پلو پھاڑا اور سر پر باندھ لیا۔ کچھ سکون محسوس ہوا اور میں درخت سے اُتر آیا۔ ایک مرتبہ پھر اپنی قوتِ ارادی کو بروئے کار لاتے ہوئے چل پڑا۔

میں بیٹ والے موڑ پر آ کر ایک ذرا رُکا۔ سامنے وہ راستہ تھا جو ڈیرا روڈ پر جا چڑھتا تھا۔ بائیں ہاتھ پر وہ تنگ اور دشوار گزار راستہ تھا جو نہر کی پٹڑی سے جا ملتا تھا۔ یہ نہر چوک قریشی سے قصبہ گجرات اور محمود کوٹ جانے والی سڑک کو کراس کرتی ہوئی اس طرف آتی تھی اور بل کھا کر ڈیرا روڈ کو بیٹ کے مقام پر عبور کرتی تھی۔ یہ معلومات مجھے کھالے نے بہم پہنچائی تھیں۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ اگر میں اس وقت بیلے سے نکل کر بڑی سڑک کے ویران مقام پر جا کھڑا ہوا تو کوئی ڈرائیور مجھے دیکھ کر گاڑی روکنے کی ہمت نہیں کرے گا۔ بیلے کا خطرناک بیابانی مقام، میرا نا گفتہ بہ اور مشکوک حلیہ، ہاتھ میں پکڑی ہوئی شارٹ گن اور سر پر بندھی ہوئی خون آلود پٹی..... رات کے اِس پہر میں کوئی فاتر العقل شخص ہی اتنا بڑا خطرہ مول لینے کا روادار ہوسکتا تھا۔ اگر میں بیٹ والی بستی کی طرف جا نکلتا تو کسی نہ کسی گھر سے مدد ملنے کی توقع کی جاسکتی تھی۔ اس میں خطرہ یہ تھا کہ مدد دینے والا پولیس کو مطلع کر سکتا تھا اور مجھے بے خبری میں سرکاری پنجرے میں پھنسا سکتا تھا۔

دونوں اطراف خطرہ موجود تھا۔ اگر میری حالت درست ہوتی اور حلیہ مشکوک نہ ہوتا تو میں یقیناً بستی کا رُخ نہ کرتا۔ اپنے دم بہ دم ناتواں ہوتے ہوئے وجود کو سنبھالا دینے کی خاطر میں نے نہ چاہتے ہوئے نہر کی پٹڑی کی طرف جانے کا ارادہ کیا۔ بستی کے کسی دروازے پر دستک دیے بغیر میں آگ جلا کر سینک سکتا تھا۔ لائن کے ہوٹل پر جا کر کھانا کھا سکتا تھا، چائے پی سکتا تھا اور کسی ٹرک ڈرائیور کی منت سماجت کر کے ملتان کی طرف عازمِ سفر ہوسکتا تھا۔ یہ راستہ بہت دشوار گزار اور ناہموار تھا۔ اگر آسمان پر چاند جلوہ گر نہ ہوتا تو شاید میں نہر کی پٹڑی تک پہنچ ہی نہ پاتا۔ ٹھوکر کھا کر گرنے کے بعد اُٹھنے کا یارا نہ تھا۔

جب میں بیٹ والی خوابیدہ بستی میں پہنچا تو میرے قدم بُری طرح ڈگمگا رہے تھے۔ وزنی نوروزی کھیڑی میرے پیروں کو بُری طرح کاٹ رہی تھی مگر میں اُسے اتار پھینکنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ میں کوئی گھنٹا بھر پیدل چلا تھا۔ عام حالات میں میرے نزدیک یہ کوئی بڑی مسافت نہیں تھی مگر رات کے اِس پہر کی جان ہوا سردی میں چند قدم چلنا دو بھر تھا جبکہ میں نے کم وبیش آٹھ دس کلومیٹر کا سفر طے کر لیا تھا۔ توقع کے برعکس بستی کے کتوں نے میرا استقبال نہیں کیا تھا اور میں خاموشی سے گلیوں میں سے گزرتا ہوا پکی سڑک پر آ گیا۔ اندازہ تو تھا کہ اس وقت سڑک پر ٹریفک

www.pdfbooksfree.pk

بہت کم ہوگی مگر ٹریفک بہت کم، بلکہ نہ ہونے کے برابر تھی۔

یہ چھوٹا سا عام نوعیت کا اڈا تھا۔ یہ مشکل بیس تیس دکانیں تھیں جو اِس وقت بند تھیں۔ پھلوں کی ریڑیاں اور سبزیوں کے پھٹے ترپالوں میں لپٹے ہوئے تھے جبکہ اڈے کے اکلوتے چھپر ہوٹل کے باہر بھی سرکنڈوں کی بنی ہوئی چق دکھائی دے رہی تھی۔ آگ سینکنے کی خواہش آمیز توقع دم توڑ گئی۔ میں چند لمحوں تک نہر کے پل پر بنی ہوئی چھوٹی سی کنکریٹ کی دیوار پر بیٹھا رہا پھر پھلوں کی ایک ملفوف ریڑی کی طرف بڑھ گیا۔

تھوڑی سی تگ ودو کے بعد میں دو تین کیلے نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔ انہیں ندیدوں کی طرح حلق سے اُتارا۔ نلکے کی ٹونٹی سے منہ لگا کر پانی پیا، شارٹ گن کی نال کو چوما اور پل کے قریب پڑے ہوئے بند چوبی کھوکھے کے نیچے پھینک دیا۔ ایک ہتھ ریڑی پر سے قدرے بہتر حالت کی ترپال اُتار کر چادر کی طرح اپنے جسم پر لپیٹ لی۔ اب میں پہلی نظر میں مشکوک دکھائی نہیں دیتا تھا اور سرد ہوا سے بھی محفوظ ہوگیا تھا۔ اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے سڑک کے کنارے پر آ کر کھڑا ہوگیا۔ گزرنے والے دو تین ٹرکوں کو رکنے کا اشارہ کیا۔ ایک لانگ روٹ کی بس بھی ہارن بجاتی ہوئی گزر گئی۔ پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ مجھے ڈر لاحق ہوا کہ کوئی پولیس کی گاڑی اِدھر نہ آ نکلے۔

رنگ برنگ بتیوں کے جلو میں آتی ہوئی ایک بس دکھائی دی تو میں نے دونوں بانہیں لہرا کر ڈرائیور کو رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ نہیں رُکی مگر اُس کے عین پیچھے آنے والی کالٹس کار رُک گئی۔ ایک شوخ آواز سنائی دی۔ ''اوئے جہاز..... کتھو ویسیں؟''

(اوئے جہاز! کہاں جاؤ گے؟)

میں جلدی سے قریب ہوا۔ کار کی اندرونی لائٹ آن تھی۔ دھمک دار آواز میں ٹیپ پلیئر پر لتا منگیشکر کا کوئی گیت چل رہا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر نہایت وجیہہ اور خوش لباس جوان بیٹھا ہوا تھا جو پہلی نظر میں کھلنڈری طبیعت کا مالک معلوم ہوا۔

میں نے کہا۔ ''مجھے مظفر گڑھ جانا ہے۔''

وہ بڑی معصومیت سے بولا۔ ''تو جاؤ' میری طرف سے تمہیں کھلی اجازت ہے۔''

میں نے دروازے پر جھک کر ملتجیانہ انداز میں کہا۔ ''کوئی سواری نہیں مل رہی ہے اس لیے براہِ کرم مجھے لفٹ دے دیں۔''

وہ حیرت اور دلچسپی آمیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''حلیے سے جہاز لگتے ہو۔ لہجے سے پائلٹ افسر جبکہ شکل سے زخمی مزدور..... کمال کے آدمی ہو یار تم..... چلو آؤ بیٹھ جاؤ۔ کیا یاد کرو گے۔''

میں نے عقبی دروازہ کھولا تو وہ جلدی سے بولا۔ ''نہیں یار..... اگلی سیٹ پر آؤ۔''

میں اس کے برابر بیٹھ گیا تو اس نے شیشہ چڑھا دیا اور گیئر لگاتے ہوئے بولا۔ ''تم نے سر پر جو کبھی دور کی ٹوپی اوڑھ رکھی ہے۔ ایک پٹی جھانک رہی ہے جس پر خون لگا ہوا ہے۔ کیا ہوا؟ کہیں یہ جہاز غلطی سے بجلی کے کھمبے پر لینڈ تو نہیں کر گیا؟''

میں نے جلدی سے کہا۔ ''میں نشئی نہیں ہوں۔''

اس نے مصنوعی تعجب سے کہا۔ ''اچھا! تم نشئی نہیں ہو..... تو پھر یقیناً میں نشئی ہوں۔ نشہ کرتا ہوں۔''

''میں نے یہ تو نہیں کہا۔''

''کہہ بھی لو تو کیا فرق پڑ جائے گا۔'' اس نے ایک قہقہہ لگایا اور اسٹیئرنگ پر انگلیاں بجاتے ہوئے گنگنانے لگا۔ ''یارو! مجھے معاف کرو، میں نشے میں ہوں..... یارو!''

وہ دیکھنے میں نہ صرف بہت ہینڈسم، پڑھا لکھا اور نفیس مزاج تھا بلکہ خاصا خوش ذوق اور خوش گفتار بھی واقع ہوا تھا۔ گاڑی اَپ ماڈل کی تھی۔ اس نے بڑا شاندار سوٹ پہن رکھا تھا۔ بال نسبتاً چھوٹے اور فوجیوں کے انداز میں تراشیدہ تھے۔ چونکہ گاڑی کا ہیٹر چل رہا تھا اِس لیے اس کی سیٹ پر کوٹ لٹک رہا تھا۔

اس کی گنگناہٹ تھم گئی۔ ہونٹ سیٹی بجانے کے انداز میں سکڑ گئے، بولا۔ ''یار! تم نے میرا ایکسرے کر لیا ہے۔ اپنی الٹرا ساؤنڈ رپورٹ بھی دکھا دو۔ میرا مطلب ہے کہ تم کچھ اپنے بارے میں کہو، خاموشی مجھے اچھی نہیں لگتی۔''

میں نے کہا۔ ''میں مصیبت کا مارا ہوا شخص ہوں، اس کے سوا میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے دوست.....''

خود پر قابو پانے کے باوجود میرے لہجے میں تلخی گھل گئی، وہ بولا۔ ''ہوں..... یہ دنیا، دنیا نہیں، مصیبت گاہ ہے..... ٹارچر سیل۔ یہاں ہر کوئی مصیبت میں ہے۔ کوئی نئی بات کرو' بتاؤ..... اپنی اس امپورٹنڈ شال پر روشنی ڈالو۔ ایسی خوبصورت شالیں بے قدرے لوگ اپنی گاڑیوں پر ڈال دیتے ہیں، ہے نا؟''

اس کی آنکھوں میں شرارت بھری ہوئی تھی۔ میں نے شرمسار ہو کر کہا۔ ''ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔''

''اور ایجاد کی ماں کے ہوتے ہوئے بھی تم سردی سے

کانپ رہے ہو۔'' وہ ہنسا۔ ''زخم کا خون جما ہوا ہے۔ لگتا ہے، کافی پرانا ہے۔ یقیناً تمہیں پٹی بدلوانے کا وقت نہیں ملا۔ تمہارا نام کیا ہے؟''

''اسلم علی۔'' میں نے جھوٹ بولا اور سر جھکا لیا۔

میں اس کی نظروں میں مشکوک ہوگیا تھا۔ وہ مجھے نشئی سمجھ رہا تھا اور میں اپنے دفاع میں خود پر ڈھائی جانے والی قیامت کو اس پر آشکار نہیں کر سکتا تھا اس لیے خاموش ہوگیا۔

وہ بولا۔ ''کہاں سے آ رہے ہو؟ اب یہ نہ کہنا کہ میں وہاں سے آیا ہوں، جہاں سے ہر آدمی آتا ہے۔''

''میں بیلے سے آ رہا ہوں۔''

''کیا مظفر گڑھ میں رہتے ہو؟''

''نہیں..... ملتان میں رہتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''ادھر کیا کرنے آئے تھے؟'' وہ بولا۔ ''صبح کی سیر کا سن رکھا ہے، رات کی سیر کا تذکرہ کسی کتاب میں نہیں ہے۔ اس لیے یہ جواب نہ دینا۔''

''میں رشتہ داروں سے ملنے آیا تھا۔''

''اور انہوں نے پہچاننے سے انکار کرتے ہوئے ذرا ٹھکائی شکائی کر دی..... چچ..... چچ..... کہا ناں کہ یہ دنیا ٹارچر روم ہے..... نہیں بلکہ ٹارچر کمپلیکس ہے۔'' وہ ہنسا۔ وہ ہنستا ہوا بہت اچھا لگتا تھا۔ ایسے ہی وقت میں ہم چوک قریشی سے گزرے۔ پورا قصبہ گہری نیند میں مستغرق تھا۔ اڈے پر کوئی دکان کھلی ہوئی نہیں تھی۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ''ڈیئر! میں اگر چاہتا تو چوک قریشی کے تھانے کے سامنے گاڑی روک دیتا اور تمہیں گیسٹ ہاؤس میں پہنچا کر مصیبتوں سے نجات دلا دیتا مگر میں اَب تک تمہیں پہچان نہیں سکا۔ تم واقعتاً کسی مصیبت میں ہو یا پیشہ ور ڈاکو ہو.....''

میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میں چور ڈاکو نہیں ہوں۔''

''تو کیا پٹواری ہو؟'' وہ ہنسا۔ ''اگر تمہارا جواب 'ہاں' میں ہوا تو یہ بھی بتا دینا کہ تمہارا بستہ کہاں ہے۔''

''نہیں.....'' میں نے کہا۔ ''میں پٹواری نہیں ہوں۔ مزدور ہوں۔ تم بتاؤ! تمہارا نام کیا ہے؟''

''میرا نام..... میرا نام یہ لکھا ہوا ہے، پڑھ لو۔''

اس نے ڈیش بورڈ پر ننھے ننھے الفابیٹیکل اسٹکرز کی مدد سے لکھے ہوئے نام کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے زیرِ لب پڑھا۔ ''شاہد.....''

''ہوں..... یار تم تو پڑھے لکھے آدمی ہو۔ لفٹ مانگنے کے علاوہ کیا کام کرتے ہو؟'' میری سمجھ میں آ گیا کہ اُس نے نام بتانے کے بجائے انگریزی میں لکھے ہوئے نام کی طرف اشارہ کیوں کیا تھا۔

''کہا تو ہے کہ مزدوری کرتا ہوں۔''

''ریس کورس گراؤنڈ میں گھوڑوں کو نہلاتے ہو؟'' اس نے کمال سنجیدگی سے پوچھا۔

''نہیں تو.....!'' میں چونکا۔ ''میں زمیندارہ کرتا ہوں۔''

''ملتان شہر میں؟'' وہ ہنسا۔

''نہیں..... ملتان کے قریب، گاؤں میں۔''

''جھوٹ..... تمہاری آواز بتا رہی ہے کہ تم نے مجھ سے جھوٹ بولنے کا آغاز کر دیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اب مجھے تمہارا انٹرویو بند کر دینا چاہیے۔'' اس نے کہا اور آٹو ریورس ٹیپ پلیئر کا بٹن پش کر کے کیسٹ کی سائڈ بدل دی۔ لتا کے ہم آواز گنگنانے لگا۔ ''ہم نے صنم کو خط لکھا، خط میں لکھا..... اے دل ربا، دل کی گلی.....''

اس کی گنگناہٹ اچانک تھم گئی۔ مجھے دیکھے بغیر سنجیدہ لہجے میں مخاطب کر کے بولا۔ ''مسٹر! اگر تم خود کو غیر محفوظ سمجھتے ہو اور تمہیں کسی دشمن کا خوف ہے تو گلوو کمپارٹمنٹ میں سے میرا پستول نکال لو۔ فلی لوڈڈ ہے، کام آئے گا۔''

میں نے ٹھٹک کر اُسے دیکھا کہ وہ مذاق تو نہیں کر رہا تھا۔ اُسے سنجیدہ پا کر میں نے کہا۔ ''شکریہ! مجھے ضرورت نہیں ہے۔''

وہ قدرے تحکمانہ لہجے میں بولا۔ ''کھولو تو سہی۔''

میں نے بے دلی سے گلوو کھولا۔ اس نے درست کہا تھا۔ ایک چھوٹے سائز کا سلور کلر کا پستول پڑا ہوا تھا۔ میں نے پستول کو چھوئے بغیر شاہد کو سوالیہ نظروں سے دیکھا، وہ بولا۔ ''چیک کرو، ایک دم جینوئن اور ولائتی مال ہے۔''

میں نے پستول اُٹھایا۔ اس کا سرسری جائزہ لیا اور واپس رکھ دیا۔ وہ بولا۔ ''چاہیے تو رکھ لو..... میں اور لے لوں گا۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا اور گلوو بند کر دیا۔ وہ منہ بنا کر بولا۔ ''میرا یہ اندازہ بھی غلط ہوا۔ سوچا تھا کہ تم کوئی ڈاکو ہو۔ رات گئے شکار کی تلاش میں بھٹک رہے ہو مگر اسلحے سے عاری ہو، تبھی یہ سہولت دے دی مگر جب تم نے پستول مجھ پر تان کر نہیں کہا کہ 'نکال دو جو کچھ بھی تمہارے پاس ہے' تو مجھے مایوسی ہوئی۔''

''مگر تم کیوں لٹنا چاہتے تھے؟'' مجھے اس کی شخصیت دم بہ دم حیرت کے سمندر میں غرقاب کیے دے رہی تھی۔

''تاکہ تم اپنا کام کر کے چلتے بنو اور میرا وقت ضائع نہ

www.pdfbooksfree.pk

کرو۔'' اس نے عام سے انداز میں کہا۔ ''چھوڑو اس تذکرے کو، اگر مناسب سمجھو تو اپنی مصیبت پر روشنی ڈال ہی دو۔ دیکھتے ہیں کہ اِس پٹاری سے کون سا سانپ نکلتا ہے۔ بائی دا وے! میں تمہاری مدد کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔ چاہو تو فائدہ اُٹھالو۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں۔ تم میری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ تمہاری یہی مدد میرے لیے بہت ہے کہ تم نے اجنبی ہونے کے باوجود مجھے اپنی گاڑی میں لفٹ دے دی ورنہ اَب تک میں وہاں سردی میں ٹھٹھر کر مر گیا ہوتا۔''

وہ مسکرایا۔ ''تم آسانی سے مرنے والے لگتے تو نہیں ہو۔''

اس کی توجہ کا مرکز میری ذات تھی۔ میں نے اُس کا دھیان ہٹانے کے لیے پوچھا۔ ''تم اتنی رات گئے کہاں سے آرہے ہو؟''

''یعنی مجھے اِس وقت ڈرائیونگ نہیں کرنی چاہیے؟'' اس نے رَسان سے کہا۔

''ہاں! نقصان کا اندیشہ ہے۔''

''کیسا نقصان؟'' وہ عام سے انداز میں مستفسر ہوا۔

''جانی یا مالی؟''

''کوئی سا بھی.....'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''میرا نقصان ہو چکا ہے۔ میری زندگی کی سب سے قیمتی شے چھین لی گئی ہے۔ اب کسی بھی واردات کا خطرہ نہیں رہا۔'' اس نے منہ بنا کر کہا۔

''میں سمجھا نہیں؟''

''تم سمجھو گے بھی نہیں۔'' وہ بولا۔ ''یہ دنیا خوب صورت عذاب کدہ ہے۔ تم سردی میں ٹھٹھر کر مرنے جا رہے تھے جبکہ میں جلتی ہوئی آگ میں کھڑا ہوں اور موت کو آوازیں دے رہا ہوں۔ ہے ناں عجیب بات کہ تم بھی ناخوش، میں بھی دکھی۔''

میں نے کہا۔ ''تم شکل سے تو دکھی نہیں لگتے ہو۔''

''ہاں! خون نچڑ جائے تو بھی چہرہ سفید ہو جاتا ہے۔''

وہ بہت باتونی اور چالاک تھا۔ بات سے بات نکالتا تھا۔ میں نے کہا۔ ''تم ڈیرا غازی خان سے آرہے ہو؟''

''نہیں..... میں پل غازی گھاٹ تک گیا تھا۔''

''اس وقت؟''

''لوگ وقت کے محتاج ہیں۔ سورج نکلتا ہے تو وہ گھر سے نکلتے ہیں۔ سورج کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے شام کو گھر پہنچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ میں سورج کی پروا کیے بغیر گھر سے نکل کھڑا ہوتا ہوں۔ اُسے جب نکلنا ہو، نکل آئے، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔'' وہ بولا۔ ''وہاں بہت ضروری کام تھا۔''

''ہو گیا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں..... شاید کبھی ہو گا بھی نہیں۔'' اس کے لہجے میں غیر متوقع طور پر مایوسی گھل گئی، بولا۔ ''پل پر سے دریا میں کودنے کا ارادہ تھا۔ یعنی خودکشی کا..... پھر دل نے ساتھ نہیں دیا۔ پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ مرنے سے پہلے میں سردی کی اذیت برداشت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اِس اہم ترین کام کو کسی مناسب وقت پر ٹال کر واپس آ گیا ہوں۔''

''خودکشی؟ مگر کیوں؟'' مجھے اس کی بات پر یقین نہ آیا۔ وہ جھوٹ بول رہا تھا کیونکہ خودکشی کا مرحلہ بہت گہرے دکھ کے بعد درپیش ہوتا ہے جبکہ اس کا چہرہ طمانیت اور آسودگی کو ظاہر کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''شاید تم مذاق کر رہے ہو۔''

''شاید.....'' اس نے کندھے اُچکائے اور سیٹی بجانے لگا۔

مجھے اچنبھا سا ہوا۔ اس اونٹ کی کوئی کل سیدھی نہیں تھی۔ میں نے اُس کے چہرے کو بہ غور دیکھا۔ بہروپیا معلوم ہوا۔ کبھی ہنسنے والا، کبھی رونے والا اور کبھی ایک دم سنجیدہ مزاج..... میں نے چوٹ کی۔ ''اگر تم چاہو تو اپنی اسٹوری کا اسکرپٹ سنا دو۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔''

وہ ہنسنے لگا۔ کئی لمحے گزر گئے۔ پھر اچانک خاموش ہو گیا اور بولا۔ ''ہاں! انسان، انسان کی مدد کر سکتا ہے۔ شاید اِسی لیے خدا نے ایک سے زیادہ انسان پیدا کیے ہیں۔ تم میرا دُکھ سن لو، یہی بہت بڑی مدد ہو گی تمہاری۔''

میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا اور اُسے اپنے انٹرویو سے ہٹا کر جواب دہ کر لیا۔ اس نے ایک طویل سانس لی اور کہا۔ ''میں سگریٹ پینا چاہتا ہوں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا؟ اوہ نو..... تم تو خودکشی ہو..... پتا نہیں چرس پیتے ہو، ہیروئن پھیپھڑوں میں اُتارتے ہو یا رگوں میں ٹیکے لگواتے ہو..... پر مجھے کیا؟ میں تو اپنا دکھ بیان کر کے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔ کیا سننے کے لیے تیار ہو؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں! میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

وہ بولا۔ ''میں ایک لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ افوہ! میں بھی کتنا پاگل ہوں۔ کرتا تھا..... کیا مطلب؟..... کرتا ہوں..... ایک لڑکی سے محبت کرتا ہوں۔ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ محبت کیا ہوتی ہے، جانتے ہو؟ کبھی تم نے کسی سے محبت کی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''محبت کے بغیر کوئی انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ تم اپنی بات جاری رکھو۔''

''یہ بھی بکواس ہے میرے دوست..... کیا نام بتایا تھا

www.pdfbooksfree.pk

تم نے...... ہاں! اسلم علی...... یہ جتنے سرمایہ دار لوگ ہیں، مل اونرز اور سیاست دان ہیں...... ان پر محبت کا دورہ نہیں پڑتا۔ ان پر دولت کی ہوس کا دورہ پڑتا ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں اور وہ ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ ہم نے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائیں، چوری چوری ملاقاتیں کیں...... پھر پھڈا ہو گیا۔ یہ ہیر رانجھا اور سوہنی مہینوال کی اسٹوری میں ولن موجود ہے۔ ہے ناں؟ بس سمجھو ویسا ہی ایک ولن ہماری محبت کہانی میں آن وارد ہوا اور 'لوکرائسیس' شروع ہو گیا۔''

ہم اس دوران مظفر گڑھ شہر میں داخل ہو گئے تھے۔ اس نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ ''شہر آ گیا ہے۔ ابھی تم کہو گے کہ میں تمہیں اُتار دوں۔ اس طرح میری محبت کی طرح میری کہانی بھی ادھوری رہ جائے گی۔ اگر برا نہ مانو تو میں گاڑی ایک طرف روک دوں اور اپنی بات پوری کرلوں؟''

اس کے لہجے کی معصومیت نے مجھے مضطرب کر دیا۔ وہ جتنا کھلنڈرا اور شوخ طبع دکھائی دیا تھا، اس سے کہیں زیادہ پریشان اور ملول نظر آنے لگا تھا۔ میں نے کہا۔ ''شاہد! میرا حلیہ ٹھیک نہیں ہے۔ پولیس دیکھ کر دھر لے گی اور میں ایک نئی مصیبت میں پڑ جاؤں گا۔''

اس نے گاڑی روڈ سائڈ پر روک دی اور بولا۔ ''پولیس کی فکر نہ کرو۔ میرا دکھ سن لو۔ میں کسی سے بھی شیئر نہیں کرسکتا۔ اگر یہی حالت رہی تو میرا دل پھٹ جائے گا یا کوئی دماغی رگ پھٹ جائے گی۔''

اس نے امید بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا، 'جو ہوگا دیکھا جائے گا' اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سگریٹ کار لائٹر سے سلگائی اور بولا۔ ''تھینکس گاڈ!'' پھر شیشہ اُتار کر دھواں باہر اُچھالتے ہوئے بولا۔ ''یار! وہ بڑی خوب صورت تھی۔ اتنی کہ ہاتھ لگانے سے میلی ہونے لگتی تھی۔ وہ بھی میرے بارے میں ایسا ہی سوچتی تھی۔ ہم دونوں نے شادی کا تہیہ کر رکھا تھا مگر اس کا باپ ولن کے روپ میں ہمارے سامنے آن کھڑا ہوا۔ وہ اُسے اپنے کسی بھانجے بھتیجے سے بیاہنا چاہتا تھا۔ پھر جانتے ہو، کیا ہوا؟''

میں نے لقمہ دیا۔ ''اس کی وہاں شادی ہو گئی جہاں اس کا باپ چاہتا تھا اور تمہارا کھیل ختم......''

''نہیں یار...... یہ تو سیدھا سادا 'اینڈ' ہے۔ میری کہانی کا اینڈ بڑا ایڈونچرس ہے۔ میری محبوبہ ایک شام گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو گئی۔ کسی نے کہا کہ وہ اپنے یار کے ساتھ کہیں منہ کالا کر گئی ہے۔ کسی نے کہا کہ وہ بہت خوب صورت تھی اس لیے اُسے اغوا کرلیا گیا ہے۔ پہلی بات غلط تھی۔ اس کے چہرے پر تقدس کا اتنا طاقتور نور ثبت تھا کہ دنیا بھر کی سیاہیاں اسے کالا نہیں کرسکتی تھیں۔ یعنی اُسے اغوا کیا گیا تھا۔ ہائے! محبت انسان کو طاقت دیتی ہے مگر اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہے۔ میں جو اس کے لیے آسمان سے تارے توڑ لانے کا دعویٰ رکھتا تھا، اُسے بازیاب نہیں کرا سکا۔ تف ہے میری مردانگی پر...... میرے اختیارات پر......''

اس نے سگریٹ کا لمبا کش پھیپھڑوں میں اُتارا اور شکست خوردہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''وہ نہیں ملی مگر میں زندہ ہوں جبکہ میں نے کئی مرتبہ اس کی گہری آنکھوں کو چوم کر وعدہ کیا تھا کہ اُس کے بغیر ایک دن بھی زندہ نہیں رہوں گا، مر جاؤں گا۔ جس دن میں نے یہ کہا تھا، اس دن نہ تو میری آنکھوں کے سامنے میری ماں کا چہرہ ابھرا تھا، نہ اکلوتی بہن کا، نہ باپ کا...... آج جب اس عہد کو نبھانے کا وقت آیا ہے تو سبھی چہروں نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا ہے۔ میں نے یہ سائنس بھی پڑھ لی ہے کہ ایک کی محبت میں زندگی گنوا کر مجھے تین سچی محبتوں کا گلا نہیں گھونٹنا چاہیے۔ ہے ناں سائنس...... امریکا اس سائنس کا پیروکار ہے۔ کہتا ہے کہ میں پاکستان کی محبت میں اتنا آگے نہیں جانا چاہتا کہ بھارت کی تجارتی منڈی میرے ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ سچ کہتا ہوں کہ یہ دنیا مصیبت گاہ ہے ڈیئر!''

بات کرتے کرتے اس کا گلا رُندھ گیا تھا اور چہرہ ایک دم تاریک ہو گیا تھا۔ مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ میرے استعجاب سے لاتعلق تھا، بولا۔ ''آج میں گھر سے چور کی طرح چپکے سے نکلا تھا۔ ارادہ تھا کہ غازی گھاٹ کے پُل پر کھڑے ہو کر اپنی محبوبہ کو پکاروں گا۔ خدا سے پوچھوں گا کہ اگر اس نے مجھ مہینوال کی قسمت میں سوہنی کا ملاپ کرانا لکھا ہی نہیں تھا تو پھر ہمیں ملانے کی کیا ضرورت تھی؟...... کروڑوں اربوں کی دنیا میں میرے سوا اُس نے کسی اور دل میں سوہنی کی محبت کیوں پیدا نہیں کی تھی؟...... ہے ناں پرابلم؟...... اگر میں اسے من مندر کی رانی بنانے کے قابل نہیں تھا تو پھر اُس وقت پھٹ کیوں نہیں گیا جب میں نے اُس کے خوب صورت ہونٹوں کا پہلا بوسہ لیا تھا؟...... مجھے آگ کیوں نہیں لگی تھی اُس وقت، جب میں نے اُسے اپنی بانہوں میں بھر کر خدا کو ہی اپنی محبت کا ضامن بنایا تھا؟...... ہائے دوست! میں خدا سے یہی پوچھنے کے لیے گیا تھا کہ اگر اس کی اتنی بڑی دنیا میں ہم دو محبت کرنے والے شادی کر لیتے تو اس کے فول پروف

سسٹم میں کیا گڑبڑ رونما ہو جاتی؟''

اس کی آواز پھٹنے لگی۔ میرا دل جیسے مٹھی میں آ گیا تھا۔ میں نے اُس کا شانہ تھپتھپایا اور ورطۂ حیرت میں ڈوب کر استفسار کیا۔ ''پھر؟''

''پھر کیا؟ اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ جواب دہ ہونا پسند نہیں کرتا۔ میں نے کئی مرتبہ بلند آواز میں پکارا۔ وہ نہیں بولا۔ مگر پکٹ پر ڈیوٹی دینے والے سپاہیوں نے سن لیا اور للکارتے ہوئے میرے سر پر پہنچ گئے۔ مجھے دیکھ کر حیران ہوئے۔ اگر میری جگہ پر کوئی اور ہوتا تو اُسے پکڑ کر اندر کر دیتے اور کہتے کہ تم قانون کی اجازت کے بغیر مرنے کا بھی اختیار نہیں رکھتے...... میں نے انہیں گالیاں دے کر بھگا دیا اور خدا کو مخاطب کر کے کہا کہ میں احتجاجاً تمہاری دی ہوئی زندگی تمہیں لوٹانے آیا ہوں۔ یہ بہت بڑا دریا ہے، اسے بندے نگلنا آتا ہے، میں جانتا ہوں۔ مجھے تیرنا نہیں آتا، یہ بات دریا جانتا ہے۔''

وہ ایک پَل کو رُکا پھر بولا۔ ''ایسے میں ماں کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے لہرا گیا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ کیا ایک لڑکی اس قابل ہو گئی ہے کہ وہ مجھ سے میری ممتا چھین کر دریا کے سپرد کرنے چل پڑا ہے؟ چشم تصور میں کالج جاتی ہوئی بہن نظر آنے لگی۔ اس نے کہا کہ بھائی! انتظار کرو، میں بھی تمہارے پیچھے آ رہی ہوں کیونکہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ باپ کے چہرے کی جھریاں گہری ہونے لگیں۔ وہ بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا...... یار! وہاں سردی بھی بہت تھی۔ دریائی ہوا نے میرے ارادے کی دیوار میں ان گنت سوراخ کر دیے...... میری روح کے بھی جذبوں کو منجمد کر دیا اور پھر سائنس نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے سمجھایا کہ تمہارے مرنے سے اغوا ہونے والی کو کیا فائدہ پہنچے گا؟ تمہاری بہن کو اغوا ہونے سے کون بچائے گا؟ تمہارے باپ کا سہارا کون بنے گا؟ ہے ناں بزدلی کی بات؟...... اور ڈیئر! میں نے اس ڈاکٹرائن کے آگے سر جھکا دیا کیونکہ در پردہ میں بھی مرنا نہیں چاہتا تھا...... زندگی ایک بار ملتی ہے۔ لڑکیاں بار بار ملتی ہیں' ہے نا؟ پَر میں پاگل ہوں۔ یہ جانتا ہوں، پھر بھی اسی لڑکی کو ہی سوچتا رہتا ہوں۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہ ہے تو جہاں ہے، وہ نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ایسا دوسروں کے ساتھ بھی ہوتا ہوگا...... یقیناً!''

میں نے کہا۔ ''یہ ڈاکٹرائن منطقی بنیادوں پر کھڑی ہے۔ اس سے انکار کرنے والا جاہل اور بزدل قرار پاتا ہے، اس پر عمل کرنے والا دانش مند ہوتا ہے۔ تم نے دریا میں نہ کود کر عقل مندی کا ثبوت دیا ہے۔''

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر ایسے ہی وقت میں مجھے سامنے سے آتی ہوئی گھومتی ہوئی نیلی بتی والی پولیس موبائل وین دکھائی دی۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ میں نے گھبرا کر وین کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ...... وہ پولیس کی گاڑی آ رہی ہے...... پلیز! یہاں سے نکل چلو ورنہ بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔''

وہ اپنی پیدا کردہ سوگوار ٹرانس سے نکل آیا اور بولا۔ ''کہا ناں کہ فکر نہ کرو۔''

میں نے جلدی سے کہا۔ ''تم نہیں جانتے کہ میں کن ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹ رہا ہوں۔ پولیس والے مجھے دیکھتے ہی پکڑ لیں گے۔''

''کیوں؟ کیا تم نے پولیس والوں کے پیسے دینے ہیں یا کوئی خطرناک اشتہاری مجرم ہو؟'' اس نے طویل سانس حلق سے خارج کی۔ ''اگر ہو بھی تب بھی فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ کیا تم کچھ کھاؤ گے؟''

''نہیں نہیں!'' میں نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ایسے میں موبائل وین قریب آ گئی تھی۔ شاہد نے گاڑی کی لائٹس سے رکنے کا مخصوص اشارہ کر کے موبائل وین کو روکا۔ نیلے رنگ کی موبائل وین، جس کے بونٹ پر سفید رنگ سے بڑے حروف میں پولیس لکھا ہوا تھا، سوزوکی کے عین سامنے، چند قدموں کے فاصلے پر آن رکی۔ میں نے شاکی نظروں سے شاہد کو دیکھا جو بے پروا بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ میں بُری طرح پھنس گیا تھا۔ بیٹھا رہتا تو حراست میں لے لیا جاتا اور بھاگنے کی کوشش کرتا تو میری کمر چھلنی ہو جاتی۔

میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ''تم نے اچھا نہیں کیا۔''

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ میں خوف زدہ نظروں سے وین سے ڈرائیور کے برابر بیٹھے ہوئے پولیس اہلکار کو دیکھنے لگا جو دروازہ کھول کر شاہد کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے شاہد کو سلام کیا اور قدرے مودبانہ لہجے میں کہا۔ ''خیر تو ہے فوجی صاحب! آج ہماری جگہ ڈیوٹی دینے لگے ہیں۔''

شاہد نے ہنس کر کہا۔ ''اوئے نِکے تھانیدار! یہ ڈیوٹیاں شیوٹیاں تمہیں مبارک ہوں، میں تو دیکھ رہا تھا کہ تم لوگ اپنے بڑے صاحب کو چکر دیتے ہو یا واقعی رات کو گشت پر نکلتے ہو۔''

''کوٹھی پر جا کر انہیں بتا دیجیے گا کہ ان کے ماتحت کس جانفشانی سے سرکاری فرائض سرانجام دیتے ہیں۔'' اس نے جواباً دانت نکالے۔ ''یہ کون صاحب ہیں آپ کے ساتھ؟''

www.pdfbooksfree.pk

''یہ میرا رقیب ہے..... ہاہا..... رقیب! پر تم کیا جانو، یہ رقیب کس بلا کا نام ہے۔'' شاہد پر سوار غم واندوہ کا تاثر چند لمحوں میں ہی زائل ہوگیا تھا، بولا۔ ''اوئے نکے تھانیدار! سچ بول، تیرے قانون کے پاس کوئی ایسی دفعہ ہے، جس کے لگانے سے میرا رقیب ساری عمر حوالات میں پڑا رہے اور میں اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ موجاں شوجاں کرتا رہوں؟''

''فوجی صاحب! ہمارے قانون میں ہر دفعہ موجود ہے۔ آپ حکم کر کے دیکھیں۔ نگینے کی طرح قانون کی انگوٹھی میں ایسے جڑوں گا کہ قیامت تک نکل نہ پائے گا.....'' نکا تھانیدار چھاتی پھلا کر بولا۔ ''ایک بس باباجی کو سنبھالنا آپ کے ذمے رہا۔ اسے ساری عمر چکروں میں ڈالے رکھنا میرا کام.....''

میری سانس حلق میں اٹکی ہوئی تھی۔ مجھے دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن کر یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ شاہد کوئی معمولی حیثیت کا شخص نہیں تھا بلکہ کسی بڑے آفیسر یا سیاست دان کا من چلا بیٹا تھا اور اس سب انسپکٹر عرف نکے تھانیدار سے خاصا بے تکلف بھی تھا۔

سب انسپکٹر سوزوکی کالس کی چھت پر ہاتھ رکھ کر جھکا اور اجازت طلب انداز میں بولا۔ ''کوئی خدمت ہمارے لائق؟''

''یار! اُدھر جھنگ موڑ سے دو چار نمکین کڑ پکڑ لاؤ..... زور کی بھوک لگی ہے۔ یہ کم بخت گاڑی چلتی کم اور اچھلتی زیادہ ہے۔ کھایا پیا سب ہضم کرا دیتی ہے، منٹوں میں..... یہ پکڑو پیسے اور اس کے سر پر کھڑے ہو کر روسٹ کرانا..... زیادہ نہیں، بس دو چکن بریسٹ پیس!''

اس نے جیب میں سے ایک بڑا نوٹ کھینچا اور سب انسپکٹر کو تھما دیا۔ اس نے مروتاً دو تین مرتبہ نوٹ لوٹانا چاہا مگر شاہد نے سختی سے روک دیا اور کہا۔ ''تم مجھے دو پیس کھلا کر عوام سے بیس اصیل گکڑ اینٹھ لوگے۔ ناں یار! مجھے بددعاؤں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ تم لوگوں کو تو خیر توپ سے بھی خوف محسوس نہیں ہوتا۔ اوئے ہاں! پانی کی بوتلیں بھی پکڑ لانا۔''

وہ ہنستا ہوا پلٹ گیا اور گاڑی میں بیٹھ کر واپس جھنگ موڑ کی طرف روانہ ہوگیا۔ میرے دم میں دم آیا۔

شاہد شگفتہ لہجے میں بولا۔ ''میں نے تمہیں کہا تھا ناں کہ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم نے مجھ پر ڈاکا نہیں مارا، بھلے دنیا کو تگنی کا ناچ نچاؤ، انگلیوں پر تھرکاؤ، مجھے کیا۔ ویسے دنیا میں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

میں نے مرعوب ہو کر پوچھا۔ ''تم کیا کام کرتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''بتایا تو ہے کہ زندگی میں ایک ہی کام چھیڑ رکھا تھا۔ وہ بھی مکمل نہیں ہوا۔ میں اپنے عشق کی بات کر رہا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''اس کے علاوہ؟''

''فوج میں ہوں..... ورزش کرنے کے پیسے سرکار سے اینٹھتا ہوں۔ اچھا کھاتا ہوں۔ ٹھنڈا گرم، سب چیتا ہوں۔ مگر جب سے میری معشوقہ اغوا ہوئی ہے، میں ڈیوٹی پر نہیں گیا۔ اُدھر، فوج میں، اپنا ایک یار بیٹھا ہوا ہے۔ وہ بھی میری حاضری لگا دیتا ہے، کبھی چھٹی..... اور محسوس نہ کرنا پولیس والے سے مذاق کیا ہے میں نے..... تم میرے رقیب نہیں ہو۔ ویسے تو اس وقت پوری دنیا میری رقیب ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک ہر چیز کو آگ لگا دوں۔''

وہ بڑی روانی سے گفتگو کرتا تھا۔ خوبروئی کے بعد یہ اُس کی دوسری بڑی خوبی تھی۔ تھوڑے توقف کے بعد گویا ہوا۔ ''ہم کیا بات کر رہے تھے؟''

''تم اپنی ناکام محبت کی کہانی سنا رہے تھے۔'' میں نے یاد دلایا۔

''ہاں یار..... بہت غلط ہوا۔ میری محبوبہ غائب ہوگئی۔ میں نے یہ تو بتایا ہی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ اُس کا ننھا منا سا بھائی بھی اغوا ہوا تھا۔ وہ کچھ عرصے کے بعد اچانک گھر پہنچ گیا۔ تب تک میں، میرا باپ اور لڑکی کے ماں باپ ان دونوں کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ جب بچے نے بتایا کہ اس کی بہن بھی زندہ ہے، تب کارِ جستجو کے لیے ہمارے جسموں میں نئی جان پڑ گئی مگر بازیاب ہونے والا بچہ ایسا کوئی کلیو نہ دے سکا جس پر چلتے ہوئے میں، اس کے والدین یا پولیس مغویہ تک پہنچ جاتے۔ میں نے اُسے بہت کریدا مگر اس نے عجیب اور نہ سمجھ میں آنے والی کہانی سنا کر میرے ذہن کو مزید الجھا دیا۔''

میں ہونقوں کی طرح اُسے دیکھ رہا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور آگہی کا نیا جہان مجھ پر کھلتا چلا گیا۔ میری نظروں کے سامنے ایک پل کو وحید کا چہرہ جھلملایا۔ وہ اپنی بہن عاشی کے ساتھ اغوا ہوا تھا اور مجھے بیلے میں جا بہ لب ملا تھا۔ پھر اُسے ملتان سے گاڑی پر بٹھا کر گھر اکیلے روانہ کر دیا گیا تھا۔ عاشی کا غم زدہ دیوانہ جس سے ملنے کے لیے وہ مظفر گڑھ آیا کرتی تھی، یقیناً یہی تھا، شاہد سلیم.....!

میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ ''ڈیش بورڈ پر تمہارا نام شاہد لکھا ہے۔ تمہارا پورا نام شاہد سلیم ہے؟''

وہ چونکا۔ ''ہاں..... میرا نام شاہد سلیم ہے۔ مجھے تحقیق کرنے والے سلیم شہزاد ایس ایس پی نے اپنا نام میرے نام کے ساتھ اس لیے چپکا رکھا ہے کہ میں کبھی اُسے فراموش نہ کر سکوں۔ مگر تم کیسے جانتے ہو؟''

مجھ سے غلطی سرزد ہوگئی تھی۔ معاملے کو سنبھالنے کے لیے میں نے بات بنائی۔ ''میں نے تمہارا نام سن رکھا تھا۔ سب انسپکٹر کا مودبانہ رویہ دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ تم سپرنٹنڈنٹ پولیس کے بیٹے شاہد سلیم ہو۔ میرا اندازہ ٹھیک ثابت ہوا۔''

وہ سر ہلا کر بولا۔ ''چکن پیس آ رہے ہیں۔ وہ کھالیں، پھر بات کریں گے۔''

پولیس کی موبائل وین دکھائی دی۔ چند لمحوں بعد سب انسپکٹر نے موبائل وین سے اُتر کر شاہد کو فوڈ پیک، منرل واٹر کی دو چھوٹی بوتلیں اور بقایا رقم تھمائی اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کرتا ہوا رخصت ہوگیا۔ شاہد نے فوڈ پیک کھول کر درمیان میں رکھ دیا۔ گاڑی میں اشتہا انگیز خوشبو پھیل گئی۔ وہ ایک ٹماٹو کیچ اَپ کے ساشے کو ناخنوں کی مدد سے کھولتے ہوئے بولا۔ ''موجاں شوجاں اُڑاؤ ڈیئر! اسے میری کہانی کو اچھے سامع کی طرح سننے کا انعام سمجھو۔''

میں نے ایک چکن پیس اُٹھا لیا' پوچھا۔ ''تمہاری محبوبہ کے بھائی نے واپس آ کر کیا بتایا؟''

''ننھا بڑا اَپ سیٹ تھا۔ نارمل نہیں تھا۔ اس پر میں نے بڑی محنت کی اور پولیس کے روایتی ہتھکنڈوں سے بچا کر معلومات حاصل کیں۔''

''پھر؟ کیا بتایا اُس نے؟'' میں نے دلچسپی لی۔

''ہاہ! جو بتایا، وہ بھی کارآمد نہ ہوا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ اور اس کی بڑی بہن سائیں دل جیت سے ملنے کے لیے نور پور نامی گاؤں میں گئے تھے۔ انہیں سائیں نے شربت پلا کر بے ہوش کیا اور کسی نامعلوم مکان میں شفٹ کر دیا۔ میں نے پولیس کو لے کر سائیں دل جیت پر ریڈ کیا تو پتا چلا کہ وہ اُسی دورانیے میں نور پور سے فرار ہوگیا تھا۔ کسی کو بھی اُس کے بارے میں علم نہیں تھا۔''

''وہ کیسے رہا ہوا؟ یہ اُس نے نہیں بتایا؟'' میں نے کریدا۔

اس نے ایک قہقہہ لگایا، پھر تادیر ہنستا رہا۔ میں نے تعجب سے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ کیا اُس نے تمہیں کوئی لطیفہ سنایا تھا؟''

اس نے عجیب سے انداز میں آنکھیں پھیلائیں اور مجھے بہ غور دیکھا، بولا۔ ''دیکھا! ہمارے باپ دادا کتنے چالاک لوگ تھے۔ انہوں نے لکھ رکھا ہے کہ عورت کے دل کا راستہ اولاد ہے جبکہ مرد کے دل کا راستہ پیٹ سے نکلتا ہے۔ چکن پیس ہاتھ میں آتے ہی تمہاری دلچسپی میری کہانی میں زیادہ ہوگئی ہے۔''

مجھے ایک ذرا شرمندگی ہوئی۔ وہ میرے کاندھے پر ہاتھ مار کر بولا۔ ''چٹنی بھی لو ناں..... شرمندہ کیوں ہوتے ہو بھئی! زندگی کھانے پینے کے علاوہ ہے ہی کیا؟..... ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ننھے مغوی نے واپسی پر ان دو اشخاص کے نام بھی بتائے تھے جو اُسے کسی جنگل سے نیم مردہ حالت میں اُٹھا کر اپنے ساتھ ملتان لے گئے تھے۔ ایک کا نام شہریار جبکہ دوسرے کا نام خالد عرف کھالا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ شہریار کا گھر نور پور میں واقع سائیں جگ جیت کے مزار کے قریب ہے۔ ہمیں وہاں جا کر پتا چلا کہ کھالے کا گھر بھی اسی گاؤں میں واقع تھا۔ دونوں آپس میں بڑے جگری یار تھے اور دونوں ہی گاؤں سے غائب تھے..... نہ سائیں ملا، نہ وہ دونوں ہاتھ لگے..... تفتیش جہاں سے شروع ہوئی تھی، بدقسمتی سے وہیں پر ختم ہوگئی!''

وہ خاموش ہوگیا۔ پھر اسپیڈومیٹر کی تھمی ہوئی سوئی پر نظریں مرتکز کر کے خاموشی سے پیس کھانے لگا۔ یوں لگا جیسے میری موجودگی اچانک ہی اُس کے نزدیک بے معانی ہوگئی تھی۔

میرے پیٹ کی بھڑکی ہوئی آگ بجھ گئی تھی۔ منرل واٹر کی آدھی بوتل حلق سے اتاری اور بکس میں پڑے ہوئے ٹشو پیپر کھینچ کر ہاتھ منہ صاف کیا، کہا۔ ''یار! تم تو واقعی بہت دکھی انسان ہو۔''

وہ زہرخند انداز میں مسکرایا، پھر چیلنج بھری نظروں سے مجھے گھورتا ہوا بولا۔ ''تم میری مدد کر سکتے ہو، اگر چاہو تو.....''

''وہ کیسے؟'' میں چونکے بنا نہ رہ پایا۔

''تم ملتان میں رہتے ہو۔ شکل سے اعلیٰ درجے کے آوارہ لگتے ہو۔ کوشش کرو تو ان دونوں کا کھوج لگا سکتے ہو جنہوں نے ننھے وحید کی جان بچائی تھی ہیں؟''

میرا ماتھا ٹھنکا، پوچھا۔ ''تم ان سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟''

''یار! وہ مجھے بتا سکتے ہیں کہ انہوں نے وحید کو کہاں سے اُٹھایا تھا۔''

''اگر انہوں نے تمہیں کچھ نہ بتایا تو؟''

وہ بڑے یقین سے بولا۔ ''وہ دنیا کے سب سے بڑے کمینے انسان ہوں گے جو میری دکھ بھری داستان سن کر بھی تعاون پر آمادہ نہ ہوں گے۔ اگر انہیں کوئی مجبوری لاحق ہوئی تو میں کمپرومائز تھیوری پر عمل کروں گا۔ اگر پھر بھی نہ مانے تو..... انہیں سلیوٹ کروں گا اور اپنی قسمت کو روتا

www.pdfbooksfree.pk

دھوتا لوٹ آؤں گا کیونکہ انہوں نے ایک انسان کی جان بچانے کا اعزاز حاصل کر رکھا ہے۔‘‘

اس کا لہجہ بڑا پختہ مگر کرب سے لبریز تھا۔ اس کی نیم بھرائی ہوئی، جذبات سے مغلوب آواز نے مجھ پر اداسی اور شکست خوردگی طاری کر دی۔ میں نے کچھ دیر سوچا، پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ’’ممکن ہے وہ اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے منظر عام پر نہ آنا چاہتے ہوں۔ ایسی حالت میں تم کیا کرو گے؟‘‘

’’میں انہیں کسی کے سامنے لے کر جانا بھی کیوں چاہوں گا۔ مجھے وہ نہیں، اپنے چند سوالوں کے جواب درکار ہیں۔‘‘ وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ ’’کیا تم انہیں تلاش کر سکتے ہو؟‘‘

میں نے فوراً جواب نہیں دیا۔ سوچ میں پڑ گیا۔ دل اُس کی مدد کا ارادہ رکھتا تھا مگر ذہن اُلجھن زدہ تھا۔ چونکہ وہ ایک اعلیٰ پولیس آفیسر کا بیٹا تھا، اس لیے مجھے کسی بہت بڑی مصیبت میں پھنسا سکتا تھا۔ وہ میری خاموشی کو انکار سمجھ کر بولا۔ ’’یار! تم کوشش تو کر سکتے ہو۔ دیکھو! اگر تمہیں پیسوں کی پرابلم ہے تو سمجھو اِٹ اِز نو پرابلم...... جتنے مانگو گے، اتنے دوں گا...... ہوں؟ اگر تم انہیں ڈھونڈ نکالو گے تو تگڑا انعام بھی دوں گا۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’شاہد! تم بہت اچھے انسان ہو۔ ایک لڑکی کے لیے اتنی سنجیدگی سے سوچتے ہو، یہ تمہاری عظمت کی دلیل ہے مگر......‘‘

’’کہا نا! میری مدد کرو۔ میں تمہارا منہ نوٹوں سے بھر دوں گا۔‘‘ وہ اسٹیئرنگ پر زور سے ہاتھ مار کر بولا۔

میں اس دوران دل ہی دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے اس پر اپنا آپ آشکار کر دینا چاہیے۔ میں نے ایک طویل سانس پھیپھڑوں میں اُتاری اور کہا۔ ’’اوکے مسٹر شاہد سلیم! میں تمہاری اُلجھنیں دور کر دیتا ہوں۔ مگر بدلے میں تم مجھے کیا دو گے؟‘‘

وہ ایک دم میری جانب پلٹا اور میرا بازو تھام کر سنجیدگی سے بولا۔ ’’مجھے تمہاری ہر ڈیمانڈ منظور ہے، بولو...... کیا چاہتے ہو؟‘‘

میں نے کہا۔ ’’میں تمہاری مدد کرتا ہوں، تم میری مدد کرو...... بس! مجھے پیسے نہیں، یہ وعدہ چاہیے کہ تم مجھے پولیس کے حوالے نہیں کرو گے اور نہ ہی منظر عام پر لاؤ گے۔‘‘

اس کے چہرے پر غیر معمولی استعجاب رقم ہو گیا۔ ’’کیا مطلب؟ میں تمہیں کیوں پولیس کے حوالے کروں گا؟ کیا تم نے کوئی جرم کر رکھا ہے؟...... اگر ایسا ہے، تو بھی سمجھے کیا...... میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔ تم بس کسی طرح ان دونوں کو تلاش کر دکھاؤ...... میں احسان فراموش شخص نہیں ہوں۔ میں تو محبت کرنے والا انسان ہوں۔ اور...... اور...... میں کسی کو گزند پہنچانے کا خواہش مند ذہن نہیں رکھتا۔ صرف اُسے الٹا لٹکاؤں گا جس نے میری جانِ من کو میری نظروں سے دور کر رکھا ہے۔‘‘

اس کے رویے نے اُس کے اخلاص کو مجھ پر عیاں کر دیا۔ میں نے مسکرا کر ہاتھ بڑھایا اور کہا۔ ’’تو پھر وعدہ کرو، اپنی محبوبہ کی قسم کھاؤ کہ تم مجھے اپنا دوست سمجھو گے۔‘‘

اس نے بڑے غور سے میری آنکھوں میں جھانکا، کچھ سوچا اور کہا۔ ’’میں اپنی جان کی قسم کھاتا ہوں کہ تمہیں اپنا دوست سمجھتا ہوں۔ میرے من میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔‘‘

میں نے اُس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ ’’شاہد! میں نے تمہیں اپنا نام اسلم بتایا تھا۔ میں اسلم نہیں ہوں بلکہ شہر یار ہوں۔ وہی، جس نے وحید کی زندگی بچائی تھی۔ میں تمہاری اور عاشی کی محبت سے بھی واقف ہوں۔ لو! میں نے تمہاری بہت بڑی اُلجھن دور کر دی ہے، تم اپنا وعدہ نبھانے کی فکر کرو۔‘‘

میری آواز سے چیلنج جھلک رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ کھلنڈرا پن عنقا ہو گیا اور وہ مجھے یک ٹک دیکھنے لگا۔ شاید اُسے یقین نہیں آ رہا تھا حالانکہ میں نے اُسے یقین دلانے کے لیے عاشی کا حوالہ دیا تھا جبکہ اس نے مجھے اپنی محبوبہ کا نام نہیں بتایا تھا۔

وہ بولا۔ ’’تم شہر یار ہو وہی جس نے وحید کو بچایا تھا اور تم نے میری محبوب ترین ہستی کا نام بھی لیا ہے...... عاشی...... کیا تم نے یہی کہا ہے؟‘‘

میں نے اس کا ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ’’ہاں! میں نے یہی کہا ہے۔ اب تم جو چاہو، دریافت کر لو۔ میں بتانے کو تیار ہوں۔‘‘

اس کی لمبی زبان شاید دانتوں تلے دب گئی تھی۔ کافی دیر بعد اس کی تھکی تھکی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ’’مگر تم نے یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟‘‘

’’کہا تو ہے کہ مصیبت میں ہوں۔‘‘ میں نے کہا۔

’’کس مصیبت میں؟‘‘

’’یہ لمبی اور غیر متعلقہ کہانی ہے۔ تم اپنی بات کرو۔‘‘ میں نے بیزاری سے کہا۔

اس نے ایک ذرا مجھے دیکھا اور ہنسا۔ پھر گاڑی

اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ ’’ہم گھر چل رہے ہیں۔ وہاں آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔‘‘

میں نے جلدی سے کہا۔ ’’نہیں شاہد! جو پوچھنا ہے، یہیں پوچھ لو پھر جھنگ موڑ اُتار کر گھر چلے جانا۔ وہاں سے مجھے ملتان کے لیے بس یا ویگن آسانی سے مل جائے گی۔‘‘

اس نے نفی میں سر ہلایا اور حتمی انداز میں بولا۔ ’’یہ نہیں ہو سکتا۔ تمہاری حالت درست نہیں ہے۔ جو بھی دیکھے گا مشکوک ہو جائے گا۔ صبح ہونے والی ہے۔ نہا کر چینج کر لینا اور ناشتا بڑپ کر کے ملتان چلے جانا۔ مجھ پر شک نہ کرنا۔ میں نے تمہیں دوست کہا ہے اور کبھی نہیں چاہوں گا کہ میرے خلوص پر حرف آئے، کہا ناں!‘‘

’’تمہارا باپ......‘‘

’’تم نے اگر پچاس قتل کر رکھے ہیں اور کروڑوں روپے تمہارے زندہ یا مردہ سر کی قیمت مقرر ہے، تب بھی میں تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔ میں نے وعدہ کیا ہے یار!‘‘

میں نے اس کے پختہ ارادے کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور سر جھکا لیا۔ لذیذ چکن پیس نے جسم کو توانائی دی تھی، کار کے چلتے ہوئے ائرہیٹر نے رگوں میں اُتری ہوئی سردی کو نوچ پھینکا تھا مگر میں مکمل طور پر فٹ نہیں تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میرے سر کے زخم کی نوعیت کیا تھی مگر یہ محسوس ہوتا تھا کہ زخم علاج طلب تھا۔ آرام کی بھی ضرورت تھی۔ سخی محمد کے ساتھ دوآبے کی طرف جانے کے لیے میڈم کی کوٹھی پر پہنچنے کے بعد سے اَب تک ایک لمحے کو بھی چین نہیں آیا تھا۔ شاہد دیکھنے میں بے ضرر اور یار باش انسان تھا، اس پر یقین کیا جا سکتا تھا، تبھی میں نے خود کو اُس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

جھنگ موڑ پر پولیس وین کھڑی تھی۔ چکن پیس لا کر دینے والا سب انسپکٹر پانچ چھ سپاہیوں کے نرغے میں ہوٹل کے باہر کھڑا تھا۔ سبھی نے ہاتھوں میں ربڑی دودھ کے پیالے تھام رکھے تھے۔ شاہد نے ان کے قریب جا کر گاڑی آہستہ کی، شیشہ اُتارا اور نعرہ لگایا۔ ’’شاوا بھئی سرکاری جوانو......‘‘

سبھی نے بہ یک آواز جواب دیا۔ ’’شاہد صاحب زندہ باد!‘‘

وہ پیچھے رہ گئے۔ شاہد نے ہونٹ سکیڑ کر سیٹی بجائی اور گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ کچھ دیر بعد اس نے مین روڈ پر واقع سرکاری رہائش گاہ کے نیلے اور سرخ رنگ والے بڑے آہنی گیٹ پر بریک لگائے۔ ہارن کی آواز سن کر گیٹ کے ملحقہ سیکیورٹی روم میں سے ایک سپاہی برآمد ہوا۔ اس نے شاہد کو سلام کرنے کے بعد گیٹ کھول دیا۔ سرکاری کوٹھی کی عمارت گیٹ سے کوئی تین سو فٹ کے فاصلے پر اپنے کروفر سمیت موجود تھی۔ پارکنگ میں نیلے کلر کی نیلی بتی والی ایک لینڈ کروزر اور ایک سفید رنگ کی ٹویوٹا کرولا کھڑی تھی۔ شاہد نے پارکنگ میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے گاڑی گیٹ وے پر کھڑی کر دی اور مجھے اُترنے کا اشارہ کرتے ہوئے دروازہ کھول کر اتر گیا۔ میں نے اُس کی تقلید کی۔ باہر قدم رکھتے ہی سرد ہوا کا جھونکا بدن سے ٹکرایا اور مجھے یاد آیا کہ میں زندگی جیسی طویل اور موت جیسی سرد رات کا مسافر تھا۔

کوٹھی کے اگلے حصے میں دو سنتری گیس ہیٹر آن کیے اسٹولوں پر بیٹھ کر ہاتھ سینک رہے تھے۔ انہوں نے اُٹھ کر شاہد کو سلیوٹ کیا۔

شاہد نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ’’انہیں مہمان خانے میں لے جاؤ۔ گیزر آن کر دو تا کہ ہم منہ ہاتھ دھو لیں۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔‘‘

وہ کوٹھی کے اندر چلا گیا جبکہ ایک سنتری نے مجھے گیسٹ ہاؤس میں پہنچا دیا۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا تو اس نے گیس ہیٹر آن کر دیا اور مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے تشکیک آمیز لہجے میں بولا۔ ’’صاحب! میں گیزر چلانے جا رہا ہوں۔‘‘

وہ چلا گیا تو میں نے سرسری نظروں سے گیسٹ ہاؤس کا جائزہ لیا۔ کافی پُرآسائش جگہ تھی۔ آرائش کا انداز بھی سادگی مگر جاذبیت لیے ہوئے تھا۔ تھوڑی دیر بعد شاہد کی آواز سنائی دی۔ وہ سنتریوں سے باتیں کرتا ہوا گیسٹ ہاؤس میں داخل ہوا۔ سیدھا میری طرف آیا اور کھڑے کھڑے بولا۔ ’’کچھ دیر میں پانی گرم ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ تم نہا لو اور فریش ہو جاؤ۔‘‘

میں نے حیرت سے کہا۔ ’’اس وقت؟‘‘

’’پانی گرم ہو تو پھر دن کیا اور رات کیا؟‘‘ وہ آنکھیں نچا کر بولا۔ ’’تمہاری حالت خاصی رَف ہے۔ پہلی نظر میں اجڈ اور پیشہ ور چور ڈاکو معلوم ہوتے ہو۔‘‘

میں نے بدن پر لپٹی ہوئی ترپال، کیچڑ اور دھول میں اَٹی ہوئی نوروزی چپل اور میلے چیکٹ لباس پر نظر ڈالی۔ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ اس نے قدرے تحکم آمیز آواز میں کہا۔ ’’تمہیں یقیناً میرا لباس فٹ آئے گا۔ پہن کر اِس خرقے سے نجات حاصل کر لو۔‘‘

میں نے اپنی کنپٹی پر ہاتھ رکھا۔ ’’مگر میرے سر میں زخم ہے۔ گیلا ہو کر خراب ہو جائے گا۔‘‘

’’اس کا بھی کچھ کرتے ہیں۔ ویٹ فار اے مومنٹ ڈیئر!‘‘

www.pdfbooksfree.pk

وہ ایڑیوں کے بل گھوما اور واپس چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہینگر میں لٹکتا ہوا سوٹ اور میڈیکل کٹ اُٹھا لایا۔ اس نے مجھے ٹیوب لائٹ کے نیچے قالین پر بٹھایا اور پٹی کھول کر زخم کا جائزہ لینے لگا، بولا۔ ''زخم تو خاصا گہرا ہے۔ شاید خراب بھی ہو گیا ہے...... نہیں...... ابھی پیپ نہیں پڑی۔ اس کی صفائی کر کے واٹر پروف جیل لگا دیتا ہوں۔ نہاتے ہوئے احتیاط سے کام لینا۔ پٹی بعد میں کر دوں گا۔''

جدید طرز کی میڈیکل کٹ میں حادثاتی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے ضروری سامان موجود تھا۔ اس نے زخم کی اطرافی جلد صاف کی، بال کاٹے اور اسپرٹ اور ہائیڈروجن پر اکسائیڈ کی مدد سے صفائی کرنے لگا۔ محسوس ہوا کہ تکلیف میں پہلی سی شدت نہیں رہی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا ٹانکے لگانا پڑیں گے؟''

''نہیں۔ زخم گہرا ہے، بڑا نہیں ہے۔ جس گدھے ڈاکٹر نے پٹی کی تھی، اگر وہ سویب صحیح جگہ پر رکھتا تو اب تک زخم ٹھیک ہو چکا ہوتا۔ خیر...... فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔'' اس نے دلاسا دیا۔ ''مظفر گڑھ آنے سے پہلے پاپا کی اپائنٹ منٹ ڈسٹرکٹ وہاڑی میں تھی۔ وہاں پاپا کا ایک دوست ہوا کرتا تھا...... ڈاکٹر اکمل مجید...... میں اُسے انکل 'بالکل جدید' کہا کرتا تھا...... وہ نہ صرف پاپا کا بلکہ میرا بھی اچھا دوست تھا۔ وہ مجھے میتھ کی ٹیوشن بھی دیا کرتا تھا اور میں نے اس سے میتھ پڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ کام بھی سیکھ لیا۔ ہے ناں مزے کی بات؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ غصے سے بولا۔ ''زبان ہلاؤ، سر کو حرکت نہ دو پینڈو پیشنٹ!''

اس کے ہاتھوں کی حرکت ماہرانہ تھی۔ زخم پر جیل کا لیپ کرنے کے بعد اس نے مجھے سوٹ تھمایا اور باتھ روم کی طرف دھکیل دیا۔ ''شیونگ کا سامان الماری میں پڑا ہے۔ یہ جھاڑ جھنکار بھی کاٹ پھینکنا۔ بہت برا لگ رہا ہے۔''

اس نے درست کہا تھا۔ مجھے فریش ہونے کے لیے باتھ لینا چاہیے تھا۔ گرم پانی نے نہ صرف میری تھکن اُتار دی بلکہ میں خود کو نہایت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ یوں لگا جیسے مجھے نئی زندگی میسر آ گئی ہو۔ چینج کر لینے کے بعد قدِ آدم آئینے نے تائید کی کہ میں واقعی چینج ہو گیا تھا۔ بالوں کو احتیاط سے سنوارتے ہوئے باتھ روم سے باہر آیا تو وہ مجھے دیکھ کر خوش ہو کر بولا۔ ''اب ہوئی ناں بات...... تم تو اچھے خاصے انسان نکلے ہو ڈیئر!''

میں کھسیا کر، اس کے ہاتھ کا اشارہ پا کر قالین پر بیٹھ گیا۔ وہ کاٹن سویب کی مدد سے جیل صاف کرتے ہوئے بڑبڑایا۔ ''نہایت بدتمیز انسان ہو یار تم تو...... کہا بھی تھا کہ احتیاط سے کام لینا۔ تین سو روپے کی امپورٹڈ جیل لگائی تھی تا کہ زخم گیلا نہ ہو۔ تم نے پھر بھی زخم گیلا کر دیا۔ افوہ! جاہل شخص کی یاری بھی کسی امتحان سے کم نہیں ہوتی۔ پر ایک بات ہے مسٹر پینڈو! تمہارے بال بڑے ملائم اور شائنی ہیں، ایک دم کسی ینگ فرنچ گرل کی طرح...... واؤ!''

نیٹو ٹیپ کی مدد سے اس نے اسمارٹ بینڈیج کی، اینٹی بایوٹک اور پین کلر گولیاں کھلائیں اور اُٹھ کر صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے مجھے فارغ کر دیا۔

میں نے اُسے بے حد ممنون نگاہوں سے دیکھا تو وہ بڑی بے پروائی سے بولا۔ ''میں جوتے لینے جا رہا ہوں۔ ڈرو مت، ماروں گا نہیں...... پہناؤں گا۔''

پھر قالین پر میرے اُتارے ہوئے لباس اور ترپال پر پڑی ہوئی نوروزی کھیڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دل کھول کر ہنسا۔ ''یہ لکڑی مارکہ کھڑاؤں تو میوزیم میں رکھنے کے لائق ہیں، پیروں میں ڈال کر ان کی بے حرمتی نہیں کرنی چاہیے۔ اِسے دیکھو! کیسی عجیب ٹوپی ہے۔ شاید ظہیر الدین بابر کے کسی مشیر وزیر کی ہے۔ اور ہاں! چائے کا موڈ ہے؟''

میں نے شرمسار ہو کر کہا۔ ''شاہد! میں اتنا اہم نہیں ہوں۔''

''مجھے مطلب بھی تو ہے تم سے۔'' وہ ہنس کر بولا اور گیسٹ ہاؤس سے نکل گیا۔ کوئی دس منٹ بعد جوتوں کا ڈبا جس پر ایک مہنگی کمپنی کا نام چھپا ہوا تھا، اُٹھائے لوٹا اور میرے پیروں کے قریب فرش پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''اس میں جرابیں بھی ہیں...... پہن لینا۔ تھوڑی دیر میں سنتری بادشاہ چائے لے آئے گا۔ پینا اور اُدھر جا کر سو جانا۔ میں بھی تھکا ہوا ہوں، جا کر آرام کروں گا۔ صبح بات ہو گی۔ ٹھیک ہے ناں؟''

میں نے دیوار گیر گھڑی کی طرف اُس کی توجہ مبذول کرائی۔ ''صبح تو ہونے والی ہے۔''

وہ بولا۔ ''میں نے کہا تھا ناں کہ میں سورج کی حکمرانی کو قبول نہیں کرتا ہوں۔ جب جاگوں گا، تب میری صبح ہو گی۔ او کے ڈیئر! ٹیک کیئر...... اینڈ سی یو اِن کمنگ مارننگ۔''

اس نے ہاتھ لہرایا، دل آویز خوب صورت مسکراہٹ میری جانب اُچھالی اور پلٹ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد سنتری نے چائے کا کپ میرے سامنے میز پر رکھ دیا۔ چائے پینے کے بعد میں جوتے اور جرابیں اُٹھائے ملحقہ بیڈ روم میں گھس گیا۔ نہایت آرام دہ بیڈ پر

گرتے ہی موٹے اور ملائم کمبل نے مجھے آغوش میں لے کر گہری نیند سلا دیا۔ ذہن کی غلام گردشوں میں چکرانے والا آخری رقصاں خیال یہی تھا کہ میں موت کا لمبا سفر طے کر کے زندگی کی پُرحدت آغوش میں سر رکھ چکا تھا اور قسمت نے مجھے اُس شخص سے اتفاقاً ملا دیا تھا جس سے ملنے کی خواہش میرے دل میں چپکے چپکے پلتی رہی تھی۔

نصف دن گزر گیا تھا جب میری آنکھ کھلی۔ پُرسکون اور بھرپور نیند لینے کے وجہ سے میری حالت بہتر ہو گئی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر فریش ہونے کے بعد ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ کمرے کی صفائی کی جا چکی تھی اور میرا نامعقول اور میلا کچیلا لباس غائب تھا۔ گیس ہیٹر اب بھی چل رہا تھا جس کی وجہ سے سردی کا مطلق احساس نہیں تھا۔ میں نے اپنی کنپٹی کو ٹٹولا۔ معمولی نوعیت کا درد محسوس ہوا۔ ایک آدھ دن میں زخم ٹھیک ہونے والا تھا۔ جب ایک وردی پوش نے جھانکا، میں دیوار گیر پینٹنگز دیکھنے میں مصروف تھا۔ مجھے بیدار دیکھ کر اُس نے دریافت کیا۔ ''سر! کھانا تیار ہے، لے آؤں؟''

''شاہد کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔ خیال آنے پر فوراً ہی تصحیح کی۔ ''میرا مطلب ہے شاہد صاحب دکھائی دیں تو انہیں بتا دینا کہ میں ان کا انتظار کر رہا ہوں۔''

''یس سر! میں نے کھانے کے بارے پوچھا ہے۔''

اس کا لہجہ مودبانہ تھا۔

''یس......''

پانچ منٹ بعد اس نے ڈائننگ ٹیبل پر پُرتکلف کھانا چن دیا۔ مجھے زوروں کی بھوک لگی تھی۔ میں نے کھانے سے انصاف کیا، ڈرنک لیا اور شاہد کا انتظار کرنے لگا۔ وہ نصف گھنٹے بعد آیا۔ ٹراؤزر اور شرٹ پہنے ہوئے تھا اور کالج بوائے لگ رہا تھا۔ مجھے ہشاش بشاش دیکھ کر اس کا چہرہ کھل اُٹھا۔ صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھا اور بولا۔ ''کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں، شکریہ!''

''میں نے پاپا سے بات کی تھی۔ وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ ابھی تو آفس میں ہیں۔ جلد آنے کا کہہ گئے تھے۔''

''یار مروا نہ دینا۔'' میرے ذہن میں تشویش کا کیڑا رینگ گیا۔ ''میں عام آدمی نہیں ہوں......''

''یہ تو میں بھی مانتا ہوں کہ تم عام نہیں، خاص آدمی ہو۔'' وہ میری بات کاٹ کر شوخی سے بولا۔

''میرا یہ مطلب نہیں ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ میں پولیس کا سامنا نہیں کر سکتا۔''

''اشتہاری ہو؟''

''ایسا ہی سمجھ لو۔''

''تمہیں اتنی سی بات کی سمجھ بھی نہیں آتی کہ سپرنٹنڈنٹ کی کوٹھی پر سے تمہیں کون گرفتار کرنے کی جرأت کر سکتا ہے؟''

''سپرنٹنڈنٹ آف پولیس......'' میں نے برجستہ کہا۔

''سپرنٹنڈنٹ صاحب کا آفیسر بھی میری مٹھی میں ہے۔ تم جانتے ہو، وہ کون ہے؟'' وہ مسکرایا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ ''میری ماما اُن کی آفیسر ہیں۔''

میں نے مسکرا کر خاموشی اختیار کر لی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر ٹھٹک گیا۔ کان لگا کر کچھ سنتا رہا پھر بولا۔ ''لگتا ہے، پاپا آ گئے۔''

اس کا اندازہ ٹھیک تھا۔ چند لمحوں بعد ایس ایس پی سلیم شہزاد کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے سفید لٹھے کا کلف شدہ لباس پہن رکھا تھا۔ شاہد وجاہت اور نین نقوش میں اپنے باپ پر گیا تھا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور جب وہ صوفے پر بیٹھ گیا، میں بھی مودبانہ انداز میں اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اس نے گہری نظروں سے میرا سرتاپا جائزہ لیا اور بڑے شائستہ لہجے میں خیریت دریافت کی، پھر شاہد کو مخاطب کیا۔ ''میرا خیال ہے کہ وقت ضائع کرنے کے بجائے ہمیں اپنے موضوع پر گفتگو کرنی چاہیے۔ مجھے کہیں جانا ہے۔''

شاہد نے اپنے مخصوص کھلنڈرے انداز میں عاشی اور وحید کے اغوا کی کہانی اور اب تک اپنی اور محکمۂ پولیس کی کارگزاری بیان کی۔ کم و بیش یہی باتیں اُس کے منہ سے میں نے پہلے ہی سن لی تھیں۔ اس نے تھوڑے توقف کے بعد مجھ سے ہونے والی اتفاقیہ ملاقات کا ماجرا سنایا اور بولا۔ ''پاپا! شہریار اور اس کے ساتھی خالد نے وحید کو نیم مردہ حالت میں اُٹھایا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ جب وہ ٹھیک ہوا تو انہوں نے اُسے بس میں بٹھا کر گھر روانہ کر دیا۔ اب آپ جانیں اور آپ کی انکوائری...... میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ مجھے عشرت تک پہنچنا ہے۔''

سلیم شہزاد نے اُس کا کندھا تھپتھپایا اور پیار سے کہا۔ ''اگر میں نے محبت نہ کی ہوتی تو شاید تمہیں نصیحت کرتا کہ اس کا خیال دل سے نکال دو۔ اب یہ کہتا ہوں کہ فکر نہ کرو، تمہارا اخلوص تمہیں اُس تک پہنچا دے گا۔'' پھر میری طرف مڑے۔ ''ہاں تو بیٹا! مجھے یہ بتاؤ، کیا تم وحید کو پہلے سے جانتے تھے؟''

''جی سر!'' میں نے کہا۔

www.pdfbooksfree.pk

''سر نہیں...... انکل کہو یار! یہ میرے پاپا ہیں، پولیس آفیسر نہیں ہیں۔ جب کبھی ان سے دفتر میں ملنے کا اتفاق ہو، تب شوق سے 'سر' کہنا۔'' شاہد نے بے تکلفی سے کہا۔

''جی انکل!'' میں نے فوراً تصحیح کر لی۔

سلیم شہزاد مسکرایا اور مصنوعی غصہ بھری آنکھوں سے اپنے بیٹے کو دیکھنے کے بعد مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''وحید تمہیں کہاں ملا تھا؟ میرا مطلب ہے کہ تم نے اُسے نیم مردہ حالت میں کہاں سے اُٹھایا تھا؟''

میں نے حیدر خان کی حویلی، بیلے، بھیڑیے اور وحید کے بارے تفصیل سے بتا دیا۔

وہ دلچسپی سے سنتا رہا۔ میرے خاموش ہونے پر نرمی سے مستفسر ہوا۔ ''تم اُس حویلی میں کیا لینے گئے تھے؟''

میں نے اُسے پروین کے اغوا کا ماجرا کہہ سنایا۔ وہ بہت ذہین آدمی تھا۔ سننے کے ساتھ ساتھ گہری نظروں سے میرے بیان کی صداقت میری آنکھوں سے کھوجتا جاتا تھا، بولا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا تھا کہ تمہاری بہن کو سردار حیدر خان نے اغوا کر کے اپنی اُس خفیہ حویلی میں رکھا ہوا ہے؟''

میں نے سر جھکا لیا۔ اس نے اپنا سوال دُہرایا تو میں نے ہمت کر کے کہا۔ ''نہیں انکل! ان باتوں کا تعلق عشرت کے اغوا سے نہیں ہے، اس لیے مجھے جواب دینے پر مجبور نہ کیجیے۔''

''او کے...... او کے...... کوئی بات نہیں۔ یہ بتاؤ کہ تم نے اپنی بہن کے اغوا کی رپورٹ تھانے میں درج کرائی تھی؟''

''نہیں...... اگر تھانے جا کر ایف آئی آر درج کرانے کی درخواست دیتا تو نئی مصیبت میں پڑ جاتا۔ پولیس والے بڑے خان کے خلاف ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہ ہوتے۔ داد رسی کیا کرتے، اُلٹا مجھے حوالات میں ڈال دیتے۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ عشرت کو اُسی حویلی میں رکھا گیا تھا اور تمہارے جانے سے پہلے کسی اور نے اُسے وہاں سے نکال لیا؟''

''جی انکل!''

''تمہارے بتائی ہوئی کہانی سے میں یہ نتیجہ اخذ کروں تو غلط نہیں ہوگا کہ سردار حیدر خان، چوک قریشی کے تھانے دار اور ڈی ایس پی نے مل کر بیلے میں پولیس مقابلے کا جو کھیل کھیلا تھا، وہ اِسی بساط پر سجایا گیا تھا جس کا تم تذکرہ کر رہے ہو۔ کیا تم میرے خیال سے متفق ہو؟'' اس نے ٹھہر ٹھہر کر پوچھا۔

میں نے پورے وثوق سے کہا۔ ''جی انکل! اسی واقعے سے ملک کے تمام پولیس مقابلوں کی صداقت میری نظروں میں مشکوک ہو گئی ہے۔''

اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا پھر قدرے توقف سے پوچھا۔ ''سائیں دل جیت شاہ کا سردار حیدر خان سے کیا تعلق ہے؟...... اس نے عشرت اور وحید کو اغوا کر کے اُس حویلی میں کیوں پہنچایا تھا؟''

میں نے کہا۔ ''دونوں کے مفادات سانجھے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ سائیں دل جیت، حیدر خان کا کارندہ ہے۔ اسی کی پشت پناہی پر جرائم کے آسمان پر پروازیں کرتا ہے۔''

''تمہارے خیال میں اِس وقت عشرت کہاں ہوگی؟''

''میں اُسے تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔''

''کیوں؟'' اس نے آنکھیں سکیڑ کر تعجب سے پوچھا۔

''تمہارا اُس سے کیا تعلق ہے؟''

''میرا اُس سے کوئی تعلق نہیں ہے مگر مجھے یقین ہے کہ جہاں وہ ہوگی، وہیں میری بہن بھی ہوگی۔''

''اوہ......'' اس کے لب سیٹی بجانے کے سے انداز میں سکڑ گئے۔ ''کیا دونوں لڑکیاں محفوظ ہوں گی اب تک؟''

میرا دل مٹھی میں آ گیا۔ خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیر کر بولا۔ ''دعا کرتا ہوں کہ وہ جہاں ہوں، خیری سلامتی ہوں۔''

''تمہارے خیال کے مطابق مجھے کیا کرنا چاہیے؟...... ایک پولیس آفیسر کی حیثیت سے......؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں انکل؟'' میں نے چونک کر کہا۔

''اگر ممکن ہے تو آپ سردار حیدر خان کو اَریسٹ کر لیں۔ اُس پر مقدمہ بنائیں اور اسے اغوا کے جرم میں سزا دلوائیں۔''

اس کی ہنسی بڑی زہر خند تھی۔ ''وہ ثبوت کہاں سے لاؤں جنہیں دیکھ سن کر عدالت اس الزام کو مان جائے؟''

میرے پاس اس کے سوال کا جواب نہیں تھا، اس لیے خاموش رہا۔ شاہد نے گفتگو میں حصہ لیا۔ ''ہم وحید کو اُس کمرے میں لے جا سکتے ہیں پاپا جہاں اُسے اغوا کے بعد رکھا گیا تھا۔ اس کی نشاندہی ثبوت کا درجہ نہیں رکھتی کیا؟''

''رکھتی تو ہے مگر اس کی حیثیت کمزور ہے۔'' ایس ایس پی سلیم شہزاد نے کہا پھر مجھے مخاطب کر کے پوچھا۔ ''تم آج کل کیا کرتے ہو؟''

''بتایا تو ہے آپ کو...... میں اپنی بہن کو تلاش کرتا پھرتا ہوں۔ جب وہ ملے گی، تب کوئی کام دھندا چھیڑوں گا۔''

''نور پور میں تمہارے گھر پر کچھ لوگوں نے حملہ کیا تھا۔ دو آدمیوں کو گھر کے ساتھ زندہ جلا دیا تھا۔ تم نے ان لوگوں کو قتل کر دیا اور موقع سے فرار ہو گئے۔ وہ کیا کہانی تھی؟''

www.pdfbooksfree.pk

اس نے براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکا۔

میں نے مدد طلب نظروں سے شاہد کو دیکھا۔ وہ جھٹ سے بولا۔ ''پاپا! فاؤل نہ کھیلیں پلیز!''

سلیم شہزاد کے لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ اپنے بیٹے کو دیکھ کر بولا۔ ''تمہارے جیسے ریفری کی موجودگی میں بھلا میں کیا فاؤل کھیلوں گا۔ او کے...... اب میں چلتا ہوں، تم اپنے نئے دوست کو کمپنی دو۔ یہ تھانہ چوک قریشی کو مطلوب ہے۔ تھوڑا دھیان رکھنا۔ اگر ممکن ہو تو اِسے کسی محفوظ ذریعے سے ملتان پہنچا دینا۔ فون نمبروں کا تبادلہ کر لینا۔ رابطہ کرنے میں آسانی رہتی ہے۔''

وہ اُٹھا، شاہد کے گال پر چپت لگانے کے بعد مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔ ''بیٹا! ڈرو مت۔ یہاں تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ شاہد کے کلاس فیلو ظفریاب کا باپ، سردار بخت خان، بڑا معقول آدمی ہے۔ میرا دوست بھی ہے۔ اس نے مجھے تمام رام کہانی سنا کر تمہاری مدد کی درخواست کی تھی۔ اگر کبھی میری ذات پر بھروسا کرنے کی جرأت اپنے اندر پانا تو مجھے راز دار بنا لینا۔ مگر اَبھی نہیں...... پھر کبھی سہی...... گڈ بائی!''

وہ چلا گیا تو شاہد میرے قریب کھسک آیا۔ اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر بڑے ملتجیانہ انداز میں کہا۔ ''دوست...... مجھے تم نے دوست کہا ہے ناں...... اور مجھ پر اعتماد کیا ہے ناں تم نے؟...... دیکھو! سچ کہتا ہوں کہ میں اپنی عشرت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجھے پاپا نے بتایا ہے کہ تم بڑے دل گردے والے انسان ہو۔ مجھے تمہاری مدد چاہیے۔''

میں نے اُس کے غیر معمولی سرخ چہرے کو، آنکھوں میں اُتری ہوئی نمی کو دیکھا اور تہ دل سے ڈھارس دی۔ ''میں تمہاری کیفیت سمجھ رہا ہوں، خدا نے چاہا تو عاشی جلد ہی تمہارے پاس پہنچ جائے گی۔''

''شہریار! تم غیرت کی جنگ لڑ رہے ہو جبکہ میں عشق کی بازی ہار رہا ہوں۔ تمہاری اور میری قلبی کیفیات میں زمین و آسمان کا فرق حائل ہے۔ میرے اندر ناکامی کی برف جم رہی ہے۔ تمہارے اندر الاؤ روشن ہے، وہ شعلے بھڑک رہے ہیں جو پوری دنیا کو جلانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ تم کہیں سے میری عشرت کو ڈھونڈ لاؤ ورنہ میں مر جاؤں گا...... رات کو دریا پر سے لوٹ آیا تھا۔ دوبارہ جاؤں گا تو شاید لوٹنے کا یارانہ بھی نہ رہے۔''

''تمہارے پاپا......''

''نہیں یار!'' اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''وہ ہر جنگ کو قانونی ہتھیاروں سے لڑنے کے عادی ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اَبھی اُڑ کر حیدر خان کے سر پر پہنچ جاؤں اور اس کی بوٹیاں نوچ کر کتوں کو کھلا دوں۔ پاپا ثبوت مانگتے ہیں۔ اب انہیں کون بتائے کہ یہ شیطان جاگیردار اپنے جرائم کے ثبوت نہیں چھوڑا کرتے۔''

''تو؟'' میں نے پوچھا۔

''تم ہی کچھ کر سکتے ہو شہریار! الٰہ دین کا چراغ رگڑو، کوئی جامِ جمشید ڈھونڈ لاؤ...... کچھ بھی کرو...... مجھے میری عشرت لا دو۔ فار گاڈ سیک ڈیئر!''

وہ اُٹھا اور پلک جھپکتے میں میرے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اپنے دونوں ہاتھ میرے گھٹنوں پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''انکار نہ کرنا یار! تم مسیحا بن کر میری زندگی میں آئے ہو۔ مسیحا کون ہوتا ہے، جانتے ہو؟ وہ جو خدا کی تخلیق کی ہوئی زندگی کو بچاتا ہے۔ تم نے وحید کی زندگی بچائی۔ میری بھی بچا لو۔ زندگی میں کبھی تمہارے کام آ جاؤں گا۔''

میں نے اُس کی بغلوں میں ہاتھ ڈالے اور اپنے ساتھ اُسے بھی کھڑا کر دیا، پھر سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ ایک ہی مسافت سے برسرِ پیکار بے سروساماں، خانماں خراب مسافر تھے۔ تبھی قدرت کی طرف سے مجھے اُس کی اور اُسے میری محبت کا قیمتی جذبہ سونپ دیا گیا تھا۔

وہ چائے نہیں پیتا تھا مگر مجھے الوداعی چائے پلانا چاہتا تھا۔ چائے پینے کے دوران اس نے عاشی کی بہت سی یادیں میرے ساتھ شیئر کیں۔ اس نے بتایا کہ وحید بات بات پر میرا تذکرہ کرتا ہے اور تعریفیں کرتے نہیں تھکتا۔ وہ میرے بارے میں جتنا جانتا تھا، اُس نے سخنے درمے شاہد کو بتا دیا تھا۔ میری دلچسپی پر شاہد نے مجھے عاشی کے گھریلو حالات سے آگاہ کیا۔ عاشی کی ماں وحید کے آنے سے قبل اپنے حواس میں نہیں تھی۔ پاگلوں کی طرح دیواروں سے سر ٹکراتی تھی اور تمام دن روتی اور چیختی تھی۔ اس کا باپ سجاول بھی ایب نارمل ہو گیا تھا۔ دکان مسلسل بند رہتی تھی اور وہ تھانے کی چہار دیواری سے ٹیک لگائے بیٹھا رہتا تھا۔ پہلے تو عشرت کی ماں نے شاہد سلیم کو موردِ الزام ٹھہرایا تھا مگر جب اُس نے بہ مشکل یقین دلا کر اپنی پوزیشن واضح کر دی تو وہ بالکل مایوس ہو گئی۔ اس کی دنیا لٹ گئی تھی۔ بیٹے اور بیٹی کے علاوہ دیکھنے کو بھری دنیا میں کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔

مستزاد یہ ہوا کہ ہر کسی نے، بہ شمول سجاول اور اس کے خاندان کے، اُس پر انگلیاں اُٹھائیں اور لعن طعن کیا۔ بیٹی کے اغوا میں اُسے ملوث قرار دیا۔ یہ تک کہا گیا کہ وہ خود بھی

گندی تھی، اس کی بیٹی بھی گندی نکلی۔ جو لوگ عاشی کا ہاتھ مانگنے کے لیے اُس کے پیروں کو چھوتے تھے، وہ تھوکر کرنے لگے۔ ہر عروج کو زوال آتا ہے۔ اس پر زوال کی گھڑی آ گئی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر بیٹی کی زندگی کی دعا مانگنے کے ساتھ ساتھ دیواروں کو مخاطب کر کے کہتی تھی کہ اُس نے کوئی جرم نہیں کیا..... اس کی بیٹی نے کوئی جرم نہیں کیا..... دیواروں کے کان ہوتے ہیں مگر آنکھیں اور زبان نہیں ہوتی اِس لیے مان جاتی ہیں مگر انسان نہیں مانتا۔

وحید اچانک گھر پہنچا تو ماں باپ کو جینے کا سہارا مل گیا۔ اکلوتے بیٹے کو زندہ و سلامت دیکھ کر دل کی دھڑکن چل پڑی۔ بیٹی کے مل جانے کی آس لگ گئی۔ پولیس نے بہت چاہا کہ عاشی کے اغوا میں نامزد ملزم کے طور پر میرا نام ایف آئی آر میں درج کیا جائے مگر عاشی کی ماں میری حمایت میں سینہ سپر ہوگئی۔ اسے وحید نے میرے بارے میں بتایا تھا اس لیے کس طرح بیٹے کی زندگی بچانے والے پر مقدمہ کرتی۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر دعویٰ کرتی تھی کہ اس کی مامتائی آنکھوں نے مجھے دیکھنے کے بعد مجھے اچھا انسان سمجھا تھا۔ چونکہ تفتیشی آفیسر کے پاس میری ذات پر شک کا نہ جھٹلایا جانے والا جواز نہیں تھا اس لیے وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا کہ ”اگر آپ نہیں مانتیں تو نہ سہی.....“

چار بجے کے قریب وہ اپنی سوزوکی میں بٹھا کر مجھے ٹیکسی اسٹینڈ پر لے آیا۔ ایک نئے ماڈل کی کار کے قریب تاش کھیلتے ہوئے ڈرائیور کو بلا کر تحکمانہ لہجے میں بولا۔ ”دن میں بیس مرتبہ حکم کا یکہ تمہارے ہاتھ لگتا ہے مگر جیب خالی رہتی ہے۔ پھر بھی پتوں پر تکیہ کیے رکھتے ہو بے وقوف آدمی! روزی روٹی کیا کرو، یہ احمقانہ کیم نہ کھیلا کرو۔ یہ میرا مہمان ہے۔ اِسے ملتان چھوڑ آؤ۔ بولو! کتنے پیسے لو گے؟“

اس نے رسماً کہا کہ ”صاحب! جتنے مرضی دے دو“ پھر شاہد کے اصرار پر اس نے کرایہ بتایا۔ شاہد نے جیب سے پیسے نکالے اور گن کر اُس کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”جاؤ، ڈیزل ڈلوا آؤ.....“

اس نے گاڑی نکالنے میں دیر نہیں کی۔ شاہد نے سگریٹ سلگائی اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”شہر یار! تم عمر میں مجھ سے بڑے ہو مگر دوستی میں کوئی بڑا چھوٹا نہیں ہوتا۔ اس لیے میرے روپے پر خفا نہ ہونا۔ تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ چونکہ میں نے وعدہ کیا تھا، اِس لیے مصر نہیں ہوا لیکن یہ تم پر قرض رہا۔ آئندہ ملاقات پر تفصیل سے سننا چاہوں گا کہ تم پر کیا بیتی ہے۔ تمہاری قانونی الجھنوں کو سلجھانے میں بھرپور مدد کروں گا۔“

میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”چلیں! دیکھیں گے کہ تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو۔“

اس نے ایک لمبا کش چھاتی میں اُتارا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”تم نے پاپا سے کہا تھا کہ تمہیں یقین ہے کہ تمہاری بہن اور عاشی محفوظ ہاتھوں میں پہنچ گئی ہیں۔ تمہیں اس بات پر یقین محض اِس لیے ہے کہ ان کے ساتھ تمہارا دوست موجود ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اُس کی حیثیت بھی محض مفوی کی ہے۔ تمہیں یہ توقع ہے کہ اُسی نے موقعے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے دونوں کو اس خوف ناک حویلی سے نکالا ہو۔ ایسا ہی ہے ناں؟“

میں نے اس کا مدعا نہ سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا، وہ بولا۔ ”جبکہ میں سمجھتا ہوں کہ انہیں ایک پھندے سے نکال کر دوسرے میں پھنسا دیا گیا ہے۔ پنجرے کا مالک بدلا ہے، پنجرہ نہیں۔“

اس کے خوب صورت چہرے پر فکر و تردد کی پرچھائیں لرزاں تھیں۔ میں بولا۔ ”میں تمہاری طرح منفی نہیں، مثبت انداز میں سوچنے کا عادی ہوں۔“

”حالات مایوس کن ہیں۔ اُمید کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔“ اس کی آنکھیں ایک دم بجھی بجھی سی لگنے لگیں۔ ”دیکھو شہر یار! اگر تمہاری بہن حیدر خان کی قید سے نکل کر کسی اور قید میں نہیں گئی تو پھر اُس نے اَب تک تم سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟“

میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے بڑی پتے کی بات کی تھی۔ ایسے ہی وقت مجھے خیال آیا کہ پروین کو میرے موجودہ پتے ٹھکانے کا علم ہی نہیں تھا، رابطہ کیسے کرتی؟..... بعید نہیں تھا کہ وہ میری تلاش میں سرگرداں ہو۔ میں نے یہی بات شاہد سے کہی تو وہ مایوسی سے سر ہلا کر بولا۔ ”تمہاری بہن کی حد تک تو اِس خوش گمانی میں رہا جا سکتا ہے مگر میرا گھر اور فون نمبر تو وہی ہے جسے عاشی مرتے دم تک بھول نہیں سکتی۔ اس نے کیوں مجھ سے رابطہ نہیں کیا؟ تم نے امیر نواز کا تذکرہ کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ بھی دونوں کے ساتھ ہے۔ اس کا گھر تو جل نہیں گیا اور نہ اس کے ماں باپ نے ٹھکانا تبدیل کیا۔ اس نے اپنے گھر زندہ اور باخیریت ہونے کی خبر کیوں نہیں دی؟..... شہر یار! میرا دل کہتا ہے کہ میری عاشی شاید مجھے کبھی نہ مل سکے گی۔“

اس کی شکست کے بوجھ تلے دبی ہوئی نیم مردہ آواز اور پختہ دلیل نے مجھے لحظہ بھر میں مضطرب کر دیا۔ میں نے

جی کڑا کر کے اُسے تسلی دی ”کم آن ڈیئر! یوں مایوس نہیں ہوتے۔ خدا پر اپنے یقین کو کامل اور ایمان کو پختہ رکھو۔ اس نے وحید کو زندہ رکھنے کے لیے مجھے اس مقام پر پہنچا دیا جہاں پہنچنے کا زندگی بھر میں نے ارادہ تک نہیں کیا تھا۔ ایسی ہی کوئی اچھی صورت عاشی اور پروین کے لیے بھی قسمت تشکیل دیدے گی۔ مجھے یقین ہے، تم بھی خود کو مضبوط رکھو ورنہ ہم ان کی مدد کرنے کے قابل نہیں رہیں گے۔“

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایسے ہی وقت میں ڈرائیور نے فٹ پاتھ کے ساتھ گاڑی روکی اور ہارن بجایا۔ میں نے شاہد سے ہاتھ ملایا اور ’ٹیک کیئر‘ کہہ کر گاڑی کا رُخ کیا۔ جب میں سیٹ پر بیٹھ گیا، تب شاہد نے چیخ کر کہا۔ ”اوئے شہر یار! تم نے کبھی عشق نہیں کیا..... تمہیں کسی نے محبت نہیں کی..... اس لیے فلسفہ بگھارتے ہو۔ کبھی جان شکنجے میں آ گئی تو پوچھوں گا..... پھر یہی نصیحت کروں گا، بڑے دانشوروں کی طرح..... ناؤ گڈ بائے ڈیئر!“

اس کی فطرت ہی ایسی تھی۔ پل میں ماشہ، پل میں تولہ..... میرے لبوں پر بے عنوان سی مسکراہٹ چپک گئی۔ ٹیکسی کی رفتار تیز ہو گئی۔ خوب صورت میزبان میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ ملاقات کا آخری منظر..... اُس کا طعنہ بار، ہنستا ہوا چہرہ میری آنکھوں میں کافی دیر کے لیے ثبت ہو کر رہ گیا۔

میں چار بجے کے لگ بھگ اپنے گھر پہنچ گیا۔ شانو نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ میری طویل غیر حاضری پر برہم تھی۔ فرزانہ اور موجو نے میری حمایت کرتے ہوئے اس جرح سے میری جان چھڑائی۔ میرے سر پر بندھی ہوئی اسمارٹ بینڈیج دیکھ کر سبھی متفکر ہوئے۔ میں نے ’معمولی چوٹ ہے‘ کہہ کر انہیں مطمئن کیا۔ فوجی اختر نے مجھے بتایا کہ پپا جی نے اسکول کے کاغذات نہ صرف مکمل کروا دیے ہیں بلکہ موجو کا قریبی انگلش میڈیم اسکول میں ایڈمشن بھی کروا دیا ہے۔ مجھے خوشی ہوئی۔

اپنے کمرے میں آیا، بیڈ پر نیم دراز ہو کر ساتھ نتھی ہوئی شانو سے مخاطب ہوا۔ ”تم بھی اسکول میں داخلہ لے لو۔“

وہ جھٹ سے بولی۔ ”بھائی! کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے تم بہت بدل گئے ہو۔ تم پہلے والے شہر نہیں رہے ہو۔“

”کیا ہوا؟“ میں پریشان ہو گیا۔

”تمہیں یاد ہی نہیں کہ میں میٹرک کر چکی ہوں۔“ مجھے شرمندگی ہوئی۔ جلدی سے کہا۔ ”میرا مطلب ہے کہ کالج میں داخلہ لے لو۔“

وہ بولی۔ ”انکل کہتے ہیں کہ داخلے کے لیے بورڈ کی سند ضروری ہے۔ سند ہو تب بھی میٹرک کا نیا رزلٹ آنے کے بعد کالجوں کے ایڈمشن کھلیں گے۔“

”پرائیویٹ کالجز میں سارا سال داخلہ ہوتا رہتا ہے۔ میں پتا کروں گا۔ ادھر قریب ہی بورڈ کا دفتر واقع ہے۔ کسی وقت چلی جانا اور ڈپلی کیٹ سرٹیفکیٹ نکلوانے کا پراسس معلوم کرنا۔ اوکے؟“

وہ بولی۔ ”میں نے موجو کے ساتھ جا کر بورڈ کی عمارت دیکھ لی ہے۔ حکم کی تعمیل ہو گی بھائی!“

وہ بڑی ادا سے مجھے بھائی کہا کرتی تھی۔ مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ میرے سامنے بیٹھی بے تکلفی سے اپنے مخصوص انداز میں بے ربط باتیں کر رہی تھی۔ وہ بچپن ہی سے شرارتی طبع واقع ہوئی تھی اور لاڈ پیار نے اُسے منہ پھٹ بھی بنا دیا تھا۔ جو بات فرزانہ اور پروین نہیں کہہ پاتی تھیں، وہ بلا دھڑک کہہ دیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میری طرف شرارت سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”بھائی! کیا تمہیں غزالہ کی یاد نہیں آتی؟“

میں نے اُسے دیکھا۔ دونوں گال تمتما رہے تھے۔ آنکھوں سے شرارت امڈ رہی تھی، میں بولا۔ ”نہیں شانو! مجھے سوائے پروین کے، کوئی یاد نہیں آتا۔“

اس کی آنکھوں کی مشعلیں اچانک ہی بجھ گئیں۔ مجھے افسوس ہوا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”جب وہ ہمارے درمیان موجود ہو گی، تب ہم مل کر غزالہ کو یہاں لانے کا منصوبہ بنائیں گے۔“

اس نے ایک طویل سانس خارج کی اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اُٹھ گئی۔ دروازے میں رُک کر پلٹے بغیر بولی۔ ”چائے پیو گے؟“

میں نے کہا۔ ”اپنے ہاتھ سے تیار کرو تو ضرور پیوں گا۔“

میں چاہتا تھا کہ میں نے بے دھیانی میں اُسے جس اندوہ بھری کیفیت میں دھکیل دیا تھا، وہ مصروف ہو کر اُس سے نکل آئے ورنہ مجھے چائے کی طلب نہیں تھی۔ اُس کا بجھا بجھا چہرہ مجھے دُکھ دیتا تھا۔ اُس سمیت میں سبھی کو خوش اور ہنستا کھیلتا دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ جذبہ میرے اندر تب پیدا ہوا جب ان کا میرے علاوہ دنیا میں کوئی نہیں رہا تھا۔ شاید اِسی جذبے کو ’مامتا‘ کا نام دیا جاتا ہے یا دنیا کے اس قیمتی ترین جذبے کا ابتدائی مرحلہ..... احساسِ سرپرستی.....

www.pdfbooksfree.pk

چند منٹوں بعد وہ چائے کا بڑا سا پیالہ تھامے کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر پیالے کو دیکھا تو وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ ”یہ دودھ پتی ہے، چائے تھوڑی ہے۔“

”کیا ساری رات بیٹھا پیتا رہوں گا؟“ میں نے مصنوعی غصے سے کہا۔ ”اور یہ کیا ہے؟“

اس نے ہاتھ میں ایک پیپر رول پکڑ رکھا تھا۔

وہ بولی۔ ”دکھانے کے لیے لائی ہوں کہ یہ کاغذات تمہارے کام کے تو نہیں...... الماری کی صفائی کرنے پر ملے ہیں۔“

”اوہ یس......“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ مجھے یاد آیا کہ یہ پیپر رول مجھے کہاں سے ملا تھا۔ یہ مجھے اُس لینڈ کروزر کی سیٹ پر سے ملا تھا جس میں میرے گھر پر حملہ کرنے والے نور پور آئے تھے اور انہوں نے اسے سائیں جگ جیت کے مزار کے احاطے میں پارک کیا تھا۔ پھر جب میں نے شانو، فرزانہ اور کھالے کو اپنی اسوزوٹرو یر میں منتقل کیا تھا، تب اس رول کو بھی اُٹھا لیا تھا۔ سوچا تھا کہ سکون سے بیٹھ کر ان کا مطالعہ کروں گا۔ مجھے یہ توقع رہی تھی کہ ان کاغذات میں کوئی کار آمد اور مجھ سے متعلقہ تحریر ہی ہوگی۔ بعد میں اسے بھول گیا۔

میں اُٹھ بیٹھا۔ اس کے ہاتھ سے پیپر رول لے کر الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ شانو نے کہا۔ ”تم چائے پیو، میں اسے کھولتی ہوں۔“

اس نے میرے ہاتھ سے رول اچک لیا اور ربڑ بینڈ کھینچ کر اُتار دیا۔ سفید رنگ کے فوٹو اسٹیٹ پیپر میں اسٹامپ پیپرز لپٹے ہوئے تھے۔ وہ انہیں سیدھا کر کے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”بھائی! ان پر تو بابا کا نام لکھا ہوا ہے...... یہ دیکھو!“

میں نے پیپر تھامے اور بیڈ پر پھیلایا۔ وہ چونکہ کافی دیر تک مڑے رہے تھے اِس لیے اسپرنگ کی طرح فوراً رول ہو گئے۔ میں نے چائے کا پیالہ رکھا اور انہیں کھول کر بہ غور پڑھنے لگا۔

وہ تین مختلف مالیت کے اسٹامپ پیپرز پر مخصوص اندازِ تحریر میں رقم کیا گیا رجسٹرڈ بیع نامہ تھا جو عمومی طور پر زمینوں کی خرید و فروخت کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ پہلے پرت پر زمین کا تتمہ اور کیفیت نامہ درج تھا۔ میرے دل کی دھڑکن اپنے چاچے چراغ دین کا نام، ولدیت اور سکونت وغیرہ دیکھ کر تیز ہونے لگی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ اس دستاویز کی رُو سے چاچے نے اپنی وراثتی جائداد فروخت کی تھی۔ اس پر چار سال قبل کی تاریخ ڈالی گئی تھی۔

میں نے تینوں اسٹامپ پیپرز الٹ پلٹ کر دیکھے۔ چاچا چراغ کے انگوٹھے لگے ہوئے تھے۔ شناختی کارڈ کا نمبر بھی درج تھا۔ زمین کو بیچنے کے اِس معاہدے پر گواہان کے نام اور دستخط بھی موجود تھے۔ میں نے دونوں نام پڑھے۔ وہ میرے نزدیک اجنبی تھے۔

بیع نامہ مکمل تھا۔ اس پر کیے گئے دستخط، ثبت شدہ انگوٹھوں کے نشان اور شہادتیں اصلی تھیں۔ ریونیو آفیسر کی تصدیق اور مہر بھی ثبت تھی۔ اس دستاویز کو ریونیو ریکارڈ میں شامل کرنے کے لیے صرف پٹواری کی جانب سے انتقال کا پیشہ وارانہ عمل باقی تھا۔

میرے ہونٹ بھنچ گئے۔ سمجھ میں آ گیا کہ میرے گھر پر حملہ آور ہونے والے اس دستاویز پر چاچے کے انگوٹھے ثبت کرانے آئے تھے۔ انہوں نے چاچے کی موت سے پہلے یا بعد میں اپنا کام مکمل کر لیا تھا مگر ان کی موت ان کا پیچھا کرتی ہوئی عین موقعے پر پہنچ گئی۔ اگر یہ رجسٹری ریونیو آفس تک پہنچ جاتی تو میرے چاچے کی تمام تر زرعی و رہائش جائداد کسی اور کے نام منتقل ہو جاتی۔

شانو میرے چہرے کے دم بہ دم بدلتے ہوئے تاثرات دیکھ رہی تھی، پریشان ہو کر مستفسر ہوئی۔ ”بھائی! اس میں کیا لکھا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی تم جاؤ اور مجھے توجہ سے پڑھنے دو۔“

وہ بولی۔ ”چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ کیا گرم کر دوں؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کاغذات میں کھو گیا۔ ایسے ہی وقت میں میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔ میں نے کریدتی ہوئی نظروں سے جائداد خریدنے والے کا نام تلاش کرنا شروع کر دیا۔ وثیقہ نویس بڑے ٹیڑھے اور الجھے ہوئے طرزِ تحریر میں لکھتے ہیں، الفاظ اور جملے بھی خالصتاً اصطلاحی ہوتے ہیں اس لیے مجھے تھوڑی دقت ہوئی مگر میں پڑھنے اور سمجھنے میں کامیاب ہو گیا۔ جونہی اپنے مطلوبہ نام پر نظر پڑی، میرا دل دھک سے رہ گیا اور یوں لگا جیسے مجھے کسی نے انگاروں سے دہکتے ہوئے کنویں میں دھکا دے دیا ہو۔ یہ نام تو میرے دل پر کندہ تھا۔

معاشرتی ناہمواریوں پر مبنی دلوں کی دھڑکن، لہو کی گردش تیز کر دینے والے سطر بہ سطر جاری
اس سفر کے اگلے پڑاؤ کا احوال آئندہ ماہ

پیش عقل

مریم کے خان

دکھ اور تکلیف میں قدرت نے ایسا گداز رکھا ہے جو انسان کو عاجزی کی طرف مائل کرتا ہے۔ جیسے ایک اور ایک گیارہ ہو سکتے ہیں ویسے ہی کئی کمزور مل کر ایک طاقت بن جاتے ہیں۔ وہ منظر کچھ ایسا ہی رقت انگیز تھا جس نے کئی سنگ دلوں کو بھی رلا دیا... جب کسی نے اپنی جیت کو کسی کی ہار سے بدل ڈالا تو... انجانے میں کتنے باشعور آپ ہی شرمندہ ہو کر رہ گئے۔

ایک ایسے مقابلے کی روداد جس سے کتنے ضمیر جھنجھنا اٹھے

اس چھوٹے سے خوب صورت اسٹیڈیم میں خاصی گہما گہمی تھی۔ سرخ اینٹوں سے بنی اس چار دیواری میں ایک طرف اسٹینڈ بنا تھا اور اس کے سامنے سرسبز میدان تھا۔ دور سبز پہاڑیوں کے پس منظر کے ساتھ یہ جگہ اور بھی خوب صورت لگ رہی تھی۔ اسٹینڈ میں خاصے لوگ تھے اور زیادہ تر فیملیز تھیں۔ اِکا دُکا لوگ اکیلے بھی آئے تھے لیکن وہ بھی کسی نہ کسی طرح اس تقریب سے متعلق تھے۔ مارچ کا آغاز تھا اس لیے سردی کی شدت کم تھی اور دھوپ اچھی لگ رہی تھی۔ میں اپنے

www.pdfbooksfree.pk

ساتھی کیمرامین فیصل کے ساتھ اسٹیڈیم میں داخل ہوئی تو ریس کے آغاز میں کچھ وقت تھا۔ میں جس چینل کے لیے کام کرتی ہوں وہاں مجھے عام طور سے ایسے واقعات کی کوریج کے لیے بھیجا جاتا ہے جنہیں دیکھ کر ناظرین کا بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا ہے۔ آپ صرف سوچ سکتے ہیں کہ ان واقعات کی کوریج کرتے ہوئے میرا کیا حال ہوتا ہوگا لیکن میڈیا اب ایک ووڈ بن گیا ہے، سب سے پہلے خبر کے جنون نے چینل ملازمین کی نیند حرام کر دی ہے، خاص طور سے جو خبر سے متعلق ہوں۔

مگر آج میرے ڈائریکٹر نے غیر متوقع طور پر مجھے اس اسپورٹس ایونٹ کی کوریج کے لیے بھیج دیا۔ یہ کوئی خاص ایونٹ نہیں تھا۔ خبروں میں اس کی کوئی اہمیت بھی نہیں تھی۔ اس بات کا تو بے فیصد امکان تھا کہ جب اس اسپورٹس ایونٹ کی خبر چینل سے نشر ہوگی تو لوگ چینل بدل کر کوئی دوسرا چینل لگا لیں گے جہاں سے کوئی گرما گرم مباحثہ یا انٹرٹینمنٹ کا پروگرام نشر ہو رہا ہوگا۔ ظاہر ہے کسی بھی رپورٹر کے لیے اس سے زیادہ حوصلہ شکن بات کوئی نہیں ہو سکتی کہ اس کی رپورٹ کو ناظرین یا پڑھنے والے ہی نہ میسر آئیں۔ مگر باس کا حکم تھا اس لیے آنا پڑا۔ اس نے واضح کر دیا تھا کہ اس کی بھی مجبوری ہے، ایونٹ میں شامل ایک لڑکی اس کی مسز کی بھتیجی ہے اس لیے کوریج لازمی ہوگی۔

ظاہر ہے، ہر چینل پر ایسی سورس دستیاب نہیں تھی اس لیے جب میں اسٹیڈیم میں داخل ہوئی تو وہاں صرف سرکاری ٹی وی کی ٹیم موجود تھی۔ ایونٹ میں صرف ریس شامل تھی۔ اس میں نوجوان لڑکے لڑکیاں شامل تھے۔ جو اٹھارہ سال سے اوپر تھے ان کی الگ الگ ریس تھی پھر بارہ سے اٹھارہ سال کے لڑکے لڑکیوں کی ریس تھی اور تیسری کیٹگری بارہ سال سے کم عمر لڑکے لڑکیوں کی تھی۔ گویا کل چھ ریس تھیں اور ہر ریس کا فاصلہ کوئی دو سو گز تھا۔ بیس بیس منٹ کے وقفے سے یہ تمام ریس دو گھنٹے میں تمام ہو جاتیں۔ اسٹینڈ میں اوپر ایک باکس میں کنٹینٹر بیٹھے تھے اور ریس کی تیاری کی کمنٹری کر رہے تھے۔ میں نے فیصل کے ساتھ ایک مناسب جگہ تلاش کی۔ اس نے منہ بنا کر کہا۔ ”یہاں کھانے پینے کے آثار نظر نہیں آ رہے ہیں۔“

”ہر جگہ کھانے کے چکر میں مت رہا کرو۔“ میں نے کہا۔ ”برائے مہربانی کیمرا اسٹینڈ میں موجود خواتین کے بجائے ریس میں حصہ لینے والے بچوں پر رکھنا۔“

”یہ بچے تو نہیں ہیں۔“ فیصل نے ایک طرف موجود لڑکیوں کو دیکھ کر کہا۔ لڑکیوں نے ریس کا لباس پہن رکھا تھا، جو ڈھیلے ٹراؤزر اور ٹی شرٹ پر مشتمل تھا۔ ان میں سے اکثر لڑکیوں کی صحت بہت اچھی تھی جیسا کہ اسپورٹس میں حصہ لینے والی لڑکیوں کی ہوتی ہے۔ وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ تھیں اور اسپورٹس ایونٹ میں حصہ لینے کے خیال سے خوش اور پر جوش تھیں۔ انہیں شاید احساس بھی نہیں تھا کہ اس لباس میں فیصل جیسی ذہنیت رکھنے والے لوگ انہیں کس طرح دیکھ رہے ہیں۔ میں نے پُرملامت نظروں سے فیصل کو گھورا تو وہ ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔

زیادہ تر فیملیز وہی تھیں جن کا کوئی بچہ اسپورٹس ایونٹ میں حصہ لے رہا تھا۔ ان کے تعاد بھی اچھی خاصی تھی اس لیے اسٹیڈیم میں گہما گہمی کا منظر تھا۔ ریس کا آغاز ہونے والا تھا۔ سب سے پہلے بارہ سال سے کم عمر بچیوں کی ریس ہوئی۔ بچیاں اسٹارٹنگ لائن پر آئیں۔ ان کے ماں باپ اور دوسرے گھر والے اسٹینڈ کے نچلے حصے میں آگئے اور ابھی سے آوازیں لگا کر ان کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ فیصل نے کیمرا سنبھال لیا اور میں تبصرہ ریکارڈ کرانے لگی۔ ریس کا آغاز پستول کے فائر سے ہوا، بچیاں دوڑ پڑیں۔ وہ چھوٹی تھیں اور ان کو ذرا دشواری بھی ہو رہی تھی لیکن وہ دوڑتی رہیں اور تقریباً سب نے آس پاس فنشنگ لائن عبور کی۔ دوڑنے سے اور فنشنگ لائن کراس کرنے کی خوشی میں ان کے چہرے چمک رہے تھے۔ ریس ختم ہوتے ہی ان کے ماں باپ اور گھر والے اسٹینڈ سے نکل کر ان کے پاس آگئے اور انہیں مبارک باد دینے لگے۔ انعامات سب سے آخر میں دیے جاتے۔

دوسری ریس لڑکوں کی تھی۔ یہ بھی اسی طرح ختم ہوئی۔ تقریباً تمام لڑکوں نے آس پاس فنشنگ لائن عبور کی اور اس ریس میں بھی فاتح یا دوسرے تیسرے نمبر پر آنے والے کا اعلان نہیں کیا گیا، کیونکہ اسپورٹس ایونٹ کا مقصد ان بچوں کی حوصلہ افزائی کرنا تھا، ان میں مقابلہ کرانا نہیں تھا۔ وہاں موجود لوگوں کی ان بچوں سے وابستگی اور ان کی طرف سے حوصلہ افزائی دیکھ کر میں بھی جذباتی ہو گئی تھی اور مجھے یہاں آنے سے جو ذرا کوفت ہوئی تھی، وہ خوشی میں بدل گئی۔ حد یہ کہ فیصل جیسا آدمی بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ فطری طور پر وہ کیسا بھی لیکن اس میں شک نہیں کہ میں نے اس سے اچھے کیمرا مین بہت کم دیکھے تھے۔

تیسری ریس کے بعد کھانے اور آرام کا وقفہ ہوا تھا۔ تب ہمیں پتا چلا کہ اسٹینڈ کے پیچھے شامیانہ لگا کر وہاں آنے والوں کے لیے ریفریشمنٹ کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہ باقاعدہ کھانا نہیں تھا لیکن بہت سارے بیکری آئٹمز موجود تھے جن

کے ساتھ کولڈ ڈرنک، چائے اور کافی بھی تھی۔ کھلاڑیوں کے لیے الگ جگہ تھی جبکہ عام لوگوں کے لیے الگ جگہ کا انتظام تھا۔ خلاف توقع وہاں سب نے ہی بہت تمیز اور تہذیب سے کھایا تھا، نہ تو ہڑبونگ مچی تھی نہ چیزیں گرائی گئی تھیں اور نہ ہی کھانا ضائع کیا گیا تھا۔ لوگ بہت آرام سے، سکون سے اپنی اپنی پسند کی چیزیں لے کر کھا رہے تھے۔ فیصل نے ایک کیک پیسٹری کھاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ ہمارے ملک میں اس طرح سکون اور تمیز سے بھی کھایا جا سکتا ہے۔“

”واقعی۔“ میں نے اعتراف کیا۔ ”ورنہ میں نے فائیو اور سکس اسٹار ہوٹلوں میں بھی ان لوگوں کو اس طرح کھاتے اور ضائع کرتے دیکھا ہے جو ارب کھرب پتی ہوتے ہیں۔“

مجھے ریس کا دوسرا مرحلہ شروع ہونے سے پہلے بچوں اور ان کے گھر والوں کے تاثرات بھی ریکارڈ کرنا تھے اس لیے کھانے کا مرحلہ جلدی جلدی ختم کیا گیا۔ فیصل نے کیمرا اور میں نے مائک سنبھالا اور ہم کھلاڑیوں اور ان کے گھر والوں کے تاثرات ریکارڈ کرنے لگے۔ وہ سب بہت خوش تھے کہ ان کے لیے اسپورٹس ایونٹ کا انعقاد کیا گیا تھا۔ ایک چھ سال کی بچی بہت خوش تھی اس نے اپنی توتلی زبان میں جو بتایا اس کا ترجمہ اس کی ماں نے کیا۔ بچی کا کہنا تھا کہ وہ فنشنگ لائن کراس کرنے پر بہت خوش ہے کیونکہ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ ایسا کر سکے گی۔ ایک دس سالہ لڑکے نے شکایت کی کہ اس کا جوتا ٹھیک نہیں تھا ورنہ وہ سب سے آگے نکل جاتا۔

کھانے اور آرام کا وقفہ ختم ہوا اور ریس کا اگلا مرحلہ شروع ہوا۔ اس بار بارہ سے اٹھارہ سال تک کے لڑکوں کی ریس تھی۔ آخری دو ریس اٹھارہ سال سے اوپر کی لڑکیوں اور لڑکوں کی تھی۔ مگر یہ سب بھی بچے تھے۔ مجھے یقین تھا ان میں سے کسی کی عمر بھی بیس سال نہیں ہوگی۔ اب لڑکیوں کی ریس تھی۔ یہ کل آٹھ لڑکیاں تھیں۔ سوائے ایک کے سب گوری چٹی، خوب صورت نقوش والی اور صحت مند تھیں۔ ایک ان میں سے کسی قدر سانولی تھی اور اس کی صحت بھی اتنی اچھی نہیں تھی۔ لڑکیوں کو دیکھ کر فیصل کی آنکھوں میں پھر چمک سی آ گئی تھی۔ وہ کچھ ٹھرکی واقع ہوا تھا اور آدمی اپنی فطرت نہیں بدل سکتا ہاں، اسے دبا ضرور سکتا ہے۔

”میرے خدا۔“ اس نے زیر لب کہا۔ ”انہیں کون لڑکیاں کہہ سکتا ہے یہ تو دو بچوں کی مائیں لگ رہی ہیں۔“

”بکواس بند کرو۔“ میں نے دانت پیس کر کہا۔ ”کسی نے تمہاری بات سن لی تو چینل پر تمہارے بارے میں خبر آ رہی ہوگی۔ ان کے چہرے دیکھو اتنی معصومیت تو آج کل چار پانچ سال کی بچیوں کے چہرے پر بھی نہیں ہوتی ہے لیکن تم چہرہ دیکھتے ہی کہاں ہو...؟“ میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔

فیصل کھسیا گیا۔ ”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“

”ٹھیک ہے، اب اپنا کام کرو اور کیمرے کا لینس قابو میں رکھنا۔ میں بعد میں پوری ویڈیو دیکھوں گی۔“ میں نے اسے خبردار کیا۔

”اوکے باس۔“ فیصل نے بدمزگی سے کہا اور کیمرے پر جھک گیا۔

لڑکیاں اسٹارٹنگ لائن پر آ گئی تھیں اور ذرا ترچھا ہو کر بھاگنے کا پوز بنا لیا تھا۔ ان کے ماں باپ اور گھر والے ابھی سے تالیاں بجا کر ان کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ جیسے ہی فائر ہوا وہ سب دوڑ پڑیں۔ زیادہ تر لڑکیاں تو فوراً ہی آگے نکل گئی تھیں حالانکہ ان میں سے بعض کو دوڑنے میں دشواری

دنیا بھر میں
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی مطبوعات
سسپنس ڈائجسٹ | جاسوسی ڈائجسٹ | پاکیزہ ڈائجسٹ | سرگزشت
منگوانے کیلئے ہمارے مقرر کردہ ایکسپورٹرز
ویلکم ٹریڈرز
سے رابطہ کریں
WELCOME TRADERS
189-E, Block-2,P.E.C.H.S, Karachi,
Pakistan
Tel: (92-21) 34545513, 34520214.
Fax(92-21) 3454885.
Cell # 0333-4315950
Email: zaidi@welcome.com.pk
Website: www.welcome.com.pk

www.pdfbooksfree.pk

پیش آ رہی تھی۔ البتہ سانولی لڑکی پیچھے رہ گئی۔ اس سے درست انداز میں بھاگا نہیں جا رہا تھا۔وہ دوسری لڑکیوں سے دس بارہ قدم پیچھے تھی اور صاف لگ رہا تھا کہ وہ فنشنگ لائن تک دوسروں کے بہت دیر بعد پہنچے گی۔دوسری لڑکیاں نصف فاصلہ طے کر چکی تھیں۔جوش اور بھاگنے کی محنت سے ان کے چہرے سرخ ہو کر چمک رہے تھے۔وہ فنشنگ لائن تک جلد از جلد پہنچنے کے لیے جسم و جان کی ساری توانائی استعمال کر رہی تھیں۔

سانولی لڑکی اب بری طرح لڑکھڑا رہی تھی اور سب کی توجہ آگے جانے والی لڑکیوں کے بجائے اس پر تھی۔پھر وہی ہوا جو میرے ذہن میں اور سب کے ذہن میں آیا تھا،لڑکی گری اور بہت زور سے گری، اس کے گھٹنے پر چوٹ آئی اور وہ بے ساختہ چلا اٹھی۔اس کے بعد وہ بری طرح رو دی۔لیکن یہ رونا تکلیف کی وجہ سے نہیں تھا، یہ رونا دوسری لڑکیوں سے پیچھے رہ جانے کی وجہ سے تھا جو اس سے خاصی آگے جا چکی تھیں۔لڑکی کو گرتے دیکھ کر اسٹینڈ میں بیٹھے لوگ بے اختیار کھڑے ہو گئے تھے۔ ایک عورت نے بے ساختہ ریلنگ عبور کرنا چاہی لیکن اس کے ساتھ موجود مرد نے بازو سے پکڑ کر اسے روک لیا شاید وہ سانولی لڑکی کے ماں باپ تھے۔مرد آگے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عورت سے کچھ کہہ رہا تھا۔تب میں نے اور دوسروں نے دیکھا۔سانولی لڑکی کی چیخ اور رونے کی آواز سن کر آگے نکل جانے والی لڑکیاں رک گئی تھیں، پھر وہ پلٹ کر واپس آنے لگیں۔انہوں نے دوڑنا ترک کر دیا تھا۔ریس کی انتظامیہ کے لوگ حیران تھے۔کچھ اور لوگ بھی سانولی لڑکی کو اٹھانے کے ارادے سے آگے بڑھے تھے لیکن وہ بھی ان لڑکیوں کو واپس آتے دیکھ کر رک گئے۔

لڑکیوں نے اپنی ساتھی لڑکی کو دیکھا۔ایک نے ٹراؤزر کا پائنچہ بلند کر کے اس کے گھٹنے کو دیکھا اور باقیوں نے اس کے گرد حلقہ بنا کر پردہ کر دیا۔سانولی لڑکی کو روتے دیکھ کر وہ بھی رونے لگی تھیں پھر انہوں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور سب ایک قطار بنا کر آگے بڑھنے لگیں دو لڑکیوں نے سانولی لڑکی کو دائیں اور بائیں سے سہارا دے رکھا تھا۔اب وہ سب ساتھ ساتھ چل رہی تھیں حالانکہ لڑکی کو صرف دو لڑکیوں نے سہارا دے رکھا تھا اور باقی پانچ آزاد تھیں مگر انہوں نے اپنی رفتار نہیں بڑھائی تھی۔ یہ بہت سادہ لیکن بہت عجیب منظر تھا۔ مجھے احساس تھا کہ میں ایک ایسا منظر دیکھ رہی ہوں جو عام زندگی میں دیکھنے کو نہیں ملتا ہے اور شاید ہم میں سے کسی کو دوبارہ ایسا منظر دیکھنے کا موقع نہیں ملے گا۔

ان تمام آٹھ لڑکیوں نے ایک ساتھ فنشنگ لائن عبور کی اور پھر ان لڑکیوں کے ماں باپ، جو خود بھی اشکبار تھے، ان لڑکیوں کی طرف دوڑ پڑے۔میرا اندازہ درست نکلا، بیتاب ہو کر ٹریک پر آنے والی سانولی لڑکی کی ماں تھی۔اس نے جاتے ہی اسے سینے سے لگا لیا۔لڑکی اب خوش تھی، یہ خوشی اس کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔اگرچہ اس کی آنکھوں سے آنسو بھی جاری تھے۔صرف اسی لڑکی کی نہیں بلکہ تمام لڑکیوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ان کے ماں باپ اور گھر والے بھی رو رہے تھے اور دوسرے لوگ بھی اپنی آنکھیں صاف کر رہے تھے۔جب میں نے فیصل کی طرف دیکھا تو وہ مجھے دھندلا نظر آ رہا تھا۔تب مجھے پتا چلا کہ میں بھی رو رہی تھی۔ میں نے آنکھیں صاف کیں تو مجھے فیصل بھی آنکھیں ملتا نظر آیا اور پھر اس نے میری طرف دیکھ کر کھسیانے انداز میں کہا۔

''آج مٹی اڑاتی ہوا چل رہی ہے۔''

''ہاں شاید۔'' میں نے اس کی بات کی تردید نہیں کی۔''یہ سارا منظر ریکارڈ ہوا ہے نا؟''

''بہت اچھی طرح۔'' اس نے اپنا کیمرا تھپتھپایا۔''تم جانتی ہو میں سین مس کرنے والا آدمی نہیں ہوں۔''

میں نے آنکھیں صاف کرنا چاہیں تو فیصل نے روک دیا۔''نہیں، ایسے ہی ٹھیک ہے اس طرح ریئل ٹچ آئے گا۔''

فیصل نے کیمرا میری طرف کیا اور میں نے مائک سنبھالا اور بولنا شروع کیا۔'' آپ نے ابھی اپنی ٹی وی اسکرین پر جو منظر دیکھا وہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔اگر ان لڑکیوں کی جگہ آپ اور ہم ہوتے تو شاید اس لڑکی کے گرنے پر مڑ کر بھی نہ دیکھتے، ہمیں صرف آگے اور سب سے آگے نکل جانے کی دھن ہوتی کیونکہ ہم باشعور ہیں اور عقل رکھتے ہیں۔ یہ لڑکیاں جنہیں ہم ایب نارمل کہتے ہیں کیونکہ ان کے پاس دماغ ہے لیکن اس میں عقل نہیں ہے۔ان معصوم لڑکیوں نے آج ہمیں سبق دیا ہے...... زندگی دوڑ کا نام نہیں ہے یا دوسرے سے آگے نکل جانے کا نام نہیں ہے...... یہ گرتوں کو سہارا دینے اور انہیں اپنے ساتھ لے کر چلنے کا نام ہے۔یہ بچے سیکھنے کے لیے ہمارے محتاج ہیں لیکن انہوں نے بتا دیا کہ ہم بھی ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ان کے پاس عقل نہیں تو کیا ہوا ان کے پاس انسانیت تو ہے جو شاید ہمارے پاس نہیں ہے۔ کیمرا مین فیصل شفیع کے ساتھ حمیرا احمد...''

□

www.pdfbooksfree.pk

ضیا تسنیم بلگرامی

سرمد شہید

اللہ اپنے لیے جب خاص بندوں کا انتخاب کرتا ہے تو ان کے عادات و اطوار اور کردار بھی بہت خاص بنا دیتا ہے۔ ایران کی سرزمین پر پیدا ہونے والے اس ولی کا مزاج بھی بچپن سے بہت منفرد رہا، اس کے نزدیک حرص و ہوس اور دولت کی تجارت ہمیشہ بے معنی رہی۔ شاہ جہان کے دور میں اس ولی کا بہت شہرہ تھا جس کا دارا شکوہ بھی گرویدہ رہا... بالآخر حالات کی ستم ظریفی نے اورنگ زیب کے حکم پر ان کا سر تن سے جدا کرا دیا۔

دنیاوی تجارت کی نفی کرنے والے ایک ولی کی سچی اور کھری باتیں

سترھویں صدی کے ایران میں جو قومیں آباد تھیں ان میں یہودی بھی شامل تھے۔ان کی اکثریت کاشان میں آباد تھی اور یہ بیشتر تاجر تھے۔جو مسلمانوں میں گھلے ملے رہنے کے باوجود اپنی قومیت اور سماجی روایات کو دل و جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ان کے گرد و پیش اسلام کا چرچا رہتا مگر یہ اس طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے مگر تا بہ کے۔آخر اسلام نے آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے پر ان میں سے بعض کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو اسلامی علوم و فنون کو محض ان کی افادیت کے پیش نظر اختیار کرتے لیکن پھر وہ اس کی محبت اور

عقیدت میں مبتلا ہو کر اسلام قبول کرنے لگے۔ ان میں ایک نوجوان یہودی عالم بھی شامل تھا۔ اس کا یہودی نام کیا تھا کسی کو نہیں معلوم لیکن مسلمان ہو جانے کے بعد اس کا اسلامی نام سعید رکھا گیا۔ سعید کو خدا نے بڑا اخلاق ذہن اور گداز دل دیا تھا۔ شعری مذاق بھی کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ اس نے مسلمان علما اور شعرا کی صحبت میں بیٹھنا شروع کر دیا۔ اس کے ذوقِ شعری نے شعر گوئی پر مجبور کیا تو اس نے اپنے لیے وہ راہ اختیار کی جو روایتی شاعری سے الگ تھی۔

سعید نے اپنا تخلص سرمد رکھا۔ خاندانی پیشہ تجارت تھا۔ خود بھی یہی اختیار کیا۔ خاندان کے دوسرے لوگ نفع و نقصان کی فکر میں رہتے مگر سرمد کو اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اور انہیں بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ حرص و ہوا بہت بری شے ہے۔ سرمد نے اپنی شاعری میں حرص و ہوا کی مذمت شروع کر دی۔ سرمد نے اپنے عزیزوں پر رشتے داروں کو فکرِ دنیا میں سر کھپاتے دیکھا تو انہیں بڑا افسوس ہوا۔ انہوں نے حرص و ہوا کی مذمت میں کئی رباعیاں کہیں۔

دنیاز ہوا وحرص بسیار پراست
حرص وہوس کی زیادتی سے دنیا لبریز ہے
ہر جاست ولے درغم دینار پراست
جہاں دیکھیے دینار کی فکر ومحبت میں گرفتار ہیں
بیمار بسے شربت دینار کم است
بیماروں کی کثرت ہے مگر شربتِ دینار قلیل ہے
ایں خانۂ ویرانہ زبیمار پراست
یہ ویران گھر بیماروں سے بھرا ہوا ہے

دوسری رباعی میں اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے:

ہر جاکہ گرفتار ہوا وہوس است
جسے دیکھیے ہوا و ہوس میں گرفتار ہے
گر سلطنتش دہی، نگوید کہ بس راست
اگر انہیں سلطنت بھی بخش دی جائے تو بس نہیں کریں گے
سررشتۂ زندگی بسے کوتاہ است
حالانکہ زندگی چند روزہ ہے
ازطول امل حذر، کہ دام وقفس است
طول امل سے بچ کیونکہ یہی دام بھی ہے اور قفس بھی

ان رباعیوں نے خاندان میں تہلکہ مچا دیا، گھر کے بڑے بوڑھے سر جوڑ کر بیٹھے اور آپس میں مشورے کرنے لگے۔ چچا نے کہا۔ ”یہ سرمد کو ہو کیا گیا ہے۔ یہ کیسی فضول باتیں کرنے لگا ہے؟“

بیمار باپ کو بھی بڑی فکر تھی۔ اس نے کہا۔ ”اس میں غلطی ہماری ہی ہے۔ ایران اور اس کے مضافات میں مسلمان صوفیوں کی کثرت ہے۔ یہ لوگ ترکِ دنیا کی تعلیم دیتے رہتے ہیں۔ سرمد بھی ان کی تعلیمات سے متاثر ہوا اور ایسی فضول رباعیات لکھنے لگا۔“

بہن نے پوچھا۔ ”لیکن اس کا علاج کیا ہے؟“

چچا نے جواب دیا۔ ”اس کا علاج یہ ہے کہ سرمد کو مسلمان صوفیا اور شعرا کی صحبت میں نہ جانے دیا جائے۔“

باپ بہت مایوس تھا، اس نے پوچھا۔ ”مگر کس طرح؟ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہم ایران میں رہیں اور صوفیوں اور شاعروں سے محفوظ رہیں شاید ایسا بالکل ممکن نہیں۔“

چچا کو سب سے زیادہ فکر تھی، اس نے کہا۔ ”دولت، جو زندگی کا اصل مقصد ہے کیا اس کے بغیر آدمی خوش و خرم رہ سکتا ہے؟“

بہن نے جواب دیا۔ ”زندگی کا مقصد کیا ہے؟ کیا دولت......؟ شاید یہ جواب ہر ایک کا ہو لیکن میں یہ کہوں گی کہ ایسا ہر شخص کے لیے نہیں ہے۔ سرمد کو اگر بدلنا ہے تو اس کے لیے انتہائی فکر و تدبر سے کام لینا ہوگا۔ سرمد میرا بھائی غیر معمولی فکر و شعور کا حامل ہے، اگر معمولی فکر و شعور کے حامل افراد نے سرمد کو نصیحتیں کیں تو یہ نوجوان اپنے آپے سے باہر ہو جائے گا۔“

چچا نے ایک بار پھر تند و تیز لہجے میں کہا۔ ”صاحبان! میں کچھ نہیں کہوں گا کیونکہ اپنے بھتیجے کی افتادِ طبع سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ وہی کرے گا جو اس نے ٹھان لیا ہوگا۔“

باپ نے کہا۔ ”اچھا، سرمد کو بلواؤ اور یہ ساری گفتگو اس کی موجودگی میں ہو تو اچھا ہے۔“

سرمد کو اسی وقت ان لوگوں کے سامنے طلب کر لیا گیا۔ ان سب کا خیال تھا کہ شاید یہاں سرمد تکلف، لحاظ یا ادب سے کام لے لیکن اس کی تیزی اور طراری میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ باپ نے کہا۔ ”سعید! تو مسلمان ہو گیا، ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ اس معاملے میں شاید میں بھی تیرا ساتھ دوں لیکن یہ تو بتا کہ تو نے مذہب کے ساتھ ساتھ اپنے شوق اور تجسس کو کیوں بدل ڈالا؟ دنیا آسودہ حال لوگوں کی ہوتی ہے مگر تو ہمیں یہ تعلیم دے رہا ہے کہ مال و زر بیکار چیزیں ہیں۔ اگر انسان مال و زر سے محروم ہو تو اس کی زندگی ہی کیا؟“

سرمد نے جواب دیا۔ ”باوا جان! میں مسلمان ہو گیا یہ میری اپنی سوچ، فکر اور تجربے کا نتیجہ ہے۔ میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتا کہ جو میں نے کیا وہی آپ بھی کریں لیکن جس دن بھی آپ فکر اور تجربے کی اس منزل میں داخل ہو گئے جس میں، میں داخل ہو چکا ہوں تو آپ بھی اسلام قبول کر لیں گے۔ رہی یہ بات کہ میں مال و زر اور دولت سے نفرت کرتا ہوں اور لوگوں کو حرص و ہوس سے دور رہنے اور بچنے کی تلقین کرتا ہوں تو یہ میرے اندر کی آواز ہے۔ میں سچی بات کہہ رہا ہوں۔“

چچا کو غصہ آ رہا تھا۔ ”لیکن تیری تعلیمات سے میرے خاندان پر بُرا اثر پڑے گا۔ مال و زر کے بغیر انسان کچھ بھی نہیں، مفلسی میں انسان خدا کو بھی بھول جاتا ہے اور افلاس ہی وہ لعنت ہے جو انسان کو گمراہ کر دیتی ہے۔“

سرمد کو بھی غصہ آ گیا۔ جواب دیا۔ ”اور مال و زر کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟ مال و زر میں انسان خدا ہی کو نہیں، خود کو بھی بھول جاتا ہے۔ تکبر جس نے معلم الملکوت کو ابلیس بنا دیا، یہ دولت و زر کا پھل ہے۔ ہوس کا بیج ڈالیے گا تو رنج و غم کی فصل کاٹیے گا۔“

باپ نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ”اچھا، تم شاعری کرتے رہو اور جو جی میں آئے کرتے رہو لیکن تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔“

سرمد نے جواب دیا۔ ”آپ کا ایک کام نہیں دس کام کرنے کو تیار ہوں۔“

باپ نے کہا۔ ”تم مال و زر سے نفرت کرتے رہو لیکن کاروبار چونکہ ہمارا آبائی پیشہ ہے اس لیے تجارت میں میرا ہاتھ بٹاؤ...... تم حرص و ہوا سے دور رہو لیکن تجارت میں خسارہ بھی نہ ہونے دو۔ تمہیں مال و زر نہیں چاہیے لیکن مجھے اور خاندان کو تو یہ چیزیں درکار ہیں۔ تم جو کچھ کماؤ، خاندان کے کام آئے گا۔“

سرمد نے کہا۔ ”میں نے کاروبار سے تو کبھی انکار نہیں کیا۔ میں تجارت ضرور کروں گا۔ شاعری اپنی جگہ، تجارت اپنی جگہ۔“

باپ نے گمبھیر لب و لہجے میں کہا۔ ”میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تم تجارت کی غرض سے ہندوستان جاؤ گے۔ اب تمہارا اس ملک ایران میں رہنا مناسب نہیں۔“

سرمد سکتے میں رہ گیا۔ کچھ دیر باپ کی صورت دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ ”جو حکم باوا جان کا۔ ہندوستان کیا، میں دنیا کے دوسرے کنارے تک جا سکتا ہوں۔“

سرمد یہ کہہ کر چلا گیا لیکن اس کی بہن کی حالت غیر ہو گئی۔ باپ سے جھنجلا کر پوچھا۔ ”باوا جان! یہ آپ نے کیا حکم دے دیا۔ سرمد کو ہم سے جدا کیوں کر رہے ہیں؟“

چچا نے کہا۔ ”بھائی نے یہ بڑا اچھا فیصلہ کیا ہے۔ اب سرمد کا ایران میں رہنا مناسب نہیں ہے۔ اگر یہ یہاں رہے گا تو اس سے ہمیں دو نقصان پہنچیں گے۔ پہلا نقصان یہ کہ اس کے مسلمان ہو جانے کا اثر دوسرے نوجوانوں پر بھی پڑے گا اور دوسرا اثر یہ پڑے گا کہ نرم اور کمزور دل و دماغ والوں کو مال و زر سے نفرت ہو جائے گی۔ اس لیے اس کا ہندوستان چلے جانا مناسب رہے گا۔“

بہن نے کہا۔ ”عم محترم! آپ بڑے ظالم ہیں۔“

چچا نے اس کو بھی ڈانٹ دیا۔ ”اچھا چپ رہ لڑکی! تو بھی سرمد ہی جیسی سوچ رکھتی ہے۔“

باپ نے دونوں کو منع کر دیا۔ ”اچھا اب تم دونوں فضول باتوں میں نہ پڑو۔ خاموش ہو جاؤ۔“

بہن سرمد کے پاس چلی گئی۔ بھائی نے اپنے بڑے بھائی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”بھائی جان! مجھے تو اس لڑکی میں بھی چند برائیاں نظر آ رہی ہیں۔ یہ سرمد سے کسی طرح کم نہیں۔ اس کو بھی قابو میں رکھنے کی ضرورت ہے۔“

سرمد کے باپ نے جواب دیا۔ ”اچھا اب خدا کے لیے تم چپ ہو جاؤ۔“

سرمد کا چچا ایک ہی کائیاں تھا، بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

سرمد نے سامانِ تجارت لیا اور خلیج فارس کی ایک بندرگاہ کی سرائے میں اتر پڑا۔ یہاں اس کو اس جہاز کا انتظار تھا جس پر بیٹھ کر وہ ہندوستان جانے والا تھا۔ اس کی بہن یہاں تک اسے چھوڑنے آئی تھی۔ وہ بہت اداس تھی۔ اس نے سرمد سے اصرار کیا۔ ”بھائی! تم جا تو رہے ہو لیکن واپس ذرا جلدی آنا۔“

www.pdfbooksfree.pk

سرمد نے بہن کی پیشانی کو چوم لیا بولا۔ ”بہن! تو فکر نہ کر، میں اگر واپس آؤں گا تو تیری وجہ سے، تیری خاطر۔ ورنہ میرا جی دنیا سے بھر گیا ہے۔“

بہن نے روتے ہوئے کہا۔ ”بھائی! باپ کے بعد اپنا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ بس تم ہی ہو جسے میں اپنا کہہ سکتی ہوں۔“

سرمد نے جواب دیا۔ ”بہن میں بھی تجھ سے پیار کرتا ہوں، میں نے کہہ جو دیا کہ جب میں واپس آؤں گا تو اس میں تیری چاہت اور پیار کو بڑا دخل ہوگا۔ میں چاہتا ہوں، اس حرص و ہوا کی دنیا کو تو بھی چھوڑ دے۔“

بہن نے جواب دیا۔ ”بھائی میں تمہاری ہر بات کو مان لوں گی مگر تمہیں بھی یہ اقرار کرنا ہوگا کہ واپس ضرور آؤ گے۔“

سرمد نے متذبذب لہجے میں کہا۔ ”میں واپسی کا وعدہ تو نہیں کروں گا لیکن آنے کی کوشش ضرور کروں گا۔“ پھر اپنی بہن کے دونوں گال تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ ”پیاری بہن! تو اداس نہ ہو میں ایک نہ ایک دن واپس ضرور آؤں گا تو بے فکر رہ۔“

جہاز ساحل پر کھڑا مسافروں کا منتظر تھا۔ سرمد نے اپنی بہن کو روتا چھوڑ کر جہاز میں قدم رکھا اور ایران پر آخری الوداعی نظر ڈالی، اس وقت سرمد کے دل کی عجیب سی حالت تھی، گداز دل پر چوٹ لگی اور دنیا اور کاروبار دنیا ہیچ نظر آنے لگے۔

جہاز نے لنگر اٹھایا اور سفر شروع کر دیا۔ کئی دن اور کئی راتیں جہاز پر ہی کٹ گئیں۔ اس میں بیشتر تاجر سفر کر رہے تھے۔ سرمد اپنے افکار میں گم رہا اور کسی سے ربط و ضبط نہ بڑھایا۔ دوسرے لوگ باتوں میں مشغول رہے، یہ سب اپنے مستقبل کی باتیں کر رہے تھے۔ انہیں اپنی اپنی تجارت کے ممکنہ سود و زیاں کی فکر لاحق تھی۔ انہوں نے اپنے ہمسفروں میں سرمد جیسا خاموش جوان دیکھا تو بڑی حیرت ہوئی۔ انہیں یہ شخص کسی طرح بھی تاجر نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ سرمد کو بار بار باتوں پر مجبور کرتے مگر اس کا بھرپور مگر مختصر جواب انہیں خاموش کر دیتا۔

جہاز کے عرشے سے سرمد نے سمندر کی امواج کا مشاہدہ کیا اور یہیں سے جب اوپر نظر کی تو لامتناہی نیلے آسمان کی وسعتوں نے سرمد پر ایک دہشت سی طاری کر دی اور انہیں اپنا وجود ایک تنکے سے بھی حقیر تر محسوس ہونے لگا۔ دنیا کی ہر شے ایسی نظر آ رہی تھی جو ایک بار نظر آنے کے بعد ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو جانے والی تھی۔ سرمد کو تجارت، سامان تجارت اور علائق دنیا ہیچ نظر آ رہے تھے۔ اس جہاز میں سرمد نے ایک تاجر کو مرتے ہوئے دیکھا جس کا سارا سامان تجارت دھرا کا دھرا رہ گیا تھا اور وہ ہمیشہ کے لیے کہیں اور جا چکا تھا۔ سرمد کو تاجر کی موت نے اور زیادہ تڑپا دیا۔

کئی دنوں بعد یہ جہاز تھٹھہ کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ سرمد نے ساحل پر چھلانگ لگائی اور وہاں کی ایک سرائے میں قیام کیا۔ یہ شاہجہانی عہد تھا۔ ہندوستان پر مغل خاندان کی حکومت تھی۔ سرمد نے دو دن آرام کر کے اپنے سفر کی تکان دور کی اور اس کے بعد بازار کا جائزہ لینے نکل کھڑے ہوئے۔ ٹھٹھے کے بازار میں بڑی رونق تھی۔ سرمد کو یہاں کے عربوں سے مشابہ لوگ بہت اچھے لگے۔ لوگ ان غیر ملکی تاجروں کو بڑے شوق سے دیکھتے۔ خاص کر بچے ان میں بڑی دلچسپی لے رہے تھے۔ سرمد کو یہاں ایک راہنما کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انہوں نے ایک دکان پر ایک ہندو لڑکے کو بیٹھے ہوئے دیکھا جو گاہکی باندھے انہیں ہی دیکھ رہا تھا۔ سرمد نے بھی اسے دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے۔ لڑکا بے حد حسین تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک سحر تھا۔

سرمد نے ہاتھ کے اشارے سے لڑکے کو اپنے پاس بلایا۔ وہ فوراً ہی اٹھا اور سرمد کے قریب جا کر پوچھا۔ ”مجھے تم کوئی غیر ملکی نظر آتے ہو، کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟“

سرمد نے جواب دیا۔ ”ہاں میں ایک ایرانی تاجر ہوں۔ میرا آبائی وطن کاشان ہے مگر بغرض تجارت تیرے گھر آیا ہوں، تو میری رہنمائی کرتا کہ میں یہاں کی پریشانیوں سے بچ جاؤں۔“

لڑکا سرمد کی باتوں سے خاصا متاثر ہوا، بولا۔ ”تاجر تم ہو اور رہنمائی میں کروں، خوب۔ تم یہاں کس کے بھروسے پر آئے ہو؟ کیا میرے بھروسے پر؟“

سرمد لڑکے کی بھولی بھالی باتیں بڑی اچھی لگیں۔ انہوں نے لڑکے کو نظر بھر کے دیکھا تو اس میں کچھ اور ہی نظر آیا۔ لڑکا حسین بھی تھا اور سادہ لوح بھی۔ چہرے پر معصومیت نے بڑی دلکشی پیدا کر دی تھی۔ سرمد نے کہا۔ ”لڑکے! میں نہیں جانتا کہ تیرا نام کیا ہے، تو کون ہے، کہاں رہتا ہے، کیا کرتا ہے اور تیرا مذہب کیا ہے؟ مگر مجھے۔ یوں لگتا ہے جیسے میں تجھے ابد سے جانتا ہوں۔ تیری صورت میں آشنا کی شباہت ہے، آ میرے قریب آ جا، تاکہ میں جی بھر کے تجھے دیکھ لوں اور یہ جاننے کی کوشش کروں کہ تو مجھے کیوں اچھا لگتا ہے اور میں تجھے کب سے جانتا ہوں۔“

لڑکے کو سرمد کی باتیں عجیب سی لگیں۔ یہ شخص لڑکے کو بھی اچھا لگا۔ کوئی اندر بیٹھا اسے بتا رہا تھا کہ یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے درست ہے اور یہ کچھ جانا پہچانا شخص معلوم ہوتا ہے۔ لڑکے نے جواب دیا۔ ”جناب والا! میرا تعارف یہ ہے کہ ہندو ذات سے تعلق رکھتا ہوں، یہیں قریب ہی ٹکڑ والے مکان میں رہتا ہوں، ابھی کرتا کچھ بھی نہیں۔ رہی یہ بات کہ میں تمہیں اچھا لگتا ہوں اور تم مجھے ایک عرصے سے جانتے ہو تو یہی کیفیت میری بھی ہے، میں نے بھی تمہیں کہیں دیکھا ہے، میں تم سے کہیں مل چکا ہوں، کہاں؟ یہ یاد نہیں آتا۔“

سرمد نے کہا۔ ”یہ تو بڑی مشکل بات ہو گئی کہ میں خود تو مسلمان ہوں اور تو ہندو ہے۔ میں تجھ سے دوستی قائم کرنا چاہتا ہوں، پتا نہیں تو اس پر راضی بھی ہوگا یا نہیں؟“

لڑکے نے جواب دیا۔ ”دوستی قائم کرنے میں آخر ہرج ہی کیا ہے۔ رہی ذات پات کی بات اور اس کا فرق، تو یہ باتیں مجھے بذات خود اچھی نہیں لگتیں۔“

سرمد نے اپنا داہنا ہاتھ لڑکے کی طرف بڑھا دیا اور کہا۔ ”لڑکے اپنا داہنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دے۔ میں پیمان وفا باندھنا چاہتا ہوں۔“

لڑکے نے بے چون و چرا اپنا ہاتھ سرمد کے ہاتھ میں دے دیا اور دونوں نے دوستی کا معاہدہ کر لیا۔ سرمد نے لڑکے سے کہا۔ ”لڑکے، اب ہماری ملاقات روز ہونی چاہیے۔“

لڑکے نے جواب دیا۔ ”بالکل، میں تو تم سے ہر روز ملا کروں گا۔“

جب لڑکا اجازت لے کر چلا گیا تو سرمد کی حالت غیر ہو گئی انہیں ہر طرف وہی لڑکا نظر آ رہا تھا۔ مقامی تاجروں نے سرمد سے ملاقات کی اور پوچھا کہ ان کے پاس کس قسم کا سامان موجود ہے تاکہ اس کا معاملہ کیا جائے؟

سرمد نے جواب دیا۔ ”صاحبان! میرے پاس جس قسم کا سامان ہے اس کا تمہارے شہر میں ایک بھی خریدار نہیں، میں کیا بتاؤں کہ میرے پاس کس قسم کا سامان ہے۔“

ایک تاجر نے مسکرا کر دوسرے تاجروں کو دیکھا اور سرمد پر طنز کیا۔ ”بھائی! تو نوجوان ہے اور یہاں تجارت کرنے آیا ہے۔ یہ تو باتیں کس قسم کی کر رہا ہے، اس طرح تو تو کاروبار کر چکا۔“

دوسرے تاجر نے کہا۔ ”میں نے تو یہ سنا ہے کہ اسے کاروبار اور مال و زر سے کوئی محبت نہیں۔ یہ ایک نااہل تاجر ہے۔“

سرمد نے جواب دیا۔ ”واقعی میں ایک نااہل تاجر ہوں لیکن میں ایک ایسی تجارت بھی کر رہا ہوں جو کسی اور کو دکھائی نہیں دیتی۔ میں نے ایک ایسی گراں مایہ متاع عزیز پالی ہے کہ اس کے بعد کسی اور چیز کی خواہش نہیں رہی۔“

ایک تاجر نے پوچھا۔ ”سرمد! ذرا یہ تو بتا کہ وہ ہندو لڑکے والا کیا چکر ہے۔ سنتا ہوں تو اس پر عاشق ہو گیا ہے؟“

سرمد نے جواب دیا۔ ”عاشق ہونا ہر ایک کے بس کی بات نہیں، بوالہوسی تو سبھی کرتے ہیں۔“

کسی اور تاجر نے پوچھا۔ ”یہاں کب تک رہنے کا ارادہ ہے؟“

سرمد اس وقت گویا اپنے ہوش میں نہیں تھے۔ جواب دیا۔ ”یہ زمین خدا کی ہے اور... میں اس کا عاجز و ناتواں بندہ ہوں۔ جب تک وہ چاہے گا میں یہاں رہوں گا۔ پھر جب یہاں سے چلے جانے کا حکم ملے گا تو میں ایک لمحے کے لیے بھی یہاں نہیں رکوں گا۔ فوراً چلا جاؤں گا۔“

کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔ ”جوان غیر ملکی تاجر! تو کیسی باتیں کرتا ہے۔ میری پیش گوئی لکھ لو کہ یہ شخص جس کا نام سرمد ہے قابل اعتبار شخص نہیں ہے، ہمیں تو یوں لگتا ہے گویا اس کا دماغ چل گیا ہے۔“

سرمد نے نرمی سے کہا۔ ”میں قابل اعتبار نہیں ہوں تو پھر اور کون قابل اعتبار ہوگا۔ میرا دماغ نہیں چل گیا۔ دماغ تو تم لوگوں کا چل گیا ہے جو دن رات مال و زر کمانے کی فکر میں گھلتے رہتے ہو۔“

کسی تاجر نے برا مان کر سرمد سے سوال کیا۔ ”اچھا اب یہ فضول باتیں بند ہونی چاہئیں۔ سرمد! مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس کون سا اور کس قسم کا مال ہے تاکہ اس کا سودا کیا جا سکے۔“

سرمد نے بیزاری سے جواب دیا۔ ”میرے پاس کوئی مال نہیں اور نہ ہی میں تاجر ہوں۔ میں شرمندہ ہوں کہ میں نے یہ کیسا دھندا اختیار کر لیا ہے۔“

ایک تاجر نے سرمد کو سمجھایا۔ ”سرمد! یہ تمہاری مرضی کہ کاروبار کرو یا نہ کرو لیکن میری ایک بات ذہن نشین رکھنا، جس ہندو زادے سے تم نے عشق لڑانا شروع کر دیا ہے وہ اچھی بات نہیں ہے۔ یہاں کے لوگ اس بات کو بالکل پسند نہیں کریں گے اور بہت ممکن ہے کہ اس سلسلے میں تمہیں رسوائی، شرمندگی اور نقصان بھی اٹھانا پڑ جائے۔“

سرمد نے ہنس کر جواب دیا۔ ”معلوم نہیں تم لوگ کتنے گندے خیالات رکھتے ہو۔ میں لڑکے سے عشق کروں گا۔ سبحان اللہ، یہ میرے سر الزام ہے، بہتان ہے۔“

کسی طرف سے آواز آئی۔ ”ایران سے آئے تھے تاجر بن کر اور اب تجارت ہی سے توبہ کر لی۔ آخر کیوں؟ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی ہی۔ ہماری سمجھ میں جو وجہ آئی بیان کر دی۔ ہمارا کام سمجھانا ہے سمجھائے جا رہے ہیں۔ ورنہ تم پڑھے لکھے عقلمند انسان ہو۔ یہ بات تو تمہیں بھی اچھی طرح معلوم ہوگی کہ جو بو کر گندم کی فصل نہیں کاٹی جا سکتی۔“

سرمد کو غصہ آ گیا۔ چیخ چیخ کر تاجروں کو دھتکارنا شروع کر دیا۔ ”تم لوگ چلے جاؤ یہاں سے ورنہ میں تشدد پر اتر آؤں گا۔ تم لوگ تو

www.pdfbooksfree.pk

مخبوط الحواس ہو گے ہی مجھے بھی اپنے ساتھ ویسا ہی بنانا چاہتے ہو، بھاگ جاؤ، چلے جاؤ۔"

تاجر حضرات وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ سرمد پر خشی سی طاری ہوگئی۔ وہ نڈھال ہو کر ایک طرف لیٹ گئے اور معلوم نہیں کب تک بے ہوش پڑے رہے لیکن جب ہوش آیا تو ہندو زادے کو اپنے پاس بیٹھا ہوا دیکھا۔ سرمد کے ہونٹوں پر ہنسی آگئی۔ اٹھ کر بیٹھ گئے اور پوچھا۔ "لڑکے تو کب آیا؟"

لڑکے نے پوچھا۔ "ذرا دیر پہلے، یہ تمہیں ہو کیا گیا تھا؟"

سرمد نے کہا۔ "تاجر حضرات مجھ پر شک کر رہے تھے، کہتے تھے، میں اپنا مال تجارت ان کے ہاتھ فروخت کر دوں۔ میں نے ان کی درخواست مسترد کر دی۔ بس اس بات سے وہ لوگ مشتعل ہو گئے اور مجھے پاگل اور مخبوط الحواس کہنے لگے۔ لڑکے! تو ہی بتا کیا میں پاگل ہوں؟"

لڑکے نے جواب دیا۔ "نہیں تو، مجھے تو تم صحیح الدماغ معلوم ہوتے ہو۔"

"اور دوسری بات بڑی شرمناک کہہ گئے وہ لوگ۔" سرمد نے کہا۔

لڑکے نے پوچھا۔ "کون سی بات؟"

سرمد نے نظریں جھکا لیں اور جواب دیا۔ "وہ لوگ مجھ پر تہمت لگا رہے تھے، کہتے تھے میں تجھ سے محبت کرنے لگا ہوں حالانکہ بات صرف اتنی سی ہے کہ میں تجھ کو دیکھ کر وارفتہ ہو جاتا ہوں اور ایک ایسی کسک اپنے دل میں محسوس کرنے لگتا ہوں جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ میں کسی اور ہی عالم میں پہنچ جاتا ہوں، شاید میں اپنے رب کے عشق میں مبتلا ہو جاؤں۔"

لڑکا سرمد کی باتیں بڑی توجہ اور انہماک سے سنتا رہا۔ شاید یہ باتیں اس کی سمجھ سے بالاتر تھیں، وہ سرمد میں خود بھی دلچسپی لینے لگا تھا۔ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ "بابا مجھے نہیں معلوم تم کیا اور کیوں کہہ رہے ہو لیکن اتنی بات میں بھی جان گیا ہوں کہ تم کوئی معمولی آدمی نہیں ہو، کیا تم مجھے اجازت دو گے کہ میں تمہارے پاس اٹھ بیٹھ لیا کروں؟"

سرمد نے کہا۔ "تو نے میرے دل میں آگ لگا دی ہے اب یہ آگ میرے پورے وجود کو جلا کر راکھ کر دے گی۔ لڑکے! بخدا پہلے میں اپنے اندر ایک سوزش ضرور محسوس کیا کرتا تھا لیکن اس سوزش نے لودے دی ہے اور میں خود کو اس آگ میں جلا کر بھسم کر دینا چاہتا ہوں۔"

لڑکا گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور سرمد کو تنہا چھوڑ کر چلا گیا لیکن دوسرے دن پھر حاضر ہو گیا۔ لڑکا بھی سرمد میں کشش محسوس کر رہا تھا۔ وہ سرمد سے دور رہ کر بھی محسوس کرتا کہ کوئی چیز کم ہو گئی ہے اور کوئی اسے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں، سرمد پر الزام لگنے لگے۔

لڑکے کے باپ کو اس صورت حال سے مطلع کیا گیا۔ دوست احباب، عزیز اقارب لڑکے کے باپ کو طعنے دینے لگے۔ کسی نے کہا۔ "اپنے لڑکے کو سنبھالو، یہ کاشانی تاجر اسے بدنام کر رہا ہے۔"

کوئی کہتا۔ "مارنے والے کے ہاتھ پکڑے جا سکتے ہیں مگر کہنے والے کی زبان نہیں پکڑی جا سکتی۔ ذرا باہر نکل کر دیکھو، لوگ تیرے لڑکے اور سرمد کی بابت کیسی باتیں کر رہے ہیں۔"

باپ کو غصہ آگیا اس نے لڑکے کو منع کیا۔ "خبردار! جو تو اب سرمد کے پاس گیا۔"

لڑکے نے کوئی جواب تو نہیں دیا مگر باز بھی نہیں آیا۔ اس کے فوراً بعد سرمد کے پاس پہنچ گیا۔ سرمد نے لڑکے سے پوچھا۔ "آج تیرا باپ تجھ سے کیا کہہ رہا تھا؟"

لڑکے نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ "کچھ بھی نہیں۔"

سرمد نے کہا۔ "لڑکے! جھوٹ نہ بول۔ اس نے تجھے میرے پاس آنے سے منع کیا تھا۔"

لڑکے نے حیرت سے پوچھا۔ "لیکن اس کی خبر تمہیں کیسے ہوئی؟"

سرمد نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "میرے سینے میں ایک آگ سی روشن ہے اور میں اس روشنی میں نادیدہ چیز بھی دیکھ لیتا ہوں۔ اسی روشنی میں، میں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ تیرے نام نہاد دوست نما دشمن تیری بابت کس قسم کی خبریں پھیلا رہے ہیں۔"

لڑکے نے عاجزی سے کہا۔ "میں مجبور ہوں خدا بہتر جانتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ لیکن یہ طے ہے کہ میں یہاں کے علاوہ کہیں سکون نہیں پاتا۔"

سرمد نے کہا۔ "لڑکے! اگر بدنامی سے بچنے کے لیے کچھ کرنا پڑے تو اس میں یہ بات سرفہرست ہوگی کہ سرمد نے ایک بھولے بھالے لڑکے کو بدنام کر دیا۔"

لڑکے نے جواب دیا۔ "سرمد! میں کچھ نہیں جانتا، میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ میں نے آپ کی صحبت میں بہت کچھ حاصل کیا ہے اور یہ حصولیابی کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔"

ابھی باتوں کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ لڑکے کا باپ اسے تلاش کرتا ہوا سرمد کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں اپنے لڑکے کو دیکھ کر سرمد پر گرم ہو گیا، بولا۔ "سرمد! تم ٹھہرے تاجر، آج ہو، کل اپنے وطن ایران چلے جاؤ گے لیکن مجھے اپنے خاندان کے ساتھ یہیں رہنا ہے۔ خدا کے لیے ہم پر رحم کرو۔"

سرمد نے جواب دیا۔ "تیرے لڑکے کو میں تو نہیں بلاتا۔ اس کو روک کر کسی کوٹھڑی میں بند کر دو۔"

لڑکے کے باپ نے کہا۔ "میں گھر میں اسے قید کر دیتا ہوں لیکن یہ کسی نہ کسی ترکیب سے باہر نکل بھاگتا ہے۔"

سرمد نے کہا۔ "بس ایک بار اور قید کر دو۔"

باپ نے کہا۔ "لیکن تم اسے منع کیوں نہیں کر دیتے؟"

سرمد نے لڑکے سے کہا۔ "لڑکے! اب تو میرے پاس نہیں آئے گا۔"

لڑکے نے کوئی جواب نہیں دیا اور باپ اپنے لڑکے کو لے کر چلا گیا۔

دوسرے دن اس کو ایک کمرے میں بند کر دیا گیا، باہر سے تالا لگا دیا گیا۔ دوپہر کو ماں نے رحم کھا کر کمرے کا دروازہ کھول دیا اور یہ دیکھ کر غمگین ہو گئی کہ وہاں لڑکے کا کہیں پتا نہ تھا۔ ماں نے اپنے ملازمین کو حکم دیا کہ وہ جہاں کہیں بھی ہو تلاش کر کے میرے روبرو لاؤ، حیران ہوں کہ یہ نکلا کدھر سے؟

نوکر نے جواب دیا۔ "ماتا جی! جب کمرے میں باہر سے قفل لگ گیا تھا تو یہ لڑکا جائے گا کہاں؟ میں اس کو کہاں تلاش کرتا پھروں؟"

ماں نے سختی سے کہا۔ "لڑکے کو گھر میں نہ پا کر میرا پتی تو مجھے زندہ جلا دے گا۔"

لڑکے کی تلاش شروع ہو گئی لیکن وہ کہیں بھی نہ ملا۔ دوپہر کو شوہر گھر میں داخل ہوا تو بیوی سے پوچھا۔ "لڑکے کو کچھ کھانے پینے کو دیا تھا یا نہیں؟"

بیوی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا جواب دے۔ شوہر نے خاموش بیوی کو سوالیہ نظروں سے گھورا، پوچھا۔ "کیا بات ہے تم جواب کیوں نہیں دے رہیں؟ میں کیا پوچھ رہا ہوں؟"

بیوی نے ڈرے سہمے لہجے میں جواب دیا۔ "کس کی بات کر رہے ہیں؟"

شوہر بیوی کے سر پر جا کھڑا ہوا، بولا۔ "میں لڑکے کی بات کر رہا ہوں۔ اس لڑکے کی جسے صبح کمرے میں بند کر کے گیا تھا۔"

بیوی نے جواب دیا۔ "میں نے کھانا کھلانے کے لیے جب کمرے کو کھولا تو وہ خالی تھا۔"

شوہر نے غصے میں اپنی بیوی کی چوٹی پکڑ لی۔ "تو بکتی ہے، جھوٹ بولتی ہے۔ تو نے اپنی ماتا میں لڑکے کو آزاد کر دیا۔"

بیوی نے عاجزی سے یقین دلانے کی کوشش کی۔ "میں نے اس کو نہیں رہا کیا۔ اس سلسلے میں، میں ہر قسم کی قسم کھانے کو تیار ہوں کمرے سے کس طرح نکلا، میں نہیں جانتی لیکن جب میں کمرے میں داخل ہوئی تو یہ بالکل خالی تھا۔"

شوہر نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی لاتا ہوں اس کو تلاش کر کے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ اس وقت وہ کہاں ہوگا۔"

وہ سیدھا سرمد کے پاس پہنچا۔ وہاں لڑکا سرمد کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ باپ نے لڑکے کا نام لے کر اسے آواز دی۔ لڑکا سہم گیا اور بالکل سرمد سے بھڑ کر بیٹھ گیا۔

باپ نے پوچھا۔ "کیا میں نے تجھے منع نہیں کر رکھا ہے یہاں آنے سے؟"

لڑکے نے جواب دیا۔ "یہ میں کب کہتا ہوں کہ منع نہیں کیا تھا۔"

باپ نے پوچھا۔ "پھر تو کیوں اور کس طرح یہاں آگیا؟"

لڑکے نے جواب دیا۔ "مجھے کچھ پتا نہیں کہ میں یہاں کیوں اور کس طرح آگیا۔"

باپ نے پوچھا۔ "کمرے کا دروازہ کس نے کھولا تھا؟"

لڑکے نے جواب دیا۔ "میں نہیں جانتا کیونکہ میں نے دروازے کو ذرا سا دھکا دیا تو وہ کھلا ہوا تھا۔"

باپ نے سرمد کو مخاطب کیا۔ "تاجر! تو نے اس لڑکے کو کیوں اپنے پیچھے لگا لیا ہے۔ خدا کے لیے اس کا پیچھا چھوڑ دے۔"

سرمد نے کہا۔ "بابا یہ اپنی مرضی سے آتا جاتا ہے۔ میری طرف سے اس کو اجازت ہے کہ اپنے گھر میں رہے اور میرے پاس نہ آئے۔"

باپ نے کہا۔ "مسلم تاجر! تم مجھ پر اتنا کرم کرو کہ جب یہ تمہارے پاس آئے تو بھگا دیا کرو۔"

اس کے بعد باپ لڑکے کو لے کر چلا گیا۔

چند دنوں بعد سرمد کی حالت کچھ سے کچھ ہو گئی۔ انہیں اپنا ہوش تک نہ رہا۔ جدھر سے گزرتے، لوگ آوازے کستے، مذاق اڑاتے،

www.pdfbooksfree.pk

سرمد کو اس عالم میں بھی یہ خیال رہا کہ ان کی جو حالت ہے اور اس کا جو سبب سمجھا جا رہا ہے اس سے ان کے دین کو نقصان پہنچا ہے، اس عالم میں انہوں نے ایک رباعی کہہ ڈالی۔

سرمد در دیں عجب شکستی کردی
سرمد! افسوس کہ تو نے دین میں رخنہ پیدا کردیا
ایمان بغدائے چشم مستی، کردی
اپنا ایمان کسی مست آنکھ والے کے حوالے کر دیا
باعجزو نیاز جملہ نقد خودرا
تیرے پاس جو نقد تھا اسے باعجز ونیاز
گرفتی وثار بت پرستی کردی
سارا کا سارا بت پرستی پر نثار کر دیا

ٹھٹھہ میں ان کے خلاف جو مہم اٹھی، تو سرمد نے دہلی کی راہ لی۔ دہلی میں پہنچ کر انہوں نے لباس سے بھی نجات حاصل کر لی۔ برہنہ رہنے لگے۔ بس پورے جسم پر ایک لنگوٹی باقی رہ گئی۔ دن رات رباعیات کہتے رہتے۔ انہیں حرص وہوس سے نفرت تھی اور دنیا کی بے ثباتی کا شدید احساس تھا۔ انہیں دنیا والوں سے ذرا سی امید نہ تھی کیونکہ وہ دنیا کے ہر رشتے کو عارضی اور کمزور سمجھتے تھے۔ دہلی میں ان کا شہرہ ہوا تو جاننے والوں کو اس پر سخت حیرت ہوئی کہ اتنا پڑھا لکھا شخص یوں مخبوط الحواس اور بیکار مارا مارا پھرتا ہے۔ یہ شاہجہاں کے آخری عہد کی باتیں ہیں۔ جانشینی کے چرچے چاروں طرف گشت کر رہے تھے اور بادشاہ کے ولی عہد کی حیثیت سے دارا شکوہ کا نام لیا جا رہا تھا۔ شہزادہ دارا شکوہ ایک عالم فاضل اور صوفی منش نوجوان تھا۔ اس نے سرمد کا ذکر سنا تو ملنے کا اشتیاق ہوا۔ ایک دن دارا شکوہ نے ایک آدمی سرمد کی خدمت میں روانہ کیا اور ملاقات کی اجازت مانگی۔

شہزادے کے نمائندے کو سرمد نے جواب دیا۔ ”شہزادہ جب چاہے ملاقات کر لے اس میں اجازت کی کیا بات تھی۔“

شہزادے کے نمائندے نے کہا۔ ”حضرت! شہزادہ ایک اصولی انسان ہے، وہ آپ کی اجازت اور مرضی کے بغیر نہیں آسکتا۔“

سرمد نے جواب دیا۔ ”تب پھر شہزادے کو میری طرف سے مطلع کر دو کہ وہ جب چاہے چلا آئے۔“

دارا شکوہ اجازت پاتے ہی سرمد کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اس نے سرمد کو ایک لنگوٹی میں دیکھا تو بہت متاثر ہوا، بولا۔ ”حضرت! یہ کیسا حلیہ بنا رکھا ہے۔ میں نے آپ کی بابت سن رکھا ہے کہ آپ نہایت پڑھے لکھے انسان ہیں اور علم وفضل میں آپ کا کوئی جواب نہیں۔“

سرمد نے جواب دیا۔ ”اگر عالم فاضل ہوں تو اس پر تمہیں اعتراض ہے؟“

شہزادے نے گھبرا کر عرض کی۔ ”حضرت! اعتراض کی بات نہیں۔ مجھے تو اس پر اعتراض ہے کہ آپ اپنی وضع قطع اور لباس سے اس کا اظہار کیوں نہیں کرتے کہ آپ بے مثل عالم وفاضل انسان ہیں۔“

سرمد نے جواب دیا۔ ”میں نے قناعت کو اپنا لیا ہے اور حرص وطمع سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے کیونکہ میں نے اہل دنیا کو بہت ہی خوار وزبوں دیکھا ہے۔ میری ایک رباعی سن جو کل ہی موزوں ہوئی ہے۔

سرمد! تو ہیچ خلق یاری مطلب
سرمد! خلق سے یاری کی امید نہ رکھ
از شاخ برہنہ ہو وہ سایہ داری مطلب
کیونکہ جو شاخ برہنہ ہو وہ سایہ کیونکر دے گی
عزت زقناعت است وخواری ازطمع
قناعت اختیار کر کہ اس میں عزت ہے اور طمع میں خواری ہے
باعزت خویش باش خواری مطلب
عزت کو بچا اپنے آپ کو خوار نہ کر

دارا شکوہ سرمد سے بہت متاثر ہوا بولا۔ ”کیا آپ میرے پاس رہنا پسند فرمائیں گے؟“

سرمد نے جواب دیا۔ ”میں ایک صوفی منش آوارہ انسان، تجھے محلات کی زندگی راس نہیں آسکتی۔“

دارا شکوہ نے کہا۔ ”مجھے اپنی خدمت کا موقع دیجیے۔“

سرمد نے کہا۔ ”کیسی خدمت، کہاں کی خدمت۔ مجھے ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں۔“

دارا شکوہ نے پوچھا۔ ”مجھے آپ کی خدمت میں حاضری کی اجازت تو رہے گی؟“

سرمد نے ہنس کر جواب دیا۔ ”بابا! یہ کوئی شاہی دربار تو ہے نہیں، جب چاہو آجاؤ۔ یہ فقیروں کی کُٹیا ہے۔“

دارا شکوہ نے عرض کیا۔ ”حضرت چند رباعیاں اور سنا دیجیے، ان کے نشے میں مست وسرشار چلا جاؤں گا۔“

سرمد نے کہا۔ ”تو سن۔“

از معصیتم بیش بود فضل ترا
میرے گناہوں سے تیرا فضل کہیں زیادہ ہے
ہر لحظہ بخود حساب دارم ہرجا
میں نے یہ حساب ہر کہیں اور ہر جگہ کر کے دیکھ لیا
ہر چند کہ سرتا بقدم عصیانم
حالانکہ میں سرتاپا گناہ ہی گناہ ہوں
ازبخشش تو نیست فزوں جرم مرا
مگر پھر بھی تیری بخشش کے مقابلے میں میرے گناہ کچھ بھی نہیں

دارا شکوہ وجد کرنے لگا، جھومنے لگا۔ اس کی حالت ہی غیر ہوگئی۔ بے اختیار بولا۔ ”حضرت کچھ اور کچھ اور.....“

سرمد نے دوسری رباعی سنائی۔

انسان کہ شکم سیری ازیک نان است
آدمی کا ایک روٹی سے پیٹ بھر جاتا ہے
ازحرص وہوا شام وسحر نالان است
اس کے باوجود اس کی حرص وہوا اسے دن رات محو نالاں وفغاں رکھتی ہے
دربحر وجودش بنگر، طوفان است
زندگی کے سمندر میں ایک طوفان بپا ہے
آخر چو حباب یک نفس مہمان است
اور اس میں انسان بلبلے کی طرح ایک سانس کا مہمان ہے

دارا شکوہ نے سرمد کی پیشانی کو فرط عقیدت سے چوم لیا اور واپس چلا گیا۔

اورنگ زیب کے آدمی دارا شکوہ کے پیچھے لگے ہوئے تھے کیونکہ اورنگ زیب کو دارا شکوہ کی ولی عہدی گوارا نہ تھی اور اس نے اپنے باپ شاہجہاں اور اپنے بھائی دارا شکوہ کے آس پاس مخبروں اور جاسوسوں کا جال سا پھیلا دیا تھا۔ سرمد اور دارا شکوہ کی ملاقات کا حال بڑی رنگ آمیزی سے اورنگ زیب تک پہنچا دیا گیا۔ اورنگ زیب نے ہدایت کی کہ اس معاملے پر کڑی نظر رکھی جائے اور ان دونوں میں جو جو باتیں ہوں انہیں حرف بہ حرف لکھ کر مجھے روانہ کر دیا جائے۔

دوسری طرف دہلی کے خواص وعام تھے جو سرمد کی طرف کھنچے چلے آرہے تھے اور ان بلند پایہ رباعیوں کو لکھ لکھ کر محفوظ کر رہے تھے۔

اسی دوران شہزادوں میں اقتدار کی جنگ چھڑ گئی۔ دارا شکوہ اور اورنگ زیب میں معرکہ آرائی ہوگئی۔ اورنگ زیب کے ساتھ اس کا چھوٹا بھائی مراد بھی ہو گیا اور ان دونوں نے مل کر دارا شکوہ کو عبرتناک شکست دے دی اور اورنگ زیب نے ہندوستان کے تخت وتاج پر قبضہ کر لیا۔

تخت نشین ہونے کے بعد اورنگ زیب نے ان لوگوں کی فہرست تیار کرائی جو دارا شکوہ کے ہمدرد یا اس کے ساتھ تھے۔ وہ ان سے نمٹنا چاہتا تھا۔ ان میں سرمد کا نام بھی شامل تھا۔ مخبروں نے اورنگ زیب کو یہ خبر بھی دی تھی کہ سرمد دارا شکوہ کو بادشاہت کی بشارت دیتے رہے ہیں۔

اورنگ زیب نے سرمد کے قریب رہنے کے لیے چند آدمی متعین کر دیے اور انہیں یہ ہدایت کر دی کہ وہ سرمد میں ایسی باتیں تلاش کریں جو قابل تعزیر ہوں۔

سرمد اپنے حال میں مگن دنیا وما فیہا سے بے خبر تھے۔

ایک دن کسی نے سرمد سے پوچھا۔ ”سرمد! معراج مصطفیٰ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ یعنی وہ جسمانی تھی یا روحانی؟“

سرمد نے کہا۔ ”اے شخص! میں تیری نیت سے واقف ہوں، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس وقت میں جو کچھ کہوں گا وہ بھی نہ کبھی میرے خلاف بہ طور شہادت استعمال ہوگا۔ مگر سن، میں کسی بات سے نہیں ڈرتا۔ تو معراج کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔ میری رباعی سن، میں نے اس میں مکمل بیان کر دیا ہے۔

www.pdfbooksfree.pk

ہر کس کہ سر حقیقتش پادرشد
جس کسی کے پاؤں حقیقت کے راز سے بندھ گئے
اوپہن تراز سپہر پہنا شد
اس کی وسعت پا جولا نگاہ آسمانوں سے بھی زیادہ وسیع ہوگئی
ملّا گوید کہ برفلک شد احمدؐ
ملّا کا کہنا ہے کہ نبی اکرمؐ آسمانوں پر تشریف لے گئے
سرمد گوید فلک بہ احمدؐ درشد
لیکن سرمد کا قول یہ ہے کہ خود آسمان رسولؐ کے قدموں میں آگیا

اس رباعی سے ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ درباری علما نے سرمد کولائقِ گردن زدنی قرار دے دیا۔

اورنگ زیب نے قاضی القضاۃ ملّا قوی کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ سرمد سے ملیں، باتیں کریں اور سزا کے لیے جواز تلاش کریں۔

قوی نہایت قیمتی ریشمی لباس پہن کر سرمد کے پاس پہنچ گیا۔ سرمد حسب دستور برہنہ تھے۔ صرف ایک لنگوٹی سے ستر پوشی کررکھی تھی۔

قوی نے پوچھا۔ ”سرمد کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟“

سرمد نے جواب دیا۔ ”ہاں پہچانتا ہوں۔ تو میرے پاس اس لیے آیا ہے کہ مجھ میں ایسی چیزیں تلاش کرے جس سے میں سزا کا مستحق قرار پاجاؤں۔“

قوی نے کھسیا کر کہا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں۔ میں اس ملک کا قاضی القضاۃ ہوں۔ میرا نام ملّا قوی ہے، میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔“

سرمد نے کہا۔ ”پوچھ، میں تیری ہر بات کا جواب دوں گا۔“

قوی نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں تم ایک عالم اور فاضل انسان ہو اس کے باوجود تم برہنہ رہتے ہو۔ ایسا کیوں ہے؟“

سرمد نے جواب دیا۔ ”کیا کروں شیطان قوی ہے۔“

قوی تلملا کر رہ گئے۔ سرمد نے کہا۔ ”ملّا قوی! میری رباعی بھی سن لے۔“

خوش بالائے کردہ چنیں پست مرا
ایک سروقد محبوب نے مجھے پست قد ٹھگنا بنا دیا ہے
چشمے بدو جام بردہ ازدست مرا
اس کی آنکھ کے دو پیالوں نے مجھے آپے سے باہر کر دیا ہے
اودر بغل من است دمن درطلبش
میرا محبوب میری بغل میں چور کی طرح چھپا بیٹھا ہے اور میں دیوانہ!
دززے عجبے برہنہ کردہ است مرا
وہ عجیب چور ہے کہ اس کی سراپا لوٹ کے ہاتھوں میں ننگا ہوچکا ہوں

ملّا قوی جز بز ہوکر رہ گئے۔ غصہ تو بہت آیا مگر کچھ کر نہ سکے، پوچھا۔ ”سرمد! میں نے سنا ہے تم بھنگ پیتے ہو؟“

سرمد نے جواب دیا۔ ”ہاں پیتا ہوں، پھر تجھے کیا۔ کوئی اعتراض؟“

ملا نے کہا۔ ”ہاں مجھ کو اعتراض ہے کیونکہ بھنگ حرام ہے۔“

سرمد نے ملا کے ریشمی لباس کو بہ غور دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”تو نے محض سنا ہے کہ میں بھنگ پیتا ہوں مگر میں نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ تو ریشم پہنتا ہے حالانکہ بھنگ کی طرح ریشم بھی مردوں کے لیے حرام ہے۔“

ملّا قوی سٹپٹا گئے مگر آدمی ذہین تھے، فوراً جواب دیا۔ ”ریشم حرام ہے لیکن تم نے شاید غور نہیں کیا کہ حرام ریشم میں حلال سوت کی آمیزش کردی گئی ہے جس سے یہ حرام شے حلال ہوگئی ہے۔“

سرمد نے جواب دیا۔ ”پھر تو ہم پر معترض کیوں ہے، میں بھی تو حرام بھنگ میں حلال پانی استعمال کرتا ہوں۔“

قومی نے محسوس کرلیا کہ ان سے پیش پانا مشکل ہے، چپ چاپ واپس چلے آئے اور اورنگ زیب کو مطلع کیا کہ سرمد کو برہنگی کے جرم میں سزا دی جاسکتی ہے۔

اورنگ زیب نے کہا۔ ”سزا کے لیے یہ عذر شرعی ناکافی ہے، کچھ اور ہونا چاہیے۔“

اس دوران یہ خبر عام ہوگئی کہ سرمد مسلمان ہونے کے باوجود پورا کلمہ نہیں پڑھتے صرف لاالٰہ پڑھ کر رہ جاتے ہیں۔

اورنگ زیب نے علمائے عصر کی ایک جمعیت کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ سرمد سے ملے اور اس سے مناظرہ کرے۔

علما تیار ہوگئے۔ یہ لوگ سرمد کے پاس پہنچے اور اس سے باتیں شروع کردیں۔

ایک عالم نے پوچھا۔ ”سرمد! تم برہنہ کیوں رہتے ہو؟“

سرمد نے جواب دیا۔ ”اس کا جواب میں ملّا قوی کو دے چکا ہوں اس لیے بار بار اپنے جواب نہیں دہرا سکتا۔“

دوسرے عالم نے پوچھا۔ ”رسول مقبولؐ کی معراج کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے یعنی کیا عقیدہ ہے؟“

سرمد نے جواب دیا۔ ”اس کا جواب میں اپنی رباعی میں دے چکا ہوں، اس کو پڑھ لو۔“

ایک عالم اپنی دانست میں دور کی کوڑی لایا، پوچھا۔ ”سننے میں آیا ہے کہ تم نے دارا شکوہ کو مژدۂ سلطنت دیا تھا؟“

سرمد نے جواب دیا۔ ”ہاں میں نے اسے یہ مژدہ سنایا تھا مگر وہ سلطنت دنیوی نہیں، آخرت کی تھی۔“

کسی دوسرے عالم نے مذکورہ عالم کے کان میں کہا۔ ”یہ کیسا سوال کردیا۔ اس سوال کے جواب پر تعزیری فتویٰ کس طرح دیا جاسکتا ہے۔“

ایک عالم نے سرمد سے کہا۔ ”سرمد! ہم علما تمہیں حکم دیتے ہیں کہ بہت دن برہنہ رہ چکے اب لباس پہن لو۔“

سرمد نے جواب دیا۔ ”میں جس مقام پر ہوں وہاں علما کا حکم نہیں چلتا۔“

علما عاجز آگئے۔ انہوں نے اورنگ زیب سے ملاقات کی اور عرض کیا۔ ”سرمد ہماری باتوں میں نہیں آتا۔ بس ایک ہی ایسی بات ہے جس پر اسے تعزیزی فتویٰ دیا جاسکتا ہے۔“

اورنگ زیب نے پوچھا۔ ”کس بات پر؟“

علما نے یک زبان جواب دیا۔ ”برہنگی پر۔“

اورنگ زیب نے بیزاری سے منہ بنایا، کہا۔ ”غلط، فضول، محض برہنگی وجۂ قتل نہیں ہوسکتی۔“

علماً نے عرض کیا۔ ”سرمد خردمند دیوانہ ہے اس کو باتوں سے زیر نہیں کیا جاسکتا۔“

اورنگ زیب کچھ دیر سوچتا رہا۔ اس کے بعد خوش ہوگیا۔ بولا۔ ”میں نے سنا ہے سرمد پورا کلمہ نہیں پڑھتا صرف لاالٰہ کہہ کر رہ جاتا ہے۔“

عالموں نے جواب دیا۔ ”اگر ایسا ہے تو یہ بات وجۂ قتل بن سکتی ہے۔“

اورنگ زیب نے کہا۔ ”یہ بات ہے، جاؤ اس سے پوچھو۔ اس کے بعد فتویٰ دے دو۔“

علما نے ایک بار پھر سرمد کو گھیر لیا اور کہا۔ ”سرمد! ذرا کلمہ تو پڑھنا۔“

سرمد نے جواب دیا۔ ”افسوس کہ میں پورا کلمہ نہیں پڑھ سکتا۔“

کسی عالم نے سوال کیا۔ ”وہ کیوں؟ آخر کیوں؟“

سرمد نے جواب دیا۔ ”اس لیے کہ میں حالتِ نفی میں ہوں۔ ابھی مقام اثبات نہیں آیا۔“

دوسرے عالم نے پوچھا۔ ”ہم حالتِ نفی اور حالت اثبات کی بات نہیں کررہے، کلمہ پڑھنے کو کہہ رہے ہیں۔“

سرمد نے کہا۔ ”میں بھی اپنی مجبوری بیان کررہا ہوں۔ میرے ظاہر اور باطن میں کوئی فرق نہیں۔ اس لیے میں منافقت سے کام نہیں لے سکتا چونکہ میں مقام نفی میں ہوں اس لیے کلمہ کا اثباتی حصہ اپنی زبان سے نہیں ادا کرسکتا۔“

کسی جوشیلے عالم نے کہا۔ ”میں کلمہ پڑھنے کی بات کررہا ہوں، فضول بحث میں مت الجھا۔“

سرمد نے نصف کلمہ پڑھ دیا۔ ”لاالٰہ۔“

عالم نے کہا۔ ”آگے۔ اور؟“

سرمد نے پھر کہا۔ ”لاالٰہ۔“

عالم نے غصے میں اصرار کیا۔ ”آگے اور بقیہ کلمہ کیوں نہیں پڑھتے؟“

سرمد نے جواب دیا۔ ”میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ ابھی میں حالت نفی میں ہوں اس لیے میں منافقت سے کام نہیں لے سکتا۔“

پرجوش عالم نے دھمکی دی۔ ”سرمد! اگر تم پورا کلمہ نہیں پڑھو گے تو میں کفر کا فتویٰ دے کر دار پر چڑھوا دوں گا۔ تم پورا کلمہ پڑھو۔“

سرمد نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”میں نے کہہ جو دیا کہ ابھی تو میں نفی کی لذتوں میں گم ہوں۔ اثبات کا مزہ نہیں جانتا۔ پھر میں پورا کلمہ کس طرح پڑھوں۔“

عالم نے کہا۔ ”سرمد! تمہیں یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ یہ اورنگ زیب کا دور حکومت ہے، یہاں فقہ اسلامی نافذ ہے اور اس سلطنت اسلامیہ میں کسی مسلمان کے منہ سے کلماتِ کفر برداشت نہیں کیے جاسکتے۔“

سرمد نے مسکرا کر ایک شعر پڑھا۔

www.pdfbooksfree.pk

کشورے ہست کہ دردے رو داز کفر سخن
ہر جاگفت وشنو برسرایماں زردو

(ایک سلطنت ایسی بھی ہے جہاں پر صرف اور صرف کفر موضوع سخن ہے۔(اے سادہ لوح لوگو!) ہر جگہ ایسی نہیں ہوتی جہاں ایمان پر ہی گفت وشنید ہوتی ہے)

کسی عالم نے اتمام حجت کے طور پر سوال کیا۔ ''سرمد! پورا کلمہ پڑھتے ہو یا نہیں؟''

سرمد نے جواب دیا۔ ''تم لوگ اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہو جس لیے آئے ہو اسے کر گزرو۔ میں اپنا کام کر چکا۔ لا الٰہ۔''

خرقہ پوشاں ہمہ گر مست گزشتند گزشت
قصۂ پامست کہ در کوچہ وبازار بماند

(خرقہ پوش یعنی لباس فاخرہ پہن کر اٹھتے ہوئے چلنے والے چلے جاتے ہیں۔ ہم تنگ دھڑنگ لوگوں کے قصے کوچہ وبازار میں رہ جاتے ہیں۔ جنہیں لوگ دُہراتے رہتے ہیں)

علما کا کام آسان ہو چکا تھا۔ انہوں نے بلا تامل قتل کا فتویٰ صادر کر دیا۔ سرمد کو گرفتار کر لیا گیا۔

اس کام میں عجلت اختیار کی گئی۔ گرفتاری کے بعد سرمد کو قتل گاہ کی طرف لے جانے لگے۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی، لوگوں نے ہر طرف سے ہجوم کر دیا تھا۔ اس بھیڑ بھاڑ میں چلنا دشوار ہو گیا تھا لیکن سرمد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

مقتل میں جلاد شمشیر برہنہ لیے تیار کھڑا تھا۔ تلوار کی چمک سے آنکھیں چُندھیا گئیں۔ سرمد نے مسکراتے ہوئے جلاد سے آنکھ ملائی اور ایک خاص ادا سے کہا۔ ''فدائے تو شدم، بیا بیا کہ تو بہر صورتے کہ می آئی، من ترا خوب می شناسم'' (میں تیرے قربان جاؤں۔ آجا، بس آجا، تو کسی بھیس میں بھی آئے، میں تجھے ہر رنگ میں خوب پہچان سکتا ہوں)

جلاد نے سرمد کو ابھی سر رکھنے کا حکم بھی نہ دیا تھا کہ سرمد نے ایک شعر پڑھا۔

شورے شد واز خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقیست شب فتنہ نمودیم

(ایک شور اٹھا تو ہم نے بیہوشی کی نیند سے ایک آنکھ کھول کر دیکھا۔ ہمیں صرف اتنا دکھائی دیا کہ فتنہ بھری رات ابھی باقی ہے لہٰذا ہم پھر سو گئے)

جلاد کے ایک بھرپور وار نے سرمد کا سر تن سے جدا کر دیا۔ اس عالم میں لوگوں نے سنا سرمد کے کٹے ہوئے تن سے تین بار لا الٰہ الا اللہ کی آواز بلند ہوئی۔

حاضرین حیران وششدر رہ گئے۔ جلاد خوفزدہ ہو گیا۔ علما کا کام ختم ہو چکا تھا۔

کاشان کا رہنے والا نومسلم سعید سرمد دیارِ غیر میں فتنوں بھری رات سے بیزار ہمیشہ ہمیشہ کی نیند سو چکا تھا۔ اس کی آخری آرام گاہ جامع مسجد کے گردونواح میں ہے۔ کہتے ہیں چاروں فصلوں میں یہاں سرسبز گھاس رہتی ہے اور لوگ اس کے مزار کی زیارت کر کے عجیب سی کیفیت محسوس کرتے ہیں۔

برسر تربت من چوں گزری ہمت خواہ
کہ زیارت گہ رندان جہاں خواہد بود

(اے دوست! (اگر کبھی) تو میری قبر پر سے گزرے تو (صرف) یہ دعا مانگنا کہ مٹی کا یہ ڈھیر دنیا بھر کے بادہ خواروں کی زیارت گاہ بن جائے)

چنانچہ آج بھی مشہد سرمد زیارت گاہ خاص وعام ہے اور ہمیشہ فاتحہ کے لیے اٹھنے والے ہاتھ رو بہ آسمان رہتے ہیں۔

آنا نکہ غم تو برگزیدہ ندہمہ،
در کوئے شہادت آرمید ندہمہ
در موکہ دو کون فتح از عشق است
با آنکہ سپاہ اوشہید ندہمہ

(وہ جنہوں نے تیرا غم سارے کا سارا اختیار کر لیا۔ آخر کار شہادت کے کوچے میں انتہائی سکون کی نیند جا سوئے۔ دونوں جہانوں کے معرکے میں انجام کار فتح عشق ہی کو حاصل ہوتی ہے حالانکہ لشکر عشق سارے کا سارا کھیت رہا)

کمائی دمائی

منظر امام

تقط ایک غمِ روزگار نے جانے کتنی قوموں کی سوچ کا دھارا بدل ڈالا ہے... جب بہتا دریا رستہ بدل جائے تو کہیں ہریالی بڑھتی ہے، کہیں زمین پانی کو ترستی ہے... مگر موسم کی طرح رستوں کا بدلنا ان کا مشغلہ نہیں بلکہ ان کا روزگار تھا اور ان کا طریقہ واردات بھی بڑا انوکھا تھا۔

محبت کے دام کھرے کرنے والی ایک معصوم حسینہ کی چالاکیاں

رکشا سگنل پر رکا تھا کہ وہ سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

بہت معقول سی لڑکی تھی اور وہ یقیناً بھکارن بھی نہیں تھی۔

بھکارنوں کے انداز کچھ اور ہوتے ہیں۔ اس کے انداز کچھ اور تھے۔ وہ کچھ پریشان سی دکھائی دے رہی تھی۔

اسمارٹ سی لڑکی، دھوپ کا چشمہ لگائے ہوئے۔

صاف ستھرے کپڑے، ہاتھ میں ایک خوبصورت سا پرس۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پلیز کیا آپ مجھے لفٹ دیں گے؟''

میں نے اس کا جائزہ لیا۔ شاید اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں اسے کیا سمجھنے لگا ہوں۔ اس لیے جلدی سے بولی۔ ''آپ مجھے غلط نہ سمجھیں۔ میں کوئی بھکارن یا فلرٹ نہیں ہوں۔ مجبوری ہے اس لیے آپ سے درخواست کر رہی ہوں۔''

اس کا لہجہ بھی شائستہ تھا۔ سگنل کھلنے والا تھا۔ اس لیے میں نے کہا۔ ''چلیں بیٹھ جائیں۔ ویسے کہاں اتریں گی؟''

''آگے۔'' اس نے اشارہ کیا۔

میں نے اسے ساتھ بٹھالیا۔ رکشا پھر آگے بڑھ گیا۔ کچھ دور آنے کے بعد اس نے کہا۔ ''اگر آپ برا نہ مانیں تو مجھے مارکیٹ کے پاس اتار دیں۔ یہاں سے میں خود چلی جاؤں گی۔''

''اس میں برا ماننے والی کیا بات ہے؟'' میں مسکرا کر بولا۔ ''ویسے آپ جہاں کہیں جائیں میں آپ کو پہنچا سکتا ہوں۔''

''ارے نہیں، میں آپ کو تکلیف نہیں دوں گی۔''

میں نے رکشے والے کو ہدایت دی اور وہ رکشا رکنے کے

www.pdfbooksfree.pk

بعد میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے چلی گئی اور میں اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔

ویسے اس لڑکی نے مجھ پر اچھا تاثر چھوڑا تھا۔

وہ مہذب لڑکی تھی اور ساتھ ہی خوبصورت بھی تھی۔ راہ چلتے، کبھی کبھی ایسے لوگ بھی مل جاتے ہیں جو ایک طویل عرصے تک یاد رہتے ہیں، ذہن سے چپک کر رہ جاتے ہیں اور یہ خواہش ہوتی ہے کہ کاش وہ دوبارہ مل سکیں۔

میری یہ خواہش حیرت انگیز طور پر تیسرے یا چوتھے دن ہی پوری ہوگئی۔ میں رکشا یا ٹیکسی کے لیے بس اسٹاپ پر تھا اور وہ شاید بس کے انتظار میں تھی۔

ہم دونوں نے ہی ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔

وہ خود ہی میرے پاس آ گئی۔ ''کیسے ہیں آپ؟'' اس نے پوچھا۔

''بالکل ٹھیک ہوں۔ آج آپ کو کس طرف جانا ہے؟''

''اوہ۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''کہیں جانا تو ہے لیکن آپ کو زحمت نہیں دوں گی۔ ابھی میری بس آ جائے گی۔''

اسی دوران ایک رکشا ہمارے قریب آ کر رک گیا۔ میں نے اس رکشے والے کو پہچان لیا تھا۔ یہ وہی نوجوان رکشے والا تھا جو اس دن تھا جب اس لڑکی سے میری ملاقات ہوئی تھی۔

ویسے یہ خوش آئند بات تھی کہ آج کل نوجوانوں نے یہ شعبہ سنبھال لیا تھا۔ بہت سے پڑھے لکھے نوجوان رکشا یا ٹیکسی چلاتے ہوئے دکھائی دے جاتے تھے اور یہ بہت مثبت رویہ تھا۔

میں نے اس لڑکی سے کہا ''پلیز بیٹھ جائیں۔''

''پتا نہیں۔ آپ کس طرف جا رہے ہیں؟'' اس نے کہا۔

''میں تو اس طرف جاؤں گا، جس طرف آپ کو جانا ہے۔ پھر آپ کو اتار کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔''

''اوہ۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''مجھے تو صدر کی طرف جانا ہے۔''

''یہ اتفاق ہے کہ میں بھی اسی طرف جا رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

وہ میرے ساتھ بیٹھ گئی اور رکشا چل پڑا۔ دوران سفر اس سے باتیں ہوتی رہیں۔ اس نے اپنا نام صائمہ بتایا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد اب جاب ڈھونڈنے کے مرحلے میں تھی۔

وہ ایک زندہ دل لڑکی ثابت ہو رہی تھی۔ اس کی باتیں بہت دلچسپ تھیں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اسے اچھے فقروں کا استعمال کہاں کرنا ہے۔

صدر آ کر میں نے اس سے درخواست کی۔ ''اگر برا نہ سمجھو تو میرے ساتھ ایک کپ چائے پی لو۔''

''ٹھیک ہے۔''

میں نے رکشے والے کو فارغ کرنا چاہا لیکن وہ جلدی سے بولا ''جناب۔ آپ لوگ ہو کر آ جائیں۔ میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔''

رکشے والے نے یہ اچھی سہولت دے دی تھی، ورنہ صدر میں کبھی کبھی رکشا تلاش کرنا عذاب بن جاتا ہے۔ ہم دونوں ہوٹل میں آ کر بیٹھ گئے۔

ہمارے درمیان اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ بہت جلد اس نے اپنے بارے میں بتایا۔ بہت کچھ میں نے بتایا۔ گفتگو اسی طرح آگے بڑھتی ہے۔ اسی طرح ملاقاتیں ہوا کرتی ہیں اور لوگ ایک دوسرے کے قریب آتے جاتے ہیں۔

اس نے اپنے بارے میں بتایا تھا کہ اگرچہ میرے علاقے سے کچھ فاصلے پر رہتی ہے لیکن وہ روز اپنی بہن کے پاس میرے علاقے میں آیا کرتی تھی۔

میں نے اسے بتایا کہ میرا نام شایان ہے اور میں ایک دفتر میں ملازمت کرتا ہوں۔ اپنے فلیٹ میں اکیلا رہتا ہوں کیونکہ گھر والے لاہور میں رہتے ہیں۔

اِدھر اُدھر کی باتوں کے دوران میں اس نے کہا۔ ''شایان صاحب۔ آج میرا موڈ سمندر کی طرف جانے کا ہو رہا ہے۔''

''خیریت؟''

''جانے کیوں۔ میں ہفتے میں ایک بار سمندر کی طرف ضرور جاتی ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''بہت دیر تک بیٹھ کر سمندر کو دیکھتی رہتی ہوں۔ اس سے میرے اندر ایک ٹھہراؤ، ایک سکون سا پیدا ہو جاتا ہے۔''

''یہ تو ہے۔ سمندر اسی طرح اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور کون ہوتا ہے تمہارے ساتھ؟''

''کوئی نہیں۔ صرف میں اور میرے احساسات ہوتے ہیں۔''

''لیکن آج تم اکیلی نہیں ہوگی بلکہ میں بھی تمہارے ساتھ ہوں گا۔'' میں نے کہا۔

''واہ۔ یہ تو بہت اچھی بات ہوگی۔'' وہ خوش ہوگئی۔ ''تو پھر چلیں؟''

رکشے والا ہمارے انتظار میں تھا۔ ہم اس کے رکشے پر سمندر کی طرف آ گئے۔ یہاں بھی رکشے والا ہمارے لیے کھڑا رہا بلکہ میں نے اسے خود رکنے کے لیے کہا ورنہ ساحل پر کسی سواری کا ملنا خواب سے کم نہیں ہوتا۔

ہم بہت دیر تک بیٹھے رہے۔

میں نے دفتر والوں کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ میں دفتر نہیں آ سکوں گا۔

ہماری واپسی دوپہر کو ہوئی تھی۔

میں اسے اس کے گھر اتار کر اپنے گھر آ گیا تھا۔ رکشے والے نے مروتاً ایک ہزار روپے لیے تھے حالانکہ بے چارہ بہت دیر تک میرے ساتھ رہا تھا۔

دونوں کے بعد صائمہ کا فون آ گیا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو اپنے موبائل نمبرز دے دیے تھے۔ اس کا موڈ پھر تفریح کا ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''میں آپ کو ایک بات بتاؤں؟ مزے کی بات ہے۔''

''ضرور بتاؤ۔''

''اس وقت بھی وہی رکشے والا میرے ساتھ ہے۔'' اس نے بتایا۔

''چلو۔ یہ تو اچھی بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس کو لے لو۔''

اس نے بتایا کہ میں بس اسٹاپ پر آ جاؤں گی۔ میں اس کی بات سن کر خوش ہوگیا۔ اب وہ لڑکی میرے دل کو بھانے لگی تھی۔ میں نے اسے اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کا ارادہ کر لیا تھا۔

اب میری کوشش تھی کہ میں اس کی کسی بات کو نہ ٹالوں۔ اسی لیے میں نے جلدی سے اپنے دفتر فون کیا کہ میں نہیں آ سکوں گا پھر جیب میں کچھ پیسے رکھ کر بس اسٹاپ کی طرف روانہ ہوگیا۔

کچھ دیر کے بعد وہ بھی آ گئی تھی۔ وہ اسی رکشے پر تھی۔ رکشے والا مجھے پہچان کر مسکرا دیا۔ وہ ایک طرح سے ہمارا رازدار بنتا جا رہا تھا۔

اس دن بھی ہم نے پورے شہر کی سیر کی۔

سمندر، پھر ہوٹل اور جانے کہاں کہاں۔ اس دن بھی میں نے رکشے والے کو آٹھ سو روپے دیے تھے۔ کچھ بھی ہو، میں اپنی جگہ بہت مطمئن تھا۔

صائمہ کی صورت میں ایک اچھی لڑکی، اچھی محبت بن کر میری زندگی میں شامل ہوگئی تھی۔

پھر یہ ہوا کہ میں نے ایک دن صائمہ سے محبت کا اظہار کر دیا۔

میری محبت کے اظہار کے جواب میں اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ یقین کریں گے کہ میں بھی آپ سے بہت متاثر ہوں؟''

''صرف متاثر؟''

''نہیں۔'' وہ مسکرا دی۔ ''بلکہ اس سے بھی بڑھ کر آپ کو پسند کرنے لگی ہوں۔''

''یہ بات ہوئی نا۔'' میں ہنس پڑا۔ ''اب بتاؤ۔ تمہیں کیا انعام دیا جائے؟''

''کچھ بھی نہیں۔ میرا تو صرف ایک ہی شوق ہے۔ پورے شہر کی سیر کرنا۔''

''تو چلو۔ اسی خوشی میں پھر پورے شہر کی سیر کرتے ہیں۔''

پھر سیر شروع ہوگئی۔

ایک جگہ سے دوسری جگہ، پھر تیسری جگہ۔ اس کے ساتھ خود اپنا شہر بھی بالکل نیا نیا سا دکھائی دے رہا تھا۔ ہم سفر اگر اچھا ہو تو سب کچھ اچھا لگتا ہے۔

اس شام رکشے والے کے پندرہ سو روپے بنے تھے لیکن صائمہ کی خوشی کے لیے ان پیسوں کی کیا حیثیت تھی اور ایک دن یہ سب کچھ ختم ہوگیا۔

میں صائمہ کے ساتھ ایک مارکیٹ سے شاپنگ کر کے باہر نکلا تھا کہ ایک دوست نے مجھے آواز دی۔

''ارے شایان صاحب۔ کیا حال ہیں؟''

پھر وہ ہمارے پاس آ کر کھڑا ہوگیا۔ ایک عجیب بات ہوئی کہ صائمہ نے اس کی طرف دیکھا اور جلدی سے سامنے کھڑے ہوئے رکشے کی طرف بڑھ گئی۔

اس نے مجھ سے کچھ کہا بھی نہیں تھا جبکہ میں اسے آواز دیتا رہ گیا۔

''ارے بھائی! کیوں آواز دے رہے ہو؟ وہ تو گئی۔'' میرے دوست نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''وہ تو گئی۔ صائمہ نام ہے نا اس کا؟''

''ہاں۔ لیکن تم کیسے جانتے ہو؟''

''اس لیے کہ یہ سب ڈراما میرے ساتھ بھی ہو چکا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''میں نہیں سمجھا کیسا ڈراما؟''

''یہی، رکشے پر سیر کرنے کا ڈراما۔'' اس نے کہا۔ ''یہ دونوں ایک دوسرے کے متلاشی ہیں۔''

''کیا؟''

''ہاں بھائی! مجھے بھی یہ بات اتفاق سے پتا چلی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''رکشے والے کا نام امتیاز ہے۔ اب رکشے سے بہترین کمائی کا یہ طریقہ نکالا گیا ہے کہ لڑکی تم جیسوں کو پھانس کر سارا دن رکشے کی سیر کرتی رہتی ہے اور شام کو رکشے والے کو اچھے خاصے پیسے دلا دیتی ہے۔ کیوں، یہی ہو رہا ہے نا؟''

''ہاں۔ یہی ہو رہا ہے۔'' میں مرجھائی ہوئی آواز میں بولا اور ایک طرف بڑھ گیا۔

اس کے بعد سے میں نے رکشے میں بیٹھنا ہی چھوڑ دیا۔ اب یا تو بس میں سفر کرتا ہوں یا پیدل چلتا ہوں۔

www.pdfbooksfree.pk

چار سمت ایک چوراہا

امجد اقبال

انجانے میں ہی سہی مگر... بے سمت چلنے والوں کی بھی کوئی نہ کوئی سمت تو ہوتی ہی ہے، یہ اور بات کہ سفر کے اختتام پر ان کے حصے میں کیا آتا ہے... منزل یا پڑائو... بعض اوقات زندگی کسی چوراہے سے شروع ہوکر چوراہے پر ہی آکر تمام ہوجاتی ہے۔ ان کی زندگی کا آغاز بھی ایک ایسی جگہ سے ہوا جس کے گرد چار سمتیں پھیلی ہوئی تھیں اور... اتفاق سے ان کی تعداد بھی چار تھی۔ جانے وہ آپس میں دوست تھے یا جانی دشمن... مگر حیات کے فلسفے سے ان کا مقابلہ بڑا عجیب تھا... اور جب ان کی جھکی گردن میں تنائو آیا اور مانگنے والے ہاتھ دنیا پر جھپٹ پڑے تو ہر مقام پر انقلاب سے ان کی شناسائی بڑھتی چلی گئی۔ پتھریلے رستوں کے انتخاب اور رتجگوں کے عذاب نے ان کی خواہشوں اور خوابوں کو ایک الگ ہی رنگ ڈھنگ میں ڈھال دیا تھا۔ محبتوں سے چھیڑ چھاڑ... حالات سے مار دھاڑ اور... زندگی کا کاروبار کرتے ہوئے وہ انجانی منزلوں کی جانب رواں دواں تھے کہ اچانک ایک موڑ کاٹتے ہوئے ان کے پیروں تلے اسی چوراہے کی زمین پھیلی ہوئی ملی جو ان کے سفر کا نقطۂ آغاز تھا مگر... اس آغاز اور اختتام کے درمیان گویا صدیوں کا فاصلہ حائل تھا... قدرت نے انہیں دوبارہ اس جگہ پر شاید اس لیے بھی پہنچا دیا تھا کہ یہاں ان کی زندگی کا اثاثہ دفن تھا۔

رشتوں کی بگڑتی صورت حال...... جذبات کے بھونچال اور مقدر کی لڑکھڑاتی چالوں کا احوال

www.pdfbooksfree.pk

شام کے بڑھتے سایوں کے ساتھ ماحول میں ایک دل دوز اداسی کا تاثر گہرا ہوتا جارہا تھا۔ سرنگوں کھڑے درختوں کے زرد پتوں سے گزرنے والی ہوا سسکیاں لیتی محسوس ہوتی تھی۔ تھکا ہارا سورج آسمان کی ویرانی کو الوداعی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے آخری بار قبر کی گہرائی میں دیکھا اور پھر ایک دوسرے کی جانب اجازت طلب نظریں اٹھائیں... ان میں سے ایک نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ دوسرا آہستہ آہستہ جھکا اور قبر میں مٹی ڈالنے لگا۔ قبر کی دوسری جانب بیٹھے ہوئے شخص نے گھاس کا ایک خشک تنکا چبانا موقوف کیا اور مٹی ڈالنے والوں میں شامل ہوگیا۔

چوتھا ہنوز ٹانگیں مضبوطی سے پھیلائے اور ہاتھوں کو سینے پر باندھے کھڑا تھا۔ پہلے نے ہاتھ جھاڑ کے کہا۔ ”تم بھی مٹی دے لو۔“

”ہاں... اس کے بعد ہم مل کے دعا کریں گے۔“ دوسرا بولا۔ چوتھے پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ باقی تین کو دیکھتا رہا جو قبر کو مٹی سے بھرنے کے بعد زمین کو ہموار کررہے تھے۔

”کچھ عرصے بعد قبر کا سراغ تک نہیں ملے گا۔“ چوتھے نے اچانک کہا۔

دوسرا بولا۔ ”ہاں... ہم خود بھی چاہیں تو اس مدفن کو تلاش نہ کرپائیں گے۔“

چوتھے نے خفگی سے کہا۔ ”آخر کیا ضرورت ہے ایسی باتیں کرنے کی۔ ایسا ہی ہے تو لگا دو یہاں کوئی کتبہ۔“

تیسرے نے تحمل سے کہا۔ ”یہ مطلب کسی کا نہیں تھا... کہ ہم میں سے کوئی یہ گڑے مردے اکھاڑنے آئے گا۔“

وہ چاروں نوجوان تھے۔ ان کی عمریں بائیس سے چھبیس سال کے درمیان تھیں۔ ان سب نے جینز پہن رکھی تھی اور مختلف رنگ کی ٹی شرٹس جس پر عجیب وغریب الفاظ اور پیغامات کے پرنٹس تھے۔ صرف ایک کی سرخ ٹی شرٹ پر ”چی گویرا“ کے چہرے کا نقش تھا۔ وہ چاروں صحت مند، لمبے، چہروں سے بے فکرے اور لاابالی ہیرو ٹائپ نظر آتے تھے اور ان کے درمیان بے غرض دوستی کا مضبوط رشتہ نظر آتا تھا۔

”اب ہم دعا کریں گے...“ چوتھے نے چیونگم تھوک دی اور باقی سب کے ہاتھ اٹھاتے ہی بولنے لگا۔ ”اے رب العالمین... ہماری اس غلطی کو معاف فرما۔“

”ہم ہرگز ناشکرے اور کفران نعمت کرنے والے نہ تھے۔“ پہلا بولا۔ ”ہمارے ماں باپ کو صبر جمیل عطا کر۔“

تیسرا بولا۔ ”ہم نے ان کی امیدوں کا خون کیا۔ ان کے خوابوں کے محل مسمار کردیے۔ ہم ان کی توقعات پر پورے اترنے میں ناکام رہے۔“

”ہم ہرگز نالائق یا نااہل نہ تھے۔ ہم نے بہت محنت کی اور ہمیشہ اچھے نمبروں سے ہر امتحان پاس کیا۔ لیکن آج اپنی ڈگریوں کو دفن کرنے پر مجبور ہوئے۔“

”ہماری بدقسمتی صرف یہ تھی کہ ہم بے وسیلہ تھے۔ کوئی سفارش نہ رکھتے تھے اور نہ رشوت دینے کی استطاعت...“

”ہم ہر جگہ کوشش کرتے رہے۔ ہمیں انٹرویو کے لیے بلوایا گیا تو فیل کردیا گیا۔ ہم کب تک بے روزگاری کی ذلت اور فرسٹریشن جھیلتے۔“

”ہمیں مجبوراً یہ کرنا پڑا۔ ڈگریاں ہمارے لیے بار تھیں۔“

”اور آج کے بعد ہم جو کریں گے۔ مجبوری کے باعث کریں گے۔ ہمارے گناہ کو نظریہ ضرورت کا جواز حاصل ہوگا۔“

چوتھے نے پھر خفگی دکھائی۔ ”ناؤ شٹ اپ... آل آف یو۔“ باقی تینوں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ ”لیکن ہم نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔“

”زبان سے نہیں کہا۔ لیکن تمہارے خیالات پڑھ سکتا ہوں میں۔ سن سکتا ہوں کہ تم کیا سوچ رہے تھے۔“ چوتھے نے کہا۔ ”فارموو... چلو۔“

وہ ایک پرانی فاکسی ویگن میں بیٹھ گئے جس کی چھت کاٹ دی گئی تھی۔ انہوں نے پلٹ کے آخری بار اس جگہ کو دیکھا جہاں قبر تھی... وہ سب دل گرفتہ اور دنیا سے بے حد خفا تھے۔

اس قبر میں ان چاروں نے اپنی اپنی ڈگریاں دفن کی تھیں۔ ناکامی اور مایوسی کے ایک طویل، پرعذاب دور سے گزرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ڈگریوں کا مصرف کوئی نہیں۔

ایک کے بعد دوسری ہر یونیورسٹی سے ہر سمسٹر کے بعد ڈگریاں لینے والوں کی نئی کھیپ مارکیٹ میں فراہم ہورہی تھی۔ اس مال کی طرح جو یکے بعد دیگرے مختلف ممالک سے بھیج کر بندرگاہ پر جمع ہوتا جارہا ہو اور بحری جہازوں کی آمد کا سلسلہ روکنے کی کوئی صورت نہ ہو مگر مال کا خریدار ناپید ہو... ڈاکٹر... انجینئر... ایم بی اے... ایم سی ایس... کراچی سے خیبر تک اور آزاد کشمیر تک سیکڑوں سرکاری، پرائیوٹ، ملکی اور غیر ملکی یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہوکے جاب مارکیٹ پر یلغار کررہے تھے۔

ان کے لیے مشکلات کے ساتھ خطرات بڑھ رہے تھے۔ فریش گریجویٹس کے مقابلے میں وہ آؤٹ آف ڈیٹ ہوسکتے تھے۔ ان کی نالج پرانی ہورہی تھی۔ حالانکہ وہ انٹرنیٹ سے خود کو اپ ڈیٹ کرتے تھے اور کسی طرح بھی نئی ڈگریوں کے ساتھ مقابلے پر آنے والوں سے کم تر نہ تھے۔ ان کے علم میں ایسے کیس بھی تھے جن کو کسی کی سفارش نے زمین سے آسمان پر پہنچا دیا تھا۔

☆☆☆

یہ صرف تین دن پہلے کی بات تھی جب وہ سخت مایوسی اور ناراضی کے جذبات سے بوجھل دل کے ساتھ یکجا ہوئے۔ ناراض وہ سب سے تھے۔ اپنے ماں باپ سے جنہوں نے شیخ چلی کی طرح خواب دیکھتے ہوئے ان کو ڈاکٹر انجینئر، بزنس ایڈمنسٹریشن آف آئی ٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے پر مجبور کیا، ان اداروں سے جنہوں نے ان کے ہاتھوں میں کامیابی کی اسناد تھما کے انہیں دنیا میں دھکے کھانے بھیج دیا۔ دھکے دینے والوں سے... اپنی تقدیر سے... اس نظام سے... ساری دنیا سے۔

”بس یار... سب بے کار ہے۔ ہم کچھ نہیں کرسکتے یہ ثابت ہوچکا ہے۔ ہم نکمے، نااہل اور غیر ضروری ہیں۔“ حیدر نے کہا۔ وہ ایک ڈاکٹر تھا۔

”ذہن کا بوجھ... ماں باپ کے لیے باعث شرمندگی۔ خود اپنے لیے باعث ذلت۔ علم کا فضول بوجھ اٹھا کے بھٹکنے والے گدھے۔“ انجینئر وقار نے غصے سے کہا۔

”ڈگریوں والے احمق... بدبخت اور بے کار انسان۔“ خاور نے جو ایم بی اے تھا، کہا۔ ”کاش ہم جاہل اور احمق ہوتے۔ لوفر اور بگڑے ہوئے نوجوان ہوتے... مگر کسی وزیر، سفیر یا جنرل کی اولاد ہوتے جو ہمیں نقل کرا کے یا پیسا خرچ کرکے پاس کرا دیتا۔ انٹر بی اے کی ڈگری خرید کے ہمیں کسی اونچی جگہ فٹ کردیتا۔“

کمپیوٹر سائنس میں ماسٹر کی ڈگری لینے والے کمال نے افسوس سے سر ہلایا۔ ”جو نہیں ہے اسے کیوں روتے ہو یارو... مجھے دیکھو... میرے ماں باپ نے کیا، سارے زمانے نے مجھے یقین دلایا تھا کہ مستقبل میرا انتظار کررہا ہے کیونکہ آنے والا وقت آئی ٹی کے انقلاب کا ہے۔ لیکن اب مجھے کسی بینک میں دس ہزار کی نوکری بھی آفر ہوتی ہے تو کنٹریکٹ پر۔ لعنت ہو ایسی قسمت پر...“

وقار اٹھ کھڑا ہوا۔ ”کاش ہم قسمت کو بدل سکتے۔“ حیدر نے برہمی سے کہا۔ ”یار! اسٹاپ دس... روز وہی باتیں... کیا حاصل قسمت کو اور دنیا کو کوسنے سے۔ اس سے کچھ بدلے گا؟“

”پھر کیسے بدلے گا...؟“ وقار نے ٹہلتے ہوئے کہا۔ ”آدمی اگر ایک ہی راستے پر چلتا جائے یہ جاننے کے بعد بھی کہ راستہ کسی منزل کی طرف نہیں لے جارہا ہے تو قصور کس کا ہے؟ راستے کا... یا منزل کا؟“ حیدر نے سوال کیا۔

خاور نے سر ہلایا۔ ”گڈ... ویری گڈ پوائنٹ۔“

کمال نے جیسے سب کی طرف سے سوال کا جواب دیا۔ ”قصور اس بے وقوف کا ہے جو راستہ نہیں بدلتا۔“

حیدر نے پیٹر پر مکا مارا۔ ”رائٹ... ہم بے وقوفوں کو بھی راستہ بدل دینا چاہیے۔“

”کیا مطلب؟“ خاور نے سر کھجایا۔

”ہمیں کچھ اور کرنا چاہیے۔“ حیدر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

وقار اور کمال ایک ساتھ ہنس پڑے۔ جیسے حیدر نے انہیں کوئی فریش ڈرٹی جوک سنایا ہو۔

”میں اچھا شیف ہوں۔“ کمال بولا۔ ”اور حق حلال کی روزی جیسے بھی کمائی جائے... آدمی کو اس پر فخر محسوس کرنا چاہیے۔ میں ریڑھی پر بریانی بیچنے کے لیے تیار ہوں۔“

”لڑکیوں کے لیے۔“ وقار نے اپنا ہاتھ اٹھایا۔ ”اگر میں ایک بیوٹی پارلر کھول لوں...“

”اپنی اپنی بکواس بند کرو۔ میں مذاق نہیں کررہا تھا۔“ حیدر نے متانت سے کہا۔ ”مجھے ایک سگریٹ دو... پھر میں بتاتا ہوں۔“

وقار نے جیب سے ایک سگریٹ نکال کے سیدھی کی اور حیدر کو دونوں ہاتھوں پر رکھ کے پیش کی۔ ”آج کی شام کا آخری جام۔“

حیدر نے سگریٹ جلائی اور کسی عظیم مدبر کی طرح ایک لمبا کش لے کر دھویں کو اوپر چھوڑتے ہوئے بولا۔ ”علامہ نے کیا فرمایا تھا میرے بچو... یاد کرو۔“

”کون سے علامہ نے... یہاں تو سارے ہی علامہ ہیں جو فرماتے رہتے ہیں۔“ وقار نے کہا۔

”ابے شاعر مشرق نے... جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روزی۔ اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو۔“

خاور پھر سر کھجانے لگا۔ ”یار کھیت کو آگ لگانے کی بات اپنی سمجھ میں نہیں آئی۔“

”بے وقوف... ابو جہل... کھیت ہے یونیورسٹی... دہقان ہیں ہم... اور خوشۂ گندم ہیں ہماری ڈگریاں۔“

خاور نے گھڑے جیسا سر ہلایا۔ ”اوکے... اوکے... مگر کسی یونیورسٹی کو جلانے سے کیا ہوگا۔“

کمال نے کہا۔ ”وہی ذمے دار ہیں ہمیں ایسی ڈگریاں دینے کے جن کو نہ دنیا میں کوئی پوچھتا ہے نہ پاکستان میں...“

وقار نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”انقلاب بے شک ایسے ہی آتا ہے جب مایوسی کی انتہا کو پہنچنے والے گھیراؤ، جلاؤ، لوٹ مار اور توڑ پھوڑ پر اتر آتے ہیں... مگر میرا خیال ہے

www.pdfbooksfree.pk

کسی انقلاب میں یونیورسٹیوں کو آگ نہیں لگائی گئی...''

حیدر نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ ''جاہلو... بڑی غلطی کی میں نے تمہارے سامنے شعر پڑھ کے... میرا مطلب تھا... ہم جیسے لاکھوں نوجوانوں کو سوچنا چاہیے کہ کیا ڈگریوں کے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے...؟ باعزت اور خوشحال زندگی کا ہمارے پاس اور کوئی راستہ نہیں...؟''

کمال نے اعتراف کیا... ''راستے یقیناً ہوں گے لیکن ہم نے چوبیس پچیس سال جھک ماری ہے...''

وقار گرم ہوگیا۔ ''تو نے ماری ہوگی جھک... میں نے بہت محنت کی تھی، نیک نیتی کے ساتھ۔ دن رات ایک کر دیا تھا۔''

خاور نے اس کا ساتھ دیا۔ ''میں نے بھی...''

کمال نے غرا کے کہا۔ ''آپ بکواس مت فرمائیں۔ ہم سب جانتے ہیں آپ کی ڈگری کی حقیقت کو۔ نقل باز سہی۔''

خاور دھیما پڑ گیا۔ ''یار... بس ایک دن مدد لی تھی اور اس دن کیا ہوا تھا تم جانتے ہو۔''

''ہاں... تیری محبوبہ کا دلیمہ ہوا تھا۔'' وہ سب بولے۔

حیدر نے کہا۔ ''میرے پیارے دوستو... عزیز ہم وطنو... آج میں آپ سے ایک اہم قومی مسئلے پر بات کروں گا۔''

''کیا یہ تقریر براہ راست کسی مواصلاتی رابطے پر دکھائی جا رہی ہے؟'' وقار بولا۔

''مذاق کی بات نہیں۔ اب ہمیں واقعی سنجیدگی سے سوچنا چاہیے کہ کامیابی کا متبادل راستہ کون سا ہے۔ آخر صرف ڈاکٹر، انجینئر۔ ایم بی اے یا ایم سی ایس تو نہیں ہیں جو کروڑ پتی، ارب پتی ہیں۔ بڑی بڑی کوٹھیوں میں رہتے ہیں اور بی ایم ڈبلیو جیسی گاڑیوں میں پھرتے ہیں۔ شاید ان میں سے نوے فیصد ایسی کوئی ڈگری نہیں رکھتے۔''

''بلکہ کوئی ڈگری نہیں رکھتے...'' وقار نے کہا۔

''شاید میٹرک پاس ہوں گے...'' کمال بولا۔

''نوے فیصد نہیں... پچانوے فیصد...'' خاور نے کہا۔

''رائٹ... دنیا میں عزت، دولت، شہرت کی منزل پانے والوں کے پاس کوئی تعلیمی سند نہیں تھی۔''

''مثلاً ایڈیسن...'' خاور بولا۔

''آج اگر ہم بھی یہ بھول جائیں کہ ہمارے پاس کوئی ڈگری ہے۔ پھر فرض کر لیں کہ ہمارے پاس کچھ نہیں۔ نہ اعلیٰ تعلیم۔ نہ سفارش۔ نہ رشوت کے لیے مال۔ نہ باپ کا بزنس یا موروثی زمینداری۔ ہمارے پاس صرف ارادہ ہے، عقل ہے اور ہمت ہے۔''

وقار نے جیسے خود سے کہا۔ ''آخر میں کیسے بھول سکتا ہوں کہ میں انجینئر ہوں۔''

حیدر نے سگریٹ کا آخری کش لیا۔ ''پاگل کے بچے... آدمی بھول جاتا ہے اپنے باپ کو۔ حالانکہ اس کا نام ساری عمر لکھتا رہتا ہے۔ وقار احمد ولد افتخار احمد... بھول جاتا ہے کہ نہیں۔''

کمال نے اعتراف میں سر ہلایا۔ ''میرا بھائی امریکا جا کے سب کو بھول گیا۔ باپ کے علاوہ ماں کو... بہنوں کو... مجھے... دس سال ہو گئے۔ ہم بھی بھول چکے ہیں اسے۔ معلوم نہیں کہاں ہے۔ زندہ ہے کہ مر گیا۔''

''دنیا اسی کا نام ہے۔'' خاور نے اسے تسلی دی۔

''بھول جاؤ اپنی ڈگریوں کو...'' حیدر نے جیسے حکم دیا۔ ''جیسے طارق نے اسپین میں کشتیاں جلا دی تھیں۔''

خاور نے کمال کی طرف دیکھا۔ ''طارق کون؟''

''یار بہت لوگ اسپین جا رہے ہیں۔ ترکی اور یونان کے راستے... طارق بھی کسی کشتی میں گیا ہوگا۔''

کمال نے کہا۔ ''حیدر کا کوئی جاننے والا ہوگا۔ ہم اسے نہیں جانتے۔''

حیدر نے پھر اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ ''جہالت کے نمونو... میں طارق بن زیاد کا حوالہ دے رہا تھا جس نے اسپین فتح کیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ کشتیاں جلا دو تاکہ واپسی کی امید اور امکان ہی نہ رہے۔ ہم ماریں گے یا مر جائیں گے۔ تم بھی جلا دو ان ڈگریوں کو جو تمہیں جھوٹی آس پر زندہ رکھتی ہیں۔ بار بار ناکامی کی ذلت اور فرسٹریشن دیتی ہیں۔ یہ تمہاری دوست نہیں... دشمن ہیں۔'' حیدر ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ ایک فلاسفر، سوشل ریفارمر بہت کچھ تھا۔

خاور متفکر ہوگیا۔ ''پہلے سوچ لو۔ ہم کیا کر سکتے ہیں۔''

حیدر نے کہا۔ ''مثالیں بہت ہیں۔ لیکن میں صرف دو کا حوالہ دوں گا... میرا ایک دوست زمانہ طالب علمی میں رائٹر تھا... مگر رائٹر شاعری یا افسانہ نگاری سے صرف نام کماتا تھا۔ نان کا مسئلہ اس کی فیملی کے لیے بھی ہوتا تھا چنانچہ وہ کلرکی کرتا تھا۔ تیرہ سال بعد اسے پھر موقع ملا لکھ کے پیسا کمانے کا۔ اس نے کلرکی چھوڑ دی اور لکھ کے سب کمایا...

عزت، شہرت اور دولت۔ اسے ہمیشہ اپنی زندگی کے تیرہ برس رائگاں جانے کا دکھ رہا۔ دوسرے حوالہ ہے ایسے شخص کا جسے اچانک کمپنی نے کام سے فارغ کر دیا... گولڈن ہینڈ شیک کے ساتھ اسے چونسٹھ لاکھ روپے بھی دیے مگر وہ اتنا اداس تھا جیسے نوکری نہیں رہی تو کچھ بھی نہیں رہا۔ اب وہ کیا کرے گا۔ کمپنی اس کے بغیر کیسے چلے گی۔'' حیدر ہنس پڑا۔

خاور نے سر ہلایا۔ ''تجربہ کار لوگ نہ رہیں تو نقصان ہوتا ہے۔''

''مائی فٹ... دنیا اپنے محور پر گھومتی رہتی ہے... سورج نکلتا ڈوبتا نظر آتا ہے... گھڑی کی سوئیاں چلتی رہتی ہیں۔ دکان، فیکٹری، حکومت کا کاروبار... سب چلتے ہیں... جب قائداعظم کا انتقال ہوا تو بدخواہوں نے کیا کہا تھا؟ اب پاکستان نہیں رہے گا۔ پاکستان ہے اور پہلے سے زیادہ مضبوط ہے... ہے کہ نہیں!''

سامعین نے اعتراف میں سر کو اوپر سے نیچے حرکت دی۔

حیدر نے خطاب جاری رکھا۔ ''میرے اس دوست کو کسی نے مشورہ دیا کہ وہ چونسٹھ لاکھ میں سے نصف کاروبار میں لگائے۔ ایک پلاٹ خریدے، اس پر مکان بنائے اور بیچ کر دوسرا شروع کر دے۔ نوکری پیشہ دوست کاروبار میں ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈرتا تھا۔ مشورہ دینے والے نے کہا کہ اس میں کون سا مسئلہ ہے... زمین بھی تمہاری مکان بھی بکنے تک تمہارا... وہ مان گیا۔ صرف دس سال میں وہ بلڈر بن گیا۔ اس نے اپنا ایک ہاؤسنگ پروجیکٹ اناؤنس کر دیا۔ تب اسے اندازہ ہوا کہ خدا نے اس کے اندر کاروبار کی کیسی زبردست صلاحیت رکھی تھی جس سے وہ بے خبر تھا۔ اب اسے افسوس ہوتا ہے کہ اس نے تیل کمپنی میں تیئس برس کیوں گنوائے۔''

حیدر کی خاموشی پر خاور نے کہا۔ ''ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں... بلڈر کیسے بن جائیں... چونسٹھ لاکھ ہوتے میرے پاس تو میں سوچتا۔''

حیدر نے اس کے احمقانہ سوال کو معاف کر دیا۔ ''برخوردار، نورچشم... الو کے پٹھے... غور کر... اپنے اندر جھانک... دیکھ خدا نے تیرے اندر کیا صلاحیت رکھی ہے... آزما کے دیکھ۔ ہو سکتا ہے تو ایم بی اے سے زیادہ بہت کچھ ہو...''

''کیا ہم سب مل کے کچھ نہیں کر سکتے...؟'' وقار نے سوال کیا۔

''کر سکتے ہیں... بہت کچھ کر سکتے ہیں...'' حیدر نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔

کچھ دیر وہ اپنی اپنی سوچ میں غوطہ زن رہے۔ یہ غور کرتے رہے کہ وہ اکیلے یا سب مل کے کیا کر سکتے ہیں۔ کون سا کام ہے جو ان کے دن پھیر دے۔ ان کی سوئی تقدیر جگا دے۔ ان پر دولت کی دیوی کو مہربان کر دے... جو دنیا میں عیش کر رہے ہیں... ان کے پاس کیش کیسے آتا ہے؟

خاور نے چٹکی بجا کے کہا۔ ''یار ہم ڈاکا ڈالیں؟''

دہرایا۔ ''ڈاکا ڈالیں...'' حیدر نے زیر لب تبسم کے ساتھ

''ہاں، کسی بینک میں... ایک گروہ بنا لیں۔'' خاور نے جوش کے ساتھ کہا۔ ''ہمارا لیڈر ہوگا تو... ہم تیرے پلان پر عمل کریں گے۔ اس کام کے لیے صرف گنز چاہئیں۔''

کمال نے تلخی سے کہا۔ ''مرنے کا حوصلہ بھی چاہیے بیٹے... سوچ اگر بینک کے گارڈ نے یا پولیس نے اچانک آ کے ہم سب کو اپنی گولیوں سے چھلنی کر دیا... تو ہمارے گھر والوں کا کیا ہوگا... کسی مردہ خانے میں ہماری خون آلود لاشیں دیکھ کر...''

وقار لرز گیا۔ ''نہیں یار... میں مرنا نہیں چاہتا۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے مرنے سے... کفن... جنازہ... عذاب قبر... یہ سب اپنے لیے سوچ کے تو میری پتلون ڈھیلی ہو جاتی ہے۔''

''ڈھیلی یا گیلی...؟'' کمال نے کہا۔

''مجھے بھی اپنی زندگی بہت عزیز ہے... کیونکہ یہ بہت قیمتی ہے اور مجھے دوبارہ نہیں ملے گی... جو بابر نے کہا تھا... وہی ہے اپنا نظریہ...؟''

خاور نے کہا۔ ''کون بابر... وہ جس کی بہن کے ساتھ...''

حیدر نے پھر سر پکڑ لیا۔ ''ابے گاودی... بابر بادشاہ... ظہیر الدین بابر۔ خاندان مغلیہ کا بانی... وہ کہتا تھا... بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔''

کمال نے طنز سے کہا۔ ''تجھ سے کہتا تھا؟ فارسی آتی ہے تجھے۔''

''مطلب یہ کہ عیش کرو عیش کیونکہ دنیا پھر نہیں ملے گی۔ لیکن میرے پیارے گدھو... عیش کے لیے کیش ہونا چاہیے... اور اس کے لیے ڈاکا نہیں ڈالنا چاہیے اور حرام موت نہیں مرنا چاہیے۔''

''پھر کیا کرنا چاہیے استاد محترم...؟'' وقار نے کہا۔

''ڈاکا۔'' حیدر نے مضبوط لہجے میں کہا۔

www.pdfbooksfree.pk

"فراڈ...!" کمال نے زیرلب دُہرایا۔

"ہاں... جو سب کر رہے ہیں۔ ہمارے آس پاس۔ ہر جگہ ہر وقت... لیڈر... بلڈر... انجینئر اور ڈاکٹر... تاجر اور صنعتکار... امپورٹر اور ایکسپورٹر... استاد اور طالب علم... ذرا مجھے بتاؤ فراڈ کہاں نہیں ہو رہا ہے... اور پکڑا کون جا رہا ہے؟ مال کون سمیٹ رہا ہے... دیواری اہل قلم، اور عامل سے عالم تک... بیچنے والے سے خریدار تک... اسرائیل سے کشمیر تک... کورٹ سے اقوام متحدہ تک۔"

وہ سارے چپ اور مسحور سے بیٹھے رہے۔ ایک ہی مسئلے پر غور و فکر کے سمندر میں غوطہ زن رہے۔ حقائق کے اور امکانات کے علاوہ اور ان گنت پہلوؤں ان کے سامنے آتے رہے جیسے کلیڈ اسکوپ کی حرکت سے اندر شیشوں کے ٹکڑے متحرک ہوتے ہیں تو مسحور کن اور نئے نئے پیٹرن سامنے آتے ہیں یا آتش بازی میں ایک انار بلندی پر جا کے پھٹتا ہے تو تاریک آسمان میں سیکڑوں ہزاروں رنگین ستارے روشن ہو جاتے ہیں۔

بالآخر انہوں نے سوال کیا۔ "ہم کیا فراڈ کریں اے عظیم لیڈر... ہماری رہنمائی فرما۔ ہم تیری عقل و دانش کا اعتراف کرتے ہیں۔"

"اور تیرے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔"

گریٹ لیڈر... کہ جس کا ترجمہ قائداعظم ہرگز نہیں کیا جا سکتا... سب پر شفقت کی نظر کی... ڈاکٹر سے زیادہ وہ ایک دانش ور تھا۔ کورس کی سب کتابیں اس نے بہ امر مجبوری پڑھ لی تھیں اور امتحان میں پڑھا ہوا ایسے لکھ دیا تھا جیسے تے کرنے والا وہی اگلتا ہے جو نگلتا ہے... لیکن اس سے سوگنا، ہزار گنا ادھر ادھر کی کتابیں اس نے بڑے شوق سے چاٹی تھیں۔ تاریخ، فلسفہ، ادب۔ چنانچہ ہم جماعتوں، ہم عصروں، ہم زادوں اور عم زادوں نے اس کو افلاطون کا خطاب دیا تھا۔

افلاطون نے اپنے شاگردوں سے کہا۔ "اپنے چار اطراف میں تم کیا دیکھتے ہو؟"

شاگردوں نے کہا۔ "دھوکا، فریب، غبن، لوٹ مار، فراڈ اور کرپشن، ہر محکمے میں، ہر کاروبار میں... ہر جگہ۔"

"اور یہ کون لوگ کر رہے ہیں...؟ کیا یہ سب وہ کر رہے ہیں جو ان پڑھ اور امتی ہیں... جن کے پاس عقل نام کی کوئی چیز نہیں۔"

شاگردوں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ سب ذہین و فطین لوگ کر رہے ہیں استاد محترم۔"

"ایسا ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ اگر تمہارے وجود کے اس حصے میں..." افلاطون نے سرگوشی سے بتایا۔ "عقل و ذہانت ہے... تو سمجھو تم خوش قسمت ہو... پیدائشی طور پر۔ اب آگے رہ جاتا ہے صرف اس کا استعمال۔ اگر تم عقل کو استعمال کرنے کی عقل بھی رکھتے ہو تو سمجھو کامیابی تمہارے ارادے کی غلام ہے۔ تم ہانکنے والے ہو... جو ایک دو فیصد ہوتے ہیں... یا شاید اس سے بھی کم۔ باقی سارے ہانکے جاتے ہیں، استعمال ہوتے ہیں... اور ایسے ہی خرچ ہو جاتے ہیں جیسے بارود ہے یا کلاشنکوف کی گولیاں... کیا میری باتیں تمہاری سمجھ میں آ رہی ہیں؟"

انہوں نے سر ہلایا۔ "ہم وہی کریں گے جو تو کہے گا عظیم رہنما۔"

"اچھا... تو سب سے پہلے اپنی ڈگریاں جلا دو... لیکن ٹھہرو... جلانا ایک تکلیف دہ عمل ہے... پتا نہیں چتا پر لیٹے باپ یا بیٹے یا ماں کو خود اپنے ہی کیسے آگ لگاتے ہیں۔ ہم تدفین کو سکون سے برداشت کرتے ہیں... عزت اور احترام سے مردے کو زمین کے سپرد کر دیتے ہیں... آگے زمین اس کے ساتھ جو چاہے کرے... ہم دیکھتے کچھ نہیں... تو دوستو... ساتھیو... ہم اپنی ڈگریاں دفن کریں گے۔"

"اور اس قبر پر فاتحہ بھی پڑھیں گے... ہر جمعرات۔"

"قبر پر پھول چڑھانے بھی جائیں گے... ہر اتوار۔"

"قبر پر چراغ روشن کریں گے... ہر پیر۔"

"چادر چڑھائیں گے... ہر سال۔"

"شٹ اپ... شٹ اپ... اینڈ شٹ اپ..." حیدر نے دہاڑ کے کہا۔ "ہم یہ سب ہرگز نہیں کریں گے۔ ہم ڈگریوں کو دفنائیں گے اور ہمیشہ کے لیے بھول جائیں گے۔"

اور انہوں نے ایسا ہی کیا تھا۔

☆☆☆

پہلی سمت:

اس کے سامنے ایک سرسبز جنگل تھا جس کا سارا فرش گرین کارپٹ سے ڈھکا ہوا تھا۔ قالین کے نیچے زمین ناہموار تھی۔ لہروں کی صورت میں کہیں اس کی بلندی بڑھتے بڑھتے نشیب میں ڈھلنے لگتی تھی، کبھی دائیں جانب تو کبھی بائیں جانب۔ یہ چھوٹے بڑے ٹیلے دور تک پھیلے ہوئے تھے اور ان میں اگے ہوئے چیڑ اور یوکلپٹس کے بلند و بالا درخت تھے جو بارش میں اپنی مہکار چھوڑتے تھے۔

پہلے وہ خودرو پھول جمع کرتا گیا۔ ان کے ان گنت رنگ تھے اور انداز تھے۔ کہیں یہ بالکل ننھے منے تھے۔ چنے کی دال کے دانے سے بھی چھوٹے۔ تو ان کے ساتھ سورج مکھی کے ایک بالشت سے بھی چوڑے دھوپ میں جگمگاتے زرد پھول تھے... وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کے ہر پھول کے ساتھ پتیوں کی بناوٹ پر غور کر کے حیران ہوتا رہا۔

اچانک اس کی توجہ پرندوں یا کیڑے مکوڑوں کی طرف ہو جاتی تھی جو ہر جگہ پھدک رہے تھے یا اپنی مختصر نچی پرواز سے پودوں کو سونگھتے پھر رہے تھے۔ ایک تتلی کے پیچھے وہ نہ جانے کدھر نکل گیا... اچانک اس کے سامنے وہ مصروف سڑک آ گئی جو اسلام آباد ہائی وے کہلاتی تھی تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ کتنی دور غلط سمت میں نکل آیا ہے۔

حسب توقع شام کے لیکچر کا دیباچہ ماں نے شروع کیا۔ "آ گئے ہو لوٹ کے گھر بیٹا... اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے مجھے۔"

"وہ... ماما... وقت کا خیال ہی نہیں رہا مجھے..." اس نے منمنا کے کہا۔

"ہاں... گھڑی جو تمہارے ہاتھ پر بندھی ہے، اتنی قیمتی... وہ تو وقت بتاتی ہی نہیں۔" ماں نے طنز سے کہا۔

"آئی ایم سوری مما۔"

"مجھے سوری کہنے سے کیا ہوگا۔ اپنے پاپا کو کیا کہو گے۔ معلوم ہے وہ کتنا غصہ کر گئے ہیں۔ ایک گھنٹے تمہارا انتظار کرتے رہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا آخر تمہارا مسئلہ کیا ہے...؟"

اس نے زیرلب دُہرایا۔ "مسئلہ... یہ تو مجھے بھی سمجھ نہیں آتا... آخر پاپا کا مسئلہ کیا ہے۔"

"کیا...؟" مما کا منہ دکھ اور حیرانی سے کھلا رہ گیا۔ "حیدر... کیا مطلب ہے آخر اس فضول بات کا۔"

وہ چونکا۔ "مطلب کچھ نہیں مما... سارا جھگڑا تو مطلب کا ہے۔"

"حیدر... تمہیں پتا ہے تم کیا کہہ رہے ہو۔" مما نے بگڑ کے پوچھا۔

"نہیں مما... بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ... کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔" حیدر بولا اور پلٹ کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

باپ نے شام کو سخت تشویش کا اظہار کیا۔ "غالب کا شعر پڑھا اس نے تمہارے سوال کے جواب میں... تمہیں کیسے معلوم۔"

"آپ بھی حد کرتے ہیں... میں نے اردو میں ایم اے کیا تھا اور پھر یہ شعر تو میٹرک کے اردو نصاب میں ہے۔"

ڈاکٹر سجاد علی شاہ بہ دستور متفکر رہے۔ "اور تم نے خود دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں دیوانِ غالب تھا۔ آخر یہ لڑکا کدھر جا رہا ہے...؟"

"دیوان غالب کسی کو ڈاکٹر بننے سے روکتا نہیں۔"

"کمال کرتی ہو تاجور... اگر ابھی سے وہ اس شعر وشاعری اور ادب وغیرہ کے چکر میں پڑ گیا تو سمجھو گیا کام سے۔" سجاد نے چائے کا مگ دھڑ سے میز پر رکھا۔

"آخر ایسا کیوں سمجھتے ہیں آپ کہ دنیا میں صرف ڈاکٹری ایک پیشہ ہے... اور ادیب، شاعر، افسانہ نگار... ان کو تعلیم یافتہ میں شمار نہیں کیا جاتا۔ ان کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔"

"دیکھو... دیکھو... تم نے پھر وہی پرانی بحث چھیڑ دی۔ اب تم نام لو گی فیض کا اور اقبال کا۔ اور کون ہیں وہ... قاسمی صاحب... پاکستان میں کتنے ہیں فیض اور اقبال۔"

تاجور نے آہ بھری۔ "اب آپ کو معلوم ہی نہیں تو میں کیا کہوں۔"

"معلوم کیسے نہیں۔ علامہ اقبال کا مکان دیکھا ہے میں نے۔ سیالکوٹ والا بھی اور گڑھی شاہو والا بھی۔ کون سی جائداد چھوڑی انہوں نے اولاد کے لیے۔ بیٹے نوکری نہ کرتے تو کیا کرتے۔ اور فیض... کتنی بار تو جیل گئے... ملک سے فرار ہوئے... مجرموں کی طرح۔"

"آپ کے نزدیک ڈاکو اور منشیات فروش زیادہ عزت دار ہیں کیونکہ ان کے پاس زیادہ دولت ہے۔" وہ تلخی سے بولی۔

"تاجور... خالی عزت آج کل پیٹ نہیں بھرتی۔ میں نے دیکھا ہے بڑے نام والے شاعروں ادیبوں کو، بس میں لنک کرنٹی وی اسٹیشن جاتے۔ جہاں کسی مشاعرے میں ہر شعر پر ہونے والی واہ، واہ تو کیمرا ساری دنیا کو دکھا دیتا ہے۔ بعد میں انہیں آدھی رات کو حقیر سی رقم کا چیک سنبھال کر جوتیاں چٹخاتے گھر جاتے کوئی نہیں دیکھتا۔ یہاں برگلی میں دس شاعر اور بیس ادیب پڑے ہیں۔ کوئی نہیں پوچھتا انہیں۔"

"یہ تو خیر ٹھیک ہے... مگر حیدر کے ساتھ زبردستی تو نہیں کی جا سکتی۔"

"کی جا سکتی ہے... ایک بچے کو کیا معلوم اس کا فائدہ کس میں ہے... وہ تباہی کے راستے پر جا رہا ہو..." تاجور نے تڑخ کے کہا۔ "کیا مطلب... میں نے

www.pdfbooksfree.pk

اردو ادب میں ایم اے کیا تو میں تباہ ہوگئی۔"

"تمہاری اور بات ہے... تم عورت ہو۔ صرف شوق کی خاطر کچھ بھی کرسکتی ہو۔ تمہیں کسی فیملی کو سپورٹ نہیں کرنا ہے۔ تم ستار بجاؤ... مصوری کرو... شاعری لکھو... تم سارے شوق افورڈ کرسکتی ہو کیونکہ تم مسز سجاد علی شاہ ہو۔ بے شک میں کوئی بہت بڑا اسپیشلسٹ نہیں بن سکا اپنے بھائیوں کی طرح... لیکن ڈاکٹر تو ہوں... اور اچھا خاصا کما لیتا ہوں..."

"واہ... بیوی کو اجازت ہے... لیکن بیٹے کو اپنا کوئی شوق پورا کرنے کی اجازت نہیں۔" اس نے تلخی سے کہا۔

"ابھی نہیں... اسے پہلے باپ کی طرح بلکہ باپ سے بھی بڑا سرجن بننا ہے... بیٹے ہی باپ کے نام کو آگے لے جاتے ہیں۔"

"اور وہ اتنا بڑا ادیب بن جائے کہ لوگ آپ کو اس کے نام سے جانیں... یہ آپ کو منظور نہیں۔"

"تاجور تمہاری یہی عادتیں اسے شہ دے رہی ہیں۔ بگاڑ رہی ہیں۔ تم میرے ارادوں کی راہ میں حائل ہونے لگی ہو۔ اس کی اجازت میں ہرگز نہیں دوں گا..." سجاد علی شاہ نے سخت لہجہ اختیار کرلیا۔ "جاؤ اسے میرے پاس بھیجو۔"

تاجور اٹھی۔ "سرجن سجاد علی شاہ... کیا کرو گے تم اگر بیٹے میں ماں کے جینز (GENES) غالب ہوئے۔ کیا تم جینز کو شکست دے سکتے ہو؟ اس کی شخصیت کا جینٹک پیٹرن اپنی سرجری سے بدل سکتے ہو یا دنیا میں کوئی ایسی دوا ایجاد ہوئی ہے جس سے یہ ہو سکے؟ کسی بچے کو صادقین یا جہانگیر خان بننے سے روکا جاسکے یا مہدی حسن نہ بننے دیا جائے۔"

سجاد علی شاہ نے اپنی بیوی کو لان کراس کر کے گھر میں غائب ہوتے دیکھتا رہا۔ تاجور کے سوال نے اسے کسی حد تک خوفزدہ کردیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ناممکن ہے۔ ایسی ان گنت مثالیں تھیں کہ غریب گھروں اور گمنام دیہات میں پیدا ہونے والے بچوں کا نام ساری دنیا نے جانا اور مانا... اگر وہ اپنی سیدھی سادی بی اے فیل تاجور سلطانہ کو اردو ادب میں ایم اے نہ کرنے دیتا اور اسے شوقیہ افسانہ نگاری کی اجازت نہ دیتا اور اس کی کہانیاں ملک بھر کی عورتوں کے ڈائجسٹوں میں دھوم نہ مچاتیں... تب بھی فرق نہ پڑتا۔

تاجور کا باپ خاصا نامور شاعر تھا۔ تمام پڑھے لکھے لوگ اس کا نام جانتے تھے اور اس کی عزت بھی کرتے تھے لیکن وہ دو کمروں کے سرکاری کوارٹر میں رہتا تھا جس کے سامنے گٹر ابلتے تھے اور وہ باہر لگے ہوئے نلکے پر قطار میں بالٹی لے کر کھڑا نظر آتا تھا اور ہر ایک سے اس کی روز گالی گلوچ ہوجاتی تھی کیونکہ اسے پانی لانے میں دیر ہوتی تھی تو وہ دیر سے آفس پہنچتا تھا جہاں وہ ایک معمولی کلرک تھا جسے ہر افسر بے عزت کرسکتا تھا۔

کلرک تو سجاد علی کا اپنا باپ بھی تھا لیکن اس کا تکمہ انتہائی زرخیز اور سجاد کا باپ پیدا گیری میں بہت بڑا فنکار تھا۔ ویسے تو لنکا میں جو تھا سو باون گز کا... اپنی اپنی نیت، ہمت اور قسمت کے مطابق سب ہی مال بنانے میں مصروف تھے مگر شکار کو تاڑنے... پھانسنے اور پیسا پیسا نچوڑنے کے فن میں اس کا ذہن کسی جینئس کی طرح کام کرتا تھا۔

شاہ جی بہت پریکٹیکل آدمی تھا۔ کبھی اس کا بڑا بھائی جو آغاز شباب سے ہی مذہبی رجحان رکھنے کے باعث صوفی مشہور ہوگیا تھا اسے سمجھاتا یا انجام سے ڈراتا تھا تو وہ اس کا تمسخر اڑاتا اور الٹا اسے یہ سمجھانے لگتا کہ اس کی سوچ کتنی غلط ہے۔ "صوفی صاحب... کام میں نہیں کروں گا تو کوئی اور کرے گا۔ میرے حصے کا مال کوئی اور سمیٹ کر لے جائے گا۔"

"پکڑا بھی تو وہی جائے گا شاہ جی..."

"رہنے دو بھائی... پکڑا وہ جاتا ہے جو اکیلا کھانے کی کوشش کرے۔ مل بانٹ کر کھانے والے سب ایک دوسرے کو بچاتے ہیں۔ پنجابی میں کہتے ہیں نا... لکھ دی چوری تے لکھ دی چوری برابر... ایک پیسا چرانے والے کو عمر قید ہوجاتی ہے... بلکہ کرا دی جاتی ہے... ایک لاکھ کی ڈکیتی کرنے والا صاف بچ جاتا ہے... پوچھو کیسے..."

صوفی نے افسوس سے سر ہلایا۔ "یہ بھی تم ہی بتا دو۔"

"رشوت دے کر صوفی صاحب اور کیسے۔ وہ کسی شاعر نے کہا ہے نا... لے کے رشوت پھنس گیا ہے، دے کے رشوت چھوٹ جا۔ ایک روپیہ چرانے والا کیا خاک رشوت دے گا۔ جس کے پاس ایک لاکھ ہوں، وہ دے سکتا ہے... چور سے ڈاکو بھلا۔"

"لاحول ولا قوۃ... حرام کھانے میں کیا مقابلہ اور کیسی بڑائی۔"

"میرے بھائی... کیا تم اخبار نہیں پڑھتے؟ یہاں کیا ہو رہا ہے... اربوں کا قرض لینے والوں کے قرضے معاف ہوجاتے ہیں۔ جو تمہارے جیسا کلرک اپنے اور بیوی بچوں کے سر چھپانے کے لیے حکومت سے تھوڑا سا قرض لے اور تنگ دستی کے باعث ادا نہ کرپائے... اس کے مکان کی قرقی نیلامی ہوجاتی ہے... بھوکے بچوں کو روتا دیکھ کر آٹے کا ایک تھیلا چرانے والا پکڑا جاتا ہے۔ سرکاری گودام سے لاکھوں

ٹن اسمگل کردینے والے وزیر ہوتے ہیں۔"

صوفی بڑا بھائی تھا اور ایسی کوئی دلیل اس کے ایمان کو کمزور نہیں کرسکتی تھی۔ "اللہ تجھے ہدایت ہے... برا وقت کہہ کے نہیں آتا شاہ جی۔"

سجاد علی کو آج اپنا باپ یاد آرہا تھا۔

☆☆☆

ہاتھی کے لیے مشہور ہے کہ اسے اور کوئی چاہے نہ گرائے مگر ایک چیونٹی گرا دیتی ہے۔

شاہ جی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اپنی دانست میں اس نے ایک ایسے ضرورت مند کو پھانسا تھا جس سے لمبی رقم اینٹھی جاسکتی تھی۔ وہ شکل سے بھی بہت مصیبت زدہ، رنجور اور بے کس لگتا تھا۔ انتہائی بے وقوف اور بے ضرر۔ اس نے شاہ جی سے کام کرانے کے لیے اس کی ہر بات مانی۔ ہر کام کے پیسے دیے۔ وہ کچھ جھکی ضرور تھا۔ سوال بہت کرتا تھا اور گھبراتا بہت تھا۔ شاہ جی ایسے تو نہیں ہوجائے گا... ویسے تو نہیں ہوجائے گا... پیسے دینے کے لیے بھی اس کو کبھی کہیں بلاتا تھا کبھی کہیں... اس نے بڑی اچھی ایکٹنگ کی اور شاہ جی کو پتا ہی نہیں چلنے دیا کہ وہ ایک صحافی ہے اور بڑی خاموشی سے سارے ثبوت اکٹھے کرتا جا رہا ہے۔ اس نے ساری گفتگو ریکارڈ کی اور سارے سودے کی فلم بھی بنالی پھر اس نے پوری اسٹوری اخبار میں چھاپ دی۔

شاہ جی نے دفتر جا کے اخبار دیکھا جب اس کے افسر اعلیٰ نے اسے اپنے کمرے میں بلا کے کہا۔ "شاہ جی... مروا دیا نا ہمیں بھی۔"

"کیا ہوگیا سر..." اس نے ہمیشہ کی طرح اطمینان سے کہا۔

"یہ دیکھو۔" افسر اعلیٰ نے اخبار اس کے سامنے رکھ دیا۔

اس نے کرسی پر بیٹھ کے اخبار پڑھا اور پریشان بھی ہوا لیکن اس نے اپنی پریشانی ظاہر نہیں ہونے دی۔ "ماں کا یار... استادوں کے ساتھ استادی کر گیا... مگر فکر کی کوئی بات نہیں۔"

"شاہ جی۔ میرے پاس ڈی جی صاحب کا فون آچکا ہے۔ فکرمند تھے کہ سیکریٹری نے پوچھا تو کیا جواب دیں گے۔"

شاہ جی نے اخبار رکھ دیا۔ "آپ یوں کریں سر... میری معطلی کے احکامات جاری کردیں۔ اور ڈی جی صاحب سے کہیں وزیر صاحب کے پریس سیکریٹری کو بتادیں۔ ڈی جی صاحب چاہیں تو ایک انکوائری بٹھادیں۔ کچھ دن میں معاملہ دب جائے گا۔"

"کیسے دب جائے گا۔"

"سر... میں خوب جانتا ہوں ایسے صحافیوں کو... کتا آخر کیوں بھونکتا ہے... اس کے سامنے ہڈی ڈال دو... بھونکنا بھول جائے گا... اس صحافی کے ناجائز نطفے سے میں بات کرلوں گا... وہ خود تردید شائع نہ کرائے تو آپ میرا نام بدل دینا۔ یہ سارے بلیک میلر ہیں۔ سب کی ایک قیمت ہے... اگر یہ کچھ زیادہ لے گا... دے دیں گے۔"

لیکن شاہ جی کی بدقسمتی کہ اسی دن اخبار کی خبر پر خود سپریم کورٹ نے "سوموٹو" ایکشن لے لیا اور اعلیٰ حکام کو عدالت میں طلب کرلیا گیا۔ شاہ جی کی گرفتاری ناگزیر تھی، تاہم وہ گھبرایا ہوا نہیں تھا۔ ڈی جی اور محکمے کے سیکریٹری نے ملزم کو عدالت عالیہ میں پیش کیا اور تفتیش کے بعد رپورٹ کے لیے مہلت مانگی لیکن یہ معاملہ قانونی الٹ پھیر کا نہیں تھا۔ عدالت عالیہ نے صرف دو دن دیے۔

ملزم کو تفتیش کے لیے پولیس کے حوالے کردیا گیا۔ تھانے میں شاہ جی کے ساتھ تمام کارروائی قانون کے مطابق ہوئی۔ تمام ثبوت اس صحافی نے عدالت کے سامنے رکھ دیے تھے۔ شاہ جی کے لیے انکار کی گنجائش ہی نہ تھی۔ اسے سات سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ دیگر شریک جرم لوگوں میں سے کوئی سال بھر کے لیے اندر ہوا تو کوئی چھ مہینے کے لیے۔ اس کے افسر اعلیٰ کو برطرفی کی سزا ملی۔

گرفتاری کے بعد شاہ جی نے پیسا پانی کی طرح بہایا تھا اور اسے یقین تھا کہ بڑے وکیل ہوں گے تو اسے تمام الزامات کی دلدل سے یوں نکال لیں گے جیسے مکھن سے بال نکالتے ہیں۔ تھانے میں تفتیش کے دوران بھی اس پر وہ سختی نہیں ہوئی جو عام طور پر روا رکھی جاتی ہے۔ تھانہ انچارج ہوشیار آدمی تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ اس کیس میں شاہ جی کا اندر ہوجانا یقینی ہے چنانچہ اس سے جو لینا ہے آج لے لو۔

شاہ جی نے دو بڑے وکیل کیے جن کا بڑا نام تھا۔ ان کی فیس سن کے اسے پسینا آگیا تھا لیکن اس نے یہ سوچ کر ادا کردی کہ رہائی کے بعد مجھے پھر بحال کیا جائے گا تو سال دو سال میں سارا خسارہ پورا ہوجائے گا لیکن ایسا نہ ہوا تو زندگی میں پہلی بار شاہ جی کی نیند، بھوک اڑ گئی اور مستقبل اس کے سامنے ایک اندھے تاریک غار کی طرح آیا جس میں وہ گر چکا تھا۔ سپریم کورٹ کے فیصلے کے خلاف نظر ثانی کی درخواست سے اسے مزید نقصان ہوا۔ اس کی وہ دولت جسے وہ قارون کے خزانے سے زیادہ سمجھتا تھا ناقابل اعتبار حد

www.pdfbooksfree.pk

تک کم ہوگئی۔

اسے جیل میں سات سال گزارنے کے لیے، جو درحقیقت تین سال ہی ہوتے، اپنے لیے آسانیاں خریدنا تھیں۔ قید بامشقت کاٹنے والے ہر قیدی کو جیل میں گھر جیسا آرام بھی فراہم کردیا جاتا ہے لیکن اسے ہر سہولت کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ آرام دہ بستر، خدمت گار، گھر کا کھانا، ہر روز ملاقات، چائے سگریٹ، موبائل فون اور ٹی وی۔ کبھی کبھار بیوی کے ساتھ خلوت... سب کی قیمت مقرر ہے۔ پیسا نہیں تو کچھ نہیں۔ باہر آپ ہوں گے بڑے معزز اور معتبر۔ یہاں آپ کے لیے ہر مشقت ہے۔ ذلت ہے اور عذاب ہی عذاب ہے جس کی نہ حد ہے نہ حساب۔

شاہ جی نے بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی۔ شاید زندگی میں اس نے یہی ایک اچھا کام کیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ جو چیز ہمیں اپنی بدقسمتی سے نہیں ملی اس سے ہمارے بچے کیوں محروم رہیں۔ ہم نے پیسا کمایا... وہ عزت بھی کمائیں۔ اس کے تین بیٹوں نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی۔ اس نے انہیں اپنی اپنی پسند کی فیلڈ میں اسپیشلائز کرنے کے لیے باہر بھی بھیجا۔ وہ ایسے گئے کہ لوٹ کر نہیں آئے۔ انہوں نے وہیں شادیاں کرلیں اور ملازمت بھی۔ شاہ جی کو اس کا کوئی رنج نہیں تھا۔ وہ فخر سے ہر ایک کو بتاتا تھا کہ اس کے دو بیٹے کتنے بڑے ڈاکٹر ہیں اور برطانیہ میں سیٹل ہو چکے ہیں۔ وہ بھی ریٹائرمنٹ کے بعد لندن میں رہائش اختیار کرلے گا۔ اور لوگ اس کی قسمت پر رشک کرتے تھے۔

تیسرا بیٹا ارشاد تھا جو اس کی امیدوں پر پورا نہیں اترا۔ معلوم نہیں کیسے وہ اپنے دوسرے بھائیوں سے مختلف رہا۔ شروع سے اس کا دھیان پڑھائی لکھائی کی طرف نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے میٹرک کیا اور آوارہ گرد ہوگیا۔ مجبوراً باپ نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ قدرت کی طرف سے اس کو طبع موزوں عطا ہوئی تھی۔ ایک شاعر کی حیثیت سے اسے ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا لیکن گھر سے اس کا رابطہ ختم ہوتا گیا۔ وہ ہفتوں کے لیے غائب ہوجاتا تھا۔ پھر پتا چلا کہ وہ نشہ کرنے لگا ہے۔ ایک بار وہ گھر آیا تو ماں اسے نہ پہچان سکی۔ اس کے بڑے بڑے بالوں میں دھول مٹی تھی اور وہ الجھ کے کسی پرندے کا گھونسلا نظر آرہے تھے۔ شیو نہ کرنے سے اس کے چہرے پر جھاڑ جھنکاڑ ڈاڑھی اگ آئی تھی۔ اس کے کپڑے میلے اور تار تار تھے۔ ماں نے دستک پر دروازہ کھول کے اسے دیکھا اور ''بابا معاف کرو'' کہہ کے بند کرنے ہی والی تھی کہ اس نے کہا ''ماں!'' اور ماں بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ یہ شاہ جی پر کیس بننے سے کچھ ہی دن پہلے کی بات تھی۔

شاہ جی گھر آیا تو اس نے ایک دیوانے مجذوب کو فرش پر بیٹھ کے وحشیوں کی طرح کھانا کھاتے دیکھا۔ اس کی بیوی سامنے بیٹھی اپنی محبت اس پر نچھاور کررہی تھی اور دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھتی جارہی تھی۔

شاہ جی بگڑ گیا۔ ''یہ تم کیا کررہی ہو۔ کون ہے یہ...؟''

بیوی نے کہا۔ ''اپنا ارشاد ہے جی۔''

''ارشاد؟'' شاہ جی کے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ ''یہ پاگل... ہیروئنچی، آوارہ گرد، یہ میرا بیٹا نہیں ہوسکتا۔ یہ میرے گھر میں رہے گا تو ناک کٹ جائے گی میری۔ لوگ کیا کہیں گے۔''

ارشاد اٹھ کھڑا ہوا۔ ''گالی گلوچ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم خود چلے جاتے ہیں آپ کے گھر سے۔ آپ اپنی ناک سنبھالیں... اب رہی لوگوں کی بات تو ہم جانتے ہیں وہ آپ کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ کون سی بنیادوں پر کھڑا ہے آپ کی عزت کا یہ قطب مینار...''

اس کے جانے کے تیسرے دن شاہ جی نے ارشاد کی تصویر کے ساتھ ایک عاق نامہ اخبار میں شائع کرادیا۔ چوتھے دن کے اخبار میں وہ خبر شائع ہوگئی جس نے اس کی جھوٹی عزت کے قطب مینار کو زمیں بوس کردیا۔ حرام کی دولت کی جن بنیادوں کی طرف ارشاد نے اشارہ کیا تھا وہ اس کی عزت نہ بچاسکیں۔

ارشاد کے اس دور ابتلا میں لوٹ کر آنے اور حق فرزندگی ادا کرنے کا کوئی سوال نہ تھا۔ شاہ جی کو امید تھی کہ لندن میں اس کے بیٹوں کو پتا چلے گا تو وہ ضرور آئیں گے۔ ماں نے فون کرکے ان سے کہہ دیا تھا کہ تمہارے باپ کو کچھ دشمنوں نے جھوٹی سازش سے مقدمے میں الجھا دیا ہے لیکن وہ نہیں آئے اور مصروفیت کا عذر پیش کرتے رہے، یہاں سے آنا اتنا آسان نہیں ہوتا ماں... چھٹی نہیں ملتی۔ گھر آنے میں بہت پیسے خرچ ہوتے ہیں۔ بچوں کے امتحان چل رہے ہیں۔ بیوی بیمار ہے، ان کے پاس بہانوں کی کمی نہ تھی۔ آخر میں انہوں نے صاف کہا کہ ہم آکے کیا کریں گے۔ اتنے بڑے نام والے وکیل ہیں نا... پاکستان میں پیسا چلتا ہے اور وہ ان کے پاس بہت ہے۔

بیٹوں کے اس رویے نے سجاد علی کی بیوی کو بہت مایوس کیا۔ اس نے سمجھ لیا کہ سات سمندر پار گوریوں کے ساتھ بس جانے والے سپوت اب کبھی لوٹ کے گھر نہیں

آئیں گے اور اس اعتبار سے ان میں اور عاق کردیے جانے والے بیٹے میں کوئی خاص فرق باقی نہیں رہ گیا... تاہم اس نے یہ بات اپنے شوہر سے چھپالی۔ ان دنوں ویسے ہی اس کا ستارہ گردش میں تھا اور بڑے نام والے وکیل بھی اس کے کیس میں مایوسی کا اظہار کرچکے تھے۔

جب شاہ جی جیل چلا گیا تو گھر پر اس کی بیوی جو چار جوان بیٹوں کے ناتے بڑی خوش نصیب سمجھی جاتی تھی، اکیلی رہ گئی۔ خوش نصیبی اچانک اس گھر سے روٹھ گئی تھی اور اس کی جگہ نحوست نے ڈیرے ڈال لیے تھے۔ جن ڈاکٹر بن جانے اور پھر ولایت جانے والے بیٹوں پر اسے ناز تھا وہ جیسے کسی حادثے میں بچھڑ گئے... (بعد میں شاہ جی نے کہا کہ ہمارے لیے تو مر گئے) تیسرے کو انہوں نے خود نکال دیا۔ وہ رہتا تو کون سا سکھ دیتا۔

☆☆☆

اس وقت سجاد نے لندن پہنچ کے نیا داخلہ لیا تھا اور ہنوز اس کی رہائش کا مسئلہ بھی حل نہیں ہوا تھا۔ دونوں بڑے بھائیوں نے اسے صاف بتادیا تھا کہ یہ پاکستان نہیں ہے جہاں پورے پورے خاندان بن بلائے وارد ہوجائیں اور میزبان کے گھر کو اپنا گھر سمجھ کے جمے رہیں۔ یہاں چھوٹے چھوٹے گھروں کے کرائے بہت زیادہ تھے۔ ان میں اتنی گنجائش ہی نہیں ہوتی تھی کہ ماں باپ یا بھائی بہن کو بھی ساتھ رکھا جاسکے۔

اصل بات یہ تھی کہ گھر نہیں دل چھوٹے تھے چنانچہ جگہ نہیں نکلتی تھی۔ یہی لوگ پاکستان میں ہوتے تو ایک کمرے کے فلیٹ میں سب کے ساتھ رہتے۔ سجاد علی کو اس طرف سے بھی مایوسی ہوئی۔ پھر اس نے الگ رہائش کے لیے مزید پیسے منگوائے تو ماں نے الٹا اس سے مطالبہ کردیا کہ وہ واپس آجائے۔ وہ اکیلی ہے اور اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں۔ ہائی بلڈ پریشر کے ساتھ اسے شوگر کا پرانا عارضہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں موتیا اتر آیا تھا لیکن شوگر کنٹرول ہونے تک ڈاکٹر آپریشن کے لیے تیار نہ تھا۔

سجاد علی چھوٹا ہونے کے سبب ماں کا لاڈلا رہا تھا۔ اسے واپس آنا پڑا۔ ماں نے کہا تھا کہ اسپیشلسٹ نہ سہی وہ ڈاکٹر تو ہے۔ ابھی اپنی پریکٹس کرے... پھر یہیں سے اسپیشلائز کرلے... سجاد نے اس تجویز پر مجبوری میں کمپرومائز کرلیا۔ تب تک اسے بالکل اندازہ نہ تھا کہ مالی طور پر بھی اس کے گھر کے حالات بگڑ چکے ہیں۔

واپس آنے کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ اب ایک کوٹھی کے سوا کچھ نہیں رہا۔ وہ خزانہ خالی ہوچکا ہے جس پر انہیں گمان تھا کہ ہمیشہ بھرا رہے گا۔ ڈیم کی طرح جس میں پیچھے سے آنے والا پانی شامل ہوتا رہتا ہے مگر موسم بدلتے ہیں تو دریا بھی سوکھ جاتے ہیں۔

سجاد اپنی ماں کے ساتھ جیل گیا تو باپ کا مزاج سخت برہم تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو ایک لفافہ دیا... یہ اسے جیلر کی معرفت ملا تھا اور اس پر نام کے ساتھ قیدی نمبر بھی لکھا ہوا تھا۔

''یہ تمہارے ہونہار سپوت شاعر اعظم ارشاد علی ارشاد نے لکھا ہے۔'' شاہ جی نے کہا۔

اس نے لکھا تھا۔

''محترم ومکرم والد صاحب۔ السلام علیکم!

میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اپنے دام فرزندی سے آزاد کیا۔ اس طرح آپ پر میری تربیت و پرورش کی دنیاوی و دینی ذمے داری کا سلسلہ ختم ہوا۔ دوسری طرف مجھ پر بھی آپ کے اس احسان کے بدلے ہر قسم کی اخلاقی ذمے داری کا بار نہیں رہا اور ہمارے درمیان رشتوں کی مجبوری نہیں رہی جس نے ہم دونوں کو مشکل میں ڈال رکھا تھا۔ نہ میری شہرت سے آپ کو طمانیت مل رہی تھی اور نہ آپ کی دولت سے مجھے عزت۔ اگرچہ قانونی طور پر اس اعلان کی کوئی حیثیت نہیں جو آپ نے اخبار میں شائع کرایا ہے لیکن میں تو آپ کی جائداد منقولہ وغیر منقولہ سے دستبرداری بہتر سمجھتا ہوں۔ آپ کو نہ سہی مجھے اپنی عاقبت عزیز ہے۔ فقط السلام۔

آپ کا سب سے زیادہ نالائق بیٹا

ارشاد۔''

''تم نے دیکھا... اس حرامزادے نے ایسے پلٹ کے پتھر مارا ہے مجھے... ایسے وقت میں۔''

اس کی بیوی نے کہا۔ ''جانے بھی دو... عاق نامہ بھی تو تم ہی نے شائع کرایا تھا۔'' اس کی بیوی بولی۔ ''اور باقی دو نے کون سا حق فرزندی ادا کردیا جو تم ایک کو رو رہے ہو۔ یہ ہمارے نصیب کی سزا ہے۔''

شاہ جی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو، چلو چھوڑو... یہ بتاؤ... وہ چیک کیش ہوگیا...؟''

بیوی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بینک والوں نے کہا ہے کہ پیسے کم ہیں چیک واپس کردیا۔''

''کیا مطلب؟ بینک میں پانچ لاکھ بھی نہیں بچے۔''

اب سجاد بولا۔ ''اس کا اندازہ تو آپ کو ہونا چاہیے لیکن

www.pdfbooksfree.pk

میں نے معلوم کیا تھا... بینک میں دولاکھ اسی ہزار ہیں۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے..." شاہ جی بولا۔

"میں اسٹیٹمنٹ لے آیا ہوں۔" سجاد نے ایک کاغذ آگے بڑھا دیا۔

شاہ جی نے اسے بڑے غور سے دیکھا۔ اس میں ہر چیک کی تفصیل تھی اور اسے یاد آتا گیا۔ یہ پہلے وکیل کا ایڈوانس، یہ دوسرے کا، یہ تھانے دار کو دی گئی رشوت۔ یہ فلاں کو، یہ فلاں کو۔ پہلے وکیل کی ادائیگی، پھر دوسرے وکیل کی۔

شاہ جی کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا۔

"اگر میں نے یہاں پیسا نہ کھلایا تو یہ میرے ساتھ بہت برا سلوک کریں گے۔"

"اگر باقی سب انہیں دے دیا تو ہمارا کیا بنے گا۔ جب تمہاری اولاد ہی کچھ دینے پر راضی نہیں تو اور کون دے گا۔" اس کی بیوی نے کہا۔

سجاد نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ "اب صرف ایک ہی صورت ہے ابا۔ ہم کوٹھی بیچ دیں گے۔"

"کوٹھی بیچ کے خود کہاں رہو گے؟"

"کرائے کے کسی چھوٹے سے مکان میں... ہم گاڑی بھی افورڈ نہیں کرسکتے۔ مجھے اپنے لیے کلینک کا بندوبست کرنا ہے۔ ایک موقعے کی جگہ ہے، آدھی رقم اس میں نکل جائے گی لیکن اس طرح آمدنی کی ایک صورت پیدا ہوجائے گی۔ میں نے ایک پرائیویٹ اسپتال میں نوکری کے لیے درخواست دی ہے۔"

شاہ جی چپ چاپ سنتا رہا۔ اب اس کے اختیار میں کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ اسے اندازہ نہ تھا کہ قدرت کی سزا اتنی جلدی شروع ہوجائے گی۔ دیکھتے دیکھتے معاملات اس کے ہاتھ سے نکل جائیں گے اور وہ عرش سے فرش پر آگرے گا۔

سجاد نے دن رات ایک کردیا لیکن پرائیویٹ اسپتال میں جہاں وہ نائٹ ڈیوٹی دیتا تھا تنخواہ بہت کم تھی۔ عام طور پر رات کے وقت اسے فراغت رہتی تھی اور وہ آر ایم او کے کمرے میں سوتا رہتا تھا یا ایک دو بار نرس اسے جگا کے کسی مریض کی حالت کے بارے میں آگاہ کرتی تھی تو وہ اسے دیکھ لیتا تھا۔ وہاں سارے کیس اسپیشلسٹ دیکھتے تھے۔ سجاد کو کسی مرض کے علاج کا نسخہ بدلنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ صرف وقتی تکلیف دور کرنے کے لیے کوئی دوا دے سکتا تھا۔

وہ اپنا کلینک صبح دس بجے کھولتا تھا اور شام سات بجے اٹھتا تھا تو سیدھا اسپتال چلا جاتا تھا۔ ایک نئے ڈاکٹر کے لیے اپنی پریکٹس جمانا مشکل اور وقت طلب کام تھا مگر سجاد نے اس کاروباری نکتے کو نظر انداز نہیں کیا کہ مریض کی آدھی تکلیف ڈاکٹر کا رویہ دور کردیتا ہے۔ وہ مریض کی بات دھیان سے سنتا تھا اور ان کا نفسیاتی اعتماد حاصل کرنے کی پوری کوشش کرتا تھا کہ دوا جو کرے سو کرے۔ مریض یہ ضرور کہیں کہ ڈاکٹر اچھا ہے... بات بھی ہے۔

آمدنی میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا رہا۔ اس کے باوجود یہ ممکن نہیں تھا کہ جیل میں شاہ جی کو وی آئی پی ٹریٹمنٹ دلانے کا ذریعہ بن سکے۔ جب اس سے ساری مراعات واپس لے لی گئیں تو وہ بڑی اذیت میں مبتلا ہوگیا۔ اس موقعے پر شاہ جی کے بھائی نے ان کے ساتھ رشتہ نبھایا اور جیل حکام کو تھوڑی بہت رقم پہنچاتا رہا۔ اس سے اتنا ہوا کہ شاہ جی کی مشقت ختم ہوگئی۔ اس کی جسمانی سزا اور ذلت سے جان چھوٹ گئی اور اسے مناسب کھانا ملنے لگا۔

عرصۂ دراز سے دونوں بھائیوں کے خاندانوں کی دوری ایک طرح سے لاتعلقی میں ڈھل گئی تھی۔ بڑے بھائی کی حیثیت سے صوفی پہلے شاہ جی کو سمجھاتا تھا لیکن مسلسل بے عزتی وہ کب تک برداشت کرتا۔ ایک فرق ان کے عقائد ونظریات کا تھا لیکن دوسرا زیادہ نمایاں محسوس ہونے والا فرق ان کے سوشل اسٹیٹس کا تھا۔ شاہ جی کی دولت مندی کے مقابلے میں صوفی کی لوئر مڈل کلاس کا اسٹینڈرڈ غریبانہ محسوس ہوتا تھا۔

ان کے تعلقات ختم ہونے کا ایک سبب اور بھی تھا... اگر بھائی کو بھائی کی پروا ہوتی تو شاہ جی اپنے ساتھ بڑے بھائی کو بھی آگے بڑھاتے۔ بے شک وہ حرام کی آمدنی میں سے کسی قسم کی امداد قبول کرنے کا روادار نہ تھا لیکن کوئی کرنا چاہے تو مدد کرنے کے سو طریقے ہیں۔

ایک عجیب اتفاق یہ تھا کہ شاہ جی کو خدا نے چار بیٹے دیے تھے تو صوفی کو چار بیٹیاں عطا کی تھیں۔ شاہ جی کی بیوی بیٹوں پر بہت اتراتی تھی اور بڑے بھائی کی بیوی اس غم میں مری جاتی تھی کہ وہ کوئی بیٹا پیدا نہ کرسکی حالانکہ اس کا شوہر سمجھاتا رہتا تھا کہ بیٹیاں خدا کی رحمت ہوتی ہیں۔ اور بعد میں فی الحقیقت ایسا ہی ثابت ہوا۔

اس کی تین بیٹیوں کے رشتے بہت اچھے گھروں میں ہوئے۔ صوفی نے بیٹیوں کو واجبی تعلیم دلائی تھی۔ پہلی دو نے میٹرک کیا اور پیا گھر سدھار گئیں۔ باقی دو نے بی اے تک پڑھا۔ تیسری بی اے کا رزلٹ آنے سے پہلے ہی رخصت ہوئی۔ دوبار ترقی پانے سے صوفی کے مالی حالات بھی بہتر ہوگئے تھے چنانچہ جب شاہ جی پر مشکل وقت آیا تو بیوی کے

منع کرنے کے باوجود بڑا بھائی اس کی مدد کے لیے پہنچ گیا۔

شاہ جی نے پہلے اس کی مدد کو شکریے کے ساتھ مسترد کردیا تھا۔ اسے خالی ہمدردی کے الفاظ اور دعاؤں کی نہیں پیسے کی ضرورت تھی اور جتنے پیسے کی ضرورت تھی وہ صوفی فراہم نہیں کرسکتا تھا۔ تاہم بعد میں بڑے بھائی نے ہی اسے جیل کے عذاب سے بچایا۔ اس کے اپنے لائق فائق بیٹے تو پیچھے ہٹ گئے تھے۔

سجاد کو سب معلوم تھا۔ اس نے کئی بار سوچا کہ تایا کے گھر چلا جائے لیکن دیورانی جیٹھانی کے تعلقات ہندوستان پاکستان جیسے ہورہنے سے ماں نے اس کی سخت حوصلہ شکنی کی کہ وہاں جائے گا تو ذلیل ہو کے آئے گا۔ "تیرے تایا نے جو کیا اپنے بھائی کے لیے کیا، ہم پر کوئی احسان نہیں کیا۔"

ان حالات میں سال بھر کے اندر اندر بڑے انقلابات رونما ہوئے۔ ایک دن وہ اسپتال پہنچا تو کاؤنٹر پر ایک نئی لڑکی کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔

"تاجور... تم..." اس نے سامنے جا کے کہا۔

"ڈاکٹر سجاد... آپ بھی یہاں ہوتے ہیں۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا۔" وہ خوش دلی سے بولی۔

"مجھے تو سال سے زیادہ ہوگیا۔"

تاجور مسکرائی۔ "کمال ہے... ایک سال مجھے بھی ہوا ہے... مجھ سے پہلے باجی یہاں تھیں۔ جب اس کی شادی ہوئی تو اس نے مجھے یہاں رکھوا دیا۔"

سجاد اسے دیکھتا رہا۔ اس کے حسن میں سادگی کے ساتھ بڑی پرکاری تھی۔ بات کرتے ہوئے اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جھکی رہتی تھیں۔ جب وہ مسکراتی تھی تو نظر اٹھا کے دیکھتی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ مسکراہٹ اس کی آنکھوں میں اتر آئی ہے۔

"آج سے پہلے میں نے تمہیں دیکھا کیوں نہیں...؟" سجاد نے ایسے سوال کیا جیسے قصوروار وہ خود ہے۔

وہ ہنسی۔ "میں صبح کی شفٹ میں تھی۔ دیکھیے پہلے ابا نے باجی کو بھی اسی شرط پر ملازمت کی اجازت دی تھی کہ نائٹ شفٹ نہیں ہوگی... وہ دو سال رہی۔ صبح آٹھ بجے آتی تھیں، رات آٹھ بجے چلی جاتی تھیں۔"

"پھر تم نے نائٹ شفٹ کیسے قبول کی...؟"

"تین سال میں اندازہ ہوگیا کہ اس میں کوئی قباحت نہیں۔ مالک پرانی وضع کے شریف مگر ڈسپلن میں سخت گیر آدمی ہیں۔"

"میں جانتا ہوں... میرے پرنسپل تھے۔"

"ابا کو میں نے راضی کرلیا کہ صرف ایک ہفتے کی تو بات ہے پھر آجائے گی کوئی نئی لڑکی۔ اب ایمرجنسی ہے اور مالکوں نے پہلی بار کہا ہے..... پھر اس میں قباحت بھی کیا ہے۔ دراصل میں چاہتی تو انکار کردیتی اور مالک مجھے مجبور بھی نہ کرتے۔"

"نائٹ ڈیوٹی زیادہ مشکل ہوتی ہے... پھر تم کیوں چاہتی تھیں؟"

"وہ دراصل... میں ایم اے کا امتحان دے رہی ہوں۔ دن میں یونیورسٹی جاتی ہوں۔ باقاعدگی سے نہیں۔" وہ ہنسی۔ "شروع کے ایک دو پیریڈ اکثر نکل جاتے ہیں۔ ہفتے میں ایک دن خود ہی چھٹی کرلیتی ہوں۔ اتنی باقاعدگی سے پڑھائی کہاں ہوتی ہے۔ حاضری لگنی چاہیے۔ پڑھنا خود ہی پڑتا ہے... وہاں سے واپس آکے کھانا کھاتے ہی سوجاتی ہوں۔ اٹھ کے سیدھی یہاں آتی ہوں۔ یہاں رات کی شفٹ میں فراغت ملتی ہے تو کچھ پڑھ لیتی ہوں۔ کچھ سو بھی لیتی ہوں، آدھی رات کے بعد صبح پانچ چھ بجے تک۔ اب ابا ایک بار مان گئے ہیں تو میں آگے بھی منوالوں گی۔ آپ آئیں نا کسی دن ہماری طرف۔"

یہ بات اس نے اتنی اچانک کہہ دی کہ وہ چونک پڑا۔ وہ بڑی محویت کے عالم میں اسے باتیں کرتے دیکھ رہا تھا۔ دیکھ رہا تھا کہ اس کے اطوار میں معصومیت کے ساتھ کتنا اعتماد ہے، کتنی شائستگی ہے۔ اس نے فرسٹ کزن کے طور پر سجاد کے ساتھ بے تکلفی اختیار کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی لیکن یہ اپنایت کا اظہار وہ ہر ایک کے ساتھ کبھی نہ کرتی۔ اس نے سجاد کے ماضی کا کوئی حوالہ نہیں دیا تھا۔ اس کے باپ کی بات نہیں کی تھی۔ کوئی شکایت نہیں کی تھی۔

"آئی ایم سوری۔ اگر آپ آنا نہیں چاہتے تو..."

سجاد نے پھر چونک کے کہا۔ "نہیں نہیں... میں تو سوچ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہوا آخر... ہم پہلے کیوں نہیں ملے۔"

تاجور کے چہرے پر حیا کا رنگ جھلکا۔ ہر لڑکی کی طرح وہ بھی اپنے سرمایۂ حسن کی قدر و قیمت اور اپنی قوت تسخیر سے پوری طرح واقف تھی اور اپنی فطری حیثیت کے باعث اس نے سجاد کی محویت کو بھی نوٹ کرلیا تھا۔ سجاد خود ایک وجیہہ شخصیت کا مالک تھا لیکن تاجور چند لمحوں کی ملاقات میں یہ بات سننے کے لیے تیار نہ تھی۔

سجاد نے فوراً کہا۔ "میرا مطلب تھا... یہ کتنی بدقسمتی کی بات ہے کہ ہمارے دونوں گھرانوں کے درمیان کوئی تعلق نہیں رہا۔ اتنا قریبی رشتہ ہونے کے باوجود... جو...

www.pdfbooksfree.pk

جو ہوا برا ہوا مگر نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ میں صبح تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

وہ چونکی۔ "میرے ساتھ۔"

"ہاں... ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد۔ کیا ہوگا... تمہارے ابا مجھے ڈانٹیں گے... وہ تو میرے ابا کو بھی ڈانٹتے تھے... میں سن لوں گا۔"

تاجور مسکرائی۔ "سنائیں گی تو تمہیں اماں... ایسی کہ دوبارہ ادھر جانے کا نام نہیں لو گے۔"

لیکن تاجور بھی جانتی تھی کہ ایسا نہیں ہوگا۔ سجاد کے لیے تو یہ پہلی نظر میں محبت والا معاملہ بن گیا تھا۔ رشتے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تاجور نے بھی اس کی حوصلہ افزائی کی اور باقی معاملات خود بخود طے ہوتے چلے گئے۔ وہ تاجور کے ساتھ گیا تو تایا نے اسے گلے لگا کے ڈانٹا۔

"نالائق... خود نہیں آسکتا تھا پہلے۔ راستہ بھول گیا تھا تایا کے گھر کا۔" پھر تائی نے اسے آڑے ہاتھوں لیا اور پچھلا سارا حساب برابر کر دیا... لیکن ان کا سارا گلہ اپنی دیورانی سے تھا جس نے اپنوں کے ساتھ غیروں کا سلوک کیا۔

بالآخر وہ ہوا جو نظر آرہا تھا۔ تاجور کی ایک ہفتے کی نائٹ شفٹ مستقل ہوگئی۔ ان کے درمیان فاصلے تیزی سے کم ہوئے اور نہ چاہنے کے باوجود بیٹے کی ضد سے مجبور ہو کے سجاد کی ماں نے تاجور کا رشتہ مانگا... وقت اور حالات بدل گئے تھے۔ رشتہ طے ہوگیا اور یہ بھی کہ شادی اس وقت ہوگی جب تاجور ایم اے کرلے گی اور شاہ جی بھی رہا ہو جائیں گے۔ یہ دونوں کام دو سال کی مہلت مانگتے تھے۔

بڑا بھائی خوش تھا تو چھوٹا شرمندہ اور احسان مند... لیکن تقدیر میں کچھ اور ہی لکھا تھا... اس سے پہلے کہ تاجور بہو بن کے اس کے گھر میں آتی، سجاد کی ماں نے گھر خالی کر دیا۔ وہ دل کی پرانی مریض تھی لیکن علاج اور احتیاط میں اپنے ڈاکٹر بیٹوں کی بھی ایک نہیں سنتی تھی اور اپنی کرتی تھی۔ ایک رات اس نے کہا۔ "آج کچھ زیادہ ہی درد ہو رہا ہے سینے میں اور بازو میں۔" جس کا مطلب یہی نکالا جاسکتا تھا کہ درد ویسے تو ہوتا رہتا ہے... بیٹا اسے اسپتال لے گیا۔ اسے اسٹریچر پر ڈال کے ایمرجنسی میں لے گئے۔ ڈاکٹروں نے دیکھا اور ڈیتھ سرٹیفکیٹ پر لکھ دیا۔ ...DOA جس کا مطلب ہوتا تھا ڈیڈ آن ارائیول... جب اسے لایا گیا تو وہ مر چکی تھی۔ وجہ...؟ ...M.I مائیوکارڈیک انفارکشن... عرف عام میں دل کا دورہ۔

اس کے بعد اپنی زندگی سے متعلق فیصلوں کا اختیار سجاد کے اپنے پاس آگیا۔ یہ رشتہ ہو جانے کے بعد تائی خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی اور ماضی کے سارے گلے شکوے بھول کے اس پر صدقے واری ہو جاتی تھی۔ سجاد کی ماں نہ رہی تو جیسے آخری کانٹا بھی نکل گیا۔ اب صرف باپ تھا جس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ شادی میں سجاد کا اپنا کوئی شریک نہ تھا۔ لندن سے دو بھائیوں نے فون پر مبارکباد دینا کافی سمجھا... ارشاد نہ جانے کہاں تھا۔ وہ بڑا آدمی بنا تھا یا نہیں۔ اس کی سجاد کو خبر نہ تھی مگر وہ بڑا شاعر ضرور بن گیا تھا۔ سجاد نے دو چار مرتبہ اسے ٹی وی پر دیکھا تھا۔ ماں مر گئی تھی اور باپ جیل میں تھا۔ دو سال بعد وہ بھی مر گیا۔

☆☆☆

آج یہ سب سجاد علی شاہ کو اس لیے بھی یاد آیا کہ اس کی ملاقات چند روز قبل اپنے بڑے بھائی ارشاد احمد ارشاد سے ہوگئی تھی... سجاد رات کے وقت اپنے خیالوں میں مگن کسی تقریب سے لوٹ رہا تھا کہ ایک ویران سڑک پر کوئی مجہول شخص اچانک اس کی گاڑی کے سامنے آگیا۔ اس نے بڑی مشکل سے بریک لگا کے گاڑی روکی اور اس دیوانے کو بچالیا مگر اس کوشش میں گاڑی فٹ پاتھ سے ٹکرائی تو اس کا بمپر ٹوٹ گیا اور ایک لائٹ چکنا چور ہوگئی۔

سجاد سخت گرمی کھا کے نکلا تو کھدر کے لمبے کرتے اور جینز کی پرانی پتلون کے ساتھ پھٹی ہوئی چپل میں وہ بڑے بڑے بالوں اور گھنی ڈاڑھی اور مونچھوں والا مجذوب صفت شخص ایک طرف سہما کھڑا تھا...

سجاد اس پر برس پڑا۔ "بے وقوف... پاگل کے بچے... مرنا چاہتے ہو تو جاؤ کسی ٹرین کی پٹری پر لیٹ جاؤ... دوسروں کو مصیبت میں کیوں ڈالتے ہو... میری گاڑی کے نیچے آجاتے تو بھگتنا مجھے پڑتا... اور یہ جو دس ہزار کا نقصان ہوا ہے گاڑی کا... یہ تمہارا باپ پورا کرے گا۔"

وہ سجاد کو عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "کر دیتا منے... اگر وہ جیل نہ جاتا۔"

سجاد بری طرح چونکا کیونکہ اسے مُنا کہنے والا اب کوئی نہیں رہا تھا... وہ سب سے چھوٹا تھا اور ماں اسے مُنا کہہ کے پکارتی تھی... اور آخری وقت تک کہتی رہی... اس کا باپ اور بھائی سب اسے مُنا ہی کہتے تھے حالانکہ بڑا ہونے کے بعد وہ اس سے چڑنے لگا تھا۔

"تو سجاد ہے نا... ڈاکٹر سجاد علی شاہ..."

"بھیّا..." سجاد کی زبان گنگ ہوگئی۔ "یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے اپنی..."

وہ ہنسا۔ "جانے دے مُنا۔ ہم تو دیوانے تھے جو سیانے ہوشیار تھے ان کی کیا حالت ہوئی...؟"

سجاد سمجھ گیا کہ وہ اپنے باپ کی ذلت کا حوالہ دے رہا ہے۔ "چلو میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھو... کہاں سے آرہے ہو اس وقت۔"

"ایک مشاعرے سے... انہوں نے نقد نہیں دیا۔ چیک پکڑا دیا... اپنے پاس اس وقت زہر کھانے کو پیسے نہیں اور بینک بند ہیں۔" اس نے کاغذ کا ایک پُرزہ لہرایا۔ "تو مجھے کچھ پیسے دے سکتا ہے...؟"

سجاد نے پرس میں سے سارے نوٹ نکال کے گنے بغیر اسے تھما دیے۔ "اب کہاں جاؤ گے... چلو میں تمہیں چھوڑ دوں۔"

ارشاد نے شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا... "سب پہلے مجھے چھوڑ چکے ہیں... میں نے بھی سب کو چھوڑ دیا ہے۔"

سجاد اسے سڑک پار کر کے فٹ پاتھ پر اندھیرے میں گم ہوتا دیکھتا رہا... اس نے جان لیا تھا کہ ارشاد نشہ کرتا ہے۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ ہیروئین کا۔ اسے بھائی کی حالت دیکھ کے دکھ ہوا... ایک طرف وہ بھائی تھے جو لندن میں اسی طرح سب سے لاتعلق اپنی زندگی جی رہے تھے، دوسری طرف یہ بھائی تھا... وہ ایک ہی چھت کے نیچے پرورش پانے والے اور ایک ہی ماں باپ کی اولاد تھے۔ ان کے درمیان خون کا وہ رشتہ کیوں نہ رہا جو اس نے دنیا میں سب بھائیوں کے درمیان دیکھا تھا۔

وہ کئی دن ذہنی طور پر ڈسٹرب رہا۔ ارشاد کی اس حالت کا ذمے دار شاعری کو نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اپنی ادبی تخلیقات کا اچھا معاوضہ پانے والے خال خال تھے ورنہ ادیب، شاعر کو صرف عزت ملتی تھی جس سے کسی کا پیٹ نہیں بھرتا... موسیقار اکثریت کے لیے میراثی تھے۔ مصور اور مجسمہ ساز گناہگار تھے لیکن کسی کی وہ حالت نہیں تھی جو ارشاد نے اپنی بنا رکھی تھی۔

حیدر نے اندر آکے اس کے خیالات کے تسلسل کو ختم کر دیا۔ "آپ نے مجھے بلایا پاپا...؟"

سجاد نے گھڑی دیکھی۔ "بلایا تو بہت پہلے تھا... خیر... یہ بتاؤ صبح تم کہاں نکل گئے تھے۔ میں تم کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔"

حیدر نے ہمت کر کے کہا۔ "میں اسپتال نہیں جانا چاہتا۔"

"کیوں...؟"

مجھے وحشت ہوتی ہے سرکاری اسپتالوں میں بیماروں کی حالت دیکھ کر... اور انہیں مرتا دیکھ کر۔"

"فضول باتیں مت کرو... تمہیں اس کا عادی ہونا چاہیے۔ میں تمہیں پریکٹیکل ٹریننگ دینا چاہتا ہوں۔ میرے ساتھ چل کے دیکھو آپریشن کیسے ہوتے ہیں۔ پوسٹ مارٹم کیسے ہوتے ہیں..."

"پاپا... میں ڈاکٹر نہیں بننا چاہتا۔"

سجاد کو شاک لگا۔ "کیا؟ ڈاکٹر نہیں بنو گے... پھر کیا بنو گے؟"

"میں کچھ بھی بن سکتا ہوں۔ پروفیسر، وکیل یا جج... کیا کسی کالج کے پرنسپل یا وائس چانسلر کی یا سپریم کورٹ کے جج کی کم عزت ہوتی ہے؟ اس کے علاوہ مجھے ڈاکٹری سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں جانتا ہوں دادا کی طرح آپ بھی دولت کو کامیابی کا معیار سمجھتے ہیں۔"

سجاد دم بخود رہ گیا۔ اس کا میٹرک میں پڑھنے والا بیٹا اتنی بڑی بڑی باتیں کر رہا تھا۔ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا مگر وہ سجاد کو مایوس کر رہا تھا۔ وہ اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ حیدر ایسا ہی نامور سرجن ہو جیسے ادیب رضوی۔

اس نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ "حیدر... یہ زبردستی ہے تو زبردستی ہی سہی۔ میں تمہیں ڈاکٹر بنانا چاہتا ہوں اور بنا کے چھوڑوں گا۔ ایک دن تم خود مانو گے کہ میں نے کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا تھا۔"

اگلے دن وہ حیدر کو اپنے ساتھ لے گیا اور اس کے بعد ہر ہفتے لے جاتا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ حیدر کے دل میں ڈاکٹری کے لیے رغبت پیدا ہو۔ اسے میڈیکل سائنس کی معجزہ نمائی متاثر کرے۔ خالق کائنات کی سب سے عظیم اور پیچیدہ مخلوق یعنی انسانی جسم کی حیرت ناکی اسے اپنے طلسم میں گرفتار کرلے۔ اور کچھ نہ سہی تو دکھی انسانیت کی حالت اسے یہ پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کر دے۔

لیکن یہ سب کسی طرح نہ ہوا۔ ایک طرح کی ضد نے بھی حیدر کو باپ کے پیشے سے دور کیا۔

اس نے سائنس پڑھنے سے صاف انکار کرتے ہوئے انٹر آرٹس میں داخلہ لیا تھا اور سجاد اب یہ سوچ رہا تھا کہ اسے کون سے منافع بخش پیشے کی طرف لے جائے۔

حیدر یار باش تھا اور خوش پوش بھی۔ وہ اپنی صحت کا بہت خیال رکھتا تھا اور صبح جاگنگ کے لیے جاتا تھا۔ وہاں اس نے ایک لڑکی کو دیکھا جو ایک بنچ پر بیٹھی کچھ پڑھتی یا لکھتی

www.pdfbooksfree.pk

رہتی تھی۔ اسے باغ کی اور موسم کی خوبصورتی سے یا صبح کے وقت کی دلکشی سے بہ ظاہر کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کا دل تو یہی چاہتا تھا کہ وہ اس کو ڈانٹے کہ مس پڑھاکو... ذرا کتاب کی دنیا سے نکل کے اپنے آس پاس کی دنیا کو بھی دیکھو... بے شک یہ دنیا تم سے زیادہ خوبصورت نہیں اور اس دنیا کی خوبصورتی کا ایک سبب تم بھی ہو... مگر کیا یہ بات تمہیں معلوم ہے...؟

ایک دن اچانک اس نے لڑکی کو اسپتال میں دیکھ لیا... سجاد آپریشن تھیٹر میں تھا اور حیدر کو موقع ملا تو وہ کوک پینے کیفے ٹیریا پہنچ گیا جہاں میڈیکل کالج کے لڑکے لڑکیاں پھرتے رہتے تھے۔ وہاں وہ لڑکی ایک میز پر اکیلی بیٹھی تھی اور اس کے سامنے کتاب تھی۔

حیدر سے برداشت نہ ہوسکا... وہ اس کے سامنے جا بیٹھا... کیفے ٹیریا میں یہ انوکھی بات نہ تھی... جگہ نہ ہو تو کوئی کسی بھی میز کو شیئر کرلیتا تھا۔ مگر حیدر نے بیٹھتے ہی کہا۔ ''ہیلو... تم تو وہی ہو... مس پڑھاکو۔''

لڑکی نے کتاب بند کردی۔ ''تم یہاں بھی آگئے... پارک میں تو جاگنگ کے بہانے مجھے گھورنے آتے ہی تھے۔''

''غلط فہمی ہے آپ کی... میرے والد یہاں ڈاکٹر ہیں۔ ڈاکٹر سجاد علی شاہ۔''

''میرے والد میڈیکل کالج کے پرنسپل ہیں... ڈاکٹر افتخار قریشی اور میں خود فرسٹ ایر میں پڑھ رہی ہوں ابھی... لیکن ایک دن مجھے اپنے والد سے بھی بڑا ڈاکٹر بننا ہے۔''

حیدر ہنس پڑا۔ ''کیا سارے باپ اسی طرح اپنے بچوں کی زندگی پر اپنی خواہشات کی اجارہ داری رکھتے ہیں۔''

''کیا مطلب...؟'' وہ ماتھے پر شکن ڈال کے بولی۔

''میرے والد بھی یہی چاہتے تھے... مگر میں نے کہا کہ زندگی میری ہے... میں جو چاہوں گا کروں گا۔''

''ماں باپ ہماری بھلائی کا سوچتے ہیں۔''

''غلط... وہ اپنی ناآسودہ خواہشات کی تکمیل کا سوچتے ہیں اور ہمیں اس کا وسیلہ بناتے ہیں۔ عامل معمول کا کھیل کھیلتے ہیں ہمارے ساتھ۔ مجھے ایمانداری سے بتاؤ۔ کیا تم خود بھی ڈاکٹر بننا چاہتی ہو... یہ پیشہ تمہیں اپیل کرتا ہے...؟'' حیدر نے کہا۔

''یہ میں تمہیں کیوں بتاؤں...؟'' وہ تنک کے بولی اور کتاب اٹھا کے چلی گئی۔

اگلے دن جاگنگ کے بعد حیدر اس کے ساتھ بنچ پر جا بیٹھا۔ ''یہ باغ ہے... کلاس روم نہیں... دیکھو گھاس پر اور پھولوں پر شبنم ہے... پھولوں کے رنگ کتنے شوخ ہیں۔ ہوا میں کتنی فرحت ہے۔ پرندوں کی چہکار میں کتنی موسیقی ہے۔''

''صبح کے اس ماحول میں جو پڑھا جائے یاد رہتا ہے۔''

''کل تم نے میرے سوال کا بہت برا مانا تھا۔''

وہ سوچ کے بولی۔ ''ہاں... بعد میں مجھے احساس ہوا کہ ایسی کوئی بات تو نہیں تھی... میں کہہ سکتی تھی کہ ہاں... میں خود ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں۔''

حیدر نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''مر گئے... اب تو مجھے بھی ڈاکٹر بننا پڑے گا۔'' اس نے زیر لب کہا۔

''کیا کہا تم نے؟'' وہ خفگی سے بولی۔

''میں نے کہا، اچانک مجھے بھی ڈاکٹری سے دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ اس کے لیے مجھے اپنے مضمون بدلنے پڑیں گے۔ سائنس پڑھنی ہوگی۔ خیر... اللہ مالک ہے... فرہاد نے تو پہاڑ کاٹ کے نہر نکال دی تھی۔ میرا نام ہے حیدر... تمہارا میں نے معلوم کرلیا تھا... عافیہ... اچھا، پھر ملیں گے۔ خدا حافظ!'' وہ اٹھا اور چل پڑا۔

عافیہ کی تربیت ایک روشن خیال گھرانے میں ہوئی تھی۔ اس کی ماں بھی ڈاکٹر تھی۔ وہ صرف شام کو اپنے شوہر کے ساتھ کلینک کرتی تھی۔ عافیہ نے اپنے والدین کے ساتھ ساری دنیا گھومی تھی۔ وہ کسی دقیانوسی ماحول میں سخت پابندیوں کے ساتھ پل کر جوان ہونے والی دبو اور جھینپو قسم کی لڑکی نہیں تھی۔ اسے سجاد کا بے تکلف اور کسی حد تک جارحانہ انداز برا نہیں لگا تھا۔ اعتماد اس کی شخصیت کا حصہ تھا اور عافیہ اس سے متاثر ہوئی تھی۔

پھر ان کے درمیان ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اور چند بار حیدر اس کے گھر بھی ہو آیا۔ ایک دن وہ خود آگئی... کال بیل بجی تو دروازہ تاجور نے کھولا... اس کی سوالیہ نظروں کے جواب میں عافیہ نے کہا۔ ''حیدر ہے گھر پر...؟''

''ہاں... لیکن آپ...؟''

''میں عافیہ ہوں... ڈاکٹر افتخار کی بیٹی... جو میڈیکل کالج کے پرنسپل ہیں۔''

تاجور نے کہا۔ ''اچھا اچھا... آؤ، اندر آؤ... میں بلاتی ہوں حیدر کو... تم اسے کیسے جانتی ہو؟''

''ہم دوست ہیں۔'' عافیہ نے بے خوفی سے کہا اور پھر دو گھنٹے تک سب سے باتیں کرتی رہی۔ جب وہ چلی گئی تو سجاد نے پوچھا۔

''کب سے ہے تمہاری اور اس کی دوستی...؟'' اس

نے آخری لفظ پر زور دیا۔

''زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ یہ اسپتال ہی میں ملی تھی۔''

''کیا صرف دوستی ہی ہے یا.....؟''

''بالکل نہیں... البتہ اس کے والد نے آپ کو انوائٹ کیا تھا۔ جب میں ان کے گھر گیا تھا... تین دن ہوئے۔''

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد تاجور نے کہا۔ ''کیا ہم پیغام لے کر جائیں؟''

حیدر چونکا۔ ''نہیں... بالکل نہیں۔ ابھی ایسی کوئی بات نہیں۔''

''ابھی...؟ گویا بعد میں ہوگی۔'' سجاد نے کہا۔ ''کیا تمہارے درمیان عہد و پیمان ہو چکے ہیں...؟ ڈاکٹر افتخار نے تمہیں پسند کرلیا ہے...''

''نہیں پاپا... ابھی تو ہم پڑھ رہے ہیں... اور میں نہیں سمجھتا کہ کسی کے دل میں ایسی کوئی بات ہے۔''

''اس کا پتا چل جائے گا... دیکھو، زندگی تمہیں گزارنی ہے۔ لیکن دونوں گھروں کے ماحول میں شاید زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہمارے گھروں کی لڑکیاں اتنی فارورڈ نہیں ہوتیں۔'' سجاد بولا۔

''فارورڈ کیا... بے شرم کہو۔'' تاجور نے خفگی سے کہا۔

حیدر کے اصرار پر وہ ڈاکٹر افتخار سے ملے... اس ملاقات سے کوئی اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ کیا چاہتے ہیں اور کیا سوچ رہے ہیں۔ اخلاقاً انہوں نے بھی ڈاکٹر افتخار کو انوائٹ کیا... پھر ایک طویل عرصہ ان کے درمیان لاتعلقی رہی لیکن حیدر کی عافیہ سے دوستی نے عشق تک کا مرحلہ طے کرلیا... دونوں کے لیے آغاز شباب کا یہ پہلا تجربہ ہی فیصلہ کن ثابت ہوا۔ حیدر نے صاف کہہ دیا کہ ابھی نہ سہی... بالآخر میں تم سے شادی کروں گا... جواب میں عافیہ نے اسے اپنے والدین کی شرط بتادی۔

''میری شادی کسی ڈاکٹر ہی سے ہوگی۔''

'کیا یہ تمہارا فیصلہ ہے۔''

''میرا بھی... اور میرے والدین کا بھی۔''

حیدر بھونچکا رہ گیا۔ تم نے انہیں بھی بتادیا...؟''

وہ تڑخ کے بولی۔ ''کیوں نہ بتاتی... ہم گھر میں ایک دوستانہ ماحول رکھتے ہیں... ہر معاملے میں مشورہ کرتے ہیں... اور ایک دوسرے کا مشورہ مانتے ہیں۔''

''واٹ نان سنس... میں ڈاکٹر بننا نہیں چاہتا۔ تم مجھے جذباتی بلیک میلنگ سے مجبور کر رہی ہو۔''

''اگر ایسا ہے تو ایسا ہی سہی... تم نے نہیں کہا تھا کہ فرہاد نے پہاڑ کاٹ کے نہر نکالی تھی۔ تم میری خاطر اتنا نہیں کرسکتے کہ ڈاکٹر بن جاؤ۔''

عافیہ نے غصے سے پیر پٹخ کے کہا اور واک آؤٹ کرگئی۔

اس سے اگلے دن حیدر نے کالج کے پرنسپل سے مل کے اپنی فیکلٹی تبدیل کرالی۔ وہ آرٹس چھوڑ کے سائنس پڑھنے لگا۔ جب حیدر کے اس فیصلے کی خبر سجاد تک پہنچی تو قدیم کہانیوں کے کردار کی طرح وہ پہلے ہنسا اور پھر رویا... ہنسا اس خوشی کے باعث جو حیدر کے بالآخر ڈاکٹری پڑھنے پر ہوئی تھی... رویا یوں کہ ماں باپ ہونے کا زعم رکھنے کے باوجود جو بات وہ بیٹے سے نہ منوا سکے وہ ایک اجنبی لڑکی نے چار دن کی شناسائی میں منوالی... مائیں اسی کو روتی ہیں کہ بہو نے جادو کردیا ہے... اب ہم کچھ نہیں رہے۔

لیکن خود حیدر نہیں جانتا تھا کہ آدمی کے ارادے اور خواب، منصوبے اور دعوے... سب قابل شکست ہوتے ہیں۔ اگر عشق عام رفتار سے وصل کی منزل تک کا سفر طے کرلیتا تو زندگی ویسے ہی گزرتی جیسے سب کی گزرتی ہے... حیدر کے باپ کی تاجور کے ساتھ گزر رہی تھی... لیکن درمیان میں انتظار کا طویل صحرائے ہجراں تھا... وہ ملتے رہے... کالج میں بھی... میڈیکل کالج میں بھی... دن میں بھی، رات میں بھی... محفل میں بھی اور تنہائی میں بھی اور چونکہ دونوں ڈاکٹری پڑھ رہے تھے اور ڈاکٹروں کے ساتھ تھے اس لیے انہوں نے ملاقاتوں کا کوئی نتیجہ تو برآمد نہیں ہونے دیا مگر شادی سے پہلے ہی شادی شدہ زندگی کے سارے تجربات سے گزر جانے کے بعد دونوں کے لیے شادی کے تصور میں نہ کوئی دلکشی رہی، نہ سنسنی خیزی... بیزاری اور اختلافات کی جو منزل شادی کے دو چار سال بعد آتی ہے وہ شادی سے قبل ہی آگئی۔

عافیہ نے بالآخر اسی صنعت کار کے بیٹے سے شادی کی جو اسے لندن میں ملا تھا اور جس کا باپ فیصل آباد میں کئی ٹیکسٹائل ملوں کا مالک تھا۔ عافیہ نے ڈاکٹری سے صرف اتنا فائدہ اٹھایا کہ ساری عمر خود کو ڈاکٹر عافیہ لکھتی رہی۔

حیدر نہ چاہنے کے باوجود دلدل میں اترا اور پھنس گیا۔ عشق کا دریا اور ڈاکٹری کی تعلیم دونوں آگ کا دریا تھے جن سے اسے گزرنا تھا۔ کورس کی کتابوں سے زیادہ اس نے زندگی کی کتاب کو پڑھا تھا اور اس سے یہ سے عملی سبق بھی حاصل کیا تھا کہ دولت کا شارٹ کٹ روایتی صراط مستقیم کی مخالف سمت میں ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی ڈگری کو دفن کردیا۔

www.pdfbooksfree.pk

☆☆☆

دوسری سمت:

مستری گلزار احمد گورداسپوری عرف گلو استاد کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ چالیس سال بعد وہ اپنا گھر بار، بیوی بچے اور اپنی ورکشاپ کا ساز و سامان لے کر اس شہر کے کس حصے میں جائے جہاں اس کے لیے کچھ بھی نہ بدلے۔ سب وہی رہے اور ویسا ہی ہو جیسا یہاں تھا۔ لیکن یہ ناممکن تھا۔

نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ ہوا گلو استاد کا باپ اپنے بیوی بچوں اور مال و متاع کے ساتھ گورداسپور سے روانہ ہوا تھا تو اسے یقین تھا کہ وہ بہتر مستقبل کی جانب جا رہا ہے جہاں اسے اپنے زیادہ تر خوابوں کی تعبیر مل جائے گی۔

گلو کے باپ فقیر محمد ماہی گورداسپوری کو یقین کامل تھا کہ اپنے اسلامی ملک پاکستان میں بالآخر ایک اسلامی حکومت قائم ہوگی جو خلافت راشدہ کا نمونہ نہ سہی... اسی کے مطابق کاروبار مملکت چلائے گی۔

اس کا باپ ایک اسکول میں اسلامیات اور فارسی کا ٹیچر تھا... وہ اپنے محلے کی مسجد کمیٹی کا صدر بھی تھا اور مسجد میں درس قرآن بھی دیتا تھا... وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باخبر شخص تصور کیا جاتا تھا کیونکہ وہ ہر روز ہیڈ ماسٹر کی اجازت سے اسکول لائبریری کے لیے آنے والا انگریزی اخبار STATESMAN اٹھا لاتا تھا اور خود اس کا بھرپور مطالعہ کرنے کے بعد اپنے حلقۂ احباب اور اہل محلہ سب کو عالمی واقعات اور ملک کی سیاسی صورت حال سے باخبر رکھتا تھا۔

عام خیال اور یقین یہی تھا کہ گورداسپور کا ضلع پاکستان کو ملے گا چنانچہ سکھ ہندوؤں میں خوف کا احساس غالب تھا مگر پھر اچانک باؤنڈری کمیشن کی بے ایمانی سے اس کا الٹ اعلان ہو گیا... مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ پڑی اور انہیں وہاں سے بھاگنا پڑا۔ بیشتر اپنا گھر بار اور ساز و سامان چھوڑ کے بھاگے تو پاکستان بھی نہ پہنچ پائے۔ راہ میں شہید کر دیے گئے۔

ماسٹر ماہی چھ ماہ تک تو دن رات گورداسپور کے شب و روز کو یاد کر کے آہیں بھرتا رہا۔ وہ زندگی اب اسے کسی حسین خواب کی طرح لگتی تھی جس کی تعبیر کے لیے خواہش کرنا بھی دیوانگی تھی۔ بالآخر اسے ایک پرائیویٹ اسکول میں نوکری مل گئی جس میں اس نے اپنی زندگی کے باقی دن بڑی عسرت میں گزارے... اس کی بیوی بیمار ہوئی تو مناسب علاج کی سہولت نہ ملی اور وہ مر گئی۔ اسے مجبوراً اپنے دو بچوں کو موٹر مکینک کا کام سیکھنے کے لیے ایک گیراج میں ملازم رکھوانا پڑا۔

اس کا خیال تھا کہ گلزار اور اسرار کو وہ صبح شام خود پڑھا سکتا ہے اور گورنمنٹ اسکول میں دی جانے والی تعلیم سے بہتر تعلیم دے سکتا ہے۔ دن میں وہ کام کریں گے تو کچھ لائیں گے اور مستقبل کا ہنر بھی سیکھیں گے لیکن ایسا نہ ہوا۔ بڑا لڑکا اسرار صرف دو سال بعد لاپتا ہو گیا۔ گلزار نے کام تو سیکھا مگر تعلیم سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا۔ ماسٹر نے اسے ہی اللہ کا احسان مانا کہ اس کی کوئی بیٹی نہ تھی، اگر وہ پاکستان پہنچ بھی جاتی تو یہاں اس کی ماں کے مرنے کے بعد اسے کون سنبھالتا... کون رخصت کرتا۔

ماسٹر چھیاسٹھ سال کی عمر پا کے دنیا سے رخصت ہوا تو گلزار ایک موٹر مکینک بن چکا تھا اور اس نے ایک دکان کرائے پر لے کر اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ دکان چلتی ہوئی سڑک پر تھی اور اس بازار سے دور نہ تھی جہاں سے گاڑیوں کے پرانے پرزے ملتے تھے۔ وہ اپنے کام کا ماہر تھا مگر اس سے بھی زیادہ وہ باتوں سے گاہک کو مطمئن کرنے کے فن میں ماہر تھا۔

موقع ملتے ہی اس نے دائیں طرف والی دکان پکڑی... پھر بائیں ہاتھ کی دکان خالی کرائی۔ اس نے گلزار موٹر ورکشاپ کا سائن بورڈ لگوایا اور ٹھیکے پر اپنے ساتھ ڈینٹر پینٹر کو اور آٹو الیکٹریشن کو رکھ لیا۔

ہجرت کے وقت ماسٹر ماہی کی عمر اڑتالیس سال تھی اور گلزار دس سال کا بچہ تھا۔ اب اس کی عمر اٹھائیس سال ہو چکی تھی۔ اپنی ورکشاپ ہی کے ایک حصے کو اس نے رہائش کے قابل بنا لیا تھا۔ آخری حصے میں اس کی چارپائی کے ساتھ ایک الماری تھی جس میں اس کے کپڑے تھے۔ وہیں ایک کونے میں لگے ہوئے نل کے ساتھ اس نے اپنا باتھ روم بنا رکھا تھا۔ اس کی نالی براہ راست گٹر میں اترتی تھی۔

وہ عیاش آدمی نہیں تھا۔ اس کے دوست نہ ہونے کے برابر تھے۔ اسے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی مگر اس کے لیے پیسے کا کوئی مصرف نہ تھا۔ اچھے کپڑے وہ پہن ہی نہیں سکتا تھا۔ صبح سے رات تک اس کے جسم پر ایک نیلی زین کی ڈانگری رہتی تھی۔ سوتے وقت وہ ایک پاجامہ اور بنیان پہنتا تھا۔ وہ اپنے کام میں اتنا مگن تھا کہ اسے کسی اور چیز کا خیال ہی نہیں آتا تھا۔

پھر ایک رات وہ ایک دوست کے گھر رکنے پر مجبور ہو گیا۔ اس دوست کے ساتھ وہ اکثر رات کے وقت گھومنے نکل جاتا تھا۔ وہ گوالمنڈی میں کچھ کھاتے پیتے تھے اور بعض اوقات شاہی قلعے کی کسی سیڑھی پر بھی چڑھ جاتے تھے۔ پھر

اس دوست نے شادی کر لی... وہ اس کی شادی میں شریک ہوا تھا تو اس نے بڑی رونق دیکھی تھی۔ وہاں اس کے ماں باپ اور دوسرے رشتے دار موجود تھے۔ وہ سب خوش تھے اور ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے۔

اسی رات گلو استاد کو پہلی بار اپنے اکیلے ہونے کا احساس ہوا تھا۔ ماں، باپ تو خیر کسی کے بھی نہیں رہتے۔ اس کا ایک بھائی تھا جو ایسا گیا تھا کہ اس نے لوٹ کر کبھی کی خبر نہ لی تھی۔ دوسرے رشتے داروں کے وجود سے وہ تقسیم کے وقت محروم ہو گیا تھا۔

شادی کے بعد اس دوست نے بار بار اسے اپنے گھر بلایا لیکن گلو فرصت نہ ہونے کا بہانہ کر کے ٹال گیا۔ ایک دن وہ خود اسے لینے آ گیا۔ اس کا گھر بڑا نہیں تھا لیکن وہ واقعی گھر لگتا تھا، مکان نہیں۔ اوپر والی منزل پر اسے دو کمرے ملے ہوئے تھے۔ نچلی منزل پر اس کے ماں باپ رہتے تھے۔ جہیز میں ملنے والا بیڈ روم سیٹ اور دوسرا فرنیچر... فریج اور ٹی وی کمرے کا نیا رنگ روغن اور اس کی سجاوٹ۔ سب دیکھ کر گلو مسحور ہو گیا۔ اس کا دوست بھی ایک مکینک تھا مگر وہ کتنے سلیقے سے رہتا تھا۔ اس کی زندگی میں کتنا حسن تھا اور کتنا آرام تھا، یہ اس نے پہلی بار محسوس کیا۔

رات کو اسے بارش کی وجہ سے دوست کے گھر رکنا پڑا۔ اس کی بیوی بڑی خوبصورت تھی اور اتنی ہی خوش اخلاق اور شائستہ اطوار بھی۔ اس نے گلو بھائی، گلو بھائی کی رٹ لگا کے پہلے اسے بہت کھلا دیا۔ اس کے ہاتھ کے کھانوں کا لطف بھی نیا تھا جو ہوٹل میں کھانے کے عادی گلو کو بہت پسند آیا پھر اس نے بڑے اصرار سے گلو بھائی کو روکا کہ جلدی کیا ہے صبح چلے جایئے گا۔ اس کی ملنساری اور مہمان نوازی نے گلو کو بے بس کر دیا۔

رات کو وہ چائے بنا کے لے آئی اور دیر تک اپنی باتیں کرتی رہی۔ اپنے گھر، ماں باپ، بھائی بہن اور اسکول کی باتیں۔ اس کا دوست فخر سے دیکھتا رہا اور مسکراتا رہا پھر وہ سونے چلے گئے۔ گلو کے لیے انہوں نے ساتھ والے کمرے میں بستر لگا دیا تھا لیکن درمیانی دروازہ بہت ہلکا تھا۔ اس کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس سے آنکھ کا پردہ ضرور رہا مگر رات بھر سنائی دینے والی آوازوں نے گلو کو سونے نہیں دیا۔ وہ رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔

اگلی بار اس کا دوست آیا تو گلو نے کہا۔ ”یار یہ پیچھے والا احاطہ مل سکتا ہے... مگر بندہ پیسے بہت مانگ رہا ہے۔“

”پیسے تیرے پاس کم تو نہیں ہیں۔ کیا کرے گا ان پیسوں کا۔“

گلو نے کہا۔ ”سوچ رہا ہوں یہ احاطہ لے لوں۔“

”کیا کرے گا احاطہ لے کر...“ دوست بولا۔

”دو کمرے، غسلخانہ، باورچی خانہ نکل آئے گا... اپنا گھر ہو جائے گا۔“

دوست نے پھر کہا۔ ”کیا کرے گا گھر بنا کے؟“

”یہ تو کس قسم کے سوالات کر رہا ہے۔“

”وہی جو میری بیوی کرنا چاہتی تھی... لیکن میں نے اسے روک دیا تھا کہ مہمان کو تنگ نہیں کرتے۔ لیکن اس نے مجھ سے کہا ہے کہ تم دوست ہو تو اپنے دوست کے لیے کچھ کرو۔ زندگی صرف خراب گاڑیوں کو ٹھیک کرنے کے لیے نہیں ہوتی۔“

”پھر کس لیے ہوتی ہے؟“ گلو نے ایک احمقانہ سوال کیا۔

”ابے تیرا باپ اور میرا باپ... ان کے باپ دادا... یہ سب تیری طرح جیتے تو میرا تیرا وجود کہاں ہوتا۔ آدمی کی ساری جدوجہد آخر کس لیے ہے... کہ وہ اپنا گھر بنائے، بیوی بچوں کے ساتھ زندگی کا لطف اٹھائے۔“

گلو سنتا رہا اور اتنا اداس ہوا کہ اس کا دل چاہا رونا شروع کر دے۔ ”تو نے بالکل ٹھیک کہا لیکن میرا تو اس دنیا میں کوئی بھی نہیں... کون دے گا مجھے اپنی بیٹی۔“

”تو اس کی فکر مت کر... ہم ہیں نا۔ آخر کیا کمی ہے تجھ میں... جوان اور صحت مند ہے۔ اچھا کما رہا ہے۔ کوئی بری عادت نہیں۔ تجھے لڑکیوں کی کیا کمی... تیری بھابی کہہ رہی تھی کہ گلو بھیا سے پوچھو... وہ راضی ہوں تو میں بات کروں۔“

اور یوں گلو استاد کا گھر آباد ہوا......

شاہین نے گلو استاد کے گھر کو ہی نہیں گلو استاد کی زندگی کو ایسے بدل دیا کہ ایک مرتبہ اس نے خاصے جذباتی اور شاعرانہ انداز میں اپنے دوست سے کہا۔ ”یار اپنی زندگی تو ایسے تھی جیسے بنجر زمین... اس نے اپنی محنت سے اسے شالیمار باغ بنا دیا۔“

وہ اپنے دوست کی بیوی کا بھی بہت احسان مند تھا کہ اس نے گلو کے لیے ایسی لڑکی چنی کہ اس جیسی شاید دوسری نہیں ہو سکتی۔ دونوں میاں بیوی اس کی باتوں پر بہت ہنستے تھے اور بیوی کے لیے اس کی دیوانگی پر بھی... اس نے شاہین کو پورا موقع دیا کہ وہ آگے پڑھے۔ اس کے لیے گلو نے پہلے بچے کی پیدائش کو بھی بیوی کے ایف اے بی ٹی کرنے تک موخر کیا۔ پھر پہلا بچہ وقار پیدا ہوا اور اس کی تعلیم میں رخنہ آیا۔ جب وہ اسکول جانے کے قابل ہوا تو شاہین

www.pdfbooksfree.pk

نے بی اے بی ایڈ کیا۔ اس وقت بھی شاہین ایک اسکول میں پڑھا رہی تھی۔ وہاں سے دوسرے اسکول میں گئی پھر تیسرے میں... یہاں تک کہ اسے ایک ایسے انگلش میڈیم اسکول میں جگہ مل گئی جہاں وہ وقار کو اپنے ساتھ لے جاتی تھی اور ساتھ ہی واپس لاتی تھی۔ ٹیچر کا بیٹا ہونے کی وجہ سے اس کی فیس بھی معاف تھی۔

وقار کے بعد دو لڑکیاں ہوئیں... گلو استاد دن رات محنت کرتا رہا اور اس کے نام کی ایک گڈول بن گئی۔ خرابی صرف ایک ہوئی لیکن جب گلو کو اس کا احساس ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ شاہین اب اسی انگلش میڈیم اسکول میں سینئر ٹیچر تھی اور پرنسپل ہونے کی امیدوار تھی۔ اس کی آمدنی تو گلو استاد کے برابر نہیں تھی۔ شاید اس کی نصف بھی نہیں تھی مگر اس کی عزت شہر کے ان تمام گھرانوں میں تھی جن کے بچے اسکول میں پڑھ رہے تھے یا پڑھ چکے تھے، وہ سب اونچے عزت دار گھرانے تھے۔

یہ احساس گلو استاد کو ایک دن اچانک ہوا کہ اس کا اکلوتا بیٹا اس کا جانشین نہیں ہوگا۔ اور یہ سوال اس کے سامنے آ کھڑا ہوا کہ جس کاروبار کو اس نے اتنی محنت سے کھڑا کیا تھا، ایک چھوٹی سی دکان سے پوری ورکشاپ بنا دیا تھا۔ اسے بعد میں کون سنبھالے گا؟

ابھی اس کی عمر زیادہ نہیں تھی... اس کی صحت بھی اچھی تھی اور وہ توقع رکھ سکتا تھا کہ اگلے بیس بائیس سال خود کام کر سکے۔ یہ ایسا کام نہیں تھا کہ شاگردوں پر چھوڑ کے وہ کسی ایر کنڈیشنڈ، صاف ستھرے اور آرام دہ آفس میں بیٹھ جائے۔ اس کے پاس کام کرنے والے بچے اور پرانے ہیلپر جو اب مکینک بن چکے تھے دن میں سو بار اس سے مدد کے طلبگار ہوتے تھے اور آواز لگاتے رہتے تھے کہ استاد... ذرا ایک نظر دیکھو... یہ کیا چکر ہے۔' اور اسے خود سمجھ کر دوسروں کو سمجھانا پڑتا تھا کہ مسئلہ کیا ہے... اسی لیے وہ استاد تھا... جو ورکشاپ میں استاد جتنے تجربہ کار ہو جاتے تھے وہ عموماً اپنا کام خود شروع کر دیتے تھے۔ ورکشاپ میں بچوں کے آنے، تربیت پانے، تجربہ حاصل کرنے اور بڑے ہونے پر چھوڑ کر چلے جانے کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا تھا۔

اس کے علاوہ یہ چھوٹے بڑے سب موقع پاتے ہی ہاتھ کی صفائی بھی دکھا جاتے تھے۔ پرزے غائب کرنا یا کسی گاڑی سے کوئی چیز نکال لینا عام بات تھی۔ وہ اس پر سخت نظر رکھتا تھا اور کسی کو پکڑ لیتا تھا تو نکالنے سے پہلے اس کی کھال ادھیڑ دیتا تھا تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔ دو چار مرتبہ اس نے پولیس سے بھی مدد لی اور چوری کے مرتکب ہونے پر تھانے میں ایسی چھترول کرائی کہ باقی سب سیدھے ہو گئے۔ وہ ظالم یا سفاک نہیں تھا، وہ سب سے زیادہ اُجرت دیتا تھا اور اپنے کاریگروں کا خیال بھی بہت رکھتا تھا۔ حادثات اور مشکل وقت میں گلو استاد کسی باپ کی طرح ان کے کام آتا تھا۔ لیکن ہر باپ کی طرح ہر وقت ان پر نظر رکھنا ضروری تھا۔

اچانک اسے یہ فکر لاحق ہو گئی کہ اسے کچھ ہو گیا تو ورکشاپ کا کیا کیا بنے گا۔ آدمی کا کیا ہے... اچھا بھلا صحت مند آدمی کینسر میں مبتلا ہو کے چٹ پٹ ہو جاتا ہے۔ حادثہ تو پھر حادثہ ہے، سڑک پر بھی ہو جاتا ہے... گھر میں بھی... ورکشاپ میں بھی۔

یہ سوال اس نے شاہین سے کیا۔ ''شانی! میرے بعد میری ورکشاپ کا کیا ہوگا؟''

وہ گھبرا گئی۔ ''کیسی باتیں کرتے ہو... تمہیں کیا ہوا ہے؟''

وہ ہنسنے لگا۔ ''اوجھلی... کوئی بندہ کبھی زندگی کی گارنٹی دے سکتا ہے تو مجھے بتا... میں بھی لے لوں۔''

شاہین کی تسلی نہیں ہوئی۔ ''سچ بتاؤ... کوئی ایسی ویسی بات ہے۔''

''مجھے کچھ نہیں ہوا ہے... لیکن ہو سکتا ہے۔''

''فضول باتیں مت سوچو... کام کرنے دو مجھے۔''

گلو نے کہا۔ ''تم تو پڑھی لکھی ہو... مجھے بتاؤ جو دنیا میں سب کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ وہ میرے ساتھ کیوں نہیں ہو سکتا۔ کیا ہمیں آنے والے وقت کے لیے پہلے سے تیاری نہیں کرنا چاہیے... مثلاً بڑھاپا سب پر آتا ہے۔ جب آدمی کوئی کام کرنے کے قابل نہیں رہتا۔''

''تم بھی حد کرتے ہو۔ اتنی دور کی سوچ رہے ہو۔''

''شاہین... دنیا بھر میں باپ کا کام بیٹے سنبھالتے ہیں۔ کام کچھ بھی ہو۔ کوئی دکان ہو یا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس... ورکشاپ ہو یا کارخانہ۔''

شاہین مسکرائی۔ ''وقار تمہاری ورکشاپ کو سنبھالے گا ہی نہیں، ترقی دے کے آٹو انڈسٹری بنا دے گا۔''

گلو نے اسے نظر جما کے دیکھا۔ ''کیسے؟''

''کیسے... اپنی صلاحیت سے۔ محنت اور ہمت سے۔''

گلو مسکرانے لگا۔ ''بیوی... آدمی جس کام میں ہاتھ ڈالے وہ اسے آنا چاہیے۔'' ''دیکھو... میں سمجھ رہی ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو... لیکن یہ ناممکن ہے کہ وقار کسی مکینک کی طرح تمہاری ورکشاپ میں کام کرے۔''

''کام نہیں کرے گا تو کام سیکھے گا کیسے؟''

''اسے کوئی ضرورت نہیں کام سیکھنے کی... کام دوسرے کریں گے۔ وہ صرف کنٹرول کرے گا۔''

''او جھلی... یہی تو میں سمجھا رہا تھا۔ کنٹرول کیسے کرے گا جب اسے کام آتا ہی نہیں ہوگا۔''

شاہین نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''کچھ بھی ہو... وقار اے لیول کر چکا ہے۔ کالج کے بعد یونیورسٹی جائے گا۔ انجینئر بنے گا۔ کیا وہ تمہاری ورکشاپ میں گاڑیاں مرمت کرے۔ ڈانگری پہن کے..... اور گاڑیوں کے نیچے لیٹ کر ہاتھ منہ کالے کرے۔''

''کوئی کام برا نہیں ہوتا۔ اپنے ہاتھ سے کام کرنے سے کسی کی بے عزتی نہیں ہوتی۔''

''رہنے دو... یہ سب کتابی باتیں ہیں۔ اگر یہی سب کرانا تھا وقار سے تو اسے انگلش میڈیم اسکول کیوں بھیجا۔ لے جاتے اپنے ساتھ اور وہ جو چھوٹے کام کرتے ہیں... انہی کی طرح لگا دیتے۔''

''یہی تو میں نہیں کر سکتا تھا... لیکن جو میں نے کیا... کیا اب وہ میری غلطی شمار ہوگا؟''

''دیکھو... ہمارے معاشرے میں موٹر مکینک کی کوئی عزت نہیں۔''

گلو کا چہرہ احساسِ ذلت سے سرخ ہو گیا۔ ''مجھے معلوم ہے پرنسپل صاحبہ! تمہاری کتنی عزت ہے اس شہر میں۔ کیا بتائی ہو تم لوگوں کو؟ تمہارا شوہر کیا کرتا ہے۔''

''تم تو برا مان گئے۔''

''نہیں... مجھے بتاؤ کہ تم اپنی عزت کیسے بچاتی ہو۔''

''تم مکینک نہیں ہو... ورکشاپ کے مالک ہو۔'' شاہین نے کہا۔

''تمہارے شاگرد... ان کے گھر والے... سب کاروں والے ہیں... کیا انہوں نے مجھے دیکھا نہیں ہوگا ڈانگری پہنے۔ کالے ہاتھوں میں پلاس پانے اٹھاتے۔ کسی گاڑی کے نیچے لیٹے ہوئے۔ ضرور دیکھا ہوگا۔ یہ صرف تمہارا خیال ہے۔ خود فریبی ہے کہ کسی کو معلوم نہیں۔ سب جانتے ہوں گے کہ تمہارا میاں ایک موٹر مکینک ہے۔ لیکن کیا اس سے تمہاری عزت کم ہوئی؟ کبھی کسی نے تمہاری بے عزتی کی کہ بڑی پرنسپل بنی پھرتی ہو... تمہارا شوہر ایک موٹر مکینک ہے۔ کل ہی میں نے گاڑی ٹھیک کرائی تو اس نے رعایت نہیں کی۔''

شاہین خاموشی سے اپنے ہونٹ کاٹتی رہی۔ بے شک ایسا ہوا تھا... لیکن اس نے تحقیر آمیز رویہ اختیار کرنے والوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اپنی بے عزتی کے احساس سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ یہ محبت کا تقاضا تھا۔ آج وہ جس مقام پر تھی، گلو کی محنت سے زیادہ اس کی فراخدلی اور قربانی کی وجہ سے تھی۔ وہ بھولی نہیں تھی کہ اولاد کی فطری خواہش رکھنے کے باوجود گلو نے بچے کی پیدائش کو صرف اس لیے موخر کر دیا تھا کہ شاہین ایف اے سی ٹی کر لے۔ ایسی قربانی ہر شوہر نہیں دے سکتا تھا۔ اس کی حوصلہ افزائی کے نتیجے میں ہی وہ بی اے بی ایڈ اور بعد میں ایم اے بھی کر سکی تھی۔ اگر وہ چاہتا تو ایک جھٹکے میں فیصلہ کر دیتا کہ بی بی... میری آمدنی بہت ہے اور تم نے میٹرک کر لیا کافی ہے۔ بس اب گھر سنبھالو۔ صرف محبت ہی آدمی کو اپنے محبوب کی خوشی کو مقدم رکھنا سکھاتی ہے۔

کالج میں پہنچنے تک وقار نے کبھی ورکشاپ میں قدم نہیں رکھا تھا۔ وہ اپنے کسی کلاس فیلو یا دوست کو اپنے باپ کی ورکشاپ کے بارے میں خود کچھ نہیں بتاتا تھا۔ کسی کو یہ بات معلوم ہو جاتی تھی تو وہ شرمندگی سے زمین میں گڑ جاتا تھا دوسروں کے باپ بڑے بڑے نام اور بڑے عہدوں والے تھے۔ ان کے درمیان وہ خود کو اچھوت محسوس کرتا تھا۔ اس کے لاکھ چھپانے کے باوجود کبھی نہ کبھی افشائے راز ہو جاتا تھا۔

یہ مسئلہ اس کی دو بہنوں کا بھی تھا لیکن وقار کی طرح ان کی سوشل لائف محدود تھی۔ انہیں بھی کلاس فیلوز کے سامنے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور کلاس کمپلکس رکھنے والی لڑکیاں ان سے دور دور رہتی تھیں۔ بہت کم تھیں جو محنت کی عظمت کے فلسفے کو تسلیم کرتے ہوئے ان دونوں سے دوستی کرنا اور انہیں اپنے گھر بلانا پسند کرتی تھیں۔ اصل مسئلہ ان کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد سامنے آیا۔

اس مسئلے پر گلو کا پھر اپنی بیوی سے اختلاف رائے ہوا۔ ان کا بی اے کا نتیجہ آیا تو گلو نے کہا۔ ''ان دونوں کے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے؟''

شاہین سمجھ لینے کے باوجود انجان بنی رہی۔ ''سوچنے کی کیا بات ہے وہ پڑھ رہی ہیں۔''

''میرا مطلب تھا ان کی شادی کی عمر ہے۔''

''شادی میرے سوچنے سے تو نہیں ہوگی۔ کوئی رشتہ بھی تو آئے مناسب۔'' شاہین نے کہا۔

''مناسب کیا ہوتا ہے... رشتے تو آئے ہیں مگر تمہیں پسند نہیں آئے۔'' گلو نے کہا۔

''مجھے کیا... تمہاری بیٹی کو پسند نہیں آئے۔ ابھی پچھلے

www.pdfbooksfree.pk

مہینے جو رشتہ آیا وہ لڑکا صرف ایک سیلز مین تھا۔ دس بارہ ہزار کماتا تھا۔"

"آج دس بارہ کماتا تھا... ابتدا سب کی ایسے ہی ہوتی ہے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ ترقی نہیں کرے گا۔ براہ راست کسی فیکٹری کے ڈائریکٹر یا جنرل منیجر کا رشتہ تو آنے سے رہا۔" گلو نے خفگی سے کہا۔

"اس کا باپ بھی ریلوے میں بکنگ کلرک تھا۔ دھرم پورے میں پانچ مرلے کے گھر میں رہنے والا۔"

گلو بگڑ گیا۔ "آخر تم کیا سوچ رہی ہو۔ ان کے لیے گلبرگ اور ڈیفنس میں رہنے والے کسی جنرل یا وزیر کا رشتہ آئے گا؟"

وہ تلخی سے بولی۔ "نہیں... میں ایسا نہیں سوچ رہی۔ گلبرگ یا ڈیفنس میں رہنے والا کسی مکینک کے گھر رشتہ لے کر کیوں جائے گا۔"

گلو کو سخت غصہ آیا مگر اس نے ضبط سے کام لیا۔

"جانتے بوجھتے میں ان کو کنویں میں دھکا نہیں دوں گی۔ آخر میں بھی ماں ہوں۔ ابھی انہیں پڑھنے دو۔"

"شاہین... عورتوں کی تعلیم بری چیز نہیں... علم سب سے بڑی دولت ہے۔ میں ایسا نہ سمجھتا تو تمہیں کیوں پڑھنے دیتا۔ لیکن اب وقت کچھ اور ہے... اگر انہوں نے ایم اے کر لیا تو انہیں ایم اے پاس لڑکے نہیں ملیں گے... یونیورسٹیوں میں جا کے تو دیکھو۔ صرف لڑکیاں پڑھ رہی ہیں۔ کہیں ساٹھ فیصد... کہیں اسی فیصد۔ یہی حال ڈاکٹری کا ہے۔ صرف لڑکیاں ڈاکٹر بن رہی ہیں مگر پریکٹس کتنی کر رہی ہیں... اکثریت ہاؤس وائف بن کے وہی کر رہی ہیں جو ایک میٹرک پاس لڑکی کرتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکے باہر بھاگ رہے ہیں یا وزیروں، سفیروں، جنرلوں اور صنعتکاروں کے گھر داماد بن رہے ہیں۔"

شاہین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ بحث لاحاصل تھی۔ گلو نے جو کہا غلط نہیں تھا مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنے وقت میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والی اپنی بیٹیوں کو اعلیٰ تعلیم نہ حاصل کرنے دے۔ انہیں ایم اے نہ کرنے دے کیونکہ انہیں ایم اے پاس لڑکے دستیاب نہ ہوں گے۔

گلو نے ایک دن اپنے بیٹے وقار سے بات کی۔

"تمہارا ایف ایس سی کا رزلٹ آنے والا ہے۔"

"یس پاپا... اسی ہفتے میں۔"

"اس کے بعد تم کیا کرو گے؟ میرا مطلب ہے کیا پڑھو گے؟"

"میں انجینئر بنوں گا۔"

"ویری گڈ... میں چاہتا ہوں تم آٹو موبائل انجینئرنگ لو۔"

وہ ہنسا۔ "نو وے پاپا... آپ اس طرح مجھے موٹر مکینک نہیں بنا سکتے جو آپ کی ہمیشہ سے خواہش تھی۔"

"مکینک اور انجینئر میں فرق ہوتا ہے۔"

"صرف نام کا... آٹو انجینئر بن کے بھی مجھے کرنا تو وہی پڑے گا جو آپ عمر بھر کرتے رہے۔ مجھے آپ کی ورکشاپ سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

وہ بگڑ گیا۔ "آج تم جو بھی ہو اسی کی کمائی سے ہو۔ میں چاہوں تو دس آٹھ انجینئرز کو ملازم رکھ لوں۔"

"ان دس میں سے میرا نام کاٹ دیں۔"

گلو نے ایک اور کوشش کی۔ "تم اس ورکشاپ کے مالک بنو گے۔"

"پاپا... ایک طوائف کی بیٹی اگر پڑھ لکھ کے وہی کام کرنے لگے جو ماں کرتی تھی۔"

گلو کے ضبط کا حوصلہ جواب دے گیا۔ وہ وقار پر بہت چیخا چلایا مگر وقار نے اسے صاف بتا دیا کہ وہ سول انجینئرنگ پڑھے گا اور ورکشاپ میں کبھی قدم نہیں رکھے گا۔ وہ اکلوتا بیٹا تھا۔ اچھی طرح جانتا تھا کہ سب کچھ اسی کا ہے۔ باپ جب تک زندہ ہے ورکشاپ کی آمدنی ملتی رہے گی۔ جس دن وہ نہ رہا ورکشاپ کوئی خرید لے گا اور اس کے بہت اچھے پیسے ملیں گے۔

گلو کے لیے صبر کرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ اس کی دونوں بیٹیوں نے جو جڑواں تھیں ایم اے کرنے کے لیے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا اور ان کے فیشن دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ کسی موٹر مکینک کی بیٹیاں ہیں۔ ابھی تک وہ اسی گھر میں رہتے تھے جو ورکشاپ کے عقبی حصے والے احاطے میں پانچ مرلے پر بنا ہوا تھا لیکن اس کا راستہ پچھلی گلی سے تھا۔ گلو نے پہلے اس پر ایک منزل تعمیر کی تھی۔ بعد میں دوسری کا اضافہ کیا۔ اس میں جگہ کم نہ تھی مگر یہ پرانے شہر کا علاقہ تھا۔ بچے اب کسی پوش علاقے میں رہائش اختیار کرنے کے حق میں تھے لیکن یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب گھر کے ساتھ گلو اپنی ورکشاپ کو بھی فروخت کر دے... پوش علاقوں میں مکان بہت مہنگے تھے۔

ورکشاپ ان کے عیش و آرام کی ضامن تھی۔ اس کی بیوی کو ایک دن ریٹائر ہونا تھا۔ پرائیویٹ اسکول سے کوئی پنشن بھی نہ ملتی تو گزارا صرف ورکشاپ کی آمدنی سے ممکن

تھا۔ اسے بیچنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے جو پس انداز کیا تھا وہ اپنے مستقبل کے لیے تھا۔ اسے بیٹیوں کی شادی کی فکر تھی اور اپنی طرف سے اس کی تیاری مکمل تھی۔

ایک اندازے کے مطابق اس کے مکان کی قیمت بائیس چوبیس لاکھ تھی تو ورکشاپ کی جگہ اور گڈول اس سے دگنی۔ اگر سنٹر پچھتر لاکھ سے وہ دس مرلے کا مکان کسی ماڈرن آبادی میں لے بھی لیتے تو وہاں کے معیار زندگی پر رہنے کے لیے اخراجات پورے کرنا ناممکن ہو جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ بیوی بچوں کی طرف سے دباؤ کے باوجود وہ ورکشاپ کے معاملے میں اپنی بات پر اڑا رہا۔ "اسے بیچ کے میں بے روزگار نہیں ہو سکتا۔ جس دن بیٹا تمام اخراجات اٹھانے کے قابل ہو گیا اس دن دیکھیں گے۔"

پھر وہ ہوا جو ناقابلِ تصور تھا۔ اچانک موٹروے بنی اور لنک روڈ بنانے کے منصوبے میں وہ سڑک آ گئی جس پر گلو کی ورکشاپ تھی۔ اسے نوٹس مل گیا کہ فلاں تاریخ تک ورکشاپ ہٹا لے۔ اس کے بعد سرکاری مشنری اسے گرا دے گی۔ وہ ساری جگہ نئی سڑک بنانے کے لیے صاف کی جا رہی تھی۔

گلو کرائے کے ایک مکان میں شفٹ ہو گیا اور خود ورکشاپ کے لیے جگہ تلاش کرنے لگا۔ یکلخت اس ورکشاپ کی قیمت پچاس لاکھ سے پانچ ہو گئی تھی۔ وہ ایک طرح سے ناجائز تعمیر تھی جسے کچی آبادی کی لیزمل گئی تھی...

اب سرکار کی طرف سے جو معاوضہ دیا جا رہا تھا وہ اس کا دس فیصد بھی نہیں تھا۔ گلو کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لاہور جیسے شہر میں وہ پانچ لاکھ لے کر کیا کرے گا۔ اس قیمت میں تو شہر کے مرکزی اور کاروباری علاقے میں ایک مرلہ زمین بھی نہیں ملتی۔ چھوٹی چھوٹی دکانوں کی گڈول اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اتنی بڑی ورکشاپ کو کسی غریب آبادی یا غیر معروف گلی میں منتقل کرنا عملاً ناممکن تھا۔ ہر نئی جگہ پر کاروبار جمانے میں برسوں بیت جاتے ہیں۔ یہاں کے گاہک وہاں کیوں آنے لگے۔ وہ چلے جائیں گے جہاں سہولت ہو گی، ہر جگہ پرانے ورکشاپ پہلے سے موجود ہیں۔

حکومت کے اس فیصلے کے خلاف نہ داد رسی نہ فریاد۔ نہ کسی عدالت انصاف میں اپیل کہ معاوضہ بہت کم ہے۔ سرکاری مہلت بھی تمام ہونے والی تھی۔ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ ورکشاپ کا سارا ساز و سامان اونے پونے بیچ دیا جائے۔ اس کے پاس تو اس کباڑ کو رکھنے کی جگہ بھی نہیں تھی۔

وقار کے سول انجینئرنگ کی ڈگری لینے تک حالات انتہائی دگرگوں ہو چکے تھے، آمدنی نہ ہونے کے باعث پس انداز کیا ہوا سرمایہ دھوپ میں رکھی برف کی طرح کم ہونے لگا تھا، بے کاری نے گلو کو خود اپنی نظر میں بے وقعت کر دیا تھا..... وہ سارا دن پڑا سوچتا رہتا تھا کہ کیا کرے جس سے اس کا گھر پہلے کی طرح چلنے لگے..... اس کے نام کی ایک گڈول تھی..... ایسا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کسی دوسرے کی ورکشاپ میں کام مانگنے جائے۔ وہ نفسیاتی مریض بنتا جا رہا تھا، بیشتر وقت وہ سوتا رہتا تھا یا کھلی آنکھوں سے خلا میں گھورتا رہتا تھا۔ گیراج میں ہر وقت چائے چلتی تھی۔ اب وہ گھر میں طلب محسوس کرتا تھا تو اسے چائے بنا کے دینے والا کوئی نہیں ہوتا تھا۔ پھر وہ غصے میں چیختا چلاتا تھا اور برتن توڑتا تھا..... سگریٹ وہ پہلے ہی پیتا تھا، اب سکون کی خاطر اس نے نشے کا سہارا لیا اور بہت جلد اس کا عادی ہو گیا۔

وقار اپنی ڈگری کے ساتھ جہاں بھی انٹرویو دینے گیا وہاں کوئی سفارشی پہلے ہی منتخب ہو چکا تھا..... دو جگہ اس سے لاکھوں میں رشوت مانگی گئی اور کہا گیا کہ لاکھوں دیے بغیر کروڑوں کمانے کا سوچنے والا خود احمق ہے یا ساری دنیا کو احمق سمجھتا ہے..... ہر گزرتے دن کے ساتھ وقار کی توقعات کا مینار زمیں بوس ہونے لگا۔ گھر کے حالات متقاضی تھے کہ وہ فوری طور پر کچھ کمائے..... اپنی انجینئرنگ کی تعلیم کو کیش کرائے، ورنہ کاغذ کے اس ٹکڑے کو پھاڑ پھینکے اور کسی ریڑھی پر دہی بھلے بیچے..... اسٹیشن پر قلی بن جائے یا رکشا چلائے۔

آخری بار جب اسے انٹرویو کے لیے ملک اینڈ برادرز نے لیٹر جاری کیا تو وہ طے کر چکا تھا کہ یہ بالکل آخری بار ہے..... وہ صبح ٹھیک وقت پر پہنچا تو آفس میں سوائے ایک چوکیدار اور چپراسی کے کوئی بھی نہ تھا..... اسے دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ پھر کنسٹرکشن کمپنی کے مالک اپنی لمبی چوڑی قیمتی دمکتی کار میں تشریف لائے۔ وقار کو حیرانی یہ تھی کہ آج یہاں انٹرویو دینے والوں کا اژدہام تھا مگر اسے فوراً ہی اندر بلا لیا گیا۔

"ہاں بھئی وقار احمد..... تو گلو استاد کا بیٹا ہے نا؟....."

ملک صاحب نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "دس ہزار مہینا پر نوکری کرنا ہے تو یہ ہے تیرے بیٹھنے کی جگہ، ابھی بیٹھ جا۔"

☆☆☆

وقار نے صوفے پر پڑے ہوئے گوشت کے عظیم الشان ڈھیر کو دیکھا۔ ابھی تک اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا تھا۔ "دس ہزار! سر آپ جانتے ہیں میں ایک کوالیفائیڈ

www.pdfbooksfree.pk

سول انجینئر ہوں۔''

گوشت کے پہاڑ میں حرکت ہوئی۔ ''اودیکھ یار... یہ جو باہر بیٹھے ہیں نا... یہ سارے ہی سول انجینئر ہیں۔ اور تیرے سے پہلے جو آئے تھے ان کے پاس بھی ڈگری تھی۔''

ایک خوشامدی چمچے نے کہا۔ ''آج کل تو ملک صاحب یہ حال ہے کہ پتھر ہٹاؤ تو نیچے سے نکلتا ہے انجینئر یا ڈاکٹر۔''

دوسرے چمچے نے ارشاد کیا۔ ''ہر شاخ پہ الو بیٹھا ہے، انجام گلستاں کیا ہوگا۔''

ملک صاحب نے غرا کے کہا۔ ''چپ کر اوئے شاعر دے پتر۔''

وقار کا چہرہ کانوں تک سرخ ہوگیا۔ ''اشتہار میں لکھا تھا کہ ایک ملٹی نیشنل کنسٹرکشن کمپنی کے دوسرے تعمیراتی پروجیکٹ کی نگرانی۔''

''اوئے آہو... تو نے دیکھا ہوگا اودھر لبٹری کے پاس ملٹی اسٹوری پروجیکٹ پورا ہوگیا ہے۔ اس کا ڈیزائن بنایا ہے ایک غیر ملکی کمپنی نے۔ تعمیراتی ٹھیکا بھی دبئی کی ایک کمپنی کا ہے۔ راج مزدور سے چیف انجینئر تک سارے بندے ان کے ہیں۔''

''وہ دبئی والی کمپنی ملک صاحب کی ہے۔'' پہلا چمچہ بولا۔

''ملٹی نیشنل تو ہوگئی... کراچی اور دبئی۔'' دوسرے نے کہا۔

ملک نے کہا۔ ''یہ ہمارا دوسرا پروجیکٹ ہے۔ پبلک کو امپریس کرنے کے لیے حوالہ تو دینا پڑتا ہے کہ ہم پہلے کیا کر چکے ہیں... اب ہم پانچ اور دس مرلہ کے چھوٹے رہائشی یونٹ بنا رہے ہیں۔ ادھر ملتان روڈ پر۔''

''مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ کام کہاں ہے... اور کیا ہے۔ میں کام کر کے دکھانا چاہتا ہوں...... مگر دس ہزار!''

ملک ہنسا تو گوشت کا ڈھیر ہلنے لگا۔ ''دیکھ کاکا دس ہزار میں تجھے کوئی کام نہیں کرنا ہے۔ کام کرنے والے راج مزدور سارے پرانے تجربہ کار لوگ ہیں۔ انہیں نہ کسی کوالیفائیڈ ڈرافٹ مین کے بنائے ہوئے نقشے کی ضرورت ہے، نہ انجینئر کی۔''

پہلا چمچہ بولا۔ ''ادھر تو بندے کاغذ پر نقشہ بنا کے لاتے ہیں۔ اتنے کمرے ہوں گے، ادھر کچن ہوگا، ادھر ڈرائنگ۔ وہ ایک نظر ڈال کے کہتے ہیں کہ بن جائے گا۔''

''کتنا سریا ہوگا، کتنا سیمنٹ اور کتنی ریت۔ سب پتا ہوتا ہے ان کو۔'' دوسرا چمچہ بولا۔

''پھر میری کیا ضرورت ہے آپ کو...'' وقار نے کہا۔

''تو بیٹھ ادھر سائٹ آفس پر۔ ایئر کنڈیشنڈ کمرا ہے۔ صوفے لگے ہیں۔ کارپیٹ ہے۔ ایک بڑی چمک دمک والی چھمک چھلو بھی تیرے سامنے ہوگی، ڈیکوریشن پیس۔ وہ فون کال ریسیور کرتی ہے اور تجھے چائے بھی بنا کے دے گی۔''

''ہر خدمت بجالائے گی۔'' پہلا چمچہ بولا۔ ''دن ہو یا رات۔''

''بس خدمت کے حساب سے معاوضہ لے گی۔''

''لاحول ولاقوۃ... میں چلتا ہوں۔'' وقار اٹھ کھڑا ہوا۔

ملک نے چمچوں کو ڈانٹا۔ ''تم چپ کر کے نہیں بیٹھ سکتے۔ اپنے وقار صاحب... جو لوگ ادھر آئیں گے۔ ان کو بتایا جائے گا کہ آپ ہو چیف انجینئر... باہر سے ڈگریاں لے کر آئے ہو۔ منصوبہ آپ کی نگرانی میں مکمل ہوگا۔ اس سے اعتبار قائم ہوتا ہے کہ کوالٹی کنٹرول ہے۔ آپ انہیں قائل کرو گے کہ تعمیرات کا معیار وہی ہے جو یورپ میں اور امریکا میں ہے۔ نام بھی ہم نے یورپین ہومز رکھا ہے۔''

''لیکن درحقیقت ہوگا کچھ بھی نہیں۔ آپ ریت کی دیواریں کھڑی کردو گے۔ پانچ سوت کی جگہ تین سوت کا سریا ڈالو گے۔ باہر سے لیپ پوت کے رنگ روغن سے ڈیزائن میں چمک دمک پیدا کردو گے... اور پائیداری کا سرٹیفکیٹ لو گے مجھ سے۔''

''دیکھ کاکا... اتنا ٹائم تیرے ساتھ اس لیے ضائع کیا ہے میں نے... کہ تیرا باپ چنگا بندہ ہے۔ اپن ادھر سے ہی گاڑی ٹھیک کرواتے رہے ہمیشہ... اس نے مجھ سے کہا تھا۔ ورنہ بندے کیا کم ہیں۔ تیری مرضی نہیں تو نہ سہی۔'' ملک نے بے رخی سے کہا۔

وقار باہر نکل آیا۔ غصے سے اس کا برا حال ہو رہا تھا مگر یہ پہلا موقع نہیں تھا... گزشتہ چھ ماہ میں اس نے درجنوں جگہ اپلائی کیا تھا۔ اگر کہیں سے کال آئی تھی تو وہاں ایسی ہی صورت حال سے واسطہ پڑا تھا۔ بالکل ان پڑھ اور جاہل لوگ جو کبھی ریت کی تگاری اٹھاتے تھے اور بعد میں راج بن گئے تھے آج بلڈر کہلاتے تھے اور کنسٹرکشن کمپنی کے مالک تھے۔ کوالی فائیڈ انجینئر کی کسی کو ضرورت تھی تو محض دکھانے کے لیے۔ ٹھپا لگوانے کے لیے یا قانونی ضرورت پوری کرنے کے لیے۔ اصل کام ویسے ہی لوگ کر رہے تھے جیسے کمپنی کے مالک تھے۔

دوسرے شعبوں میں بھی صورت حال مختلف نہ تھی۔ آٹو انجینئرز پر اس کے باپ جیسے لوگوں کو ترجیح دی جاتی تھی جو چھوٹے سے بڑے ہو کے میکنک اور پھر استاد کہلانے لگے تھے۔ الیکٹریکل انجینئرز پر کئی جگہ پر الیکٹریشن رکھ لیے جاتے تھے کیونکہ یہ ہنرمند لیکن غیر تعلیم یافتہ کاریگر کم اجرت پر بدترین حالات میں کام کرنے کو تیار ہوجاتے تھے۔ وہ کام کے درست ماحول یا کام کے مقررہ اوقات کار یا لیبر لاز کی بات نہیں کرتے تھے۔ مالکان کی زبان میں نخرے نہیں کرتے تھے۔ کام کرتے تھے۔

وقار کا دل اب گھر جانے کو نہیں چاہتا تھا... گھر اب پہلے سے بھی زیادہ ناقابلِ قبول جگہ ہوگئی تھی۔ اس کا باپ گھر میں پڑا رہتا تھا۔ بے کاری کے عذاب نے اسے چڑچڑا بنا دیا تھا۔ کچھ عرصے سے وہ ہیروئن کا نشہ بھی کرنے لگا تھا جو ہر پریشانی کے خلاف ایک عارضی پناہ گاہ بن جاتا تھا۔

اس کی ماں دیوار سے ٹیک لگائے اسکول کے سالانہ امتحانات کی رپورٹ بکس پر سائن کر رہی تھی۔ وولٹیج کم ہونے سے سو واٹ کا بلب بھی ٹمٹما رہا تھا اور کم روشنی میں اس کی آنکھوں پر بہت زور پڑ رہا تھا۔ وہ بار بار چشمہ ہٹا کے آنکھوں سے بہنے والا پانی صاف کرتی تھی۔ ماں اب تیزی سے بڑھاپے کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اس کے سارے شوق ختم ہوچکے تھے۔ اس نے اپنے کپڑے بنوانا، بیوٹی پارلر جانا اور میک اپ کرنا سب چھوڑ دیا تھا۔ ہیئر کلر نہ لگانے سے اس کے بالوں میں اچانک سفیدی کا رنگ غالب آگیا تھا۔

وقار کو دیکھ کے ماں نے چشمہ اتارا اور آنکھیں صاف کر کے پوچھا۔ ''کیا ہوا...؟''

وقار نے جواب دینے کے بجائے کہا۔ ''اتنی کم روشنی میں تمہاری آنکھوں پر زور پڑتا ہے ماں۔''

''کام تو کرنا ہے... کل رزلٹ دیا جائے گا۔''

''تم دوسرا چشمہ بنوالو۔''

ماں نے دکھی لہجے میں کہا۔ ''کہاں سے بنوالوں... پیسے رکھے تھے پرس میں... تمہارے باپ نے نکال لیے۔''

اس کے باپ نے ٹی وی پر سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔ ''میں نے نہیں نکالے۔''

''جھوٹ مت بولو... تمہیں ہیروئن کی طلب تھی۔''

وہ چیخ کے بولا۔ ''ہاں تھی... ہیروئن میری ضرورت ہے۔ ساری عمر میں نے سب کی ضرورت پوری کی... جتنا کماتا سب تم پر لٹا دیا۔''

وقار چپکے سے اپنے کمرے میں چلا گیا جہاں اس کی چھوٹی بہن بہ ظاہر کتاب پر نظریں جمائے چپ بیٹھی تھی۔ وہ دوسرے کمرے سے آنے والی آوازیں صاف سن سکتے تھے۔

''مجھے بتادیں کیا کروں۔ اب مجھے بارہ ہزار تنخواہ ملتی ہے، اس سے گھر کا خرچ بڑی مشکل سے چلتا ہے۔''

''جب میری ورکشاپ تھی تو اس سے زیادہ ایک ہفتے کی کمائی تھی۔''

''وہ تو اب رہی نہیں... جو ورکشاپ کی جگہ کا حکومت نے دینے کا اعلان کیا تھا... وہ ملا نہیں تمہیں۔''

''وہ کسی کو بھی نہیں ملا... میری ورکشاپ کا سامان بیچ کے جو رقم ملی تھی اور کہاں گئی؟''

''وہ گھر میں خرچ ہوئی اور کہاں... اس مہینے تو گھر کا کرایہ بھی ادا نہیں ہوا۔ مالک مکان کب تک رعایت دے گا۔''

گلو نے چیخ کے کہا۔ ''کرایہ کیوں ادا نہیں ہوا؟''

''چلاؤ مت... تم جانتے ہو کرایہ بڑی ادا کرتی تھی۔ اپنی تنخواہ میں سے... اب اس نے شادی کرلی ہے... پہلے وہ استانی تھی۔ اب اسکول کی مالکن ہے مگر اسے تنخواہ نہیں ملتی۔''

دوسرے کمرے سے چھوٹی ایک دم اٹھ کے درمیانی دروازے میں جا کھڑی ہوئی۔ ''اگلے مہینے سے کرایہ میں دوں گی۔''

ایک دم خاموشی چھا گئی۔ پھر ماں نے کہا۔ ''تو کہاں سے دے گی؟''

''میں نے نوکری کرلی ہے۔''

باپ چلایا۔ ''ہمیں بتائے بغیر۔''

''کہاں نوکری کی ہے؟'' ماں نے سوال کیا۔

''میں کسٹمر ریلیشن آفیسر ہوں... ملک بلڈرز اینڈ ڈولپرز میں۔ بہت بڑی کمپنی ہے... ملٹی نیشنل۔''

وقار اٹھ بیٹھا۔ اسے وہ الفاظ یاد آنے لگے جو اس سے کچھ دیر پہلے ملک کے آفس میں ایک چمچے نے کہے تھے۔ ایک بڑی چمک دمک والی چھمک چھلو بھی تیرے سامنے ہوگی، ڈیکوریشن پیس۔

اس نے دہاڑ کے کہا۔ ''تم وہ نوکری نہیں کرو گی۔''

چھوٹی نے پلٹ کے پوچھا۔ ''کیوں؟ کیا تم نے نوکری کرلی ہے؟''

اور اس وقت وقار نے بھی فیصلہ کیا کہ وہ اپنی ڈگری کو جلا دے گا۔ بھول جائے گا کہ وہ انجینئر تھا۔ کیا فائدہ اس کا جب وہ گھر کا کرایہ بھی ادا نہیں کرسکتا اور اس کی بہن کو ملک

www.pdfbooksfree.pk

کے آفس میں ڈیکوریشن پیس کے طور پر استعمال ہونا پڑتا ہے... (اور بعد میں اس کی شراط بھی پوری کرنی پڑتی ہیں)

☆☆☆

تیسری سمت:

بیس فٹ لمبے اور دس فٹ چوڑے ہال جیسے کمرے میں پنکھے تو تین تھے لیکن درمیان والے کی رفتار آہستہ آہستہ کم ہوتی گئی اور اب اس کے عین نیچے لیٹنے والوں کو بھی ہوا نہیں ملتی تھی۔ لمبائی کے رخ بچھی ہوئی دو دریوں پر سولہ افراد سوتے تھے۔ نادر کے بالکل ساتھ عبداللہ دراز تھا جو اپنی بہت سی صفات کے باعث بودا، بدھا اور بدھو سب کچھ کہلاتا تھا۔ سائیں دوست اور اس کا معاون خصوصی..... دہشت فورس کا چیف اور اصل سے بڑا شیطان جلال داد عرف جلاد۔

سب اسے بودا کہہ کے پکارتے تھے۔ ان کے نزدیک وہ ایسا ہی تھا۔ احمق، سطحی اور بے کار۔ وہ خود اپنے آپ کو بدھا کہتا تھا۔ مہاتما بدھ کے بارے میں اس نے نہ جانے کس سے سنا تھا کہ وہ ان کی بڑی عزت کرتا تھا اور انہی کے آسن میں آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاتا تھا تو ہر مسئلے کا حل نکال لیتا تھا۔ کہتا تھا مجھے گیان ہوا ہے۔ بدھو وہ ہرگز نہ تھا مگر نظر آتا تھا اور بنتا بھی تھا۔

نادر کے ساتھ اس کی یاری بہت پرانی تھی۔ ویسے تو سب ہی سمجھتے تھے کہ بودا ان کا دوست ہے لیکن نادر کے سوا اس نے کسی کو کبھی اپنے دل کی بات نہیں بتائی تھی۔ جو اس کے دل میں ہوتا تھا، نہ کبھی اس کی زبان پر آتا تھا نہ چہرے پر جذبات کا عکس بن کے عیاں ہوتا تھا۔

جب نادر کو یہاں لایا گیا تھا تو اس کی حالت جنگل سے پکڑے جانے والے شیر جیسی ہو رہی تھی جو بالکل فطری بات تھی۔ اس نے تہیہ کر رکھا تھا اور اپنے عزم کا کئی بار کے اعلان بھی کیا تھا کہ وہ مر جائے گا یا سب کو مار کے نکل جائے گا لیکن یہ بے عزتی اور بے غیرتی کی زندگی قبول نہیں کرے گا۔ کم و بیش سب نو وارد ایسا ہی کہتے تھے لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ سب کچھ کرنے لگتے تھے۔ جیسے جنگل کا شیر سرکس میں ایک اشارے پر کرتب دکھانے لگتا ہے۔

نادر کو اب بھی یاد تھا کہ ابتدا میں اس کے ساتھ کیا سلوک ہوا تھا۔ اسے بھوکا پیاسا اور ننگا رکھا گیا تھا۔ تین دن تک وہ ایک پنجرے میں بند رہا تو اس کی ساری خونخواری نکل گئی۔ وہ بلی کی طرح میاؤں میاؤں کرنے لگا۔ پہلے وہ پھولا ہوا غبارہ تھا مگر تین دن بعد ہوا نکلے چھچھڑے کی طرح ہو گیا۔ پھر اسے سائیں دوست کے سامنے لایا گیا۔

سائیں دوست اس وقت پوری شاہانہ تمکنت کے ساتھ ایک تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ تخت پر سرخ قالین تھا اور سائیں کے پیچھے سرخ ریشم کے غلاف والا گاؤ تکیہ جس پر اس نے اپنی کہنی ٹکا رکھی تھی۔ اس نے بے داغ سفید کرتے شلوار کے ساتھ کندھے پر سفید ریشمی چادر ڈال رکھی تھی جو اس کے شانوں پر پن کر دی گئی تھی چنانچہ اٹھتے بیٹھتے پھسلتی نہیں تھی۔ وہ بھاری بھرکم جسم والا طویل قامت اور پر ہیبت شخص تھا۔ اس کی آنکھوں کے لال ڈورے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ سخت غصے میں یا پھر نشے میں ہے۔ اس کے سر پر سندھی کام والی رنگین دھاگوں اور شیشوں والی گول ٹوپی منڈھی ہوئی تھی جس کا پیشانی والا حصہ درمیان سے تکون کی شکل میں کٹا ہوا تھا... اس کی ڈاڑھی بہت گھنی اور مہندی رنگ کی تھی۔

سائیں کے پیچھے اور دائیں بائیں اس کے خاص مرید کھڑے تھے جو سب کے سب سفاک نظر آتے تھے۔ جلال داد عرف جلاد نے اسے سائیں کے سامنے ایسے پھینک دیا جیسے وہ انسان کا بچہ نہیں، قربان کیا ہوا جانور ہے۔

نادر میں چوٹ لگنے کے باوجود کراہنے کی طاقت بھی نہ تھی۔ وہ فرش پر بچھے قالین پر اسی طرح پڑا رہا۔ تین دن تک مار کے سوا کچھ اور نہ کھانے سے اس کی جسمانی قوت صفر پر آ گئی تھی اور وہ سمجھ رہا تھا کہ اب کسی بھی لمحے دم توڑ دے گا۔ اس کے اندر جو کچھ تھا وہ پنجرے میں ہی نکل گیا تھا۔

سائیں نے اسے پاؤں کی ٹھوکر سے سیدھا کیا۔ پھر اس کے اوپر اپنا پیر جوتوں سمیت رکھ دیا۔ نادر کے سینے پر وہ بوجھ کسی چٹان کی طرح تھا۔ اس کا سانس رکنے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے دباؤ سے اس کی ساری پسلیاں چرمر ہو جائیں گی۔

''کیوں اوئے... کچھ عقل آئی یا ابھی اکڑ باقی ہے...'' سائیں نے کہا۔

جلاد نے مسکرا کے کہا۔ ''سائیں! اب تو صرف جان رہ گئی ہے... چاہو تو نکال دو۔''

سائیں نے پھر سوال کیا۔ ''بول... مرنا چاہتا ہے تو قبر تیار ہے... گاڑ دیں اسی حالت میں۔''

حیرت انگیز طور پر نادر نے نفی میں سر ہلایا۔ اس نے مرنا قبول نہیں کیا جیسا کہ اس کا ارادہ تھا اور اس نے اعلان بھی کیا تھا۔ تب سے اب تک وہ زندگی کے لیے مسلسل سمجھوتے کرتا چلا آ رہا تھا۔ سائیں نے ٹھوکر مار کے اسے دور کیا تھا اور جلاد نے اسے اٹھانے کا حکم دیا تھا۔ اگلے تین

www.pdfbooksfree.pk

دن اس کی بہت خاطر داری ہوئی تھی۔ پہننے کے کپڑوں کے علاوہ اسے اچھی خوراک دی گئی تھی اور وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ اٹھ کر کھڑا ہو سکے۔

نادر کی عمر اس وقت بارہ سال تھی۔ اسے اپنی پہلے والی زندگی کا ایک ایک دن یاد تھا۔ وقتی طور پر اس نے ہار مان لی تھی کیونکہ اس کا جسم ہار گیا تھا۔ طاقت بحال ہوتے ہی اس کی ذہنی توانائی بھی واپس لوٹ آئی۔ سائیں دوست کے ڈیرے پر کیا ہوتا تھا۔ یہ وہ اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ تربیت کے تمام عرصے کے دوران اس پر سخت پابندیاں تھیں۔ وہ ہر جگہ نہیں جا سکتا تھا۔ ہر ایک سے نہیں مل سکتا تھا۔ فرار ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ جگہ زیر زمین تھی اور اوپر بھی آستانہ عالیہ کے گرد جیل خانے جیسی بلند دیواریں تھیں۔ مقفل دروازے کے اندر باہر مسلح پہرے دار ہر وقت متعین رہتے تھے اور چڑیا کا بچہ بھی اندر بلا اجازت پر مارنے کی کوشش کرے تو وہ اسی طرح گولی مار سکتے تھے جیسے اندر سے باہر جانے کی ناجائز اور غیر قانونی کوشش کرنے والے کو۔ قانون وہاں سائیں دوست کا چلتا تھا۔

پہلے پہل اسے نقل و حرکت کی محدود اجازت ملی تو کچھ اسی کی عمر کے لڑکے بھی اس سے ملنے آتے۔ جو درحقیقت بھیجے گئے تھے۔ ان سب نے اپنے اپنے انداز میں ایک ہی بات کہی۔ یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنا بے سود ہے۔ اس میں جان جائے گی۔ تعاون کرنے میں بڑا فائدہ ہے۔ ہم جب آئے تھے تو تم جیسے ہی تھے لیکن بعد میں کوئی بھی لوٹ کے اپنے گھر نہیں گیا۔ حالانکہ پوری آزادی تھی۔

عبداللہ واحد لڑکا تھا جس نے اسے چپکے چپکے بتایا کہ تمہارے پاس آنے والے سب سائیں کے بھیجے ہوئے غلام تھے اور سب کو اس کر رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بعد میں واپس جانا چاہے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ بہت سے لڑکے موقع ملتے ہی فرار ہو گئے اور بہت سے پکڑ کر واپس بھی لائے گئے۔ کئی جلاد کے ہاتھوں تشدد کے باعث ہلاک بھی ہوئے۔ ان کی قبریں آستانہ عالیہ کے پچھواڑے ان کھیتوں میں ہیں جہاں سبزی کاشت کی جاتی ہے۔

نادر بہت پرامید ہو گیا۔ ”میں بھی بھاگ جاؤں گا اور کبھی ان کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔“

”ابھی سے اعلان مت کرو۔ کیا پتا تم نہ جا سکو۔ کیا پتا پکڑے جاؤ کیا پتا مارے جاؤ۔ بس چپ کر کے دیکھو۔ سوچو اور سمجھو۔ یہ آج کے بدھا کے تین اصول ہیں۔“

”بدھا کون ہے؟“

”میں... آج کا بدھا۔“ وہ ہنسا اور مہاتما بدھ کے آسن میں آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا۔ آنکھیں بند کر کے وہ زیر لب بولنے لگا۔ ”یاد رکھو آدمی کی طاقت اس کی عقل ہے۔ بے وقوف بن کے دنیا کو بے وقوف بناؤ۔ صرف اپنے لیے جیو۔ یہ ہیں زندگی گزارنے کے تین اصول۔“

وہ ایسی عجیب و غریب باتیں کرتا تھا اور ہمیشہ تنہا رہتا تھا۔ ایک طرف اسے سائیں دوست اور اس کے چیلوں کا اعتماد حاصل تھا تو دوسری طرف وہاں لائے جانے والوں کی اکثریت اسے اپنا دوست سمجھتی تھی۔ اس کی عمر نادر سے دو تین سال زیادہ ہو گی لیکن وہ گورا چٹا خوبصورت لڑکا تھا جو ہر وقت بنا ٹھنا، بالوں میں تیل اور آنکھوں میں سرمہ لگائے پھرتا رہتا تھا۔ اسے ہر جگہ آنے جانے کی آزادی تھی اور نادر نے محسوس کیا کہ جلاد بھی اس کے ساتھ سختی سے پیش نہیں آتا۔

نادر کو آستانہ عالیہ پر دوسرا ہفتہ تھا اور عملاً اس کی تربیت کا آغاز ہو چکا تھا کہ ایک دن کھانا کھاتے ہوئے عبداللہ نے اس سے پوچھ لیا۔ ”تم کہاں سے لائے گئے ہو؟“

نادر نے اسے اپنے گھر اور گاؤں اور پھر اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے بارے میں بتایا۔ بتاتے بتاتے وہ رونے لگا۔ اسے وہ سب لوگ بہت یاد آتے تھے جن سے وہ بچھڑ گیا تھا۔ اپنا چھوٹا سا گاؤں، اپنا کچا مکان اور اپنے دوست، سب سے بڑھ کر اپنی ماں۔

”ہم نو بہن بھائی تھے۔“ اس نے عبداللہ کو بتایا۔ ”میرا نمبر چوتھا یا پانچواں تھا۔“

بودا ہنسنے لگا۔ ”تجھے یہ بھی یاد نہیں۔“

”دراصل... چوتھا کوئی اور تھا... میرا بڑا بھائی۔ ماں تو کہتی تھی کہ وہ مر گیا تھا۔“ وہ چپ ہو گیا۔

”کیا وہ زندہ تھا۔“

”پتا نہیں... میری دادی نے مجھے بتایا کہ تیری ماں ڈائن ہے۔ کھا گئی اسے، بیچ دیا صرف پانچ سو روپے میں۔“

”کس کو بیچ دیا؟“

”جب میں نے دادی کی بات ماں سے کی تو ساس بہو کی خوب لڑائی ہوئی۔ میری ماں تگڑی تھی اسی لیے ساس کو پکڑ کے اسے نیچے گرا لیا اور اس کے منہ پر تھوکا۔ دادی نے اسے خوب کوسا اور خوب گالیاں دیں۔ اور بعد میں رو رو کے بتاتی رہی کہ شہر سے کوئی آیا تھا۔ ان کو نئے پیدا ہونے والے بچے کی ضرورت تھی۔ دادی کو اس نے بتایا کہ انہوں نے پانچ سو دیے تھے مگر یہ جھوٹ تھا۔ اس نے پورے ہزار لیے تھے۔“

”ہزار روپے میں اس نے اپنا بچہ بیچ دیا... کیوں؟“

”پتا نہیں... جب شام کو میرا باپ گھر آیا تو اس نے ماں کو بھی مارا اور دادی کو بھی گالیاں دیں کہ تیری زبان کاٹ کے پھینک دوں گا۔“ نادر نے کہا۔ ”میری ہمت نہ پڑی کہ اس سے کوئی سوال کرتا کہ جھوٹ کون بول رہا تھا اور سچ کون... لیکن بعد میں مجھے معلوم ہو گیا۔ دادی کا الزام غلط نہیں تھا۔ ماں نے شوہر سے پوچھ کے بچہ دیا تھا۔“

عبداللہ دم بخود رہ گیا۔ ”ایسی کیا آفت تھی؟“

”ماں نے خود مجھے روتے روتے بتایا، میرے باپ کو دو ہزار کا قرضہ چکانا تھا۔ زمیندار نے کہا کہ اس سال سارا قرضہ ادا نہ کیا تو تیری بیٹی لے لوں گا۔ میری سب سے بڑی بہن کی عمر اس وقت بارہ سال تھی اور اگر میرے بڑے بھائی کا سودا نہ ہوتا تو پھر بڑی بہن کا ہوتا۔ وہ زمیندار کے گھر میں رہتی۔ وہ پینتالیس سال کا ہٹا کٹا مرد تھا۔ میری بہن تو مر جاتی لیکن اس کے سوا چارہ بھی نہ تھا۔ ایسے میں اچانک قدرت نے ان کی مدد کی۔ شہر سے کوئی بندہ آیا، اس نے ماں کو برساتی نالے پر کپڑے دھوتے اور نہاتے دیکھا۔ میرے بڑے بھائی کی پیدائش سے چند دن پہلے اس نے کسی سے معلوم کیا اور جس دن بچہ پیدا ہوا اس دن گھر آ گیا۔ میری ماں کی صحت بہت خراب ہو رہی تھی۔ اسے کافی عرصے سے بادی کا بخار تھا۔ اس کی چھاتیوں میں دودھ ہی نہیں اترا تھا۔ اس بندے نے دو ہزار میں بچہ خریدنا چاہا اور کہا کہ اسے ایک امیر آدمی گود لینا چاہتا ہے جس کے بچے نہیں ہوتے۔ میری ماں نے اسے گالیاں دیں اور باپ نے بھی دھکے دیے مگر دو سے بڑھ کر وہ پانچ پر آ گیا تو میرے ماں باپ دونوں ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ پانچ ہزار تھے جو میری دادی نے پانچ سو سنے۔ ماں کہتی تھی کہ اچھا ہی ہوا وہ آرام سے تو رہے گا۔ اچھا کھائے گا، اچھا پہنے گا۔ اسکول جائے گا، مگر وہ روئی بھی بہت تھی۔“

”کسی نے اس بندے سے پوچھا نہیں کہ گود لینے والا کون ہے، کہاں رہتا ہے؟“

”نہیں۔ اس نے کہا تھا کہ یہ سب چھوڑو بچہ خاموشی سے میرے حوالے کر دو اور بس..... اور اس طرح دیکھا جائے تو ہم نو بہن بھائی نہیں تھے۔ چودہ تھے۔ پانچ نہیں اور نو بھائی۔“

”کیا... ہر سال کوئی بچہ پیدا ہو جاتا تھا؟“

”ایسا ہی ہوگا۔ میرے باپ نے زمیندار کا سارا قرضہ چکا دیا۔ وہ بہت مایوس ہوا اور گرم بھی کہ حرامزادے اتنے پیسے کہاں سے لایا تو؟ کیا کڑی بیچ دی زیادہ پیسوں میں۔ میرے باپ نے کہا کہ کڑی خیر سے گھر میں ہے۔ آ کے دیکھ لے۔ اور پیسا میں کہاں سے لایا اس سے تجھے کیا۔ میرے ماں باپ نے تو یہی مشہور کیا تھا کہ بچہ مرا ہوا پیدا ہوا تھا۔ اس کا جنازہ نہیں ہوا۔ ہم نے خود ہی دفنا دیا۔ لیکن بعد میں ساس نے بہو کے خلاف یہ الزام بھی نشر کر دیا۔ لوگوں نے برا بھلا کہا مگر پھر چپ ہو گئے۔ اس کے بعد والے دو بچے واقعی مر گئے مگر میرے باپ نے دولڑکے اور بیچے۔“

عبداللہ پھر بھونچکا رہ گیا۔ ”اسے لالچ پڑ گیا تھا؟“

”ایسا ہی ہوگا... مجھے نہیں معلوم کہ خریدار وہی تھا یا کوئی اور۔ اور میرے باپ نے ہر بچے کی کیا قیمت وصول کی۔“

”اسے زیادہ ہی قیمت ملی ہوگی۔ اولاد نرینہ کی مانگ بہت ہے اور وہ بھی تجربہ کار ہو گیا تھا، اس کا تو اچھا بزنس بن گیا ہوگا۔ تیری ماں ہر سال ایک بچہ دے اور وہ بچہ پانچ دس ہزار دے جائے۔“

نادر نے سر ہلایا۔ ”نہیں یار... پندرہواں بچہ جنتے وقت وہ مرتے مرتے بچی تھی اس کی صحت بالکل جواب دے چکی تھی۔ ڈاکٹر نے بچے روک دیے۔“

”تجھے غصہ نہیں آتا ان پر... اپنے ماں باپ پر۔“

”شاید وہ مجبور تھے۔ اتنے بچوں کو کیسے پالتے؟ ہم ایک کمرے میں سوتے تھے تو ایک دوسرے پر چڑھ جاتے تھے۔ ایک وقت کھاتے تھے ورنہ ہمیں آزادی تھی کہ جہاں سے چاہیں پیٹ بھر لیں۔ مانگ کے کھالیں یا چرا کے۔ ہمارے گاؤں سے ایک میل کے فاصلے پر جی ٹی روڈ تھی۔ ہم وہاں چلے جاتے تھے اور آتی جاتی گاڑیوں کے مسافروں سے ہاتھ جوڑ کے کچھ مانگتے تھے۔ بعض اوقات کوئی سکہ یا نوٹ پھینک دیتا تھا۔ ہم اسے اٹھانے دوڑتے تھے۔ اصول یہ تھا کہ جو پہلے اٹھا لے۔ انہی دنوں میں میرا ایک بھائی کار کے نیچے آ گیا تھا۔ وہ مرا تو نہیں لیکن اس کی دونوں ٹانگیں کاٹنی پڑیں۔ کار والا اسے شہر لے گیا تھا۔ وہاں بڑے اسپتال میں اس کو چھوڑ کے بھاگ گیا۔“

”پھر وہ گھر کیسے واپس آیا۔“

”گھر کہاں آیا۔ وہیں فٹ پاتھ پر ڈال دیا تھا کسی نے۔ گاؤں کے کسی شخص نے دیکھا تو میرے باپ کو بتایا۔ اس نے کہا کہ اسے واپس لانے کا کیا فائدہ۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ کبھی کبھی میرا باپ اس کے پاس شہر جاتا تھا اور وہ باپ کی مدد کرتا تھا۔ اسے بھیک میں اچھے پیسے ملتے تھے۔“

www.pdfbooksfree.pk

عبداللہ نے کہا۔ ''اور اس کے باوجود تو واپس جانا چاہتا ہے اپنے گھر... آخر کیوں؟''

''یار میں اپنے بہن بھائیوں کو اور ماں باپ کو کیسے چھوڑ دوں۔''

''تیری مرضی دوست۔ یہاں رہتا تو زیادہ عیش کرتا۔'' عبداللہ نے کہا۔ اور پھر ہنس کے بولا... ''یار میں تیرا بڑا بھائی تو نہیں ہوں۔''

نادر نے حیرانی سے کہا۔ ''تیری شکل تو مجھ سے بالکل نہیں ملتی۔''

''مجھے کچھ پتا نہیں میں کہاں سے آیا تھا... کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ مجھے تیرے ماں باپ سے خرید کے لائے ہوں۔''

آستانۂ عالیہ پر سائیں دوست کی پیری مریدی کا دھندا الگ چلتا تھا۔ وہاں بے اولادوں کو اولاد، لڑکیاں جننے والی عورتوں کو اولاد نرینہ۔ قرض سے نجات اور ملازمت کے حصول تک ہر طرح کے تعویذ اور نقش بنا کے دیے جاتے تھے۔ بہوئیں ساس کی موت مانگتی تھیں تو ساس بہو کو کالے جادو سے مارنا چاہتی تھی۔ سوکنوں کے معاملات الگ تھے۔ سائیں دوست کے مشٹنڈے بھی خوب عیش کر رہے تھے۔ ان کے خصوصی چلے میں حاضری دینے والی کچھ بے اولاد عورتیں واقعی صاحب اولاد ہوتی تھیں اور کچھ نے بیٹے بھی جنے تھے۔ ظاہر ہے مراد پانے والوں کی پبلسٹی زیادہ ہوتی تھی۔ نامرادوں کے پاس اپنی تقدیر کو الزام دینے کے سوا چارہ نہ تھا۔

آستانۂ عالیہ پر ایک یتیم خانہ بھی تھا جہاں فقیر بنائے جاتے تھے اور بچے اغوا کر کے لائے جاتے تھے۔ انہیں ٹریننگ دی جاتی تھی اور مختلف شہروں کے ٹھیکے داروں کو فروخت کر دیا جاتا تھا۔ جلاد یعنی جلال داد بچوں کو معذور بنانے کا ایکسپرٹ تھا۔ وہ ان کے ہاتھ پاؤں توڑ کے ایسے موڑتا تھا کہ وہ رینگنے والی عجیب کراہیت انگیز مخلوق نظر آتے تھے۔ خوبصورت بچے ویسے ہی شوقین مزاج خرید لیتے تھے۔ خود بودا یعنی عبداللہ ایک ایسا ہی بچہ تھا جس کے اچھے پیسے مل سکتے تھے مگر سائیں دوست کا اس پر دل آ گیا اور وہ آستانۂ عالیہ پر ہی رہا۔

معلوم نہیں نادر کے ساتھ کیا سلوک ہوتا۔ اسے بھی لنگڑا، لولا اپاہج بنا کے کہیں بھیج دیا جاتا لیکن اس موقعے پر بودے نے دوستی کا حق ادا کیا اور اسے ہاتھ پاؤں ٹوٹنے سے بچا لیا۔ اس کے بارے میں فیصلہ ہوا کہ وہ اندھا بن کے بھیک مانگے گا۔

نادر کی حالت غیر ہو گئی۔ ''کیا وہ میری آنکھیں نکال دیں گے۔''

عبداللہ کا چہرہ سنجیدہ اور لہجہ مغموم ہو گیا۔ ''سوچ لے یار، تجھے کیا منظور ہے؟ لنگڑا معذور بن کے فٹ پاتھ پر پڑا رہنا... یا...''

''مجھے کچھ بھی منظور نہیں۔'' نادر نے چلا کے کہا۔ ''میں سب کو مار دوں گا اور خود بھی مر جاؤں گا، بھاگ جاؤں گا یہاں سے۔''

بودے نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا اور ہنس پڑا۔ ''اوئے پاگل خانے... تجھے کچھ نہیں ہوگا۔ تجھے اندھا بنانے کے لیے تیری آنکھوں میں لینسز لگا دیں گے۔ تیری آنکھوں میں سفیدی نظر آئے گی جیسے اندھوں کے ہوتی ہے۔''

نادر نے سکون کا سانس لیا۔ ''بودے... اگر میں بھاگ جاؤں؟''

''بھاگ جا...'' بودے نے سرسری انداز میں کہا۔ ''جب میں بھیک مانگنے جاؤں گا تو کون ہوگا دیکھنے والا۔ یہ لوگ مجھے چھوڑ کے چلے جائیں گے۔''

بودا ہنسنے لگا۔ ''کہاں چلے جائیں گے۔ ابے یہ ہر وقت ہر جگہ موجود رہتے ہیں۔ ان کی ہزار آنکھیں ہیں اور ہزار ہاتھ ہیں۔ تو جہاں جائے گا پکڑا جائے گا، کوشش کر کے دیکھ لے۔''

نادر نے اپنی طرف سے بڑی عاقلانہ کوشش کی... صبح جب بھکاریوں سے بھری گاڑی نکلتی تھی جسے بودا بھکاری ایکسپریس کہتا تھا جو ہر بھکاری کو شہر کے مختلف مقامات پر ڈراپ کرتی جاتی تھی۔ یہ سارے ٹھکانے طے شدہ تھے۔ یہاں کوئی دوسرا بھکاری نہیں آ سکتا تھا۔ بھکاریوں کے ٹھیکے داروں کا آپس میں ایک کاروباری معاہدہ تھا جس کی رو سے انہوں نے ٹھکانے اور علاقے بانٹ رکھتے تھے اگر کوئی ٹھیکے دار کوئی ٹھکانا لینا چاہتا تھا تو متعلقہ ٹھیکے دار سے بات کر کے اس کی قیمت ادا کر دی جاتی تھی جو گڈول کی طرح تھی۔ ٹھکانا زیادہ آمدنی والا ہے تو گڈول بھی زیادہ... گڈول کم زیادہ بھی ہوتی رہتی تھی مثلاً رمضان کے مہینے میں پارک اور میدانوں میں تراویح ہوتی تھیں تو آس پاس یا داخلے کے راستے پر۔ ان میں مساجد بھی شامل تھیں۔ بھکاری بہت کماتے تھے۔

نادر کے ساتھ ایک بچہ بھی رہتا تھا جو اس کی انگلی پکڑ کے چلتا تھا اور بڑا منجھا ہوا صدا کار تھا۔ اس کی آواز میں بڑا درد تھا۔ وہ نادر کو سڑک بھی پار کراتا تھا۔ نادر کو یقین تھا کہ

تربیت مکمل ہونے کے بعد اس کی اپائنٹمنٹ کرنے والے اب اس کی کارکردگی کا غور سے جائزہ لے رہے ہوں گے۔ وہ محنت کرتا ہے یا کام سے جی چراتا ہے۔ پیسے تو نہیں مارتا۔ فالتو خرچہ تو نہیں کرتا۔ بھاگنے کے موڈ میں تو نظر نہیں آتا۔

پورا ایک مہینا نادر نے اعتماد سازی میں لگا دیا۔ اسے کافی حد تک خود مختاری بھی حاصل ہو گئی۔ دو بار ایسا ہوا کہ چھوٹا بیمار تھا تو وہ اکیلا ہی ڈیوٹی دیتا رہا اور اس نے معمول کے مطابق کمائی لا کے جلاد کے ہاتھ میں رکھی۔ ایک بار بھکاری ایکسپریس کا انجن فیل ہو گیا تو وہ خود ہی بس میں بیٹھ کے آستانۂ عالیہ پہنچ گیا۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ نگرانی کرنے والے اس کی طرف سے بے شک ہو جائیں۔

بالآخر ایک دن نادر نے محسوس کیا کہ وہ آزاد ہے اور کچھ بھی کر سکتا ہے۔ دن بھر کی کمائی جیب میں ڈال کے وہ سیدھا ایک پولیس اسٹیشن چلا گیا۔ اسے ناتجربہ کاری کے باعث یہ معلوم نہیں تھا کہ بھکاریوں کی مافیا کو بھی پولیس کی سرپرستی حاصل ہے۔ تھانیدار نے اس کی ساری بات سنی اور پھر اسے حوالات میں بند کر دیا۔ وہ چلاتا رہا کہ تھانے دار صاحب میرے ماں باپ کو بلائیں۔ مجھے کیوں بند کیا ہے۔ جواب میں اسے کہا گیا کہ اس کے ماں باپ کو بلانے کے لیے بندہ بھیج دیا گیا ہے۔ وہ رات تک آ جائیں گے۔

حوالات میں کچھ پرانے پاپی تھے تو کچھ نادر جیسے نوآموز۔ ایک تجربہ کار بوڑھے شخص نے جو تھانے دار کے عناد کو دو سال سے بھگت رہا تھا نادر کی ساری کہانی سن کے افسوس سے سر ہلایا۔ ''تو نے بڑی غلطی کی یہاں آ کے بے وقوف۔ تو کیا سمجھتا ہے وہ تیرے ماں باپ کو بلائیں گے۔''

''کیوں نہیں بلائیں گے... تم دیکھ لینا۔ آج ہی رات کسی وقت پولیس آستانۂ عالیہ پر چھاپا مارے گی۔ سائیں دوست اور جلاد سمیت سارے بدمعاش پکڑے جائیں گے۔ وہاں جتنے لوگ قید ہیں، سب ان کے خلاف گواہی دیں گے۔''

حوالات میں موجود سارے قیدی مسکرانے لگے۔ ''تو واقعی پاگل ہے۔ کون سی دنیا میں رہتا ہے۔'' ایک نے کہا۔

دوسرا بولا۔ ''وہ تجھے واپس انہی کے پاس لے جائیں گے۔ یہ سب پولیس سے ملے ہوتے ہیں جو ایسے دھندے کرتے ہیں۔''

بڈھے نے کہا۔ ''تجھے پولیس کی مدد لینی ہی تھی تو پہلے جاتا کسی وکیل کے پاس۔ کسی این جی او یا صحافی کے پاس۔ انہیں اپنی ساری کہانی سناتا۔ پھر شاید تیرا کام ہو جاتا۔''

''پھر اب میں کیا کروں؟'' نادر سخت مایوس ہوا اور گھبرایا۔

بڈھے نے کہا۔ ''دیکھ ابھی اخبار والا ایک بندہ آئے گا۔ وہ کرائم رپورٹر ہے۔ ویسے تو بہت سے کرائم رپورٹر بھی پولیس سے ملے ہوتے ہیں اور وہی خبر دیتے ہیں جو پولیس چاہے مگر ہو سکتا ہے اس کی وجہ سے تو بچ جائے۔''

بڈھے کی بات سو فیصد درست ثابت ہوئی۔ اس کی ہدایات کے مطابق نادر نے کرائم رپورٹر کو دیکھتے ہی واویلا مچا دیا اور اس کا نام لے کر اسے اپنے پاس بلا لیا۔ اس نے حوالات کے باہر کھڑے ہو کے نادر کی ساری بات سنی اور بولا۔ ''اب تم بے فکر ہو جاؤ۔ تمہیں والدین سے ملانے کی ذمے داری میری۔ لیکن تمہیں سائیں دوست کے خلاف کچھ بولنے کی ضرورت نہیں۔ ان کا تم کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ تم صرف اتنا کہو کہ والدین سے بچھڑ گئے تھے۔ تم شہر آئے تھے ان کے ساتھ۔''

نصف شب کے بعد جلاد دو سپاہیوں کے ساتھ آیا۔ نادر کی روح فنا ہو گئی۔ اس نے سمجھ لیا کہ صحافی کا سہارا لینا بھی فائدہ مند ثابت نہ ہوا۔ شاید اس نے کوئی درد سر مول نہیں لیا اور یونہی جان چھڑائی یا پھر وہ بھی پولیس سے ڈر گیا۔ جلاد حوالات کے سامنے آ کے کھڑا ہو گیا اور اسے گھورتا رہا مگر کچھ بولا نہیں اور واپس چلا گیا۔ نادر کو یقین تھا کہ اب اسے واپس اسی جہنم میں بھیج دیا جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔

اگلے دن نادر کو تھانیدار کے کمرے میں بلایا گیا۔ وہاں ایک چگی ڈاڑھی والا لمبوترا شخص ایک نوجوان عورت کے ساتھ بیٹھا تھا۔ مرد کی عمر شاید پچاس پچپن برس تھی عورت کی اس سے نصف۔ وہ بڑی بنی ٹھنی اور میک اپ تھوپے بیٹھی تھی۔

تھانیدار نے نادر کے داخل ہوتے ہی کہا۔ ''دیکھو... یہ ہے تمہارا بیٹا۔''

مرد نے پلٹ کے دیکھا اور چلایا۔ ''نادر... میرا پتر۔'' اسے گلے لگانے کے لیے لپکا۔

نادر نے اسے دھکیلا۔ ''کون ہو تم۔ میں تمہیں نہیں پہچانتا۔''

مرد رونے لگا۔ ''اوئے ناپتر... ایسا مت کہہ۔ میں تیرا ابا ہوں۔ کیا ہوا اگر میں نے دوسری شادی کر لی۔ تیری ماں کے مرنے کے بعد۔''

''یہ جھوٹ بولتا ہے۔ یہ میرا باپ نہیں ہے۔'' نادر چلاتا رہا۔

www.pdfbooksfree.pk

تھانیدار نے نادر کو واپس بھیج دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ شخص جسے اس نے کبھی دیکھا نہیں آخر کیوں اسے اپنا باپ منوانے پر تلا ہوا تھا۔ یقیناً اس میں کوئی چکر تھا۔ بڈھے کی حالت اس رات بہت ابتر تھی۔ اس پر تشدد ہوا تھا اور لگتا تھا وہ مر جائے گا۔ اس نے نادر کو سمجھایا کہ وہ پولیس کی دشمنی مول نہ لے۔ جو شخص اس کا جعلی باپ بن کے آیا تھا وہ یقیناً سائیں دوست کا آدمی ہوگا۔ نادر کو اس کے حوالے کر دیا جائے گا اور وہ اسے واپس آستانہ عالیہ پر پہنچا دے گا۔

''پھر میں کیا کروں؟'' نادر نے بے بسی سے کہا۔

''انتظار کر پتر... اللہ کوئی سبب پیدا کرے گا۔'' بڈھا بولا۔

''اس صحافی نے بھی کچھ نہیں کیا۔''

''اگر میں زندہ یہاں سے نکل سکا تو تیرے لیے کسی سے ضرور بات کروں گا۔'' بڈھے نے کہا۔

لیکن ایسا نہ ہوا۔ اس بڈھے کو صبح حوالات سے نکال کر اسپتال لے جایا گیا مگر اس کا فائدہ نہ تھا، وہ مر چکا تھا۔ نادر اب سخت دہشت زدہ تھا اور بالکل مایوس ہو چکا تھا لیکن اس دن دوپہر کے بعد نادر کو پھر حوالات سے نکال کے تھانے دار کے کمرے میں لے جایا گیا۔

وہاں اپنے ماں باپ کو دیکھ کر نادر خوشی سے پاگل ہو گیا۔ وہ چیخ مار کے آگے بڑھا ہی تھا کہ اسے ساتھ لے جانے والے سپاہی نے اسے پکڑ لیا۔ نادر کو سخت حیرانی ہوئی جب اس کے ماں باپ سپاٹ چہرے کے ساتھ یوں بیٹھے رہے جیسے وہ کوئی اجنبی ہوں۔

تھانیدار نے پوچھا۔ ''پہچانو اسے... یہ ہے تمہارا بیٹا۔''

اس کے باپ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں جناب!''

نادر چلایا۔ ''بابا... میں نادر ہوں۔''

اس کے باپ نے سفاک لہجے میں کہا۔ ''ہمارے بیٹے کا نام مراد تھا۔''

نادر نے ماں کو پکارا مگر وہ منہ بند کیے دوسری طرف دیکھتی رہی وہ پہلے جیسی کمزور تھی۔ فاقہ زدہ اور ہڈیوں کا ڈھانچا۔ اس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ نادر سمجھ گیا شاید اس نے اپنا ایک بچہ اور بیچ دیا تھا۔ اسی لیے نادر کی قیمت بھی وصول کر لی تھی۔ سائیں دوست کے پاس بہت دولت تھی۔ نادر اپنے بھائیوں میں سب سے بیش قیمت ثابت ہوا ہوگا۔

ایک گھنٹے بعد تھانیدار نے اسے پھر بلایا۔ ''چل کاکا... تیار ہو جا۔ تیرا باپ اور سوتیلی ماں تجھے لینے آ رہے ہیں۔ پاگل... سوتیلی ماں تو ظلم کرتی ہے۔ تجھے گھر سے بھاگنے کی کیا ضرورت تھی۔''

نادر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''تھانیدار صاحب، میں واپس آستانہ عالیہ جاؤں گا۔''

تھانیدار کے لبوں پر ایک بے رحم مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''دو دن میں بڑا سیانا ہو گیا ہے تو...''

☆☆☆

نادر نے عبداللہ کا شانہ پکڑ کے ہلایا۔ عبداللہ نے پلٹ کے دیکھا۔ ''کیا بات ہے؟ نیند نہیں آ رہی ہے تو چلا جا سائیں کے پاس، مجھے سونے دے۔''

نادر نے دوبارہ اس کا شانہ تھپتھپایا تو وہ اُٹھ بیٹھا۔ ''آدھی رات کو کیا ضروری بات یاد آ گئی اچانک... صبح تک انتظار نہیں کر سکتا بھوتنی کے۔'' بودے نے ناگواری سے کہا۔

نادر اسے باہر لے گیا۔ آستانہ عالیہ کے اندر کی لائٹس آف تھیں مگر باہر کی روشنیاں جل رہی تھیں۔ گیٹ پر چوکیدار کرسی پر بیٹھا تھا، اس کی کلاشنکوف اس کے قریب ہی رکھی ہوئی تھی۔ اس نے عبداللہ کو دیکھ کے ہاتھ ہلایا۔ وہ اس سے دور ٹہلنے لگے۔

''عبداللہ! اب میں اور برداشت نہیں کر سکتا۔ میں تجھے بتا رہا ہوں... مجھے بھوری سے محبت ہو گئی ہے۔''

بودے نے جماہی لی... ''کون بھوری؟''

''سائیں دوست کی بیٹی اور کون۔''

بودا سچ مچ اچھل پڑا۔ اس کا جماہی لینے والا منہ کھلا رہ گیا۔ وہ کچھ دیر نادر کو دیکھتا رہا اور پھر کہنے لگا۔ ''اس سے محبت کس کو نہیں ہے۔ میں بھی مرتا ہوں اس پر۔ سارے ہی عاشق ہیں اس کے۔''

نادر نے کہا۔ ''لیکن وہ صرف مجھ سے محبت کرتی ہے۔''

''اچھا...؟ چل پھر شادی کر لے اس سے۔''

عبداللہ اس کا مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔

''ہم نے یہی طے کیا ہے۔ کیا خیال ہے تیرا، میں سائیں دوست سے بات کر کے دیکھوں۔''

اب عبداللہ نے غور سے نادر کی طرف دیکھا تو اس کی صورت پر صرف سنجیدگی تھی۔ ''نادر... تو سیریس ہے۔''

''کمال ہے یار! اس وقت میں تجھے اٹھا کے لایا ہوں تو کیا یہ مذاق کرنے کے لیے۔''

''تو نے اپنی شکل دیکھی ہے۔ اپنی اوقات پر غور کیا

ہے، اگر سائیں کے کانوں میں بھنک بھی پڑ گئی، اسے ذرا بھی شک ہو گیا تو تیری ہڈیاں بھی کہیں نہیں ملیں گی۔''

''بودے! معاملات بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ ہم اب پیچھے ہٹنے والے نہیں ہیں اس لیے تجھ سے پوچھ رہا ہوں۔''

عبداللہ نے کہا۔ ''میں بھی تیار ہوں، کہاں تو ایک نکے کا فقیر، لاوارث۔ کہاں سائیں دوست کی بیٹی۔''

نادر نے ایک فلمی ڈائیلاگ بولا۔ ''محبت اونچ نیچ کو نہیں دیکھتی ایسا ہوتا تو وہ مجھ سے چھپ چھپ کے کیوں ملتی۔''

بھوری کا یہ نام اس لیے پڑا تھا کہ اس کے بال بھورے تھے اور اس کی آنکھیں بھوری تھیں۔ وہ سائیں دوست کی تیسری بیوی کی پہلی بیٹی تھی۔ باقی دو سے کوئی اولاد نہ تھی۔ انہیں سائیں دوست طلاق دے دی تھی۔ چوتھی بیوی سے اس کے لڑکا ہوا تھا لیکن وہ مجہول تھا۔ بارہ سال کی عمر میں اس کا دماغ تین سال کے بچے جتنا تھا۔ عقیدت مند اسے بھی اللہ لوک کہتے تھے۔ دوسرا بیٹا ابھی صرف تین سال کا تھا۔ اس طرح دیکھا جائے تو بھوری اس کی واحد جوان اولاد تھی۔

وہ بالکل اپنی ماں پر گئی تھی اور بہت خوبصورت تھی۔ شاید ہی کوئی ہوگا جو اسے دیکھے تو دم بخود نہ رہ جائے۔ وہ آستانہ عالیہ پر کھیلتے ہوئے بڑی ہوئی تھی۔ وہ دس سال کی تھی جب اس کا باہر نکلنا بند کر دیا گیا تھا۔ تاہم وہ رہائشی حصے کے دروازے سے کار میں ماں کے ساتھ ہر جگہ آتی جاتی تھی۔ بودے کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کس کلاس میں اور کس اسکول میں پڑھ رہی ہے۔ آتے جاتے اس نے بھوری کی جھلک ضرور دیکھی تھی۔

اچانک اسے اپنے دوست نادر سے سخت حسد محسوس ہوئی۔ بودا یقیناً نادر کے مقابلے میں بہت حسین و جمیل تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو کئی سال وہ سائیں کا منظور نظر کیوں رہتا۔ بڑے ہو کے اس نے قد بھی خوب نکالا تھا اور اس کے مقابلے میں نادر کچھ بھی نہیں تھا۔ سیاہی مائل سانولا رنگ۔ چپٹی ناک، چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور کمزور جسم۔ بھوری نے آخر کیا دیکھ کے اسے پسند کر لیا۔ یہ بات سچ ثابت ہو گئی تھی کہ حسن دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے۔ اور پھر ایک لڑکی کی نظر کیسے دیکھتی ہے...!

نادر نے کہا۔ ''ایسے کیا دیکھ رہا ہے مجھے بودے۔''

بودا چونک پڑا۔ ''کب سے چل رہا ہے یہ سلسلہ؟''

''چھ سات مہینے ہو گئے۔''

''تمہاری ملاقات کیسے ہوئی؟'' بودے نے کہا۔

''سائیں دوست نے اس کو ایک گاڑی خرید کے دی ہے۔ چھوٹی سی کار ہے۔ وہ پہلے اسکول بس سے آتی جاتی تھی۔ ایک دن بس کو حادثہ پیش آ گیا بھوری آگے بیٹھی تھی اس کو چوٹیں آئیں اور چہرے پر شیشے کے ذرات سے خراشیں پڑ گئیں۔ کچھ عرصہ سائیں کا ڈرائیور اسے لے جاتا رہا۔ ایک دن اس کی نیت خراب ہو گئی۔ بھوری کو کسی سہیلی کے گھر جانا تھا، اس کی شادی تھی۔ بھوری خوب زیور اور اچھے کپڑے پہن کے گئی۔ رات کو واپسی میں ڈرائیور نے کہا کہ مجھے سائیں دوست نے ایک چیز پہنچانے کو کہا تھا۔ وہ گاڑی ایک ویران سڑک پر لے گیا۔ بھوری خفا ہوئی کہ اتنی دیر سے کھڑے تھے، یہ کام کیوں نہیں کیا۔ اس نے ایک دم گاڑی کو کسی احاطے میں موڑ دیا۔ بھوری کو اتر کے بھاگنے کا موقع ہی نہیں ملا۔''

بودا دم بخود سنتا رہا۔ ''اس نے بھوری کو خراب کیا؟''

''نہیں... اللہ نے اسے بچا لیا۔ وہاں بھوری کی چیخ پکار سننے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ اسے گھسیٹ کے اندر لے گیا۔ وہ کوئی موٹر ورکشاپ تھی۔ بھوری نے مزاحمت کی اور ایک دفعہ اس وحشی درندے سے خود کو چھڑا کے بھاگی تو اس کے ہاتھ میں لوہے کا پائپ آ گیا۔ اس نے پلٹ کر وار کیا جو پیچھے آنے والے کے سر پر لگا۔ وہ چکرا کے گرا تو بھوری نے پھر مارا۔ وہ مارتی رہی، وہ مر گیا۔ اس کا سر پاش پاش ہو گیا۔ وہ پھر بھی مارتی رہی۔ پھر پائپ پھینک کے بھاگی۔ احاطے میں اس کی گاڑی کھڑی تھی مگر اسے چلانا نہیں آتی تھی۔ وہ پیدل گھر تک گئی۔ آدھی رات کے وقت اکیلی لڑکی شادی بیاہ کے کپڑوں میں اور پورے زیور کے ساتھ۔ اس نے باپ کو ساری بات بتائی۔ اس نے کہا کہ ''شاباش! تو نے خود مار دیا اس کو۔ بہت بہادری کا کام کیا۔'' اس نے اپنے بندے بھیج کے لاش تو اٹھوا دی... مگر اس کے بعد بیٹی کو آنے جانے کے لیے گاڑی خرید کر دی۔ اس نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ تمہیں گاڑی چلانی آتی ہے۔ میں نے کہا کہ ہاں۔ بھکاری ایکسپریس آج کل میں ہی چلا رہا ہوں۔ بھکاری ایکسپریس کے نام پر وہ بہت ہنسا۔ کہنے لگا کہ اچھا کل سے تم بھوری بی بی کو اسکول سے لاؤ گے، لے جاؤ گے۔''

عبداللہ نے رشک سے کہا۔ ''سالے، بڑی قسمت ہے تیری۔''

''سائیں نے یہ بھی کہا کہ تم بھوری بی بی کو گاڑی چلانا بھی سکھا دو۔ میں نے کہا کہ جو حکم سائیں!''

''یہ تو نے مجھے نہیں بتایا؟''

www.pdfbooksfree.pk

"سائیں دوست نے منع کیا تھا۔ بھوری کو اسکول میں چھوڑ کے میں چلا جاتا تھا اپنے ٹھکانے پر۔ دوپہر کے بعد پھر اسکول پہنچ جاتا تھا اور بھوری کو گھر چھوڑ کے واپس چلا جاتا تھا۔"

"کب سے چل رہا ہے یہ سلسلہ...؟"

"ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے، ایک مہینا دس دن..."

بودے نے برہمی سے کہا۔ "اتنی جلدی پٹالیا تو نے اسے۔"

نادر نے سادگی سے کہا۔ "میری اتنی ہمت کہاں، اس نے خود ہی کہا کہ تم سائیں بابا کے لیے کام کرتے ہو۔ میں نے کہا کہ ہاں تو بولی کہ کیا کام کرتے ہو۔ میں نے صاف بتادیا کہ پہلے بھیک مانگتا تھا، اب بھیک مانگنے والوں کی نگرانی کرتا ہوں۔ اس نے پوچھا کب سے ہو یہاں۔ پہلے کہاں تھے، میں نے بتادیا۔"

"اس کا مطلب ہے وہ ریجھ گئی تجھ پر ورنہ یہ کیوں پوچھتی، آخر کیا دیکھا اس نے تجھ میں؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم، پہلے اسکول سے آتے جاتے بات ہوتی تھی۔ پھر وہ گاڑی چلانا سیکھتی رہی، آستانہ عالیہ کے پیچھے والے گراؤنڈ میں۔ اس نے کہا کہ تمہیں کچھ اور کرنا چاہیے، کوئی عزت والا کام۔ صرف پرائیویٹ میٹرک کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ تمہیں آگے پڑھنا چاہیے۔ بس ایسے ہی باتوں باتوں میں ہم قریب آگئے۔ مجھے بھی اندازہ ہوگیا کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے اور میں تو دیوانہ ہو ہی گیا تھا۔ کئی بار وہ مجھے جھوٹ بول کے اپنے ساتھ لے گئی۔ سہیلی کی سالگرہ ہے، سہیلی کے بھائی کی منگنی ہے۔"

"سائیں دوست کیا اندھا ہے، اسے شک نہیں ہوا؟"

"میرا خیال ہے اسے بیٹی پر زیادہ بھروسا تھا کہ وہ میرے جیسے دو کوڑی کے شخص کو پسند نہیں کرسکتی اور میں اس کی بیٹی کو بُری نظر سے دیکھنے کی جرأت نہیں کرسکتا لیکن بودے، عشق تو ایسے ہی ہوتا ہے۔"

"اب مجھے بھی یقین آگیا لیکن بیٹے... کیا وہ تیرے ساتھ بھاگنے پر تیار ہے؟"

"ہاں، ہر وقت۔ وہ جانتی ہے کہ اس کا باپ کبھی اس کا اور میرا رشتہ نہیں ہونے دے گا۔ وہ ڈرتی ہے کہ کہیں اسے معلوم نہ ہوجائے۔ اس سے پہلے ہمیں بھاگ جانا چاہیے۔"

عبداللہ کا موڈ اب بدل گیا تھا۔ "ابے یہ بھی سوچا ہے کہ بھاگ کے کہاں جاؤ گے۔ جہاں جاؤ گے پکڑے جاؤ گے۔ تم کب تک چھپ کے رہ سکتے ہو اور کیسے رہو گے۔ تم خالی ہاتھ کیا کرو گے؟"

"وہ کہتی ہے پیسے کی فکر مت کرو۔"

بودے کا پھر حسد سے بُرا حال ہوگیا۔ "وہ اپنے ساتھ لائے گی... باپ کے گھر سے؟"

"ہاں! لاکھوں کا زیور ہے اس کے گھر میں۔"

"دیکھ نادر... تو مارا جائے گا۔ یہ بہت خطرناک کام ہے۔ سائیں دوست تم دونوں کو مروادے گا۔"

"ہم مرنے کے لیے تیار ہیں۔"

"پھر مجھ سے کیا پوچھ رہا ہے، پاگل کے بچے اور مجھے کیوں بتا رہا ہے۔ فرض کر میں ہی جا کے سائیں دوست کو سب بتادوں... پھر۔"

"تو ایسا نہیں کرسکتا، مجھے معلوم ہے۔"

وہ مہاتما بدھ کے آسن میں آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔ "مجھے سوچنے دے۔ ابھی میرا دماغ خراب ہو رہا ہے۔"

کافی دیر بعد اس نے آنکھیں کھول کے کہا۔ "سوات میں میرا ایک رشتے کا ماموں رہتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم اب زندہ ہے کہ مر گیا۔ وہ قتل کر کے عمر قید کاٹنے جیل گیا تھا۔"

"کسے قتل کیا تھا اس نے؟"

"اس شخص کو جس نے اس کی محبوبہ کو خرید لیا تھا۔ اس کے بعد وہ بھاگ جاتا مگر ماما پکڑا گیا اور اس لڑکی نے خودکشی کرلی۔ ماما جیل سے نکل گیا اور سوات چلا گیا۔ وہاں فرضی نام سے رہتا ہے۔ یہ دس بارہ سال پرانی بات ہے۔ تم اس کے پاس چلے جاؤ، راستے کی ذمے داری میں نہیں لیتا۔ سائیں دوست کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ پولیس ہر طرف تمہیں تلاش کرے گی لیکن میرا خیال ہے کہ وہ پنڈی، لاہور یا کراچی جانے والی ٹرینوں، بسوں اور جہازوں کو دیکھیں گے۔"

"مگر ہم سوات جائیں گے کیسے؟"

"بھوری کو پہنا دے برقعہ، شٹل کاک ٹائپ۔ خود اپنا بھی حلیہ بدل لے۔ سر پر چترالی ٹوپی رکھ، عینک لگا، شلوار قمیص پہن لے میلی ملیشیا کی۔ ہوسکے تو کسی سے میک اپ کرا کے بال سفید کرا۔ ڈاڑھی لگوا لے۔ ڈراما کرنے والے سب کرسکتے ہیں۔ تو پہلے نکل سکتا ہے۔ بعد میں وہ آجائے گی۔ اگر تم مردان جانے والی بس میں بیٹھ جاؤ گے تو کوئی نہیں دیکھے گا۔ کسی کو شک نہیں ہوگا۔ وہاں سے چلے جانا سوات۔ اگر میرا ماما مل گیا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"اور نہ ملا تو..."

بودے نے ایک آہ بھری۔ "تمہاری قسمت... لیکن یہ سارا کھیل ہی قسمت کا ہے جو تم کھیل رہے ہو۔ ایک جوا ہے

جس میں تمہارے زندگی ہار جانے کے امکانات نوے فیصد ہیں اگر دس فیصد پر تم جیت گئے تو تمہاری خوش قسمتی۔"

بھوری کو ساری بات معلوم ہوئی تو وہ نادر پر سخت خفا ہوئی۔ "عجیب عقل سے پیدل آدمی ہو تم۔"

نادر ڈر گیا۔ "کوئی غلطی ہوئی مجھ سے؟"

"کیا ضرورت تھی اس مہاتما بدھ کو یہ سب بتانے کی!"

"وہ دوست ہے میرا۔"

"فضول بات مت کرو۔ جتنا میں جانتی ہوں تم نہیں جانتے۔ وہ خود کو سب کا دوست کہتا ہے مگر دوست کسی کا بھی نہیں ہے۔ دوست وہ ہے تو سائیں دوست کا، میرے باپ کا۔ گھن آتی ہے مجھے اس کے کردار سے۔ وہ جاسوسی کرتا ہے میرے باپ کے لیے۔"

"لیکن... اس نے تو مجھے اپنے ماما کا پتا دیا ہے... یہ ہوسکتا کہ بودا ویسا ہی ہو جیسا تم سمجھتی ہو۔ اس کا کردار واقعی قابل نفرت ہو لیکن میں نے اسے دیکھا ہے اور آزمایا ہے۔ وہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔ آدمی سود دشمن بنالے پھر بھی ایک دوست کے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

"چھوڑو یہ باتیں۔ میں کسی پر بھروسا نہیں کرسکتی۔ اب تو تم پر بھی نہیں۔ تم وہی کرو گے جو میں کہوں گی۔ وہ نہیں جو تمہارا دوست کہے گا۔"

"ٹھیک ہے... بتاؤ مجھے کیا کرنا ہے؟"

"ابھی کچھ نہیں بتاؤں گی، تمہارا کوئی بھروسا نہیں۔ ابھی جا کے پھر اسے بتادو گے۔"

بھوری جس کا اصل نام مہناز تھا کچھ قدرتی طور پر ذہین تھی، کچھ ان حالات نے اسے اپنی عمر سے زیادہ تجربہ کار بنادیا تھا جن میں اس کی پرورش ہوئی تھی۔ اس نے ہوش سنبھالا تو آستانہ عالیہ کا ماحول دیکھا۔ اس میں سوائے دھوکے، فراڈ، بے ایمانی اور جھوٹ کے کچھ نہیں تھا۔ اس کا ضمیر فروش اور ایمان فروش باپ سادہ لوح انسانوں کے لیے بڑا نیک، پرہیزگار اور پہنچا ہوا شخص تھا مگر وہ جانتی تھی کہ اندر سے اس کا کردار کیا ہے۔

آستانہ عالیہ ایک عیاشی اور بدکاری کا اڈا تھا۔ وہاں شراب ایسے پی جاتی تھی جیسے شریف گھرانوں میں چائے پی جاتی ہے۔ رات کو وہاں حجرۂ خاص میں رقص و سرود کی محفلیں بپا ہوتی تھیں جن کے لیے طوائفیں بلائی جاتی تھیں۔ ان میں سے کچھ خود کو ماڈل یا ایکٹرس کہتی تھیں۔

مہناز کی ماں کی اپنے شوہر پر کیا چلتی۔ وہ بیوی سے زیادہ کنیز کی حیثیت رکھتی تھی اور جانتی تھی کہ اس نے شوہر کے معمولات پر اعتراض کیا تو وہ اسے فارغ کرنے میں دیر نہیں لگائے گا۔ وہ اپنی بیٹی کو لے کر کہاں جائے گی۔ یہی سوچ کر وہ سب برداشت کرتی تھی لیکن ایک فکر اسے کھائے جاتی تھی۔ آستانہ عالیہ کا ماحول اس کی بیٹی پر بُرا اثر ڈالے گا۔ اگر خود اس نے برائی اختیار نہ کی تو وہ جسم برائی اپنے باپ سے نفرت کرنے لگے گی۔

آخر ایسا ہی ہوا۔ مہناز کے دل میں باپ کے لیے احترام یا محبت کا ایک ذرہ بھی نہ تھا۔ اس کے نزدیک وہ شیطان تھا جس سے صرف نفرت کی جاسکتی تھی۔ اسے اپنی ماں پر رحم بھی آتا تھا اور اس سے شکایت بھی رہتی تھی کہ وہ بیوی ہونے کے باوجود یہ سب برداشت کرتی رہی۔

نادر کی صورت میں کسی شہزادۂ گلفام والی کوئی بات نہ تھی۔ نہ وہ فلمی ہیرو تھا نہ کسی تاجر صنعتکار یا وزیر سفیر کا بیٹا۔ نہ ولایت سے ڈگری لے کر آنے والا اور نہ کوئی نامور شخصیت۔ مہناز کو اس کی شرافت اور کردار کی مضبوطی نے متاثر کیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے اور جب اس نے نادر کو آزمالیا کہ وہ زندگی کے سفر میں اس کا ہاتھ تھام کے چل سکتی ہے تو اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ اس خراب خانے سے نکل کے اپنی الگ دنیا بسائے گی۔

اس نے ماں کو شریک راز کیا اور ماں جس نے ساری زندگی جہنم جیسا عذاب جھیلتے گزاری تھی، بیٹی کو دعا دی اور حوصلہ دیا کہ جاؤ، اللہ تمہیں کامیابی اور خوشی دے اور وہ محبت دے جو میرے نصیب میں نہ تھی۔

مہناز نے بڑی ہوشیاری سے فرار کا منصوبہ بنایا۔ اس کی ایک ٹیچر نے گھر سے فرار ہو کے شادی کی تھی۔ اس کا باپ ایک قبائلی سردار تھا اور قبیلے کے رسم و رواج کے مطابق اس کو سترہ سال کی عمر میں ایک ایسے شخص کو دے دیا گیا تھا جو اٹھاون سال کا تھا اور پہلے بھی دو بیویوں کا شوہر تھا۔ اسے باپ کے ایک جرم کی سزا کے طور پر یہ قربانی دینی پڑی تھی لیکن اس نے بغاوت کی اور راتوں رات اپنے گاؤں کے ایک نوجوان کے ساتھ نکل گئی۔ انہوں نے کورٹ میں شادی کی اور جان بچانے کے لیے روپوش ہوگئے۔ گزشتہ سات سال سے نام بدل کے زندگی گزار رہے تھے اور دو بچوں کی پیدائش کے باوجود ڈرتے تھے کہ کہیں قبیلے والے انہیں تلاش کر کے مار نہ ڈالیں۔

اس ٹیچر نے مہناز کی مدد کی۔ ایک رات مہناز اور نادر خاموشی سے نکلے اور اس ٹیچر کے گھر میں بند ہوگئے۔ نادر کو بڑی حیرانی ہوئی کیونکہ ٹیچر کا گھر آستانہ عالیہ کے بہت

www.pdfbooksfree.pk

قریب تھا۔

مہناز نے کہا۔ ”تم نے سنا نہیں، چراغ تلے اندھیرا۔“

”کیا مطلب؟“

مہناز ہنسی۔ ”بچہ بغل میں، ڈھنڈورا شہر میں۔ دوڑ بھاگ کرنے والے لاہور، کراچی، پشاور یہاں سے وہاں ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔ یہ خیال کسی کے دماغ میں کیسے آسکتا ہے کہ ہم صرف سو گز دور بیٹھے ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے... لیکن ہم یہاں کب تک رہ سکتے ہیں؟“

”جب تک تلاش کرنے والے تھک کر نہ بیٹھ جائیں۔ وہ ٹھنڈے پڑ جائیں، پھر ہم آرام سے نکلیں گے۔ جہاں جانا ہوگا چلے جائیں گے۔“

نادر کو اس پلان کی کامیابی بہت مشکوک نظر آتی تھی۔ اسے دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کسی روز دروازے توڑ کر سائیں دولت کے غنڈے اندر آجائیں گے اور انہیں مار جائیں گے۔ ٹیچر کے ذریعے ان کو باہر کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ سائیں دوست نے مہناز کے اور نادر کے غائب ہو جانے کے بعد ہر طرف اپنے آدمی لگوا دیے تھے۔ پولیس نے کراچی سے خیبر تک ہر بس، ٹرین اور جہاز کے اڈے پر انہیں دیکھا۔ ان کی تصویریں اخبار میں شائع ہوئیں مگر صرف ایک دن۔ دیکھنے والوں نے دیکھیں اور بھول گئے۔ تلاش کرنے والے ناکام رہے۔

مہناز اور نادر ایک کمرے میں بند رہے۔ وہ ایک منٹ کے لیے باہر نہیں آئے۔ انہیں وہیں کھانا پینا ملتا رہا۔ ٹیچر ان کی ہر ضرورت اندر ہی پوری کرتی رہی اور اس کے شوہر نے اس معاملے میں بیوی کا پورا ساتھ دیا۔ مہناز کو یہ بھی معلوم ہوا کہ باپ نے اس کی ماں کو بیٹی کے فرار کا ذمے دار ٹھہرایا تھا اور اسے اتنا مارا تھا کہ وہ مرتے مرتے بچی تھی۔

اس ٹیچر کا رول ایسا تھا کہ کوئی بھی اس پر شک نہیں کرسکتا تھا۔ وہ معمول کے مطابق اسکول آتی جاتی رہی اور دیکھنے والوں کو اس کے رویے میں بھی کسی فرق یا تبدیلی کا شبہ تک نہ ہوا۔ آستانہ عالیہ کے قریب ہونے سے اس کو فائدہ یہ ہوا کہ وہ سائیں دوست کے بارے میں افواہیں اور خبریں سنتی رہی۔ وہ جگہ مرجع خلائق تھی، عقیدت مند دیکھتے تھے کہ سائیں کی حالت خراب ہے۔ وہ بیمار لگتا ہے ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتا ہے۔ پھر اسکول سے بھوری کے غیر حاضر ہونے کی بات عام ہوئی۔ ان فقیروں نے جو سائیں کے جیسے کہلاتے تھے، اندر کی باتوں کو باہر پھیلایا۔ ان میں سب سے زیادہ پریشانی بودے کو تھی۔ نادر اچانک غائب ہو گیا تھا اور سوات بھی نہیں پہنچا تھا۔

ایک مہینے سے زیادہ گزر گیا تو مہناز اور نادر اپنی پناہ گاہ سے باہر آئے۔ ان کی مددگار ٹیچر نے اسکول کے ایک سابق چوکیدار کی مدد حاصل کی۔ وہ پٹھان تھا اور اسکول چھوڑنے کے بعد کچھ عرصہ پشاور کی ویگن چلاتا رہا۔ پھر ایک حادثے میں اس کا بایاں پاؤں کاٹ دیا گیا۔ اس سے وعدہ کیا گیا کہ اس خدمت کے صلے میں اس کو اتنا معاوضہ دیا جائے گا کہ وہ کسی بہترین اسپتال سے مصنوعی ٹانگ لگوائے اور دوبارہ ڈرائیور بن جائے۔ اس کا نام بہرام خان تھا۔

بھوری کو سوات جانے میں تامل تھا۔ وہ ڈرتی تھی کہ کہیں بودے نے دوغلے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے سائیں دوست کو سب بتا نہ دیا ہو مگر نادر کو یقین تھا کہ وہ ایسا نہیں کرسکتا۔ بہرام خان چالیس سال کا خالص پٹھان تھا۔ اس کا لباس، حلیہ اور شرعی ڈاڑھی کے ساتھ اس کی زبان سرحد کے ہر علاقے میں قابل قبول تھی۔

آخری وقت میں بھوری کے اصرار پر نادر نے اپنا حلیہ بدلنے کا ارادہ ترک کر دیا اور خود بھی بھوری کی طرح سفید شٹل کاک برقعے میں روپوش ہو گیا۔ برقعہ پہن کے سوات تک سفر کرنا نادر کے لیے سخت ترین آزمائش تھا اور بھوری کا مذاق اسے مزید پریشان اور شرمندہ کرتا تھا لیکن بھوری کی یہی دانش مندی ان کی جان بچانے کا سبب بن گئی۔

جب بالآخر وہ سوات پہنچے تو بہرام خان نے مقامی لوگوں سے اس شخص کے بارے میں معلوم کیا جسے بودے نے اپنا ماما قرار دیا تھا تو انہیں معلوم ہوا کہ نامعلوم افراد نے اسے گھر میں گھس کے قتل کر دیا تھا۔ پاس پڑوس کے لوگوں نے بتایا کہ وہ لوگ رات کو آئے تھے اور دروازے توڑ کے اندر گئے تھے۔ صبح لوگوں نے اس کی لاش صحن میں پڑی دیکھی۔ فائر کی آواز کسی نے نہیں سنی۔ قاتلوں نے اس کے کلہاڑی سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے تھے۔ پولیس کا کہنا تھا کہ یہ ذاتی دشمنی کا نتیجہ تھا مگر دشمن مقامی لوگ نہیں تھے۔ یہاں کلہاڑی سے قتل کرنے کا دستور بھی نہیں تھا۔

بہرام خان پر شک کرنے کا سوال ہی نہ تھا۔ وہ اور دو برقعہ پوش خواتین پشاور سے آئے تھے اور یہ بات سن کے واپس لوٹ گئے۔ بھوری تقریباً تین لاکھ نقد اور اس سے دگنی مالیت کے زیورات سمیٹ لائی تھی۔ بہرام خان کو انہوں نے پچاس ہزار دے کر شکریے کے ساتھ رخصت کر دیا اور

خود راولپنڈی سے کراچی جانے والی گاڑی میں بیٹھ گئے۔

کراچی جانے کا آئیڈیا بھی بھوری کا تھا۔ ”ہم اور کہیں بھی گئے تو لوگ شک کریں گے۔ سرحد بلوچستان میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمیں زبان نہیں آتی۔ نہ پشتو نہ بلوچی۔ لوگ صدیوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ یہی مشکل سندھ میں ہوگی۔ صرف کراچی ایک ایسا شہر ہے جہاں ہر صوبے اور ہر ملک کے لوگ آباد ہیں۔“

”یہ تمہیں کیسے معلوم، تم کب کراچی میں رہی ہو۔“

”مجھے ... بودے نے بتایا تھا کہ وہاں برما، گوا، بنگال اور افغانستان سے آئے ہوئے لوگوں کے علاوہ پاکستان کے ہر علاقے کے لوگ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں آباد ہیں۔ وہ انسانوں کا ایک سمندر ہے۔“

”بودے نے تمہیں یہ سب کیوں بتایا تھا؟“

”سچ بتاؤں۔ وہ تھا میرے چکر میں، بہانے بہانے سے اشاروں میں کچھ کہہ جاتا تھا۔ دراصل اسے اپنی خوبصورتی پر بڑا ناز تھا۔ ایک دن اس نے موقع پا کے اظہار محبت کر دیا اور مجھ سے کہنے لگا کہ ہم کراچی چلے جائیں گے۔ جو وہاں قسمت آزمانے جاتا ہے کامیاب ہوتا ہے۔ میں اتنی دولت کماؤں گا کہ ہمارا سمندر کے کنارے محل ہوگا، گاڑیاں ہوں گی، نوکر چاکر ہوں گے۔ میں پہلے تو سنتی رہی۔ پھر میں نے اسے وہ ذلیل کیا۔ ایسا بے عزت کیا کہ سارا عشق بھول گیا۔ میں نے کہا کہ محبت کرتے ہیں مرد۔ تم تو نخے ہو۔ سائیں دوست کی داشتہ ہو۔ تم صرف ایک کام کرسکتے ہو...“ وہ رک گئی۔

”یہ سب کہہ دیا تم نے...“

بھوری کا رنگ سرخ ہو گیا۔ ”ہاں... اور میں نے کہا کہ اب میں بتاتی ہوں اپنے باپ کو کہ تم مجھے ورغلا رہے تھے۔ وہ میرے پاؤں پڑ گیا۔ سچ مچ ... میں نے ایک پاؤں اٹھا کے کہا کہ اچھا میرے تلوے چاٹو اور تمہارے اس دوست نے اپنی زبان سے تلوے چاٹے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بدلہ لے گا۔ اس نے تمہیں اعتماد میں لیا اور ہمارے نکلتے ہی سائیں دوست کو سب بتا دیا کہ ہم کہاں گئے ہوں گے۔“

انہوں نے ٹرین کی اکانومی کلاس میں سفر کیا۔ جب یہ کراچی میں اترے تو ان کے سامنے ایک اجنبی شہر تھا جو اپنی وسعت اور آبادی میں کسی ملک جیسا تھا۔ یہاں نہ ان کا کوئی شناسا تھا اور نہ گواہ۔ مگر کوئی دشمن بھی نہ تھا۔ مہناز نے یہاں سیاہ ریشمی برقعہ اوڑھا اور نادر نے بھی کسی حد تک چشمہ لگا کے اور بال بڑھا کے اپنا حلیہ بدلا۔ انہوں نے پہلے جو ہر اسکوائر میں اور پھر یوسف پلازا میں کرائے پر فلیٹ لیا جو سیکڑوں فلیٹوں کا ایسا شہر تھا جس میں کوئی کسی کو نہیں جانتا تھا اور کسی سے رابطہ نہیں رکھتا تھا۔ نادر نے ہمیشہ مہناز کی فہم و فراست پر بھروسا کیا۔ انہوں نے تھوڑا تھوڑا کر کے اپنا زیور فروخت کیا۔ پانچ چھ لاکھ کے زیور کو بیچ کے انہیں چار سوا چار لاکھ ہی ملے مگر باقی نقد رقم کو شامل کر کے ان کے پاس اتنا ہو گیا کہ نادر کوئی کام کرسکے۔

نادر نے کئی کام کیے۔ بالآخر وہ سپلائی کے کام میں جم گیا۔ وہ پہلے موٹر سائیکل پر بسکٹ ٹافیاں دکانوں پر پہنچاتا رہا۔ پھر اس نے سوزوکی پک اپ لے لی اور ڈسٹری بیوشن کے ایک ادارے سے منسلک ہو گیا۔ سیلز مین شپ میں تجربے کے ساتھ اس کا منافع بھی بڑھتا گیا۔ اس نے فلیٹ چھوڑ دیا اور یوسف پلازا کے پیچھے ہی فیڈرل بی ایریا کے بلاک سولہ میں ایک مکان خرید لیا۔ اس وقت تک اس کے دو بچے ہو چکے تھے۔ بڑا خاور تھا اور چھوٹی فرح۔ خاور کی عمر پانچ سال تھی اور فرح تین برس کی ہو چکی تھی۔

اس وقت تک انہیں یقین آچکا تھا کہ وہ محفوظ ہو گئے ہیں۔ ان کو دہشت زدہ کرنے والا ماضی بہت پیچھے رہ گیا تھا اور وہ خون خشک کرنے والے تصورات سے نجات پا چکے تھے۔ وہ اپنی کامیابی پر اور اپنی رفاقت پر مسرور تھے اور اپنے تعلقات کا ایک حلقہ بنانے میں بھی کامیاب ہو چکے تھے۔ وہ سائیں دوست کی بات بھی نہیں کرتے تھے۔

لیکن سائیں دوست کے دل پر ذلت کا زخم مندمل نہیں ہوا تھا۔ منہ پر کالک مل کے جانے والی بھوری اور نظفۂ حرام نادر نے اس کی پیٹھ میں خنجر گھونپا تھا۔ یہ واردات وہ فراموش نہیں کر پایا تھا۔ بھوری کی ماں سال بھر بعد روتی تڑپتی مر گئی تھی۔ اپنی زندگی میں وہ کبھی شوہر کو یقین نہ دلا سکی کہ بیٹی کو فرار کرانے میں اس کی رضا شامل نہ تھی۔ وہ سائیں دوست کی ناکامی پر مطمئن تھی اور اسے کوئی قلق نہ تھا کہ وہ بیٹی کو پھر نہ دیکھ سکی۔

اچانک ایک دن بھوری کا سامنا سائیں دوست کے ایک عقیدت مند سے ہو گیا۔ بھوری نے اسے دیکھا مگر پہچانا نہیں۔ اس نے پوری طرح تصدیق کرنے کے بعد سائیں دوست کو اطلاع پہنچائی۔ سائیں دوست نے قاتلوں کا ایک ٹولہ روانہ کیا کہ ان دونوں کے سر کاٹ کر لے آؤ۔

قاتلوں نے ایسا ہی کیا۔ قاتل ایک رات ان کے گھر میں گھسے اور ان کے سر کاٹنے میں کامیاب رہے۔ چھوٹی فرح ماں کے ساتھ سو رہی تھی۔ اس مزاحمت میں جو ماں کر رہی تھی

www.pdfbooksfree.pk

اس نے بھی حصہ لیا اور ماں کے ساتھ ہی ماری گئی۔ خاور موقع پا کے چارپائی کے نیچے گھس گیا تھا وہ محفوظ رہا۔

سائیں دوست کے سامنے دونوں سر پیش کیے گئے تو وہ پاگل ہو گیا۔ اس نے بھوری کے سر کو ٹھوکریں ماریں اور نادر کے سر پر پیشاب کیا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کے کچھ مریدوں نے اسے پکڑ لیا اور حجرے میں بند کر دیا۔ وہ اپنی عمر، موروثی اثرات، مرغن غذاؤں اور شراب نوشی کے باعث بلڈ پریشر کا پرانا مریض تھا۔ اس جذباتی بحران میں اس کے دماغ کی رگ پھٹ گئی۔ وہ بچ تو گیا مگر ہمیشہ کے لیے مفلوج ہو گیا۔ اس کے محبوب نظر اور مرید خاص عبداللہ نے ایک دن اس کا کام تمام کیا اور گدی نشین ہو گیا۔

خاور کی پرورش ایک ہمسائے نے کی۔ وہ بے اولاد تھا اور خاور ان سے بہت مانوس تھا۔ خاور نے ایک پرائیویٹ یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا۔ ایسی پرائیویٹ یونیورسٹیوں کی کراچی میں بھرمار تھی جو اشتہار بازی سے طلبا کو کھینچتی تھیں اور تعلیم کی رسم پوری کر کے طلبا کے ہاتھ میں کامیابی کی سند تھما دیتی تھیں کہ جاؤ اب تم ماسٹر آف بزنس ایڈمنسٹریشن ہو۔ بے شعور اور ناتجربہ کار طلبا کو عملی دنیا میں آ کے پتا چلتا تھا کہ کاغذ کا وہ ٹکڑا ان کے لیے بے کار ہے۔ مانگ صرف آئی بی اے یا LUMS جیسے اداروں سے ڈگری پانے والوں کی تھی۔

خاور بھی اپنی ڈگری کا بوجھ اٹھائے بھٹکتا رہا اور ہر جگہ سے دھتکارا گیا۔ یہ شعبہ ایسا تھا جس میں سفارش لاحاصل تھی۔ بڑے کاروباری ادارے اور ملٹی نیشنل کمپنیاں صلاحیت اور کارکردگی مانگتے تھے اور ہر جگہ ایچ آر ڈیپارٹمنٹ موزوں ترین افراد کا انتخاب کرتا تھا۔ خاور نے محسوس کیا کہ ایسی ڈگری کے ساتھ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔

اس نے وہی کیا جو اس کے باقی سب دوستوں نے کیا تھا۔ اس نے ڈگری کو دفن کر دیا اور بھول گیا۔

☆☆☆

چوتھی سمت:

جمال الدین بڑی باقاعدگی سے اسی مسجد میں تراویح کی نماز پڑھنے آ رہا تھا۔ مقصد وہی تھا کہ ستائیسویں شب تک ختم قرآن کر لے۔ اس مسجد کو شہر کی سیکڑوں مساجد پر ترجیح دینے کی وجوہات دو تھیں۔ ایک تو اسے امام صاحب کی قرات کا انداز پسند تھا۔ دوسرے یہ نئی اور خوشحال آبادی کے قلب میں واقع مسجد خاصی کشادہ تھی اور اس کے مرکزی حصے کے سامنے کا صحن سرسبز لان تھا جس پر نماز پڑھنے سے طبیعت کو بڑی فرحت سی محسوس ہوتی تھی۔

اس کا کام بہت محنت طلب تھا۔ صبح دس بجے سے وہ ایک اسکول کے سامنے وہی بڑے اور چاٹ بیچتا تھا۔ آدھی چھٹی میں اس کا زیادہ مال بک جاتا تھا۔ جو بچ جاتا تھا وہ چھٹی کے وقت نکل جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ ایک سنیما میں گیٹ کیپر کی ڈیوٹی دیتا تھا۔ یہ کام مشکل نہیں تھا لیکن اسے رات نو بجے سے پہلے فراغت نہیں ہوتی تھی۔ جب آخری شو دیکھنے والے سارے تماشائی اندر بیٹھ جاتے تھے اور فلم شروع ہو جاتی تھی تو اس کا کام ختم ہو جاتا تھا۔ وہ بھاگم بھاگ مسجد میں پہنچتا تھا کیونکہ اتنا وقت ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ بس میں بیٹھ کے گھر جا سکے اور اپنے محلے کی مسجد میں نماز عشا اور تراویح پڑھ سکے۔ وہ رات ساڑھے گیارہ بارہ بجے گھر پہنچتا تھا تو تھکن سے اتنا چور ہوتا تھا کہ بعض اوقات کھانا کھائے بغیر ہی بستر پر گرتا تھا اور سو جاتا تھا۔ اس کے پاس بیوی بچوں کے لیے بھی وقت نہیں ہوتا تھا۔ سوائے اتوار کی صبح سے دوپہر تک جب اسکول میں چھٹی ہوتی تھی۔

اس کی بیوی اور ماں ہر صبح کے لیے وہی بڑے اور چھولوں کی چاٹ تیار کر کے رکھتی تھیں جو وہ اپنی سائیکل پر باندھ کے روز صبح نو بجے گھر سے چل پڑتا تھا۔ اس کا گھر ایک غریب آبادی میں شہر سے دس بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ ابتدا میں یہ ایک جنگل تھا پھر اس نے ایک پختہ کمرا اور غسلخانہ بھی بنا لیا۔ اب اس کے پاس اوپر نیچے دو کمرے تھے۔ نیچے باورچی خانہ بھی تھا اور صحن میں نلکا بھی لگا ہوا تھا چنانچہ اسے یا بیوی کو پانی لانے کے لیے باہر جا کے لائن میں نہیں کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ یہ نلکا لگوانے کے لیے اس نے تین ہزار رشوت دی تھی۔

اس کے گھر میں بجلی کا عارضی کنکشن بھی آ گیا تھا۔ بجلی کمپنی کے ایک لائن مین نے سو روپے ماہانہ کے عوض اسے لائن پر ایک کنڈا ڈال کے گھر میں ایک بلب، ایک پنکھا اور ٹی وی چلانے کی اجازت دے رکھی تھی مگر وہ دو پنکھے چلا رہا تھا اور اوپر نیچے تین بلب جلاتا تھا۔ ٹی وی اس نے قسطوں پر لیا تھا اور گزشتہ ماہ آخری قسط دے کر اس کا مالک ہو چکا تھا۔ چنانچہ جمال الدین اپنی ترقی سے مطمئن تھا۔

ایک رات وہ تراویح سے فارغ ہوا تو کچھ متفکر تھا۔ اس کی ماں کی طبیعت کچھ عرصے سے علیل چل رہی تھی۔ ایک مہربان ڈاکٹر نے بریسٹ کینسر کا اندیشہ ظاہر کیا تھا اور اسے ایک اونکولوجسٹ سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ لیڈی ڈاکٹر تھی اور اس کی فیس بہت زیادہ تھی لیکن جمال

الدین ماں کو اس کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے کچھ ٹیسٹ بتائے جو خاصے مہنگے تھے۔ جمال الدین نے ہر سال کی طرح اس بار بھی عید پر بیوی بچوں کے لیے نئے کپڑوں کا پورا بندوبست کر رکھا تھا۔ باپ کی موت کے بعد ماں نے تو عید پر نئے کپڑے پہننا چھوڑ دیے تھے لیکن اس کے دیگر اخراجات کا بار جمال دین پر آ گیا تھا جو اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی چار بہنیں بیاہی گئی تھیں اور ایک بھائی بچپن میں فوت ہو گیا تھا۔

ماں کی بیماری کا پتا چلانے کے لیے ٹیسٹ ضروری تھے۔ یہ ٹیسٹ کرانے میں وہ ساری رقم خرچ ہو جاتی جو عید کے کپڑوں کے لیے سنیما کے مالک نے قرض دی تھی۔ دو سو روپے ماہانہ کے حساب سے یہ قرض دس ماہ میں ادا ہوتا تھا۔ پھر رمضان آ جاتے تھے اور اگلی عید کے ساتھ ہی نیا قرض شروع ہو جاتا تھا۔ یہ سلسلہ ایسے ہی جاری تھا۔

جمال کو معلوم تھا کہ نئے کپڑے نہ ملے تو بچوں کو کتنا رنج ہوگا اور اس کی بیوی کا موڈ کتنا خراب ہوگا۔ ساس کے ساتھ اس کی بالکل نہیں بنتی تھی اور اسے وہ اپنے گھر کی معیشت پر اور خود پر بوجھ سمجھتی تھی لیکن جمال ماں کے حقوق اور اپنے فرائض کو نبھاتا تھا۔ اس نے طے کیا تھا کہ ماں کے علاج کے لیے وہ کہیں سے قرض لے لے گا۔

پریشانی اسے یہ تھی کہ ماں کے ٹیسٹ کے رزلٹ پازیٹو ہوئے تو کیا ہوگا۔ لیڈی ڈاکٹر نے جو سرطان کے علاج کی ماہر سمجھی جاتی تھی اس کی ماں کو کھل کے سب بتا دیا تھا۔ "مرض قابل علاج ہے اگر اس کا پتا ابتدا میں ہی چل جائے لیکن تمہاری سرطان سے متاثرہ چھاتی کو کاٹ دیا جائے گا۔ ایسا نہ کیا گیا تو سرطان پھیلے گا اور تمہاری زندگی بچائی نہیں جا سکے گی۔"

گھر پہنچتے ہی اس نے اوپر جا کے ماں کو سلام کیا اور اس کی حالت پوچھی۔ اس کی طبیعت میں بہت بے چینی تھی اور سارے جسم میں درد کی وجہ سے وہ کراہ رہی تھی۔ درد کم کرنے والی گولیاں اب بے اثر ہونے لگی تھیں۔

وہ خاصا متفکر نیچے آیا۔ اسے اب رپورٹ دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ماں یقیناً کینسر میں مبتلا تھی۔ یہ بات اس ڈاکٹر نے بھی ویسے ہی سمجھ لی ہوگی مگر ڈاکٹر آج کل ٹیسٹ کرانے کے شوقین تھے۔ خرچہ ہوتا تھا مریض کا۔ انہیں لیبارٹری سے کمیشن ملتا تھا۔

اس کی بیوی نے تنک مزاجی سے کہا۔ "کھانا تو کھا لیتے تسلی سے۔ سیدھے اوپر چڑھ گئے۔"

جمال نے کہا۔ "تم رپورٹیں لائی ہو؟"

بیوی نے لفافہ اس کے سامنے پٹخ دیا۔ "اب رپورٹوں میں کیا رہ گیا ہے دیکھنے کو۔"

"تم نے پوچھا تھا؟"

"ہاں! لیبارٹری کے بڑے ڈاکٹر نے صاف کہا کہ خرچہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ مرض بہت بڑھ گیا ہے۔"

جمال سر جھکا کے کھانا کھانے لگا۔ "اسے کیا پتا۔ وہ ریڈیالوجسٹ ہے۔ علاج تو وہ ڈاکٹر کرے گی۔"

"علاج اس کے ہاتھ میں بھی نہیں ہے۔ وہ صرف آپریشن کی فیس وصول کرے گی۔ مرنے جینے کی کوئی گارنٹی نہیں دے گی۔ ماں کی عمر بھی ایسی ہی ہے۔ پھر آپریشن سے پہلے اور بعد میں دواؤں کا جو خرچہ ہے..."

جمال نے نوالا رکھ دیا۔ "آخر کیا کہنا چاہتی ہے تو؟ میں کچھ بھی نہ کروں؟ ماں کو مرتا دیکھتا رہوں اور مر جائے تو دفنا دوں۔"

بیوی نے اپنا لہجہ بدل لیا۔ "میں تو تمہاری طرف سے فکرمند ہوں، اتنا کرتے ہو پھر بھی پورا نہیں پڑتا۔ آگے عید ہے۔"

جمال نے تلخی سے کہا۔ "ہاں! آ گئی نا دل کی بات زبان پر۔ ماں کا علاج ہوگا تو تیرے اور بچوں کے لیے نئے جوتے کپڑے کہاں سے آئیں گے۔ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کے بتا۔ میری جگہ ہوتا کمال، اور میری ماں کی جگہ ہوتی تو..."

بیوی نے رونے کی تیاری کی۔ "اللہ نہ کرے، تمہارا جو جی چاہے کرو مگر اپنوں کے لیے ایسی منحوس بات تو زبان سے مت نکالو۔"

جمال کو رات بھر نیند نہیں آئی۔ اس کے دل میں چھپ کر بیٹھا ہوا خوف بھی کہتا تھا کہ بیوی کی بات غلط نہیں۔ ہوگا کچھ بھی نہیں، ماں بچے گی نہیں۔ اگر وہ آپریشن کے لیے کہیں سے قرض لینا بھی چاہے تو اتنا بڑا قرض دینے والا کوئی نہیں اور بالفرض محال قرض مل جائے اور آپریشن ہو جائے تو بعد میں علاج کے اخراجات کے لیے رقم کہاں سے آئے گی، وہ قرض کیسے اتارے گا؟

تو کیا ہوگا وہی جو اس نے کہا تھا۔ وہ صرف ماں کو مرتا دیکھتا رہے گا؟

اگلے روز لیڈی ڈاکٹر نے رپورٹیں دیکھ کے فیصلہ صادر کر دیا۔ ماں کا فوراً آپریشن ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ دیر کی گئی تو اس کی دوسری چھاتی بھی کینسر کی لپیٹ میں آ جائے گی۔ ان چھاتیوں سے جمال نے دودھ پیا تھا، زندگی پائی تھی، اب اس کی باری تھی۔ وہ ماں کو مرنے سے

www.pdfbooksfree.pk

بچا سکتا تھا لیکن اس کے لیے کم سے کم بھی دو لاکھ روپے درکار تھے۔

جمال نے اپنی پریشانی کا ذکر سنیما کے مالک حاجی عبدالرزاق سے کیا۔ انہوں نے اپنے تعلقات کا استعمال کیا اور ماں کے آپریشن کا انتظام بلا معاوضہ سرکاری اسپتال میں ہوگیا۔ وہیں آپریشن کے بعد کیموتھراپی بھی فری ہوگئی مگر صحت یابی تک دی جانے والی دوائیں بہت مہنگی تھیں اور اسپتال میں دستیاب نہ تھیں۔ ان کے لیے پچاس ہزار اضافی درکار تھے۔ حاجی صاحب نے قرض کی درخواست مسترد کردی۔ ایک معمولی گیٹ کیپر کو اتنی بڑی رقم کیسے ادھار دی جاسکتی ہے، وہ چکائے گا کیسے؟ اور اتنا کیا کم ہے کہ آپریشن کا خرچہ بچ گیا میری کوشش سے، ان لوگوں کا بھی تو مسئلہ ہے۔ خود کچھ نہیں کرتے۔

جمال نے بہت کوشش کی مگر دوائیں فراہم کرنا اس کے اختیار میں نہ تھا۔ اب ایک صورت یہ تھی کہ وہ اپنا گھر فروخت کردے، اس طرح جمال کو پچاس ہزار کے لگ بھگ مل جاتے لیکن ایک تو اس بات کی گارنٹی کوئی نہیں تھی کہ پچاس ہزار میں ماں کو زندگی کی گارنٹی حاصل ہوجائے گی اور علاج کے لیے مزید رقم درکار نہ ہوگی۔ دوسرا مسئلہ زیادہ سنگین تھا۔ اس کے بعد وہ سب کہاں رہیں گے؟ کسی کرائے کے مکان میں؟ کرایہ کون دے گا؟

مایوسی کے گرداب میں چکر کھاتے ہوئے اس کے دماغ کا مجرمانہ ترغیب میں گرفتار ہونا لازمی بات تھی۔ آخر کیا کرے؟ چوری کرے، ڈاکا ڈالے، غبن کرے۔ ادھار نہیں مل سکتا تو پھر ایسے ہی راستے باقی رہ جاتے ہیں۔

اس ذہنی خلفشار میں ایک بدخواہ نے اسے وہ راستہ دکھا دیا جو سیدھا تباہی کے غار میں گراتا تھا۔ اس نے ایک سود خور افغان کا پتا بتا دیا۔ ”وہ تمہیں پچاس ہزار دے سکتا ہے۔ کسی بھی ضمانت کے بغیر۔“

”مگر قرض ادا کیسے ہوگا؟“

”اگر تم اسے سود ادا کرتے رہو۔ تو وہ کبھی اصل رقم کی واپسی کا مطالبہ نہیں کرے گا۔“

”اور سود کتنا ہوگا۔“

”بہت کم صرف ایک ہزار روپے ماہوار۔“

جمال اس شخص سے ملا۔ وہ اپنے رویے سے انتہائی ہمدرد اور شریف آدمی لگتا تھا۔ اس نے جمال سے دو گواہوں کی موجودگی میں ایک رسید لکھوائی اور اس کے ہاتھ پر پچاس ہزار نکال کے رکھ دیے۔ جمال نے اس وقت محسوس کیا کہ وہ مسائل کی جس چٹان کے نیچے دبا ہوا تھا وہ ہٹ گئی ہے۔ ہزار روپے ماہانہ ادا کرنا اس وقت جمال کو زیادہ مشکل نہ لگا۔

حالات نے بعد میں رخ بدلا۔ ماں کے علاج کے لیے وہ رقم قطعی ناکافی ثابت ہوئی۔ جس مشہور اونکولوجسٹ نے سب سے پہلے ماں کو دیکھا تھا اس نے اپنی فیس کھری کی تھی۔ لیبارٹری والوں نے غلط رپورٹ دی تھی۔ اگر جمال کے پاس پیسے ہوتے تو وہ مشہور لیڈی ڈاکٹر سرجری کی فیس بھی کھری کرلیتی۔ ماں کا کینسر اس سے کہیں زیادہ بڑھ چکا تھا جتنا رپورٹ میں بتایا گیا تھا۔

چند ماہ بعد ماں مرگئی۔ جمال پر پچاس ہزار کے قرض کا بوجھ چھوڑ گئی۔ اس کی موت تک جمال پوری دل جمعی سے کوئی کام کرنے کے قابل ہی نہ تھا۔ ادھر اسکول میں چھٹیاں ہوگئیں۔ اس کے دہی بڑے اور چھولوں کی چاٹ کی فروخت کا سلسلہ معمول کے مطابق دو ماہ کے لیے بند ہوگیا جو اس کی آمدنی کا بڑا ذریعہ تھا۔ پہلے وہ اس عارضی بے روزگاری کے لیے تیار رہتا تھا اور دس ماہ کی آمدنی کو بارہ ماہ پر تقسیم کرکے کام چلاتا تھا۔ اب قرض کے سود کی ادائیگی کا مسئلہ آمدنی میں اضافے کا تقاضا کرتا تھا۔

مزید بدقسمتی یہ ہوئی کہ مالکوں نے سنیما بند کرکے اس کی جگہ پلازا بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ پاکستان فلمی صنعت کی تباہی اور بھارتی فلموں کی بندش نے پورے ملک کی سنیما انڈسٹری کو ختم کردیا تھا اور ہر جگہ سنیما گرا کے کمرشل پلازا بنائے جارہے تھے۔

بے روزگاری نے جمال کی کمر توڑ دی۔ اس نے بہت دوڑ بھاگ کی مگر اسے ریلوے اسٹیشن پر قلی کی جگہ بھی نہ ملی۔ قلیوں کا ٹھیکے دار اسے نمبر دلوانے کے پانچ ہزار مانگتا تھا۔ وہ ایک ماہ سود کی قسط نہ دے سکا۔ دوسرے مہینے دو ہزار کہاں سے دیتا۔

قرض دینے والے کے مطالبے میں سختی آتی گئی۔ وہ دروازے پر آکے جمال کو بے عزت کرنے لگا اور دھمکیاں دینے لگا کہ اس کی بیوی کو اٹھا کرلے جائے گا یا گھر پر قبضہ کرلے گا۔ چوتھے مہینے وہ سچ مچ گھر میں گھس گیا اور اس نے جمال کی بیوی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے کھینچ کر باہر لے جانے لگا۔

”چلو ہمارا ساتھ... تم ابھی جوان ہے، خوبصورت ہے۔ دھندا کرکے قرضہ دو۔ ہم چھوڑے گا نہیں۔“

”جمال...“ اس کی بیوی نے چیخ ماری۔ بچے رونے لگے۔ جمال آگے بڑھا تو قرض خواہ نے بیوی کو چھوڑ کے

جمال کو مارا اور گالیاں دیتا باہر نکل گیا۔

اس رات بیوی روتی کوستی رہی۔ وہ سوچتا رہا کہ اب دو ہی راستے ہیں یا وہ مکان بیچ کے قرض ادا کرے یا سب کو مار کے خود بھی مرجائے۔ اس کی بیوی بھی یہی کہہ رہی تھی۔ ہمیں زہر لادو تاکہ ہماری جان اس عذاب سے چھوٹے۔ تمہاری ماں خود تو قبر میں جا کے لیٹ گئی، ہم سب کو زندہ درگور کرگئی۔

رات وہ ہمیشہ کی طرح نماز تراویح پڑھ کے لوٹ رہا تھا تو اسے گزشتہ برس کی عید یاد آئی جب ان مسائل کا آغاز ہوا تھا۔ اب مسائل کی دلدل اسے اور اس کے خاندان کو نگل چکی تھی اور لگتا یہی تھا کہ اب کی عید پر ان کے پاس کھانے کے لیے بھی کچھ نہیں ہوگا۔ نئے کپڑے بنانا تو دور کی بات ہے۔ کسی وجہ کے بغیر وہ اپنے گھر سے اتنی دور تراویح پڑھنے آجاتا تھا۔ کچھ اس لیے کہ وہ عادی ہوگیا تھا۔ کچھ اس لیے کہ اس خوبصورت سرسبز لان والی مسجد میں اسے بڑا سکون ملتا تھا۔

وہ سائیکل کے پیڈل مارتا واپس جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہے؟ آخر اس پر جینے کے راستے بند کیوں ہوگئے ہیں؟ اسے مزدوری تک نہیں ملتی۔ وہ بھیک مانگے یا ڈاکے ڈالے۔ دونوں کام اس کے بس کے نہیں۔ اب اسے مکان کو بیچ ہی دینا چاہیے۔

اچانک سائیکل کی چین ٹوٹ گئی۔ اس نے سائیکل کو کوسا اور ایک درخت کے ساتھ کھڑا کردیا۔ یہ خیال بڑا روح فرسا تھا کہ اب اسے سارا راستہ پیدل طے کرنا ہوگا اور اپنے ساتھ سائیکل کو بھی گھسیٹنا پڑے گا۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر چلنے ہی والا تھا کہ ایک کوٹھی میں شور مچا پھر فائرنگ کی آواز آئی۔ جمال نے خود کو بچانے کے لیے ادھر ادھر دیکھا۔ اسی وقت دو افراد دوڑتے ہوئے نکلے۔ ان پر کسی نے دوسری منزل کی کھڑکی سے گولی چلائی۔

جمال کو یوں لگا جیسے اس کی ٹانگ میں انگارہ اتر گیا ہو۔ وہ سمجھ گیا کہ اسے گولی لگی ہے۔ وہ وہیں بیٹھ گیا اور ایک ہاتھ سے ٹانگ کو پکڑ لیا۔ اس کا ہاتھ اپنے ہی خون سے تر ہوگیا۔ مخالف سمت سے ایک پولیس کار نمودار ہوئی۔ سائرن سنائی دیے اور مزید فائر ہوئے۔ جمال نے دوڑ کر باہر آنے والوں میں سے ایک کو سڑک کے درمیان گرتا دیکھا۔ وہ جمال سے پچاس قدم دور تڑپتا رہا اور پھر ساکت ہوگیا۔

اب ہر گھر سے لوگ نکل آئے تھے۔ دوسرا بھاگنے والا شخص پولیس کی گرفت میں تھا۔ خطرے کا احساس ہونے سے پہلے پولیس نے جمال کو بھی دبوچ لیا۔ اسے اٹھا کے پولیس کی موبائل میں ڈال دیا گیا۔ کسی نے اس کے چیخ چیخ کے بے گناہ ہونے پر توجہ نہ دی۔

ڈکیتی کی واردات ناکام ہوگئی تھی۔ ایک ڈاکو مارا گیا تھا۔ دوسرا جمال کے ساتھ پکڑ لیا گیا تھا۔ ٹانگ کے زخم کی مرہم پٹی کے بعد پولیس نے تفتیش کا آغاز کیا۔ ایف آئی آر میں جمال کا نام بھی شامل ہوگیا کہ وہ ڈاکوؤں کا ساتھی تھا۔

جمال آخری وقت تک انکار کرتا رہا لیکن یہ نہ بتا سکا کہ اس علاقے میں عین جائے واردات پر وہ کیا کررہا تھا۔ اسے وہاں کوئی جانتا نہیں۔ اس کا گھر دس بارہ کلومیٹر دور ہے۔ تراویح کے لیے وہاں کی مسجد میں آنے والی بات ایک احمقانہ اور مضحکہ خیز جھوٹ سمجھی گئی۔ پولیس نے مار مار کے اس کا حلیہ بگاڑ دیا۔

حالات کی گواہی جمال کے خلاف گئی۔ وہ بے روزگار تھا، ایک سود خور کا مقروض تھا جس کے قرض کی قسط اس نے چار ماہ سے ادا نہیں کی تھی۔ قرض خواہ نے اس کے گھر میں گھس کے جو کچھ کیا تھا اس کے گواہ محلے والے تھے۔ اس کا چوری ڈکیتی کی راہ پر چل نکلنا ایک فطری بات تھی۔ آدمی مجبوری میں جرم کا راستہ اختیار کرتا ہے۔

ایک خرابی یہ ہوئی کہ سوچے سمجھے بغیر گواہوں نے اسے شناخت کرلیا، ہاں یہ بھی ڈاکوؤں کے ساتھ تھا، شاید انہیں پہلے سے جمال کی تصویر دکھا دی گئی تھی۔ پولیس اپنا کیس پکا کرنا چاہتی تھی۔ تمام ثبوت جمال کے خلاف تھے۔ اسے ناکام ڈکیتی کی کوشش کے جرم میں سات سال قید بامشقت کی سزا سنا دی گئی۔

سماعت کے دوران بھی جمال نے بچ جانے والے ڈاکو سے روکے، ہاتھ جوڑ کے اور چلا کے کہا تھا کہ آخر وہ بولتا کیوں نہیں کہ یہ میرا ساتھی نہیں ہے۔ جمال کی بیوی نے بھی اس کے سامنے دوپٹے کا دامن پھیلا کے رحم کی بھیک مانگی مگر وہ سخت سنگ دل تھا۔ اس نے ایک بار بھی تردید نہیں کی کہ جمال اس کا ساتھی نہیں ہے۔

جیل بھیجے جانے کے بعد وہ ڈاکو جمال کے پاس خود ہی آیا۔ اس کا نام تو رحمان تھا مگر وہ مانی کہلاتا تھا۔ جمال اسے دیکھتے ہی نفرت سے گالیاں دینے لگا۔ وہ مسکراتا رہا۔

”کبھی دے لے جتنی گالیاں دینی ہیں۔ اب رہنا تو ساتھ ہی ہے۔ جس دن تیرا غصہ نکل جائے گا اس دن میں بات کروں گا۔“

”مجھے تمہاری شکل سے نفرت ہے۔“

www.pdfbooksfree.pk

"اور محبت کس سے ہے؟ اپنی بیوی سے۔ وہ واقعی بڑی سوہنی ہے۔ سود خور اسے لے جاتا تو لاکھوں کما لیتا۔ تو بھی پاگل ہے۔ سالے سود خور سے کہتا کہ لے جا اسے اور لکھ رسید۔ قرض بے باق۔"

"بکواس بند کر..."

مانی اطمینان سے سگریٹ پیتا رہا۔ "اگر تجھ میں عقل ہوتی تو سونے کا انڈا دینے والی مرغی تھی تیرے گھر میں۔ دو چار ہزار تو ایک رات میں لے آتی۔"

جمال نے اسے چیخ کر گالی دی اور اس کی طرف پتھر پھینکا۔ "اپنی بہن سے کرا تا یہ دھندا۔ تو ڈاکو کیوں بنا؟"

اس نے خود کو بچا لیا۔ "ایسی کوئی بہن تھی نہیں میری۔ تو بلاوجہ شرافت کے چکر میں پڑا رہا۔ محنت مزدوری اور حق حلال کی روزی تلاش کرتا رہا۔ حاصل کیا ہوا؟ اور تو یہاں رہے گا تو وہ کیا کرے گی؟ کہاں سے کھائے گی۔ بچوں کو کیا کھلائے گی؟"

"وہ کرلے گی کچھ نہ کچھ۔"

مانی ہنسا۔ "محنت مزدوری، لوگوں کے برتن مانجھنا، کپڑے سینا۔ شریف عورتیں ایسا ہی کرتی ہیں مگر بیٹے، اسے کیا ضرورت ہے اتنی تکلیف اٹھانے کی جب وہ آسانی سے ہر رات..."

جمال نے اس پر حملہ کیا۔ مانی نے تول کے اس کو ایسا مکا مارا کہ جمال چت ہو گیا۔ اس کے منہ سے خون نکلنے لگا۔

ایک وارڈن ان کی طرف آیا۔ "کیوں لڑ رہے ہو..."

مانی نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ "یہ لڑائی کہاں ہے جناب!"

"پھر کیا ہے۔ چلو میرے ساتھ جیلر صاحب کے پاس۔"

مانی نے کہا۔ "اب جانے بھی دو سرکار۔ ہم پرانے دوست ہیں۔ مذاق کر رہے تھے۔ جاؤ اپنا کام کرو۔"

وارڈن انہیں گھورتا ہوا چلا گیا تو مانی نے سہارا دے کر جمال کو اٹھایا اور خود اس کے پاس بیٹھ گیا۔ "کیا اب ہم بات کر سکتے ہیں۔"

جمال نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "تم میرا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ آخر تم کیا چاہتے ہو؟"

"میری بات سنو گے تو فائدے میں رہو گے۔ ابھی میں نے وارڈن کے سامنے تمہیں اپنا دوست کہا۔ مقدمے کے دوران بھی یہی کہا گیا کہ تم میرے ساتھی ہو اور میں نے تردید نہیں کی۔"

"آخر کیوں... کیا دلچسپی تھی تمہیں مجھے جیل پہنچانے میں۔"

"دلچسپی نہیں... مجھے ہمدردی تھی تم سے۔" مانی بولا۔

"یہ اچھی ہمدردی ہے۔"

"دراصل، مجھے تمہاری ساری کہانی سن کے... جو تم نے کورٹ میں سنائی اندازہ ہو گیا تھا کہ تم میں اپنے حالات سے نمٹنے کی وہ صلاحیت ہی نہیں ہے جو آج کے دور میں ہونی چاہیے۔ اگر تمہاری مدد نہ کی جائے تو بالآخر تم اپنے بیوی بچوں کو بھی مار دو گے اور خود مر جاؤ گے۔ تم مایوسی اور ناکامی کی آخری حد پر تھے۔"

"یہ اچھا طریقہ ہے مدد کا۔" جمال نے تلخی سے کہا۔

"فرض کرو یہ واقعہ پیش نہ آتا تو تم کیا کرتے؟ سود خور کا قرضہ کیسے چکاتے۔ تمہارے پاس تو سود ادا کرنے کے پیسے نہیں تھے۔ بے غیرت تم ہو نہیں کہ بیوی اس کے حوالے کرتے اور دوسری کر لیتے۔ تم میں نہ غبن کی ہمت تھی نہ چوری کی۔ نہ تم ڈاکا ڈال سکتے تھے اور نہ بھیک مانگ سکتے تھے۔ ورنہ ایک آسان طریقہ یہ بھی تھا۔ بیوی ایک سگنل پر گود میں بچہ لیے کھڑی ہو، باقی بچے کسی دوسری جگہ میاں تیسری جگہ۔ دن بھر میں تمہارا خاندان ہزار روپے کر لیتا۔"

جمال نے سر ہلایا۔ "یہ سب کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے واقعی یہ سوچا تھا کہ خودکشی کر لوں لیکن اس سے پہلے اپنے خاندان کو ختم کر دوں۔"

"اخباروں میں تم جیسے کم ہمت لوگوں کے ایسے ہی حالات میں بیوی بچوں سمیت مر جانے کے واقعات آتے رہتے ہیں۔ لیکن کیا فرق پڑتا ہے اس سے؟ کیا دنیا بدلتی ہے؟ انسانیت کا ضمیر جاگتا ہے کہ پھر ایسا المناک واقعہ نہ ہو؟ حکومت کے کانوں پر جوں رینگتی ہے؟ لاکھوں کی کاروں میں اور کروڑوں کی کوٹھیوں میں رہنے والے جو کہیں بھی بیٹھ کے ہزاروں ایک وقت کے کھانے پر اڑا دیتے ہیں۔ کیا انہیں کوئی احساس ندامت ہوتا ہے؟"

جمال نفی میں سر ہلایا اور کچھ سوچنے لگا۔

"یہ تم جیسے کم ہمت لوگ کرتے ہیں، ارے بھائی مرنا ہے تو کسی کو مار کے مرو۔ پہلے کوشش کرو کہ حق ملتا نہیں تو چھینو۔ کون سا جرم زیادہ سنگین ہے۔ چوری، ڈکیتی یا قتل۔"

"ظاہر ہے قتل۔"

"تو اپنے بیوی بچوں کو قتل کرنے کا سنگین جرم کرنے سے پہلے چوری ڈکیتی کرو۔ اس سے کیا ہوگا؟ کامیابی یا ناکامی۔ کامیاب ہو گئے تو واہ واہ۔ ورنہ وہی جو تمہارے

ساتھ ہوا۔ جو گولی تمہاری ٹانگ میں لگی وہ دل میں لگتی تو خبر آتی کہ دو ڈاکو مارے گئے۔ ایک پکڑا گیا۔ کچھ کیے بغیر تم میرے ساتھ جیل کاٹ رہے ہو۔ خیر... اب ماضی کو بھول جاؤ۔ آج سے تم وہی کرو گے جو میں کہوں گا۔"

جمال پلک جھپکائے بغیر اس کی صورت دیکھتا رہا۔ "یعنی؟"

"تم اب واقعی میرے ساتھی ہو۔ میرے گروہ میں شامل ہو۔"

"لیکن اس کا فائدہ؟" جمال نے بے وقوفوں کی طرح پوچھا۔

مانی نے ایک قہقہہ لگایا۔ "اوئے پاگل خانے۔ ادھر تو ہم مہمان ہیں۔ آتے جاتے رہتے ہیں۔ باہر ہمارا خیال رکھنے والے بہت لوگ ہیں۔"

"کون لوگ؟ تمہارے ساتھی ڈاکو۔"

"ڈاکو کا لیبل تو ہم پر بلاوجہ لگا دیا گیا ہے۔ باہر سب ڈاکو ہیں بلکہ ہم سے بھی بڑے ڈاکو ہیں جو ہمیں لوٹتے ہیں۔"

"تمہیں کون لوٹ سکتا ہے؟" جمال سادگی سے بولا۔

"او بھولے بادشاہ، ہمیں لوٹتے ہیں وردی والے۔ جو تھانوں میں پیٹ نکالے کرسیوں پر رکھے رہتے ہیں اور وہ لالچی جج جو ہماری ضمانت منظور کرتے ہیں۔ ہمیں فرار کرانے والے اور ہمیں پناہ دینے والے بڑے لوگ۔ بس تو دیکھتا جا اور سیکھتا رہ۔"

مانی کی بات غلط نہ تھی۔ جیل خانے میں انہیں دو ہی مہینے گزرے تھے کہ ان کی سزا کے خلاف اپیل دائر ہو گئی۔ ان دو مہینوں میں بھی جیل کے اندر انہیں ہر طرح کی سہولت حاصل رہی۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ جب اس کی بیوی ناصرہ اس سے ملنے آئی تو وہ بہت خوش تھی۔ اس کے کپڑے اور اس کا میک اپ دیکھ کے جمال حیران بھی ہوا اور اس کے دل میں حسد کی خلش بھی بیدار ہوئی۔ وہ بے حد حسین لگ رہی تھی اور لگتا تھا اسے سلاخوں کے پیچھے شوہر کی حالت پر کوئی صدمہ نہیں ہے۔

"مجھے وہ دس ہزار روپے مل گئے۔" اس نے بتایا۔

جمال حیران ہوا۔ "کون سے دس ہزار روپے۔"

"جو حاجی صاحب نے بھیجے تھے۔ انہوں نے کہا کہ جمال کی رہائی تک ہر ماہ باقاعدگی سے خرچہ ملتا رہے گا۔ یہ وہی سنیما والے حاجی صاحب ہیں نا؟ جو سنیما کی جگہ پلازا بنا رہے تھے۔"

جمال نے کہا۔ "ہاں... ہاں۔ وہی ہوں گے۔"

"انہوں نے کہلوایا تھا کہ جمال بہت جلد رہا ہو جائے گا۔ میں بھی روز رات کو تمہاری رہائی کے لیے نفل پڑھتی ہوں اور ہر وقت دعائیں مانگتی ہوں۔ اللہ بڑا منصف ہے اور سب دیکھنے والا ہے۔ وہ کسی بے گناہ کو عذاب کیسے دے سکتا ہے۔ تمہاری اپیل ہو گئی ہے نا؟ دیکھ لینا منظور ہو جائے گی۔ عدالت انصاف کرے گی تمہارے ساتھ۔"

وہ بولتی جا رہی تھی اور جمال اسے تک رہا تھا۔ یہ سوچ رہا تھا کہ اسے کیا بتائے اور کیا نہ بتائے۔ صاف ظاہر تھا کہ دس ہزار اس کے گھر بھجوانے والا مانی کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ جو سوال جمال کے دل میں کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا یہ تھا کہ مانی نے ایسا کیوں کیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمدردی کی آڑ میں وہ کچھ اور نیت رکھتا ہو۔ کئی بار وہ ناصرہ کے حسن کی تعریف کر چکا ہے۔ اگر اس کی عدم موجودگی میں وہ ناصرہ کو ورغلانے لگا پھر، عورت ذات بڑی جلدی پھسل جاتی ہے۔ تعریف، پیسے عیش و آرام..... روپیا!

"کس سوچ میں پڑ گئے۔ دیکھو میں کیا لائی ہوں تمہارے لیے۔ گاجر کا حلوا ہے اور پائے پکائے ہیں خاص تمہاری پسند کے۔"

جمال کو اپنے خیالات کی بے راہروی پر سخت شرم آئی۔ ناصرہ کے جانے کے بعد جب وہ مانی کے ساتھ روغنی نان اور پائے کھا رہا تھا تو اس نے پوچھا۔ "دس ہزار تم نے بھیجے تھے؟"

"اور کون ہے جو اب اتنا مہربان ہو جائے۔"

جمال نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہوتا تو میں یہاں نہ پہنچتا۔ لیکن تم نے ایسا کیوں کیا؟"

مانی مزے لے لے کے گاجر کا حلوا کھانے لگا۔ "بھئی کیا سواد ہے تیری بیوی کے ہاتھ میں۔ واہ واہ۔"

"میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا۔" جمال نے ناگواری سے کہا۔

"ہاں... یار جمال الدین! یہ اپنا اصول ہے یاد ستور ہے۔ جو بھی سمجھ لو۔ کوئی سگی بیٹی مشکل میں ہو تو اس کے گھر والوں کا خیال رکھتے ہیں۔ سکھ سانجھا تو دکھ بھی سانجھا۔"

کچھ عرصہ میں جمال کو اپنے نئے دوست اور محسن کی نیت کا اندازہ ہو گیا۔ اس کی مہربانیوں میں کسی بدنیتی کو دخل نہ تھا۔ وہ اب بھی ناصرہ کے حسن کی یاد اس کے لائے ہوئے کھانوں کے ذائقے کی تعریف کرتا تھا لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ملاقات کے وقت وہ بھی جمال کے ساتھ گیا ہو۔

www.pdfbooksfree.pk

اگلے دو ماہ میں انہیں چار بار اپیل کی سماعت کے لیے کورٹ لے جایا گیا۔ یہ سب رشوت کا کھیل تھا ورنہ جیل میں ایسے بھی قیدی تھے جن کو سالہا سال کسی عدالت میں پیش نہیں کیا گیا تھا۔ کہنے کو جیل حکام کے پاس ہمیشہ ایک عذر ہوتا تھا کہ گاڑی نہیں یا گارڈ نہیں۔ عدالت میں بھی مہینوں کی تاریخ اس لیے نہیں پڑی کہ ریڈر کی جیب گرم کردی جاتی تھی۔ پولیس کے پراسیکیوٹر کی دلچسپی ڈاکوؤں کو سزا دلوانے سے زیادہ کیس ختم کرانے میں رہی۔ اس کے پیچھے بھی پیسا تھا۔ اصل مدعی وہ تھے جن کے گھر میں ڈکیتی ہوئی تھی۔ واردات ناکام ہونے سے ان کا کوئی نقصان نہیں ہوا تھا لیکن تھانے کچہری کے چکر میں ان کا وقت اور پیسا برباد ہو رہا تھا وہ اس کیس سے جان چھڑانا چاہتے تھے۔ ماتحت عدالت سے ڈاکوؤں کو سزا ہونے تک انہیں خاصی پریشانی اٹھانا پڑی تھی لیکن اب اپیل ہوئی تو حریف کی حیثیت سے انہیں پھر طلب کرلیا گیا۔

تاہم عدالت عالیہ کے جج کا رویہ مانی کے لیے باعث تشویش ہو رہا تھا۔ اس نے ایک دن جج کو گالی دے کے کہا۔ ''وہ رشوت قبول ہی نہیں کرتا، کسی صورت نہیں مانتا۔''

جمال نے گھبرا کے کہا۔ ''پھر اب کیا ہوگا؟ کیا ہماری سزا برقرار رہے گی۔''

''یہی لگتا ہے۔'' مانی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

''کیا ہم اس کے خلاف سپریم کورٹ میں جائیں گے؟''

مانی نے اسے ناراضی سے دیکھا۔ ''دماغ خراب ہے تیرا۔ ہر کیس سپریم کورٹ میں نہیں جاتا اور وہاں کسی کی نہیں چلتی۔''

جمال مایوس ہوگیا۔ ''مطلب یہ کہ ہم پوری سزا کاٹیں گے۔''

جمال کی شکل دیکھ کے مانی ہنس پڑا۔ ''اوئے فکر مت کر میرے یار۔ ہم نے کہا ہے نا کہ ادھر نہیں رہنا تو بس نہیں رہنا۔''

مانی نے غلط نہیں کہا تھا۔ عدالت عالیہ کا موڈ دیکھتے ہوئے مانی نے سیدھا قانونی راستہ چھوڑ دیا۔ اگر ہائی کورٹ سے ایک بار فیصلہ صادر ہو جاتا تو پھر ان کی رہائی صرف ایک صورت میں ممکن تھی کہ وہ جیل سے فرار ہوں لیکن یہ مشکل ترین راستہ تھا۔ مانی نے کمرشل راستہ اختیار کیا۔

انہیں پیشی کے لیے عدالت لے جایا جا رہا تھا کہ وہ فرار ہوگئے۔ ان کے ساتھیوں نے پولیس پارٹی پر حملہ کیا اور اپنے ساتھیوں کو چھڑا لیا۔ درحقیقت ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ یہ صرف ایک خبر تھی جو اخبارات کو دی گئی۔ معاملات پہلے ہی طے پا چکے تھے کہ راستے میں جمال اور مانی کو کہاں اور کیسے چھوڑا جائے گا۔ اس کے لیے پورا منظر نامہ خود پولیس نے بنایا تھا کیونکہ انہیں اس ''کوتاہی اور مجرمانہ غفلت'' کی بہت بھاری قیمت ادا کردی گئی تھی۔ مانی اور جمال کے فرار ہونے کے بعد پولیس کی محافظ نفری کو گرفتار اور معطل بھی کیا گیا لیکن وہ سب ضابطے کی فرضی کارروائی تھی جو پریس اور پبلک کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے کی گئی تھی۔

ناصرہ کو یہ اطلاع پہلے ہی دے دی گئی تھی کہ اسے جمال کے فرار ہونے کی خبر ملے تو وہ پریشان نہ ہو۔ پولیس یقیناً مفرور مجرم جمال کو برآمد کرنے کے لیے گھر پر چھاپا مارے گی اور اس کی نگرانی بھی کرے گی مگر فکر کی کوئی بات نہیں۔ اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ نہ گھر پر نہ تھانے میں۔ بہت جلد جمال اس سے ملنے آئے گا۔

جمال نے پورا ایک مہینا ڈاکوؤں کے ساتھ ان کے ڈیرے پر گزارا جہاں اس کی پیشورانہ تربیت ہوئی۔ اس کا دل ناصرہ سے اور اپنے بچوں سے ملنے کے لیے تڑپتا تھا مگر وہ صبر و ضبط سے کام لینے پر مجبور تھا۔ پھر ایک رات ناصرہ کو بچوں کے ساتھ ایک نئے گھر میں لے جایا گیا جو شہر کے دوسرے کنارے پر بالکل مخالف سمت میں تھا۔ یہ بھی چھوٹا سا گھر تھا لیکن یہاں ضروریات زندگی کے تمام اسباب مہیا تھے۔ اس سے کہا گیا کہ اب وہ اپنے پرانے گھر کو بھول جائے۔ ایک اخبار میں چھوٹی سی خبر بھی شائع کرائی گئی کہ فلاں محلے سے ایک عورت اور اس کے بچوں کو اغوا کرلیا گیا ہے۔ اغوا پرانی دشمنی کا شاخسانہ لگتا ہے۔ پولیس تفتیش کر رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب بکواس اور جھوٹ تھا۔

ایک ہفتے بعد جمال نصف شب کے بعد اپنے گھر پہنچا تو اسے دیکھ کر ناصرہ نے خوشی سے چیخ ماری اور بچے اس سے لپٹ گئے۔ وہ رات اور اس سے اگلی دو راتیں جمال نے ان کے ساتھ گزاریں۔ وہ ان کے لیے ڈھیروں کپڑے، جوتے اور قیمتی تحائف لے کر آیا تھا۔

چوتھی شام کا سورج ڈھلتے ہی جمال نے کہا۔ ''اب میں جاؤں گا۔''

ناصرہ نے سادہ سا سوال کیا۔ ''کہاں؟''

''یہ میں نہیں بتا سکتا۔''

''اپنی بیوی پر بھی اعتبار نہیں؟''

جمال نے کہا۔ ''جو میں خود نہیں جانتا تمہیں کیا بتاؤں۔''

ناصرہ نے کہا۔ ''جو جانتے ہو وہ تو بتا سکتے ہو۔''

''ہاں۔ میں جیل سے رہا نہیں ہوا، فرار ہوا ہوں۔'' جمال بولا۔

''کس کے ساتھ؟'' ناصرہ نے پوچھا۔

''انہی کے ساتھ جن کے ساتھ پکڑا گیا تھا۔''

ناصرہ کچھ دیر خاموش رہی۔ ''اس کا مطلب ہے...''

''ہاں، وہ رقم جو تمہیں ہر ماہ ملتی رہی کسی حاجی نے نہیں بھیجی تھی۔''

''شک مجھے بھی تھا لیکن میں تمہاری بات پر یقین کیسے نہ کرتی۔ میں اس کو سچ ماننے پر مجبور تھی۔''

''مجبور میں بھی ہوں ناصرہ۔''

''ڈاکوؤں کا ساتھ دینے پر۔'' ناصرہ نے کہا

''کیوں؟''

''اس لیے کہ شریفوں نے میرا ساتھ نہیں دیا تھا۔ نیکی کے راستے پر چل کے مجھے ذلت اور عذاب کے سوا کچھ نہیں ملا تھا۔''

''تم بہت جلدی ہمت ہار گئے۔''

''یہ بات نہیں، میری ہمت جواب دے چکی تھی۔ میں اس انتہا تک پہنچ گیا تھا جہاں میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب سارے مسائل کا ایک ہی حل باقی رہ گیا ہے کہ میں تم سب کو مار کے خود بھی مر جاؤں۔''

''یہ ہمت تھی تم میں؟''

''ہر روز نہ جانے کتنے لوگ زندگی کے حق سے دستبردار ہونے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کیونکہ زندہ رہنا ان کے لیے ناممکن بنا دیا جاتا ہے۔ ایسے تم جو چاہو کہو۔ میں سمجھتا ہوں اس میں بھی مشیعتِ ایزدی تھی کہ میں وہاں سے گزر رہا تھا۔ میری سائیکل کی چین ٹوٹی اور میں رک گیا۔ میری ٹانگ پر گولی لگی اور میں پکڑا گیا۔ یہ سب میں نے تو پلان نہیں کیا تھا۔ پھر کس نے کی تھی میرے لیے یہ ساری منصوبہ بندی۔''

''تم غلط سوچ رہے ہو۔''

''دیکھو! جس راستے پر میں جا رہا ہوں اب اس سے واپسی ممکن نہیں۔ اگر تم اپنے لیے بہتر راستہ منتخب کرنا چاہو تو تمہیں اس کا حق ہے۔''

''تم اتنی آسانی سے چھوڑ سکتے ہو مجھے، ہم سب کو؟'' ناصرہ رونے لگی۔

''تمہارے بغیر میرے لیے زندگی کا کوئی تصور نہیں۔ لیکن میں تمہیں زبردستی اپنے ساتھ اس راستے پر نہیں چلا سکتا جو میں نے اپنے لیے چنا ہے۔''

''یہ مجبوری میری بھی ہے کہ میں تمہارا ساتھ دوں۔ دکھ سکھ میں اور اچھے برے حالات میں۔'' ناصرہ نے سر جھکایا جیسے کچھ کہتے کہتے رک گئی ہو۔

''تم کچھ اور کہنا چاہتی ہو؟ بولو رک کیوں گئیں۔''

''کچھ نہیں، بچے کچھ نہیں جانتے اور سب مان لیتے ہیں۔''

''ہاں! جب تک وہ بچے ہوں۔''

''ان کے بڑے ہونے سے پہلے میں یہ راستہ چھوڑ دوں گا۔''

ناصرہ نے کہا۔ ''کیا دلدل میں اپنی مرضی سے اترنے والا اپنی مرضی سے باہر آسکتا ہے؟''

جمال برہم ہوگیا۔ ''میں کوشش ضرور کروں گا اگر تم کہو کہ بشرط زندگی... تو میں بھی کہوں گا کہ ہاں سب کچھ زندگی سے مشروط ہے۔''

وہ چلا گیا اور پھر وقفے وقفے سے آتا رہا۔ یہ وقفہ کبھی ہفتہ دس دن کا ہوتا تھا تو کبھی مہینے دو مہینے کا بھی ہو جاتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے حالات میں انقلاب آیا۔ جمال نے ایک خوشحال علاقے میں گھر لے لیا۔ ایک کار خریدی جسے ناصرہ خود ڈرائیو کرتی پھرتی تھی۔ اس کے بچے ایک انگلش میڈیم اسکول میں جانے لگے۔ ناصرہ خود انہیں لاتی لے جاتی تھی۔

پاس پڑوس کے اور جاننے والوں کے لیے جمال ایک بزنس مین تھا جس کا زیادہ وقت باہر مختلف ممالک کے کاروباری دوروں میں صرف ہوتا تھا۔ اس بیان کی صداقت پر کون شک کرتا۔ نہ کسی کو اس کی ضرورت تھی اور نہ فرصت۔ ناصرہ اپنے تمام معاملات میں خود مختار تھی۔ جمال بہت خوش اور مطمئن تھا کہ وہ اندر باہر کے سارے معاملات کو بڑی خوش اسلوبی سے چلا رہی ہے۔

پھر ایک واقعے نے اس کی دنیا بدل ڈالی۔ ڈاکوؤں کے گروہ کے ساتھ جمال ہر واردات میں شریک ہوتا تھا تو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کے۔ وہ اپنے علاقے اور ٹھکانے بدلتے رہتے تھے۔ کئی بار وہ محصور ہوئے اور بڑی مشکل سے جان بچا کے نکلے۔ ان کے کئی ساتھی مارے گئے۔ ان کی جگہ دوسرے لوگ آگئے۔ ایک سال میں جمال نے لاکھوں کمائے اور اس کمائی سے بیوی بچے عیش کرتے

www.pdfbooksfree.pk

رہے۔ وہ بھٹکتا رہا، دُہری زندگی جیتا رہا اور سوچتا رہا کہ وہ دن کب آئے گا جب ہر لمحہ خوف، ہر گھڑی مارے جانے یا زخمی ہو کے پکڑے جانے کے ڈر، مسلسل روپوشی، فرار اور احساس جرم کا بوجھ بڑھنے کا یہ سلسلہ ختم ہوگا۔ وہ سکون سے اپنے گھر میں بیٹھے گا اور معاشرے میں وہ عزت حاصل کرے گا جو پیسے سے مل جاتی ہے۔

اچانک ایک دن اسے بیوی بچوں کی یاد نے اتنا بے قرار کیا کہ وہ کسی کو کچھ بتائے بغیر اپنے گھر جانے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ وہ گھر سے تین چار گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ اس نے سوچا کہ صبح تک وہ بہ آسانی لوٹ آئے گا تو کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ اس نے رات بھر کے لیے دگنے کرائے پر ایک ٹیکسی لی اور تین گھنٹے بعد اپنے گھر کے دروازے پر جا اترا۔

وہ اچانک پہنچ کے ناصرہ کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ اس نے چشم تصور سے دیکھا۔ وہ سوتی ہوئی آنکھیں ملتی دروازے تک آئی اور پورچ کی لائٹ جلائی تو اپنے سامنے جمال کو دیکھ کر پتھر کے بت کی طرح ساکت و جامد رہ گئی۔

عمداً جمال نے کال بیل نہیں بجائی اور گیٹ کے اوپر سے پورچ میں اتر گیا جہاں اس کی نئی سیاہ رنگ کی کرولا لشکارے مار رہی تھی حالانکہ پورچ کی لائٹ آف تھی۔ برآمدے میں ایک دروازہ ڈرائنگ روم کا تھا۔ دوسرا ناصرہ ... اور اس کے بیڈروم کا۔ اسے بیڈروم میں روشنی دیکھ کے حیرانی ہوئی۔ رات کے ایک بجے ناصرہ کیوں جاگ رہی ہے پھر اس نے کسی مرد کی آواز سنی پھر ناصرہ کھلکھلا کے ہنسی۔

جمال کا خون اس کے سر میں کھنچ آیا۔ یہ آواز کسی ٹی وی ڈرامے کے کردار کی نہیں تھی۔ ٹی وی خاموش تھا۔ گھر میں کوئی اور مرد تھا، اس کے اپنے بیڈروم میں، ناصرہ کے ساتھ۔ ایک لمحے کے لیے اسے یہ شک بھی گزرا کہ آواز اس کی سنی ہوئی ہے۔

اس نے پھر کان لگا کے سنا لیکن اب اندر خاموشی تھی لیکن اب اس کے دماغ میں شک نے پنجے گاڑ دیے تھے اور وہ تصور میں عجیب لہو منجمد کر دینے والے مناظر دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے اپنا وہم قرار دینے کے لیے بے چین تھا چنانچہ وہ پچھلی طرف سے گیا۔ آخری حصے میں دس فٹ چوڑی گیلری تھی جس میں کپڑے سوکھ رہے تھے۔ اس کے سامنے کچن کی کھڑکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی جالی والا عقبی دروازہ تھا۔

اس نے پہلے جالی والے دروازے کو دھکیلا مگر وہ اندر سے بند تھا۔ پھر اس نے کھڑکی پر کوشش کی کھڑکی کھل گئی۔ وہ کچن میں اتر گیا اور گھر میں کھلنے والے دروازے سے مختصر سے کاریڈور میں آ گیا۔ کاریڈور کے دائیں بائیں دو بند دروازے بیڈرومز کے تھے۔ پھر ٹی وی لاؤنج تھا۔ اس کے بالکل سامنے ایک دروازہ بیڈروم کا تھا اور دوسرا ڈرائنگ روم کا۔ دونوں دروازے کھلے ہوئے تھے۔

وہ تاریکی میں آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ نے اندازے سے دیوار پر سوئچ بورڈ تلاش کیا اور لائٹ جلا دی۔ ایک دم جیسے ساری کائنات تہ و بالا ہو گئی۔ وہ سوئچ کسی بم کا تھا جو پھٹا تو اس نے جمال کی دنیا کو تباہ کر دیا۔

جو منظر جمال کی نظروں کے سامنے روشن ہوا اس کے ہوش گم کرنے کے لیے کافی تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا۔ یہی ایک لمحہ فیصلہ کن ثابت ہوا۔ اس نے ناصرہ کی چیخ سنی پھر ایک جست لگا کے مانی اس کے مقابل آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور جسم پر کچھ بھی نہیں تھا۔ بستر پر ناصرہ خود کو چادر میں چھپا رہی تھی۔

"مانی..... تو..... میرے ہی گھر میں۔" جمال چلایا۔

"اپنے ہی دوست کی عزت پر ہاتھ ڈالا تو نے!"

"دنیا میں کوئی کسی کا دوست نہیں ہوتا۔" مانی نے سفاکی سے کہا۔

"لیکن تو نے دوست بن کے مدد کی تھی۔ میں تجھے چھوڑوں گا نہیں اور اس عورت کو..."

"سیدھا کھڑا رہ جمال۔ میں تیرا دوست بنا تھا اس عورت کے لیے۔ مجھے کیا معلوم تھا یہ تیری بیوی ہے۔"

جمال چلایا۔ "یعنی تم پہلے سے جانتے تھے ایک دوسرے کو؟"

"ہاں! تو نے اسے مجھ سے چھین لیا تھا۔ اب میں نے اسے تجھ سے چھین لیا ہے۔ وقت وقت کی بات ہے۔" مانی بولا۔

جمال نے ناصرہ کی طرف دیکھا۔ "تیرے دعوے تو کچھ اور تھے۔ بڑی نیک اور باوفا تھی تو۔"

ناصرہ نے تڑخ کے کہا۔ "تم بھی بہت شریف اور عزت دار تھے۔ اب تم نے جرم و گناہ کی راہ اختیار کر لی ہے تو شرافت اور وفاداری کے راستے پر چلنا میرے ہی مجبوری کیوں؟"

جمال نے چیخ کے کہا۔ "بے حیا... فاحشہ۔"

مانی نے سائیلنسر لگے پستول سے ایک فائر کیا۔ جمال پلٹ کے پیچھے گرا۔ ناصرہ ایک دم اٹھ کے کپڑے پہننے لگی۔

"جاؤ... تم نکل جاؤ۔" اس نے مانی سے کہا۔

"جلدی کرو۔"

مانی نے آہستہ سے اسے اپنے قریب کر لیا۔ "فکر کی

کوئی بات نہیں اس وقت یہ آواز کسی نے نہیں سنی ہوگی۔"

پھر وہ جمال پر جھکا۔ "تمہیں اس طرح بن بتائے اور چوروں کی طرح نہیں آنا چاہیے تھا۔"

جمال نے خون اگلا۔ "مجھے... ؟" اور ساکت ہو گیا۔

مانی نے جمال کے مردہ جسم کو ایک بہت بڑے پلاسٹک بیگ میں ڈالا پھر اس نے قالین کو لپیٹا جس نے جمال کے دل سے نکلنے والے خون کو جذب کر لیا تھا۔ "اب تم سو جاؤ آرام سے۔" وہ ناصرہ کی طرف دیکھ کے مسکرایا۔

ناصرہ کانپ رہی تھی اور اس کا جسم ٹھنڈا پڑ رہا تھا۔

"یہ بہت برا ہوا مانی!"

"کیا برا ہوا؟ اب ہمارے درمیان کوئی نہیں رہا۔ میں تو بہت پہلے اس سے تمہیں مانگ لینا چاہتا تھا۔ اسے بتا دینا چاہتا تھا کہ تم میری ہو مگر تم نے ہمیشہ سے روکا۔"

وہ اسے پلاسٹک کا تھیلا گھسیٹ کر باہر لے جاتے دیکھتی رہی۔ وہ پھر آیا اور قالین اٹھا کے لے گیا۔ "اب اپنا دروازہ بند کر لو۔"

"مانی، مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" وہ دروازے تک آئی۔

"فکر مت کرو میں سب ٹھیک کر لوں گا۔" اس نے آخری بار ناصرہ کو چوما اور باہر نکل گیا۔

باہر ایک ٹیکسی کھڑی تھی جو جمال کو یہاں لائی تھی۔ اس گھر میں جسے وہ ابھی تک اپنا ہی گھر سمجھتا تھا چنانچہ بن بتائے آ گیا تھا' اپنی بیوی کو سرپرائز دینے کے لیے۔ یہ جانے بغیر کہ اس سے بڑا سرپرائز خود اس کے سامنے آئے گا۔

مانی نے ٹیکسی والے کو دس ہزار دیے۔ اس نے وہی کیا جو مانی نے کہا اور تمام عمر لب نہیں کھولے۔ اس نے اپنی بیوی کو کچھ نہیں بتایا۔ عورت راز کو راز نہیں رکھ سکتی۔ وہ کسی کے سامنے یہ کہانی رازداری کے وعدے پر سنا دیتی تو وہ مصیبت میں پڑ جاتا۔

ایک مہینے بعد ناصرہ نے اپنے شوہر کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوائی۔ وہ کیا کرتے تھے؟ اس سوال کے جواب میں ناصرہ نے کسی عام گھریلو عورت کی طرح معصوم بن کے جواب دیا۔ "مجھ سے تو وہ یہی کہہ کے جاتے تھے کہ بزنس کے سلسلے میں باہر جا رہا ہوں۔ کچھ امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس تھا ان کا۔ وہ کہہ گئے تھے کہ دبئی جا رہا ہوں۔ اس سے پہلے وہ سنگاپور گئے تھے۔ ہانگ کانگ بھی جاتے تھے۔ اور مجھے پتا نہیں۔"

ناصرہ نے چار مہینے دس دن انتظار کیا جو درحقیقت اس کے لیے عدت کا زمانہ تھا پھر وہ گھر چھوڑ دیا۔ بچے کافی عرصہ پوچھتے رہے۔ "امی... ابو کب آئیں گے۔" اور وہ بڑے سکون سے ایک ہی جواب دیتی رہی۔ "پتا نہیں بیٹے۔" بالآخر بچوں نے بھی پوچھنا چھوڑ دیا۔

ناصرہ کے لیے فوری طور پر مانی سے شادی کرنا مشکل تھا۔ وہ راتوں کو چھپ کے آتا رہا اور مال غنیمت میں سے جمال کا حصہ باقاعدگی سے اسے پہنچاتا رہا۔ اصول بھی آخر کوئی چیز ہے۔

دو سال بعد ایک صبح ناصرہ نے اخبار اٹھایا تو دوسرے صفحے پر مانی کی تصویر تھی۔ اس کی خون آلود لاش کسی سڑک یا گلی میں پڑی تھی۔ اس کے ساتھ دی ہوئی خبر کو پڑھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ کسی ڈکیتی کے دوران مارا گیا تھا۔

ناصرہ کی آنکھوں سے خود بخود آنسو بہہ نکلے۔ اسے اب اپنے دنیا میں اکیلے رہ جانے کا احساس ہوا تھا۔ اب وہ آدھی نہیں پوری بیوہ ہو گئی تھی۔ تاہم وہ ایک ہمت والی اور ذہین عورت تھی۔ ایک حقیقی اور دوسرے اختیاری شوہر نے مل کے اسے اتنا دے دیا تھا کہ اب زندگی گزارنا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا۔

اس نے اپنی جمع پونجی کو بڑی ہوشیاری سے استعمال کیا۔ صرف چھ مہینے بعد وہ ایک بزنس مین کے ساتھ ڈنر کر رہی تھی جس نے اسے اپنے ساتھ شریک ہونے کی دعوت دی تھی۔ پہلے ڈنر میں... پھر بیڈروم میں اور بالآخر بزنس میں۔ وہ ہر جملہ اس ترتیب سے چلتی رہی۔

اس نے کامل کو بہت اچھے اسکول میں داخل کرایا تھا لیکن پہلے باپ کی غیر موجودگی اور پھر ماں کی عدم دلچسپی نے اس کے لیے گھر کو کبھی گھر نہیں ہونے دیا۔ وہ اپنا بیشتر وقت باہر صرف کرتا تھا۔ نہ اسے ماں کے آنے جانے کی خبر ہوتی تھی نہ ماں کو اس کے لیکن ہائی سوسائٹی میں تو یہ ہوتا ہے۔

گھر میں دو ملازم تھے جو تمام امور نمٹاتے تھے۔ ایک شامیر جو ڈرائیور ہونے کے ساتھ رات کے وقت چوکیداری کرتا تھا۔ دن میں بازار سے سودا سلف لانا اور بچوں کو اسکول چھوڑنا اور چھٹی کے وقت واپس لانا سب اس کے ذمے تھا۔ دوسری ادھیڑ عمر کی ملازمہ رشتے میں شامیر کی خالہ لگتی تھی اور اسی کی سفارش پر شامیر کو رکھا گیا تھا۔

ناصرہ اپنی گاڑی خود ڈرائیو کرتی تھی۔ بچوں کو کہاں اپنے ساتھ لے جانا کہاں نہیں لے جانا ہے، اس کا فیصلہ بھی وہی کرتی تھی۔ خیر خواہوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنے لیے

www.pdfbooksfree.pk

بھی ڈرائیور رکھ لے کیونکہ شہر میں بڑھتے ہوئے ٹریفک کے مسائل کی وجہ سے گاڑی چلانا سخت مشکل ہوتا جارہا ہے لیکن ناصرہ نے ان کی بات پر عمل نہیں کیا۔ دراصل وہ جانتی تھی کہ ڈرائیور ساتھ ہو تو نقل وحرکت کی رازداری برقرار نہیں رکھی جاسکتی۔ ناصرہ کب کہاں گئی کس سے ملی، کتنی دیر کس آفس میں یا کس کے گھر میں رہی۔ کس کے ساتھ کس ہوٹل میں لنچ یا ڈنر کے لیے گئی یا شب بسری کے لیے۔ ڈرائیور کو کچھ نہ بتایا جائے تب بھی اسے معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ اسے منظور نہ تھا۔

ایسا اکثر ہوتا تھا کہ وہ ایک دو دن کے لیے دبئی کا کہہ کے جاتی تھی۔ لیکن دبئی نہیں جاتی تھی۔ ویسے وہ ساری دنیا گھوم رہی تھی اور اس کے یہ دورے بیک وقت کاروباری بھی ہوتے تھے اور تفریحی بھی۔ اس کے دونوں بچے ماں کو ایک معروف اور کامیاب بزنس ویمن سمجھتے تھے۔

ماں اور باپ کا کنٹرول نہ ہونے کے نتائج اس وقت سامنے آنے لگے جب بچوں کو یہ احساس ہوا کہ اب وہ بڑے ہوگئے ہیں۔ ان کے رنگ ڈھنگ اور معمولات میں آنے والی تبدیلی نے ناصرہ کو پریشان کردیا۔ پہلے کمال کے اسکول سے غیر حاضری کی شکایات موصول ہونے لگیں۔

ناصرہ نے پہلے ڈرائیور کو طلب کیا۔ ''یہ کمال اسکول نہیں جاتا تو کہاں جاتا ہے؟''

شامیر گھبرا گیا۔ ''میڈم! میں تو روز اسکول میں چھوڑ کے واپس آجاتا ہوں... واپسی پر اکثر فاخرہ بی بی ہی آتی ہیں۔''

''کیوں؟ کمال کیوں نہیں آتا۔''

''وہ کسی دوست کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔ دوست ہی گاڑی میں ان کو چھوڑ جاتا ہے۔'' شامیر نے کہا۔

ناصرہ نے کمال سے پوچھا تو اس نے سرکشی سے کہا۔ ''اب کیا دوستوں سے ملنے کے لیے بھی مجھے آپ کے اجازت نامے کی ضرورت ہوگی۔''

''آخر کون ہیں تمہارے دوست؟''

''دس از پرسنل۔ کیا کبھی میں نے آپ سے پوچھا کہ آپ کے دوست کون ہیں؟''

''کمال! شٹ اپ... میں تمہاری ماں ہوں۔''

''میں بھی آپ کا بیٹا ہوں۔'' کمال نے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور باہر نکل گیا۔ اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جس نے ناصرہ کو پریشان کردیا۔ کیا وہ کہہ رہا تھا کہ اب میں بڑا ہوگیا ہوں اور تمہاری نقل وحرکت پر نظر رکھوں گا؟ میں تمہیں آوارہ گردی کرنے اور اپنی بدنامی کا سبب بننے کی اجازت نہیں دوں گا۔

تعلیم کی طرف سے کمال کی بے پروائی اور آوارہ مزاجی بڑھتی گئی۔ ناصرہ نے معلوم کیا تو مزید پریشان ہوگئی کیونکہ اس کی کمپنی اچھی نہیں تھی۔ ایک دن اس نے کمال کو اپنے پاس بٹھا کے پیار سے سمجھایا۔

''دیکھو! تم تعلیم مکمل نہ کرسکے تو کیا کرو گے؟''

''میں آپ کا بزنس سنبھالوں گا۔''

''بزنس سنبھالنے کے لیے بھی تو آج کل ایم بی اے کرنا ضروری ہے۔'' ناصرہ نے کہا۔

''کیا آپ نے ایم بی اے کیا تھا؟''

وہ سٹپٹا گئی۔ ''ہم نے تو سخت حالات میں بہت کچھ کرلیا مگر اب دنیا بدل گئی ہے۔ تم اس کاروبار کو بڑھا سکتے ہو۔''

''کون سا کاروبار ہے آپ کا؟'' وہ ناصرہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولا۔ ''مجھے آج تک پتا نہیں چلا۔''

ناصرہ اس سوال کے لیے ہمیشہ تیار تھی۔ ''میں بتاتی ہوں تمہیں۔ میں یہاں سے ہینڈی کرافٹس اور لیدر گڈز بھجواتی ہوں دبئی اور بنکاک۔ دبئی سے کاسمیٹکس لاتی ہوں، بنکاک سے گارمنٹس۔''

''آپ کا کوئی آفس نہیں ہے؟''

''میں ڈائریکٹ آرڈر لیتی ہوں۔'' ناصرہ نے کہا۔

''پھر بھی... مال خریدنا بھیجنا... کسٹم کلیرنس... حساب کتاب اور انکم ٹیکس... یہ سب کون کرتا ہے؟''

ناصرہ کو پہلی بار احساس ہوا کہ کمال بچہ نہیں رہا اور وہ دنیا کے معاملات کو سمجھتا ہے۔ ''اس کے لیے دوسرے لوگ ہیں۔ کلیرنگ فارورڈنگ ایجنٹ۔ انکم ٹیکس پریکٹشنر۔ لیکن تم یہ جرح کیوں کررہے ہو۔ جو میں کہہ رہی ہوں وہ سنو۔ میں چاہتی ہوں کہ تم ایم بی اے کرو پھر میرے بزنس کو آرگنائز کرو۔ کوئی پیداواری پوسٹ لگاؤ۔ کسی ایک فیلڈ میں آگے بڑھو۔ صفر بیکار بنو۔ ایم بی اے کے بغیر یہ نہیں ہوگا۔ تمہیں آئی بی اے یا لمز جانا ہے۔ اور اس کے لیے تمہارا بہت اچھے نمبروں سے پاس ہونا ضروری ہے تاکہ تم انٹرٹیسٹ میں کوالیفائی کرسکو۔''

کمال بیزار ہوگیا۔ ''او کے... او کے۔ کرلوں گا ایم بی اے۔ لیکچر مت دیں مجھے۔ دس ہزار روپے دیں۔''

''دس ہزار... وہ کس لیے؟'' ناصرہ نے برہمی سے کہا۔

''میرے پرسنل اخراجات۔''

''پرسنل... پرسنل... مائی فٹ۔ ابھی تم پڑھ رہے ہو کوئی گھر نہیں چلا رہے ہو۔ پھر تمہیں اتنی رقم کی کیا ضرورت

ہے۔ مجھ سے مانگو گے تو تمہیں سب بتانا پڑے گا۔''

''میں سچ بولوں گا تو آپ مجھے پیسے نہیں دیں گی۔ اور آپ کو برا بھی بہت لگے گا۔''

وہ چلائی۔ ''آخر کیا کرتے ہو تم؟ شراب پیتے ہو، جوا کھیلتے ہو؟''

''یہ بھی کرتا ہوں لیکن ابھی تو مجھے اپنی ایک گرل فرینڈ کے لیے گفٹ لینا ہے۔''

''ابھی ایک ہفتے پہلے بھی تم نے یہی کہا تھا۔''

کمال ڈھٹائی سے بولا۔ ''وہ دوسری گرل فرینڈ تھی ماما۔''

''دوسری کے بعد تم تیسری کے لیے مانگو گے... پھر چوتھی کے لیے۔ نو کمال! میں اپنی محنت کی کمائی ایسے نہیں لٹا سکتی۔''

کمال ہنسا۔ ''محنت... کیسی محنت ماما۔ جو کچھ آپ کرتی ہیں اس کو محنت، حق حلال یا شرافت کی کمائی نہیں کہا جاسکتا۔''

اس نے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ ''کمال...''

کمال نے ماں کی نازک کلائی اپنے مضبوط ہاتھوں میں پکڑ لی۔ ''آپ کیا سمجھتی ہیں میں جانتا نہیں۔ آخر میں بھی تو اسی دنیا میں رہتا ہوں۔ اور دنیا خود مجھے بتاتی ہے کہ تمہاری ماں کیا کرتی ہے۔''

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''کیا کرتی ہوں میں؟''

''تم خود کو بیچتی ہو۔''

''کتے... کمینے... حرامزادے...'' وہ ہسٹریا میں مبتلا ہوگئی۔ ''اور کیا کروں میں؟ کیا ہے میرے پاس بیچنے کو۔ اسی کمائی سے تو پلا بڑھا ہے، آج مجھ سے سوال کرتا ہے۔ کبھی اپنے باپ سے سوال کیا کہ وہ کیا کرتا تھا؟''

کمال کے ہاتھوں کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ اس نے کمزور لہجے میں سوال کیا۔ ''وہ کیا کرتا تھا۔''

''وہ ایک ڈاکو تھا... یقین نہیں آتا تو چلا جا کسی تھانے میں اور دیکھ لے اس کا سارا ریکارڈ۔ جو عیاشی کی زندگی تم نے گزاری وہ کیا حق حلال کی کمائی سے ممکن تھی؟ اس نے صرف تمہیں پیدا کیا اور بس۔ اسے مجھ سے یا اپنی اولاد سے محبت ہوتی تو وہ ایسے کام نہ کرتا۔''

کمال نے اپنا سر تھام لیا۔ ''ماں... انکل مانی کیا تھے؟ وہ بھی تو ڈاکو ہی تھے۔ میں نے اخبار میں ان کی تصویر دیکھی تھی۔ تم نے ایسا کیوں کیا ماں؟ ایک ڈاکو کو چھوڑ کے دوسرے ڈاکو کو اپنا لیا۔''

وہ روتی رہی۔ ''تم نہیں سمجھو گے یہ سب۔ یہ دوسرا ڈاکو مجھ سے وہ محبت کرتا تھا جو سوائے کیلی مجنوں جیسی داستانوں کے اور کہیں نہیں ملتی۔''

''پھر اس نے تم سے شادی کیوں نہیں کی؟''

''پہلے اسے میں نے دھوکا دیا پھر قسمت نے۔ غلطی میری تھی کہ میں مانی کے ساتھ نہیں نکلی عزت اور شرافت کے چکر میں۔ اور دیکھو آج ایک ماں اپنے بیٹے کے سامنے مجرم بنی کھڑی ہے۔ جواب دہی کررہی ہے۔ کیا ایسا دیکھا ہے تم نے کہیں؟''

کمال نے کہا۔ ''بس کرو ماں۔ بہت ہوگئی۔ اب کل سے تم باہر نہیں جاؤ گی۔''

''باہر نہیں جاؤں گی تو کام کیسے چلے گا۔ تیری گرل فرینڈز کو تحفے دینے کے لیے رقم کہاں سے آئے گی۔ کل سے کیا تو کما کے لائے گا؟ میں تو رہ لوں گی۔ تو رہ سکتا ہے دو کمروں کے فلیٹ میں، کسی جھگی میں۔ بغیر کار کے پھر سکتا ہے؟'' اس نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔

کمال دانتوں سے اپنے ناخن کاٹتا رہا۔ ''اب ہم اتنے غریب بھی نہیں ہوگئے۔''

''تو کیا جانے غربت کیا ہوتی ہے۔ اور دیکھنا چاہتا ہے تو جا چلا جا یہ گھر چھوڑ کے پھر پتا چل جائے گا تیری گرل فرینڈز کیا ہیں۔ وہ کیا طوائف نہیں ہیں؟ تیرے تحائف کے بغیر وہ تجھے گھاس ڈالیں گی۔ آزما لے۔''

کمال اب وہاں سے بھاگنا چاہتا تھا۔ ''اچھا ابھی تو دس ہزار دے دو ماں۔''

ناصرہ اٹھ کے الماری تک گئی اور اپنا بیگ نکالا۔ ''یہ لو دس ہزار... لیکن آئندہ کے لیے ایک بات سن لو۔ میری زندگی میں دخل مت دینا۔ جیسے میں تمہاری زندگی میں دخل نہیں دیتی۔ میں مردوں کی دنیا میں ایسا کاروبار کرتی ہوں۔ ان کی مدد کے بغیر میں آگے نہیں بڑھ سکتی اور یہ مدد مشروط ہوتی ہے۔ آئی بات سمجھ میں۔ اپنے افعال وکردار کی ذمے دار میں خود ہوں اور کسی کو جواب دہ نہیں۔ تمہارے لیے یہ اطمینان کافی ہونا چاہیے کہ تم ایک نکاح کی پیداوار ہو حرامی نہیں ہو۔ اب جاؤ۔'' اس نے دس ہزار کمال کی طرف پھینک دیے۔

کمال نے جھک کے دس ہزار اٹھائے اور باہر نکل گیا۔ ناصرہ نے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ کیا وہ لوٹ کے آئے گا؟ اس کے دل میں ایک اندیشے نے سر اٹھایا۔

www.pdfbooksfree.pk

"خداوند... کیا میں نے اپنا بیٹا بھی گنوا دیا ہے؟"

وہ بستر پر گری اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

فون کی گھنٹی سن کے اس نے ریسیور اٹھایا اور اپنی آواز میں سکون پیدا کر کے بولی۔ "ہیلو..."

"مسز ناصرہ جمال۔" کسی اجنبی نے سوال کیا۔

"جی میں بول رہی ہوں۔"

"میں گڈلک کارپوریشن سے بول رہا ہوں... ابراہیم خان۔"

"آپ کرنسی ایکس چینج کرتے ہیں..." ناصرہ کو یاد آ گیا۔

"بالکل صحیح سمجھا آپ نے۔ دبئی سے پارٹی نے آپ کو ایک لاکھ کی رقم ادا کرنے کے لیے کہا ہے، لوکل کرنسی میں لیکن آپ چاہیں تو ہم ڈالر، پاؤنڈ اور یورو، سب دے سکتے ہیں۔"

ناصرہ نے ایک لمحہ سوچا۔ "اگر یورو ہو تو آپ کس ریٹ پر دیں گے؟"

"آپ اگر آ سکتی ہیں تو ہم بیٹھ کے معاملات طے کر لیں گے ورنہ میں خود آ جاتا ہوں۔ دراصل پرسنل ویری فیکیشن ضروری ہے۔"

"پھر آپ آ جائیں پلیز! کل صبح۔"

اگلے دن ابراہیم خان آیا تو ناصرہ اسے بالکل نہ پہچان سکی۔ رقم ادا کرنے تک وہ ناصرہ کو گھورتا رہا جس سے وہ کچھ نروس ہوئی۔ جب رسید پر دستخط کرانے کے بعد بھی وہ بیٹھا رہا تو ناصرہ نے کہا۔ "آپ ایسے کیا دیکھ رہے ہیں۔"

"تم نے پہچانا نہیں مجھے؟" وہ بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔

[illegible] کہا۔ "جی نہیں۔"

"لیکن میں نے پہچان لیا ہے تمہیں۔ تم اسی مولوی جمال الدین کی بیوی ہو نا جو میرا مقروض تھا۔"

ناصرہ نے اسے غور سے دیکھا۔ "وہ تو نہ جانے کس کس کا مقروض تھا۔"

"اس نے ہم سے پچاس ہزار لیا تھا۔ ایک ہزار روپیا مہینا سود پر۔ اب یاد آیا؟ وہ سود بھی ادا نہیں کر پایا تھا پھر جیل چلا گیا تھا۔"

ناصرہ کی نظروں میں وہ منظر گھوم گیا جب یہ شخص ان کے گھر میں گھس کے اسے زبردستی لے جانے کی کوشش کر رہا تھا اس کے الفاظ تیزاب کے قطرے تھے جو اس کے دل میں زخم ڈال گئے تھے اور ان کا نشان باقی تھا۔ اس نے کہا تھا کہ تم جوان ہو، خوبصورت ہو، دھندا کر کے میرا قرضہ ادا کرو۔

وہ غصے میں کھڑی ہو گئی۔ "چلو ابراہیم خان، ابھی اور اسی وقت نکل جاؤ میرے گھر سے ورنہ..."

"ورنہ کیا... تم پولیس کو بلاؤ گی۔ ضرور بلاؤ، میرے تو پولیس سے پرانے مراسم ہیں۔ ان کی مدد کے بغیر ہم یہ ہنڈی کا غیر قانونی کاروبار کیسے چلا سکتے ہیں۔ وہ تم سے بھی پوچھیں گے کہ یہ ایک لاکھ دبئی سے کس نے بھیجے ہیں اور کیوں..."

ناصرہ صوفے پر گر گئی۔ "آخر تم کیا چاہتے ہو ابراہیم خان... اگر اپنا پرانا قرض وصول کرنا چاہتے تو یہ لو... آدھی رقم واپس لے جاؤ۔"

"یہ تو اصل ہوا... سود کا حساب بھی تو دو۔ ایک ہزار روپے ماہانہ کے حساب سے کتنے مہینے ہو گئے۔" وہ عیاری سے مسکرایا۔

"اوکے... اوکے... سب لے جاؤ۔" ناصرہ نے گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی۔ "لیکن رسید ضروری ہے۔"

"مجھے ایک بات بتاؤ! تم ایک غریب مُلّا کی بیوی، ناکام ڈکیتی کی واردات میں وہ جیل چلا گیا تھا۔ تم نے اتنی ترقی کیسے کر لی؟"

"اس سے تمہیں غرض نہیں ہونی چاہیے۔" وہ برہمی سے بولی۔

"ہاں... لیکن قانون کو ہو گی۔ کہاں ہے تمہارا وہ شوہر، کیا بزنس کرتا ہے۔ کتنا انکم ٹیکس دیتا ہے۔ بہت سے سوالات کا جواب تمہارے پاس نہیں ہو گا ناصرہ۔"

"جواب تو تمہارے پاس بھی نہیں ہو گا۔"

"بالکل ٹھیک۔ میں کل بھی [illegible] غیر قانونی دھندا کرتا تھا، آج بھی کرتا [illegible]۔ [illegible] مجھے سود خور کہتے تھے۔ آج میں [illegible] ڈیلر ہوں۔ نہ جائز ذرائع سے رقم منتقل کرنے والے مجھ پر بہت اعتبار کرتے ہیں اور وہ مولوی جمال الدین جیسے احمق... میرا مطلب ہے شریف لوگ نہیں ہوتے۔ ان سے پولیس بھی ڈرتی ہے۔"

ناصرہ پُرسکون ہو گئی۔ "تم مجھے بلیک میل کرو گے ابراہیم خان۔"

"کل سے اب تک میں نے سب معلوم کر لیا ہے۔ وہ مولوی ڈاکوؤں کے ساتھ مل گیا تھا۔ بہت مال لوٹا اس نے مگر ایک ایک کر کے وہ سب مارے گئے۔ تم اس گروہ کے سرغنہ مانی کے ساتھ رہنے لگیں۔ مولوی جمال الدین کا کسی کو پتا نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ مارا گیا کہ جیل میں ہے۔ جیل سے میں نے معلوم کر لیا ہے وہ دوبارہ جیل نہیں گیا۔ اس کے مارے جانے کی کوئی اطلاع نہیں۔ وہ کہاں ہے ناصرہ، تمہارا شوہر؟"

"ابراہیم خان... مطلب کی بات کرو۔"

وہ بولتا رہا۔ "میں بتاتا ہوں۔ تم نے مانی کے ساتھ مل کے اسے مار دیا ہو گا۔ وہ تم جیسی عورت کا شوہر کہلانے کے لائق نہیں تھا۔ مانی اچھا آدمی تھا... مرد کا بچہ، بہادر اور نڈر۔ کیا اس نے تم سے شادی کر لی تھی... مارے جانے سے پہلے؟"

ناصرہ کی آنکھوں سے آنسو خاموشی سے بہنے لگے۔

"چلو چھوڑو۔ ان خوبصورت آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں لگتے۔ میرے یہاں آنے کا مقصد نہ تمہارا دل دکھانا تھا، نہ اپنا قرض وصول کرنا...... اور نہ تمہیں بلیک میل کرنا۔ میں نے سوچا جو بات اس دن نہ کہہ سکا جس دن پہلی بار تمہیں دیکھا تھا، وہ آج کہہ دوں۔ تب سے تمہاری صورت میرے دل میں بسی ہوئی ہے۔ بین الاقوامی کرنسی کے کاروبار میں ملک ملک کی عورت دیکھی میں نے۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ استعمال بھی کی لیکن تمہیں نہ بھلا سکا۔ ناصرہ... مجھ سے شادی کرو گی؟"

ناصرہ دم بخود رہ گئی۔ "شادی...؟"

"شادی اب تک نہیں کی ہے میں نے۔ میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ میں لائف پارٹنر بنوں گا تو تمہارا بزنس پارٹنر بھی ہو جاؤں گا۔ تمہاری ہر طرح سے مدد کروں گا۔ تمہیں خوش رکھوں گا... بولو ناصرہ۔"

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ابراہیم خان سود خور نے ناصرہ کو جتنا خوش رکھا اتنا [illegible] اور نے نہیں رکھا تھا۔ اس کی زندگی میں دکھ صرف ایک تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو پھر نہ دیکھ سکی۔ وہ گھر سے ایسا نکلا کہ کبھی لوٹ کے گھر نہ آیا۔"

کمال نے بے گھر ہونے کے بعد زندگی کا دوسرا چہرہ دیکھا۔ بدصورت اور قابلِ نفرت۔ فاقہ زدہ اور بے وسیلہ لیکن اسی دنیا میں بھٹکتے ہوئے اس نے ایم بی اے ضرور کر لیا جو اس کی ماں کی آخری خواہش تھی۔

اس کے نزدیک ماں اسی دن مر گئی تھی جس دن اس نے گھر چھوڑا تھا۔

☆☆☆

چوراہا:

چوراہا سو فٹ قطر کا پارک تھا جو چاروں طرف سے آنے والی سڑکوں کے مقابلے میں تقریباً ایک فٹ اونچا تھا۔ ہر سمت سے آنے والی گاڑیاں بائیں ہاتھ پر رہنے کے لیے گھوم کے ایک سڑک سے دوسری پر جاتی رہتی تھیں۔ ہر سڑک کے وسط میں گرین بیلٹ بھی اتنی ہی اونچی تھی اور سڑکوں کو دو رویہ بناتی تھی۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 6,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

www.pdfbooksfree.pk

چوراہے پر ٹریفک کے رش کو کنٹرول کرنے کے لیے ایک سگنل کی تنصیب اب ضرورت بنتی جارہی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ پارکس کے عین وسط میں جو دائرے کا مرکز تھا ایک بہت بڑا، بہت پرانا اور ہر طرف پھیلا ہوا برگد کا درخت، قدامت کے سارے حسن اور تکبر کے ساتھ استادہ تھا۔ اس کی قدامت کے بارے میں اندازے مختلف تھے۔ کوئی اسے سو سال پرانا بتاتا تھا تو کوئی پانچ سو سال سے بھی زیادہ۔ اسی برگد کی وجہ سے چوک کا نام بھی برگد چوک پڑ گیا تھا۔

ٹریفک سگنل نصب کرنے کے لیے برگد کو ہٹانا لازمی تھا لیکن کچھ پرانی یادگاروں سے محبت کرنے والے، کچھ حسن پرست اور کچھ ماحول دوست افراد اور ادارے اس خیال کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ وہ کہتے تھے کہ برگد اس شہر کی تاریخ کا حصہ ہے۔ چوک کی خوبصورتی اسی سے ہے اور درخت کاٹنا ویسے بھی ایکولاجیکل بیلنس کو خراب کرنا ہے چنانچہ کوئی متبادل راستہ اختیار کیا جائے مثلاً معلق HANGING سگنل لگائے جائیں۔

پارک کی سرسبز گھاس کا نظارہ آنکھوں کو تراوٹ دیتا تھا چنانچہ اس پر چلنا یا بیٹھنا منع تھا۔ گولائی کے ساتھ ساتھ بینچوں پر دوپہر کے سوا لوگ ہر وقت بیٹھے نظر آتے تھے۔ برگد کا سایہ سورج کے ساتھ ساتھ سفر کرتا تھا اور کبھی ایک طرف کی بینچوں پر آجاتا تھا تو کبھی دوسری طرف۔ سایہ دار بینچ پر لوگ دوپہر کے وقت سوتے ہوئے بھی نظر آتے تھے۔

بینچ سے پیچھے پوری گولائی میں پھولوں کی کیاری تھی جس میں سارا سال موسم کے مطابق رنگ کھلے رہتے تھے۔ ایک سیکیورٹی گارڈ ہر وقت سیٹی بجاتا ادھر سے ادھر دوڑتا نظر آتا تھا کہ کوئی پھول نہ توڑے، سبزے پر نہ چلے اور کوڑا کرکٹ نہ پھیلائے۔

وہ چاروں ساتھ ساتھ ایک ہی بینچ پر چپ بیٹھے تھے اور برگد کو دیکھ رہے تھے۔ گاڑیاں ان کے پیچھے سے زن زن گزرتی جارہی تھیں لیکن وہ اپنے خیالات میں اور اپنی باتوں میں اتنے محو تھے کہ انہیں ٹریفک کے شور سے کوئی جھنجلاہٹ نہیں ہورہی تھی۔

ان میں سے ایک دبلا پتلا فاقہ زدہ چہرے والا اور گنجا تھا۔ اس نے چارخانے کی ڈھیلی اور میلی شرٹ پہن رکھی تھی۔ پرانی جینز کے ساتھ اس کے پاؤں میں سینڈل نما چپل نظر آرہی تھی۔ یہ حیدر تھا جو کسی زمانے میں ڈاکٹر تھا کیونکہ اس نے ایم بی بی ایس کیا تھا۔ اس وقت وہ ایک اسمارٹ، صحت مند اور باڈی بلڈر ٹائپ انقلابی نوجوان تھا جس کے وجود میں ایک بے چین عقاب کی روح تھی جو بلندیوں کی جانب پرواز کرنا چاہتا ہو۔

دوسرا لمبی سفید ڈاڑھی اور اور سفید بالوں والا شخص بھی بیمار لگتا تھا۔ اس کی ڈاڑھی گھنی نہیں تھی اور سر کے بال بھی چاروں طرف جھالر کی صورت میں باقی رہ گئے تھے۔ وہ سفید کرتے میں تھا جو اب مٹیالا ہو رہا تھا۔ چارخانے کی لنگی اور عینک کے ساتھ وہ ایک جھٹکے سے گردن کو دائیں بائیں حرکت دیتا تھا تو کسی ویران درخت پر بیٹھا ہوا الو لگتا تھا جو دنیا کی بے ثباتی پر غور کرنے کے سوا کچھ نہ کرسکتا ہو، یہ انجینئر وقار تھا۔

تیسرا جو لگتا تھا۔ وہ بہت موٹا تھا اور اس کا سر کسی تربوز کی طرح صاف اور چمکیلا تھا۔ اس کی گردن شانوں کے درمیان نظر ہی نہیں آتی تھی، رہی سہی کسر اس کے لباس نے پوری کردی تھی۔ اس نے لال، نیلی، پیلی دھاریوں والی چست بنیان ٹائپ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی جس میں سے اس کے پیٹ کا پھولا ہوا غبارہ اور عورتوں جیسا لٹکا ہوا سینہ واضح ہوتا تھا۔ اس نے نیچے کئی جیبوں والا پاجامہ یا ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ ہر جیب میں کھانے کے لیے کچھ بھرا ہوا تھا چنانچہ اس کا منہ مسلسل چل رہا تھا۔ یہ خاور تھا جس کے پاس ایم بی اے کی ڈگری تھی۔ جو ایک پرائیویٹ یونیورسٹی نے عطا کی تھی۔

چوتھا دبلا پتلا، دراز قد، خاموش اور سنجیدہ صورت شخص ان سب کے مقابلے میں بہتر لباس پہنے ہوئے تھا۔ اجلی سفید قمیص گرے پتلون اور بلیک شوز۔ اس کے سر پر دوسروں کی نسبت زیادہ بال تھے۔ بہ ظاہر ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں گم ہے لیکن اچانک وہ کسی وجہ کے بغیر ہنس پڑتا تھا۔ یہ کمال تھا جس نے کسی زمانے میں انفارمیشن ٹیکنالوجی پڑھی تھی۔

ان سب کی عمریں پینتالیس سال سے کم تھیں لیکن وہ ساٹھ کے نظر آتے تھے۔ وہ صبح باری باری یہاں آئے تھے۔ ملاقات کا وقت تو آٹھ بجے تھا مگر سب سے پہلے حیدر نو بجے آیا تھا۔ ساڑھے نو بجے خاور پھر کمال اور سب سے آخر میں وقار دس بجے پہنچا تھا۔

حیدر نے اپنے گنجے سر پر رومال پھیر کے پسینا صاف کیا۔ ”خاور! تمہیں پورا یقین ہے؟“

وقار نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ”ہاں... ہم اپنی ڈگریوں کے مدفن پر بیٹھے ہیں۔“

وہ ایک دوسرے کے پیچھے چلتے چوک سے سڑک تک آئے۔ پھر ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ریلوے اسٹیشن کے قریب ٹیکسی ایک پرانے ہوٹل کے سامنے رک گئی۔ وہ اتر کے

ہوٹل کے نچلے حصے میں واقع ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے۔ ان کے کمرے اوپر والی منزل پر تھے۔ ریسٹورنٹ اس وقت خالی پڑا تھا۔ وہ اس کے ایک گوشے میں براجمان ہوگئے۔

ویٹر گندے کپوں میں خوب ابالی ہوئی کوئٹہ برانڈ چائے لے آیا۔ حیدر نے کہا۔ ”چلو اچھا ہے اپنا دکھڑا رو کے ہم دل کچھ ہلکا کرسکتے ہیں۔ آج مجھے دیکھ کے تم لوگ سکتے میں رہ گئے تھے کیونکہ میں وہ حیدر نہیں تھا، پرانا حیدر...“

میں ڈاکٹر تھا۔ میں نے سوچا کہ زکام، بخار یا دمہ جیسے امراض کی گولیاں اور کیپسول دے کر سو پچاس روپے مانگنے سے میرا گزارا نہیں ہوگا۔ ان غریبوں کو یہی بیماریاں ہوتی ہیں۔ ملیریا کیونکہ وہ مچھروں کے ساتھ رہتے ہیں، مچھروں کی بستی میں۔ سیوریج اور پانی کی لائنوں کے مل جانے کے بعد جو پانی انہیں ملتا ہے وہ پی کے انہیں اسہال کی بیماری نہیں ہوگی تو کیا ہوگا۔ تازہ ہوا اور دھوپ نہ ملنے سے وہ ٹی بی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ صحیح خوراک یا تو اسے بالکل نہ ملنے سے ماں کوٹی بی ہو تو وہ بچوں میں تقسیم کردیتی ہے اور مرتے دم تک بچے جننے کی مشین بنی رہتی ہے۔ خیر... پھر میں نے سوچا کہ دولت مندوں کا مسئلہ کیا ہے۔ شوگر، انجائنا، جوڑوں کا درد۔ کیونکہ وہ بہت کماتے رہے اور اچھا کھاتے رہے اور اپنی ٹانگوں پر چلنے سے مکمل پرہیز کرتے رہے۔ بے خوابی..... کیونکہ انہیں دولت کمانے یا گنوانے کی فکریں لاحق ہوتی ہیں۔ اعصابی کمزوری کیونکہ وہ خوف میں مبتلا رہتے ہیں۔ انکم ٹیکس بچا کے پکڑے جانے کا خوف، تاوان کے لیے اغوا ہو کے مارے جانے کا خوف، ڈاکوؤں کے ہاتھوں لٹنے کا خوف یا اپنوں کے ہاتھوں... لیکن وہ کسی گمنام ڈاکٹر کے پاس کہاں جاتے ہیں۔ وہ بڑے نام والے کسی اسپیشلسٹ کے سوا کسی ڈاکٹر کو منہ نہیں لگاتے۔ یا پھر باہر چلے جاتے ہیں مزے میں علاج کرانے۔

تو دوستو... یوں میں نے سوچا کہ کون ہیں وہ بے وقوف جن کے پاس پیسا بھی ہو۔ یہ تو ظاہر ہے کہ پیسا کمانے والا بے وقوف نہیں ہوتا۔ وہ محنتی بھی ہوتا ہے اور ذہین بھی۔ لیکن اس کے گھر میں کئی بے وقوف ہوتے ہیں۔ نمبر ون اس کی بیوی جو اس غم میں گھلتی ہے کہ عمر کے ساتھ اس کے حسن و شباب کو گھن لگ رہا ہے اور اسے شوہر کی... یا اپنے چاہنے والوں کی نظر میں پہلے کی طرح پرکشش نظر آنے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ پھر اس کی بیٹی جو سانولے رنگ سے یا چہرے پر جھائیوں اور کیلوں مہاسوں سے نجات چاہتی ہے۔ بال لمبے کرنا، نسوانی کشش کے اسباب میں اضافہ، لمبا قد۔ یہ سب پیسے والوں کی نوجوان اولادوں کے وہ کمپلیکس ہیں جو کسی دوا سے دور نہیں ہوسکتے کیونکہ قد یا لمبے بال یا رنگ... سب موروثی ہیں۔ مرد گنجا ہونا نہیں چاہتے۔ بغیر ورزش کے سلم رہنے کے خواہش مند ہیں اور خوب کھانا پینا بھی چاہتے ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کے لیے اشتہاری دوائیں ہیں۔ رنگ گورا کرنے والی کریم، قد بڑھانے کی گولیاں، وزن گھٹانے کے نسخے۔ ہوگا کچھ نہیں، بس اشتہار زبردست ہونا چاہیے۔ ٹی وی، پر اخبار میں۔ گلی بازاروں میں ہر جگہ ڈھول پیٹا جارہا ہو تو کوئی کب تک نہیں سنے گا۔

دوسری اہم بات یہ کہ سستی دوا کو ایسا احمق ضرورت مند قابل غور ہی نہیں سمجھتا... قیمت سیکڑوں کے بجائے ہزاروں میں ہو تو وہ سوچتا ہے کہ اس میں ضرور کچھ ہوگا۔ اسے ضرور آزمانا چاہیے۔ امیر کو چھوڑو، غریب اور متوسط طبقے کی لڑکیاں اور لڑکے کہیں نہ کہیں سے ہزاروں لے آتے ہیں۔ نہ کسی کا رنگ گورا ہوتا ہے نہ کسی کا قد بڑھتا ہے۔ نہ وزن گھٹتا ہے۔ اشتہاری دوا بنانے، بیچنے والے کو ہزاروں مل جاتے ہیں۔ دو چار مہینے بعد ایک احمق جاتا ہے تو دوسرا آجاتا ہے۔ پہلا احمق دوسری دوا پر لگ جاتا ہے؟“

خاور نے بے صبری سے کہا۔ ”تو نے کیا بیچا؟“

”یار یہ جلدی کیسی... ہمیں کہیں جانا تو نہیں ہے۔“ وقار بولا۔

حیدر نے اپنی بات پھر شروع کی۔ ”اب آگے چلو... نوجوانوں کے بعد ہیں وہ بوڑھے جو بوڑھا ہونا نہیں چاہتے۔ جوان رہنے کے لیے وہ کیا نہیں کرتے لیکن یہاں تو جوانوں کو نامردی کے خوف میں مبتلا کردیا جاتا ہے۔ جو دیواروں پر لکھا ہے پڑھ لو۔ نوجوانی کی غلط کاریاں کسی مرد کو شب عروسی نامرد نہیں کرتیں مگر اشتہاری دوائیں بیچنے والے کہتے ہیں کہ ایسا ہوتا ہے تو وہ ڈر جاتے ہیں۔ قصہ مختصر... میں نے بہت سوچا اور پھر ایک فنانسر تلاش کیا۔

وہ ایک دوا ساز ادارے کا ایگزیکٹو تھا جسے بریک تھرو نہیں مل رہا تھا۔ وہ اپنی دوا ساز کمپنی بنانا چاہتا تھا کیونکہ وہ خود بچپنے کے سارے حربے اور طریقے جانتا تھا اور اندر کی بات بھی۔ لیکن اس کے پاس بھی پیسا نہیں تھا۔ جب میری اس سے ملاقات ہوئی تو ہمارے خیالات میں ایسی ہی ہم آہنگی تھی جیسی ساز اور مضراب میں ہوتی ہے۔ بجلی کے دو تاروں میں ہوتی ہے جن کے ملنے سے روشنی پیدا ہوتی ہے۔“

ہم نے سب کچھ طے کرلیا۔ ہم کیا کریں گے، کیسے کریں گے؟ پھر مسئلہ آگیا پیسے کا۔ اس کے لیے میں نے

www.pdfbooksfree.pk

ایک دولت مند لیکن بدصورت اور بدکردار عورت کو پھانسا جس کا شوہر کوئی آڑھتی تھا اور پیسا ہونے کے باوجود اس کے ارمان پورے نہیں ہوتے تھے۔ پھر شوہر نے دوسری شادی کرلی اور پہلی بیوی کو بھول گیا۔ وہ اپنی ضرورت اِدھر اُدھر سے پوری کرتی رہی۔ میں نے اس پر ڈورے ڈالے۔ سب سے پہلے اسے یقین دلایا کہ وہ میری نظر میں کتنی حسین ہے۔ عجیب بات ہے یار... دنیا کی ہر عورت یہی یقین کرنا چاہتی ہے... مگر آئینے پر یقین نہیں کرتی، کسی میرے جیسے جھوٹے مرد کے الفاظ کا اعتبار کرلیتی ہے۔ دوسرے مرحلے میں جو بہت جلد آگیا' میں نے اسے اپنی محبت کا یقین دلایا۔ تیسرے مرحلے میں کہا کہ ہم شادی کرکے یورپ امریکا، فرانس اور سوئٹزرلینڈ جاسکتے ہیں۔

میں تو چاہتا تھا کہ وہ شوہر کا قصہ تمام کرے اور ساری دولت اس کے ہاتھ میں آجائے تو میرا کام بن جائے۔ مگر ایک تو دوسری بیوی درمیان میں رکاوٹ تھی... پھر خود اس میں قتل کرنے کی ہمت نہ تھی حالانکہ میں نے اسے مرڈر کا بالکل پرفیکٹ پلان بنا کے دیا تھا۔ ایک رات وہ کوئی بیس لاکھ نقد اور تقریباً ایک کروڑ کے بونڈ اور زیورات لے کر آگئی، میرے ساتھ فرار ہونے کے لیے۔ یہ مال اس نے گھر میں سے اکٹھا کیا تھا۔ نہ کسی کو اس کے اور میرے تعلقات کی خبر تھی' نہ یہ معلوم تھا کہ وہ گھر سے نکلی تو کہاں گئی۔ میں نے اسے مار کر ایک کھنڈر میں ڈال دیا۔

''اس مال سے ہم نے آغاز کیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ دوسرا شخص کچھ نہیں لایا۔ اس نے اپنے دولت مند سسر کو عدم آباد بھیجا۔ خود نہیں، بیوی کے ذریعے۔ بیوی کو نصف جائداد ملی کیونکہ اس کی ایک بہن بھی تھی۔ یہ نصف بھی کوئی بیس لاکھ نقد تھے اور ایک مکان۔ اس ابتدائی سرمائے سے ہم نے کام شروع کیا۔

کام کیا تھا۔ صرف اشتہار بازی۔ گولیاں اور دوائیں تو سب بوگس تھیں لیکن بے ضرر۔ مثلاً وٹامن بی کی گولیوں کو ہم نے قد بڑھانے کا قدیم چینی نسخہ بنا کے پبلسٹی کی۔ رنگ بدل کے انہی گولیوں کو قد بڑھانے کا رومن فارمولا کرلیا۔ اہل یونان جہاں بقراط اور سقراط تھے۔ دائمی صحت کے لیے کیا کرتے تھے۔ تاریخ کا انمول راز۔ مصر کے فرعون بیک وقت سیکڑوں بیویوں کو کیسے خوش رکھتے تھے۔ اہرام مصر سے دریافت ہونے والا شاہی طبیب کا نسخہ جو اس کی حنوط شدہ ممی کے ساتھ پایا گیا، وغیرہ وغیرہ... بکواس میں کمال کو اب ماس کمیونی کیشن کہتے ہیں۔

بس دوستو۔ ہم شرطیہ ایڈز کا علاج کرتے رہے۔ ہیپا ٹائٹس بی اور سی سے نجات کی گارنٹی دیتے رہے۔ منی بیک گارنٹی۔ دیواروں پر یورپ اور امریکا کی میڈیکل ریسرچ کو چیلنج کرتے رہے اور بے وقوف آتے رہے۔ سارا معاملہ یہ ہے کہ دنیا میں شاید 95 پچانوے فیصد عقل کے اندھے ہیں۔''

خاور نے نفی میں سر ہلایا۔ ''98 اٹھانوے فیصد۔''

کمال نے فوراً تردید کردی۔ ''یار ننانوے اعشاریہ نو فیصد۔''

حیدر نے ہاتھ اٹھایا۔ ''یہ اپنا اپنا مشاہدہ اور تجربہ ہے۔ جب کہیں میرے جھوٹ کا راز فاش ہونے لگتا تھا۔ کوئی میڈیا کا نمائندہ جسے مجھ سے مال کم ملے ناراض ہوجاتا تھا تو ہم غائب ہوجاتے تھے۔ پھر سال کچھ مہینے گم رہتے تھے۔ دبئی، سنگاپور، ہانگ کانگ چلے جاتے تھے۔ میرے پارٹنر نے اپنی بیوی سے نجات حاصل کرلی تھی۔ ایک دن غصے میں شرعی حق مہر بتیس روپے آٹھ آنے ہاتھ پر رکھ کے تین بار طلاق کہا اور ہاتھ پکڑ کے باہر کردیا۔ ہمارا یہ کاروبار مختلف شہروں میں مختلف ناموں سے چلتا رہا۔ ہماری آمدنی کی کوئی حد نہ تھی۔ ہم نے لاکھوں نہیں کروڑوں کمائے۔ لیکن پھر ہمارے درمیان ایک عورت آگئی۔ اس نے ہم دونوں کو پھانسا۔ دونوں کو اپنی محبت کا یقین دلایا۔ حسن سے کہیں زیادہ خطرناک اور پرفریب اس کی معصومیت تھی۔ ہم دونوں کو پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کس مہارت سے اپنا گیم کھیل رہی ہے۔ ہم ایک دوسرے سے ہر راز چھپاتے رہے اور بالواسطہ طور پر اس کی مدد کرتے رہے۔

قصہ مختصر... اس نے میرے ہاتھوں میرے پارٹنر کا خون کرادیا۔ یقیناً اس نے میرے پارٹنر کو بھی میرے قتل پر اکسایا ہوگا۔ وہ بزدل تھا یا اس نے سوچنے میں اور عمل کرنے میں دیر لگادی۔ میں پہل کرگیا۔ اگر وہ پہل کرپاتا تو میں یہ سب سنانے کے لیے یہاں موجود نہ ہوتا۔ اس عورت کے نزدیک ہم دونوں غیر اہم تھے۔ اہم تھی ہماری دولت جس پر وہ قابض ہونا چاہتی تھی اور ہوگئی۔ اس نے مجھ سے شادی کی اور مہینے بھر بعد پولیس کو بتادیا۔ وہ خود معصوم بن گئی کہ مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ جس سے میں عمر بھر کے لیے پیمان وفا باندھ رہی ہوں وہ اتنا بڑا دھوکے باز اور خونی ہے۔ اس نے رازداری کے وعدے پر مجھے بتایا تو پولیس کو بتانا میرا فرض بن گیا۔

اس نے وعدہ معاف گواہ کی طرح میرا کچا چٹھا کھول کے پولیس کے سامنے رکھ دیا۔ مجھے عمر قید ہوگئی جبکہ مجھے پورا

یقین تھا سزائے موت ہوگی۔ وہ صاف بچ گئی یا بچالی گئی۔ جب میں جیل کاٹ کے نکلا تو اس کا کہیں پتا نہ تھا۔ وہ میرا سب کچھ لے گئی تھی۔''

کچھ دیر بعد پھر چائے آئی تو وقار نے کہا۔ ''میرے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا۔ یاد ہے جب ہم نے اپنی ڈگریاں دفن کی تھیں تو کیا کہا تھا۔ اب ہم محنت نہیں فراڈ کریں گے۔ کیونکہ ہر طرف فراڈ ہورہا ہے اور کامیاب وہی ہیں جو فراڈ کررہے ہیں۔''

میرے باپ نے ایک پلاٹ بک کرایا تھا۔ پچیس فیصد ڈاؤن پیمنٹ کے بعد میں اس کی ماہانہ اقساط بھی بڑی باقاعدگی سے دیتا رہا۔ مجھے خیال آیا کہ دیکھوں اب کتنی رقم بقایا ہے۔ میرے حساب سے تو پانچ دس اقساط رہتی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ میں متعلقہ ادارے میں جاکر معلوم کرلوں گا۔

میری بات سن کے وہ ہنسنے لگا۔ ''اوئے یتیم خانے۔ اتنا عرصہ کدھر تھا تو... آج آگیا ہے مجھ سے پلاٹ مانگنے۔''

میں نے کہا۔ ''میں ہر ماہ بینک میں قسط جمع کراتا رہا۔ ساری رسیدیں ہیں میرے پاس۔''

اس نے مجھے ساری رسیدوں کے بارے میں ایک ناقابل عمل مشورہ دیا۔ ان کی بتی پولیس کے ڈنڈے سے دگنی موٹی بنتی... غالباً میری شکل دیکھ کر اسے پہلے ہنسی آئی تھی پھر ترس آگیا۔ اس نے کہا۔ ''درمیان میں تو نے ایک بار بھی پتا نہیں کیا۔''

میں نے کہا۔ ''پوری رقم ادا کرنے سے پہلے یہ بات نامناسب ہوتی۔''

وہ پھر ہنس پڑا۔ ''اوئے نامناسب وقت کی پیداوار... اب بھی کیا ضرورت تھی پتا کرنے کی۔ لوگ تو سال بعد چکر لگانے لگے تھے کہ پلاٹ دو پھر ہر مہینے آجاتے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''شاہ جی اب کہاں ہے؟''

وہ بولا۔ ''میں بتا بھی دوں گا تو کیا بگاڑ سکے گا تو اس کا۔ وہ پہلے غائب ہوگیا تھا پھر حلیہ بدل کے آیا اور اب ایک کنسٹرکشن کمپنی چلا رہا ہے۔ بہت بڑا بلڈر ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے اس کا پتا چاہیے۔''

وہ بولا۔ ''اسی سڑک پر ذرا آگے دستگیر ٹاؤن بن رہا ہے۔ وہ اس کا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ تجھے آفس میں مل جائے مگر میرا نام مت لینا کہ میں نے تجھے بھیجا ہے۔ تو صورت سے ہی یتیم مسکین لگتا ہے۔ اس لیے میں نے بتادیا۔''

میں اس کا شکریہ ادا کرکے دستگیر ٹاور پہنچا۔ شاہ جی مجھے اپنے شاندار آفس میں مل گیا۔ میں نے اسے پہچان لیا حالانکہ اس نے اپنا حلیہ بالکل بدل لیا تھا۔ اس کی ڈاڑھی غائب تھی۔ اس کا لباس پینٹ شرٹ تھا اور تسبیح کی جگہ اس کے ہاتھ میں جام شراب تھا۔ وہ اپنے آفس میں پینے پلانے کا عادی تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ پر نشۂ شباب سے معمور اور لباس میں بے لباسی کے ہوشربا انداز رکھنے والی سیکریٹری بیٹھی تھی۔

میں نے پلاٹ کی کوئی بات نہیں کی۔ میں نے اس کے سامنے نوکری کی درخواست رکھ دی۔ ''میں ایک انجینئر ہوں جناب! ڈگری ہے میرے پاس۔''

اس نے چوکیدار کو بلایا۔ ''اس بندے کو باہر کا راستہ دکھاؤ۔''

میں نے کہا۔ ''جناب میں بغیر تنخواہ کے کام کروں گا۔''

اس نے چوکیدار کو روک دیا اور مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔ ''کیوں؟ کھانے کے لیے اتنا ہے تیرے پاس تو جا عیش کر۔ نوکری کیوں مانگتا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ایک مہینے بعد آپ خود مجھے تنخواہ دیں گے۔''

وہ ایسے ہنسا کہ منہ سے شراب پھوار کی طرح نکلی اور اس حسینہ کے کھلے گریبان سے ظاہر حصوں پر گری۔ ''ایک مہینے بعد کیا میرا دماغ خراب ہوجائے گا۔''

''جی نہیں۔ آپ کو اندازہ ہوگا کہ جتنی تنخواہ آپ مجھے دے رہے ہیں اس سے سوگنا فائدہ آپ کو میری وجہ سے ہوچکا ہے۔''

''اچھا؟ یہ بات ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ ہر مہینے چیک کرلیں۔ جتنی بچت میرے کام سے ہو۔ اس کا چالیس فیصد مجھے دے دیں۔''

وہ حیرانی سے مجھے دیکھتا رہا۔ ''اور نقصان ہوگیا پھر؟''

''پھر آپ مجھ پر غبن کا کیس بنوا کے جیل بھیج سکتے ہیں۔''

''آخر میں کیوں پڑوں اس چکر میں۔''

میں نے کہا۔ ''میں رسید لکھ دیتا ہوں کہ میں نے آپ سے ایک لاکھ روپے قرض لیے تھے، چھ مہینے پہلے۔''

اس کی داشتہ نے کہا۔ ''سر جی! بندہ کھرا ہے۔ آزمانے میں کیا حرج ہے؟''

وہ مسکرایا۔ ''اچھا! تو سفارش کرتی ہے تو رکھ لیتا ہوں۔''

مجھے نوکری مل گئی۔ میں نے اپنی افادیت ثابت کی۔

www.pdfbooksfree.pk

میرے مشورے خطرناک تھے۔ جو انجینئر پہلے سے کام کررہے تھے انہوں نے میری مخالفت کی لیکن شاہ جی کو بچت صاف نظر آرہی تھی۔ اس نے میری مانی۔ پس پردہ مجھے اس کی سیکریٹری کی حمایت بھی حاصل رہی۔ میری معصومیت سے متاثر ہوکے اس نے مجھے اپنا منہ بولا عاشق بنالیا تھا۔ دس پندرہ دن میں ایک بار جب شاہ جی کہیں باہر ہوتا تھا، اس کے حسن کی خیرات مجھے مل جاتی تھی۔ جیسے نوکروں کو بچا ہوا جھوٹا کھانا دیا جاتا ہے۔

صرف تین مہینے میں میری کوشش سے تین انجینئر فارغ کردیے گئے اور شاہ جی کا مجھ پر اعتماد بڑھ گیا۔ مسئلہ کسی انجینئر کی قابلیت کا نہیں تھا۔ میں نے چوری چھپے شاہ جی کو رپورٹ دی تھی کہ ایک اس کی عدم موجودگی میں اس کی محبوبہ سے ملتا ہے۔ دوسرے پر میں نے الزام عائد کیا کہ وہ شاہ جی کے حریف بلڈر کے ساتھ ساز باز کررہا ہے اور پتا نہیں بندے توڑ کے لے جانا چاہتا ہے یا کوئی اندر کی بات بتانے کی قیمت وصول کررہا ہے۔ تیسرے کے بارے میں خود شاہ جی کی معشوقہ نے شبہ ظاہر کیا کہ اس کی ڈگری جعلی ہے۔ شاہ جی نے مجھ سے پوچھا تو میں نے تصدیق کی کہ اسے انجینئرنگ کا کچھ پتا نہیں۔ میرے ایما پر اس کی ڈگری کی مصدقہ کاپی یونیورسٹی کو بھیجی گئی۔ جواب آیا کہ اس نام کے کسی شخص نے اس سال انجینئرنگ کا امتحان پاس نہیں کیا۔ جواب کا لیٹر ہیڈ اور رجسٹرار کے دستخط اور مہر سب جعلی تھے۔ خود میں نے بنوائے تھے۔ اس انجینئر کو وضاحت سنے بغیر رخصت کردیا گیا۔ یوں شاہ جی کی دنیا میں میری عملداری قائم ہوگئی۔

اب بات یہ ہے دوستو! کہ کلوپیٹرا کے زمانے سے عورت ذات ہی کو تختے الٹنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ کہلاتی وہ ناقص العقل ہے مگر عقل مرد کی ماری جاتی ہے۔ میں نے بھی اس کی معشوقہ، سیکریٹری یا داشتہ۔ کچھ بھی کہو اسے۔ میں نے اس کو استعمال کیا۔ وہ دنیا بھر کے دھکے کھانے والی۔ ہر مرد کے بستر کی زینت بن کے پیسا کمانے والی۔ اپنے مستقبل کا تحفظ چاہتی تھی، اپنا گھر اپنا شوہر اور اپنے بچے چاہتی تھی جیسے ہر عورت چاہتی ہے خواہ وہ فقیرنی ہو یا ایشور یا رائے جیسی مس یونیورس۔ میں نے خفیہ طور پر اس سے شادی کرلی، نکاح پڑھوالیا۔

''ہاں۔ مل گیا ہوگا کوئی فراڈ نکاح خواں۔''

''سب مل جاتا ہے دنیا کے بازار میں۔ قیمت ادا کرنے والا ہونا چاہیے۔'' کمال نے کہا۔

''اس کی مدد سے میں نے شاہ جی کی کمپنی میں غبن کیا۔ شاہ جی کے خلاف ٹیکس بچانے اور بلڈنگ میں ناقص میٹریل استعمال کرنے کے دستاویزی ثبوت اکٹھے کیے۔ وہ ثبوت ایف آئی اے کو بھجوائے اور پچاس لاکھ جیب میں ڈال کے نکل گیا۔ شاہ جی اس وقت جیل میں جوتے کھا رہا تھا۔ میری مفروضہ منکوحہ میرا انتظار ہی کرتی رہ گئی۔ میں لاہور سے کراچی پہنچ گیا۔

اس کے بعد کام آسان ہوگیا۔ میں نے بوگس ہاؤسنگ سوسائٹیاں بنائیں جو اسکیم تینتیس میں بہت تھیں۔ جعلی دستاویزات کی مدد سے زمین کی ملکیت ظاہر کی۔ لون لیے اور لوگوں کا پیسا اکٹھا کرتا رہا۔ متعلقہ محکمے اور پولیس میرے معاون و مددگار تھے۔ میں کبھی پکڑا نہیں گیا۔ میں نے شادی کرلی اور کراچی کے ایک پوش علاقے میں کوٹھی بھی بنالی۔ ایک دن میں اپنی بیوی کے ساتھ کار میں حیدرآباد جارہا تھا کہ جنگ شاہی سے ذرا آگے مجھے ایک شخص سڑک پر پڑا نظر آیا۔ سڑک پر خون بھی تھا۔

میری بیوی نے کہا۔ ''لگتا ہے اسے کوئی گاڑی والا مار کے نکل گیا۔''

میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے وہ مرچکا ہے۔''

''ذرا دیکھو۔ ہوسکتا ہے وہ زندہ ہو۔'' میری بیوی نے کہا۔

میرا ارادہ رکنے کا نہیں تھا مگر میں نے گاڑی سلوکرلی۔ ''جانم! ایسے معاملات میں پڑنے والا مصیبت میں پڑجاتا ہے۔ ابھی آئے گی کوئی ایدھی ایمبولینس یا پولیس کی گاڑی تو اٹھالے گی۔''

میری بیوی چلائی۔ ''وقار... وہ زندہ ہے۔ دیکھو اس کا ہاتھ ہل رہا ہے۔ وہ گردن گھما کے ہمیں دیکھ رہا ہے۔''

مجبوراً میں گاڑی روک کے اترا۔ میرے دل میں زخمی کی مدد سے زیادہ اپنی گاڑی کے خون سے گندا ہونے کا خیال غالب تھا۔ ابھی میں نے اس کی طرف ایک قدم ہی بڑھایا تھا کہ وہ تڑپ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کے میں بھونچکا رہ گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ دھوکے باز ڈاکو ہے جو مجھے روک کے لوٹنا چاہتا ہے۔

میں نے کہا۔ ''دیکھو! تمہیں جو چاہیے لے لو۔''

مجھے امید تھی کہ وہاں سے گزرنے والی کوئی گاڑی یہ سین دیکھ کے رک جائے گی۔ رات کے وقت بھی اس سڑک پر ٹریفک ختم نہیں ہوتی لیکن مجھے بڑی مایوسی ہوئی جب ہر کار اپنی رفتار بڑھا کے نکل گئی۔

ڈاکو نے کہا۔ ''ہم کو جو لینا ہوگا لے لیں گے۔ تو چل۔''

میں نے کہا۔ ''کہاں چلوں؟ میرے ساتھ میری بیوی ہے۔''

اچانک سڑک کے دونوں جانب سے چار افراد نمودار ہوئے۔ وہاں خودرو جھاڑیاں تھیں، چاروں مجھے کھینچ کر لے گئے۔ میری بیوی مسلسل شور مچا رہی تھی۔ پانچواں اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا اور اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ مجھے انہوں نے ناک آؤٹ کرکے جھاڑیوں کے پیچھے ڈال دیا۔ بعد میں ان کی گاڑی آئی تو وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔

وہ ہالہ کے گردونواح کا جنگل ہی ہوگا جہاں کے بارے میں مشہور تھا کہ ڈاکوؤں کی پناہ گاہ ہے اور اغوا کیے جانے والے وہیں رکھے جاتے ہیں۔ مجھے وہ کئی دن آنکھوں پر پٹی باندھ کے ننگے پاؤں چلاتے رہے۔ بالآخر انہوں نے مجھ سے مطالبہ کیا کہ اپنی بیوی کو فون کرو۔ پچاس کروڑ ادا کردے تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔ پچاس کروڑ سن کے میرے ہوش اڑ گئے۔ میرے پاس اس کے دسویں حصے کے برابر بھی نہیں تھے۔ میں نے انہیں سمجھانا چاہا تو انہوں نے مجھے مارا۔ لیکن بالآخر وہ دس کروڑ پر آگئے۔

وہ میری بیوی سے بات کراتے تھے تو اسے سمجھا دیتے تھے کہ اگر تم نے پولیس سے رابطہ کیا تو سمجھو بیوہ ہوجاؤ گی۔ اپنی بیوی کو میں نے ہمیشہ بے وقوف اور سیدھا سادا سمجھا۔ میرا خیال تھا کہ اسے کاروباری معاملات کی الف بے کا بھی پتا نہیں لیکن وہ اس کے برعکس ثابت ہوئی۔ اس نے کھل کے یہ نہیں کہا کہ مجھے بیوہ ہونا منظور ہے مگر بڑی ہوشیاری سے تاخیر کی۔

میری بے وقوفی دیکھو کہ میں نے بینک میں مشترکہ اکاؤنٹ رکھا تھا، اپنے اور بیوی کے نام سے۔ کوٹھی بیوی کے نام پر تھی۔ اپنی آمدنی چھپانے اور ٹیکس بچانے والے ایسا ہی کرتے ہیں۔ خود ان کے نام پر کچھ بھی نہیں ہوتا اور جو ہوتا ہے بیوی بچوں کے نام سے ہوتا ہے۔ میں نے بیوی سے کہا کہ سب پیسا نکال لو۔ کوٹھی بیچ دو، زندگی رہی تو سب پھر بن جائے گا۔ اس نے یہی کیا۔ لیکن اس کے بعد سب کچھ لے کر غائب ہوگئی۔''

حیدر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اکیلی عورت یہ سب کیسے کرسکتی ہے۔ ضرور اس کی مدد کوئی مرد کررہا ہوگا۔''

وقار نے شرمندگی سے سر جھکالیا۔

ایک اور خاموشی کے وقفے کے بعد حیدر نے خاور کی طرف دیکھا۔ ''تیرے ساتھ کیا ہوا پیارے بھائی!''

''وہی جو تم سب کے ساتھ ہوا۔ میں نے بی اے کیا تھا۔ مجھے دوران سفر ایک شخص ملا جو کسی دفتر میں کلرک تھا لیکن عام لوگوں کی طرح خواب وہ بھی بڑے اونچے دیکھتا تھا۔''

حیدر بولا۔ ''ایسے خوابوں پر فی الحال کوئی پابندی نہیں۔''

''عام آدمی کے خواب کیا ہوتے ہیں۔ جیسے سکھوں کے پانچ ککے ہوتے ہیں۔ ککے مطلب..... کنگھی، کیسی، کڑا، کرپان اور کچھی۔ یہ سب ان کے مذہبی عقیدے کا حصہ ہیں۔ تو عام آدمی پہلے کوٹھی، کار، کیش، کاروبار اور کڑی، یعنی لڑکی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس نہ علم ہے نہ صلاحیت۔ نہ سفارش اور نہ وسائل۔ چنانچہ اس نے خوش قسمتی کی لاٹری پر سارے خوابوں کی بنیاد رکھی تھی۔ کہیں سے گڑا ہوا خزانہ مل جائے۔ سٹے کا نمبر نکل آئے۔ پرائز بونڈ لگ جائے۔ اس کے لیے وہ فقیروں اور مجذوبوں کے پاس جاتا تھا۔ مزاروں پر منت مانتا تھا اور عاملوں سے رجوع کرتا تھا۔ اب کمال دیکھو تقدیر کا۔ اس کا پرائز بونڈ لگ گیا۔ پورے دس لاکھ کا۔ یہ بات وہ قہقہے لگا کے ہر ہم سفر کو بتا رہا تھا اور اپنے مستقبل کے منصوبوں کا بھی اعلان کررہا تھا کہ وہ دس لاکھ کو دس کروڑ بنانے کے لیے کیا کرے گا۔ سوچو ذرا، ایک کلرک کا ذہن کس حد تک کاروباری ہوسکتا ہے۔ مجھے موقع ملا تو میں نے اسے سمجھایا کہ بزنس کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ اس کے دس لاکھ دس دن میں دس روپے رہ جائیں گے۔ وہ میری باتوں سے متاثر ہوا اور جب میں نے اسے بتایا کہ میں ایم بی اے ہوں۔ اس کے علاوہ بھی جھوٹ بولا تو وہ خاصا متاثر ہوگیا۔ میرے خلوص سے بھی اور میری قابلیت سے بھی۔ کیا یہ اس کے بے عقل ہونے کی دلیل نہیں تھی؟

اس نے مجھ سے پوچھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے اس کو اعداد و شمار کے ایسے گورکھ دھندے میں الجھایا کہ وہ چکرا گیا۔ میں نے اسے ایک اسکیم بتائی۔ وہ ایک فنانس کمپنی کھولے۔ لوگوں کا اتنا پیسا آئے گا۔ اتنا جائے گا۔ وہ کہنے لگا کہ پیسا میں لگاتا ہوں۔ لوگوں سے آپ ڈیل کرو۔ حساب کتاب رکھو۔ منافع آدھا آدھا۔ میں مان گیا۔

ہم نے کراچی میں فنانس کمپنی قائم کی اور اخبار میں ایک اشتہار دیا کہ ایک لاکھ پر ماہانہ دس ہزار روپے منافع دیا جائے گا۔ حالانکہ یہ ناممکن ہے، یہ سالانہ ایک سو بیس فیصد بنتا ہے۔ اتنا منافع کسی کاروبار میں نہیں ہوتا۔ مگر لالچی لوگ چکر میں آگئے۔ کوئی ایک لاکھ دے گیا۔ ہم نے اسے اپنے پاس سے دس ہزار دے دیے۔ اس کے ایک لاکھ جمع ہوگئے۔ دوسرا دس لاکھ لایا۔ ہم نے اسے ایک ماہ بعد ایک

www.pdfbooksfree.pk

لاکھ دے دیے۔ ہمارے پاس ایک لاکھ کم ہوئے مگر دس جمع ہو گئے۔ لوگ اب رقم بینکوں سے نکلوا کے لانے لگے۔ زیور اور مکان بیچ کے لانے لگے۔ ہم نے پانچ ماہ تک انہیں اسی حساب سے منافع دیا۔ گویا ان کی اپنی رقم کا نصف لوٹا دیا۔ دس فیصد ماہانہ کے حساب سے پانچ مہینے میں وہ آدھے لے گئے مگر ہماری ایمانداری کی دھوم مچ گئی۔ عقلمندوں نے اور ماہرین معاشیات نے اخباروں میں بہت لکھا کہ یہ فراڈ ہے مگر منافع برابر تقسیم ہو رہا تھا۔ ہمارے پاس پیسا آتا جا رہا تھا۔ ہم لوگوں کے پیسے انہی کو واپس کر رہے تھے اور ہمارے پاس جمع شدہ رقم بڑھتی جا رہی تھی۔ دس لاکھ کا پرائز بونڈ پانے والا لکی ڈرک تو خوشی سے پاگل ہو رہا تھا۔ اس زمانے میں دوسری بہت سی فنانس کمپنیاں بھی وجود میں آگئی تھیں مثلاً صمد، دادا بھائی کا نام بہت مشہور ہوا تھا۔

ہمارا مشترکہ اکاؤنٹ کمپنی مینجنگ ڈائریکٹر کہلاتا تھا۔ وہ چیئرمین، ہمارے اسٹاف میں سات افراد تھے۔ ساتوں خوبصورت لڑکیاں۔ کلرک تو راجا اندر بنا ہوا تھا اور میں بھی پریوں کے اکھاڑے میں تھا۔

ایک دن اچانک مجھے اطلاع ملی کہ حکومت کے کارندے فنانس کمپنیوں پر دھاوا بولنے والے ہیں۔ میں نے کوشش ضرور کی کہ جتنا مال ہاتھ لگے سب سمیٹ کے نکل جاؤں لیکن مجھے موقع نہ ملا۔ ایف آئی اے والوں نے آدھی رات کو چھاپا مارا اور ساری اکاؤنٹ بکس ضبط کر لیں۔ بینکوں میں ہمارے فنڈ منجمد ہو گئے اور ہمیں گرفتار کر کے لاک اپ پہنچا دیا گیا۔ اس کے بعد کی کہانی مختصر ہے۔ ان کمینی لڑکیوں نے سارا پول کھول دیا۔ اکاؤنٹ ہولڈر ہمارے دشمن ہو گئے اور ضمانت پر رہائی کے بعد بھی ہمیں روپوشی اختیار کرنا پڑی۔ ایک طرف تفتیشی ادارے تھے جو ہماری کھال کھینچ رہے تھے۔ ہم سے مال بٹور رہے تھے اور ہمیں جیل میں بھجوانا چاہتے تھے۔ ہم بالکل پھکڑ ہو چکے تھے اور وہ کلرک بادشاہ اس دن کو روتا تھا جب اس کی ملاقات مجھ سے ہوئی تھی۔ ایک دن ہم عدالت میں پیشی بھگتا کے لوٹ رہے تھے کہ مشتعل لوگوں کے ایک ہجوم نے ہم پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ وہ سب اپنے پیسے واپس مانگ رہے تھے۔ مار مجھے بھی پڑی لیکن میں کسی طرح بچ کے نکل گیا۔ چیئرمین صاحب شدید زخمی ہوئے اور اسپتال پہنچ کے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ سات سال کی جیل میں نے اکیلے کاٹی۔ مگر لوگ پھر بھی خوار رہے۔ بہت سے ایسے ہیں جن کو آج تک کچھ بھی واپس نہیں ملا۔ حکومت نے کسی کو چالیس فیصد دیا کسی کو پچاس فیصد۔ لیکن یہ بھی دس فیصد اپنا کمیشن کاٹ کے۔ میری مزید بدبختی کہ مجھے جیل کے اندر ایک شخص مل گیا جس کا سرمایہ ہماری فنانس کمپنی میں ڈوب گیا تھا۔ اس نے اپنا گھر بیچ کے پیسا لگایا تھا۔ بعد میں اس کی ملازمت چھوٹ گئی۔ گھر پہلے ہی نہیں تھا۔ بیوی بھی اسے چھوڑ گئی۔ وہ اسے لینے میکے گیا تو سالوں نے اسے مارا اور ان کے ساتھ مل کر بیوی نے بھی۔ وہ پاگل ہو گیا۔ ایک دن وہ چھری لے کر اپنی سسرال گیا اور بیوی کو ذبح کر دیا۔ جیل میں مجھے دیکھ کر اس پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا۔ اس نے مجھ پر حملہ کیا اور میں نے اپنا دفاع کیا۔ اس کے گواہ بہت تھے کہ اگر میں اسے نہ مارتا تو خود اس کے ہاتھوں مارا جاتا۔ اس کے باوجود مجھ پر غیر ارادی قتل کا کیس بن گیا۔ میں دس سال بعد جیل سے نکلا تو مجھے کچھ نہ سوجھتا تھا۔ کیا تم یقین کرو گے کہ میں نے ایک دکان پر منشی گیری بھی کی۔ ایم بی اے ہونے کے باوجود میں ایک آڑھتی کا حساب کتاب رکھتا رہا۔ پھر اس کا بھی دو لاکھ روپیہ لے کر بھاگ گیا۔ پنڈی میں ٹیکسی چلاتا رہا۔ ٹیکسی ایک حادثے میں تباہ ہو گئی۔ مری سے واپسی میں اس کے بریک فیل ہو گئے۔ دو مسافر مر گئے۔ میں بچ گیا۔ میری ایک ٹانگ مصنوعی ہے۔"

وہ سب بڑے دکھ سے اس کی ٹانگ کو دیکھتے رہے جو گھٹنوں کے اوپر تسموں سے بندھی ہوئی تھی۔

کمال نے آہستہ سے کہا۔ "دوستو! کیا تم نے اس شخص کو دیکھا ہے جو ہماری میز کے قریب بہت دیر سے بیٹھا ہے۔"

"بیٹھا ہے تو ہمیں کیا۔" خاور بولا۔

کمال نے سرگوشی میں کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ وہ ہماری گفتگو سن رہا ہے۔"

موقع ملنے پر ان سب نے باری باری سر گھما کے دیکھا لیکن اس طرح کہ شک نہ ہو۔ وہ نوجوان لڑکا تھا۔ اٹھارہ بیس سال کی عمر کا۔ اس کا رنگ بہت صاف تھا اور چہرے پر اگنے والی ڈاڑھی ابھی اصل حالت میں تھی۔ سفید شلوار قمیص کے ساتھ اس نے سر پر سفید پگڑی باندھ رکھی تھی جس کے نیچے سے اس کے لمبے بالوں کے پٹے نظر آ رہے تھے۔ وہ نہ جانے کن خیالوں میں مستغرق تھا اور خلا میں نہ جانے کیا دیکھ رہا تھا۔ ان سب نے کمال کے خیال سے اتفاق نہیں کیا کہ وہاں وہ ان کی باتیں سننے کے لیے بیٹھا تھا۔

"اب تم اپنی داستان غم کہو۔" حیدر بولا۔

کمال نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "ایک وہ چار یار غار تھے۔ ان پر اللہ کی رحمت۔ ایک ہم چار یار ہیں۔ ہم پر خدا کی لعنت۔ ہم نے ایک دوسرے کو تباہی کے غار کی

طرف دھکیلا۔"

"ہمیں الزام مت دے فلسفی کی اولاد۔ ہم نے تجھے مجبور نہیں کیا تھا۔ تو نے اپنی عقل پر بھروسا کرتے ہوئے اپنے راستے کا انتخاب کیا تھا۔"

"جب میں اِدھر سے اُدھر دھکے کھا رہا تھا تو میرے ذہن میں بہت سے پلان تھے۔ میں اس قدر ناشاس دنیا کی ایسی تیسی کر سکتا تھا لیکن اس کے لیے بھی مجھے ایک ٹھکانے کی ضرورت تھی۔ خالی ہاتھ آدمی کیا کر سکتا ہے۔ ایک دن میں اکیلا یہی سوچ رہا تھا کہ کیا اب کسی کو لوٹنے کے سوا میرے سامنے کوئی راستہ نہیں رہا کہ میرے جیسا ہی ایک نوجوان میرے ساتھ آ کے بیٹھ گیا۔ اس نے خود بات شروع کی۔ ہم دوست بن گئے اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔

اس کا گھر دیکھ کے میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ وہ کوٹھی ایک محل تھی۔ اندر دو شاندار گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان گاڑیوں کے لیے دو ڈرائیور تھے۔ دیگر نوکر چاکر اس کے علاوہ تھے۔ کوٹھی کے اندر کی آرائش میں روپیا پانی کی طرح بہایا گیا تھا۔ قالین، پردے، فانوس اور فرنیچر۔ ہر چیز امپورٹیڈ اور بہت اعلیٰ تھی۔

میرے پوچھنے پر وہ ہنسا۔ "بھائی! یہ میرا گھر ہوتا تو پھر رونا ہی کس بات کا تھا۔ یہ ایک سابق صنعتکار کی بیوہ ہیں۔ مجھے تم ان کا ویری پرائیویٹ سیکریٹری سمجھ لو۔ آج یہاں ایک میٹنگ ہے۔ اگر کسی نے تمہیں پسند کر لیا تو سمجھو تمہارے دن پھر گئے۔"

"لیکن مجھے کرنا کیا ہوگا؟"

"دیکھو، اپنی کمپیوٹر سائنس کی ڈگری کو بھول جاؤ۔ میں بھی فزکس میں ایم ایس سی ہوں لیکن نوکری نہیں ملی تو طوائف بن گیا۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "طوائف...؟"

اس نے کہا۔ "ہاں! طوائف۔ اگر تم بھی طوائف بننے کے لیے تیار ہو تو تمہیں تمہاری توقع سے زیادہ پیسا ملے گا۔"

میرا دماغ چکرا گیا۔ "یار کھل کے بات کرو۔"

"کھل کے ہی بات کر رہا ہوں۔ دیکھو جیسے اپنے حسن اور شباب سے دولت کمانے والی عورت طوائف ہوتی ہے۔ ایسے ہی مرد بھی ہوتے ہیں۔ تم ماشاء اللہ ہینڈسم اور جوان ہو، کسی کی داشتہ بن جاؤ۔ ابھی یہاں جو خواتین آئیں گی۔ وہ سب ایسی ہی ہیں۔ انتہائی دولت مند لیکن ٹھکرائی ہوئی۔ ناآسودہ۔ جن کو شوہروں نے چھوڑ دیا، گھر میں رکھ کے بھول گئے اور خود باہر عیش کرتے رہے، دوسری عورتوں کے ساتھ۔ یہ انتقامی ردعمل کا شکار عورتیں ہیں۔ کچھ موٹی اور بدشکل ہو گئی ہیں۔ کچھ زیادہ عمری ہیں۔ یہ اپنے شوہروں کی طرح ہوٹلوں کلبوں میں جا کے رنگ رلیاں نہیں مناتیں۔ انہوں نے سوشل ورک کے نام پر ایک تنظیم بنائی ہے۔ اس کے لیے لڑکے لڑکیاں ملازم رکھتی ہیں... لیکن درحقیقت یہ ایک سیکس کلب ہے اگر تم کسی کو پسند آ گئے تو سمجھو ایک ٹکٹ میں دو مزے۔ وہ تمہاری ایک ٹیم بنا دے گی۔ اس میں تمہارے ساتھ ایک لڑکی ہوگی۔ اس کے ساتھ مراسم بونس میں... لیکن جب تمہاری باس یا مالکن تمہیں طلب کرے گی تو تمہیں جانا پڑے گا اور اسے ہر طرح سے خوش کرنا پڑے گا۔ یہ ناپسندیدہ کام ہے اور مشکل بھی مگر اس کے بدلے میں جو کچھ تمہیں ملے گا..."

قصہ مختصر... مجھے ایک خاتون نے پسند کر لیا۔ میرے ساتھ ٹیم میں جو لڑکی تھی وہ بھی کوئی شریف زادی نہیں تھی۔ یہ کام خلاف ضمیر بھی تھا اور خطرناک بھی۔ مجھے شرم آتی تھی کہ آخر میں کیا کر رہا ہوں، اور کب تک کرتا رہوں گا۔ ایک سال میں مجھے تین مختلف خواتین نے خدمت کا موقع دیا۔ ایک نے دوسری کو پاس آن کیا۔ دوسری نے تیسری کو، بڑے اچھے ریمارکس کے ساتھ۔ لیکن میں نے بھی انہیں خوب لوٹا۔

ایک سال بعد ہم دونوں نے دس دس لاکھ سے اپنا بزنس سیٹ کیا۔ ہم انٹرنیٹ پر اپنا ٹیلی فون ایکس چینج چلاتے رہے اور لوگوں کو سستی انٹرنیشنل کال کراتے رہے پھر ہم نے کچھ لڑکیوں کی ایسی گفتگو بھی ریکارڈ کی جو ہماری آمدنی کا ذریعہ بنی۔ ہم نے شوبزنس کے نام پر لڑکیوں کے فوٹو سیشن کیے اور ان کو خوب بلیک میل کیا۔ صرف ایک اشتہار پر کہ عنقریب شروع ہونے والی ٹی وی سیریل کے لیے یا فلم کے لیے نئے چہروں کی ضرورت ہے۔ درجنوں لڑکیاں آ جاتی تھیں۔

بہت جلد میں اس سے بھی آگے گیا۔ میں نے اپنے پارٹنر سے کہا کہ یار ہمیں ہیکر بننا چاہیے۔ سائبر کرائم کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ امریکا میں لوگوں کے پاس ورڈ چرانے والے لاکھوں ڈالرز ادھر سے ادھر کر دیتے ہیں۔ کریڈٹ کارڈز سے آن لائن بینکنگ تک فراڈ کے ان گنت راستے ہیں۔ ہمیں یہ غیر اخلاقی جرائم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

اسے میری بات نے قائل کیا۔ ہم غیر قانونی طور پر امریکا پہنچ گئے۔ وہ تو جاتے ہی پکڑا گیا اور واپس بھیج دیا گیا۔ مجھے ایک انڈین نے رکھ لیا۔ اس نے مجھے قانون سے بھی بچایا لیکن میرا استحصال بھی کیا۔ دو سال بعد میں اس کے چنگل سے نکل گیا اور میں نے وہ سب کیا جس کے لیے میں امریکا گیا تھا۔ لیکن بالآخر میں پکڑا گیا۔ مجھے جیل ہو گئی

www.pdfbooksfree.pk

اور اپنی سزا پوری کرنے کے بعد مجھے ڈی پورٹ کر دیا گیا۔ یہاں مجھے ایف آئی اے نے دھر لیا۔ میں نے شادی نہیں کی۔ امریکا میں شادی کر کے دیسی آدمی پھنس جاتا ہے۔ وہ کاغذی شادی کرتی ہیں اور وہ خوب بلیک میل کرتی ہیں۔ حالانکہ بہت سے پاکستانیوں نے اسی طرح امریکی شہریت بھی حاصل کر لی مگر ساری بات نصیب کی ہے...''

''غلط... جھوٹ... خود فریبی... ساری بات نیت کی ہے۔'' ساتھ والی میز پر بیٹھا ہوا باریش نوجوان چلایا۔ پھر اس نے اپنی کرسی کو کھینچ کر ان چاروں کے درمیان کر لیا۔ ''تم سب بدنیتی، فریب کاری، دغابازی اور مردم آزاری میں ملوث رہے۔ تمہارے ساتھ یہی ہونا تھا۔''

''تو تم واقعی ہم سب کی گفتگو سن رہے تھے۔'' حیدر نے کہا۔ ''یہ ہمارا شک نہیں تھا۔''

''ہاں۔ میں نے سب سنا۔'' اس نے جوش سے اپنے لہجے میں کہا۔ ''جو ایک نے کہا۔ پھر دوسرے نے کہا۔''

''کسی کی نجی گفتگو سننا غیر اخلاقی بات ہے۔'' کامل بولا۔

''غیر اخلاقی؟'' اس نے میز پر مکا مارا۔ ''کس منہ سے تم یہ بات کرتے ہو۔ اخلاقیات کا تم جیسے پدکرداروں سے کیا رشتہ۔ انسانیت کا تم جیسے شیطانوں سے کیا تعلق۔''

خاور نے کہا۔ ''آخر تم ہو کون... خدائی فوجدار؟''

''میں ہوں تمہاری شامت اعمال... اللہ نے مجھے تمہارے اعمال کی سزا کے لیے بھیجا ہے۔ تم جو گناہ اور جرائم کرنے تھے... تم کر چکے۔ اب تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا ہے۔''

کامل ہنسا۔ ''کیا روز حساب آ گیا؟''

وہ پھر چلایا۔ ''ہاں، تمہارے لیے آ گیا... ہر شخص کے لیے آخرت کے علاوہ بھی اس دنیا میں مکافات عمل ہے۔''

حیدر نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ ''چلو بس بہت ہو گئی۔ آخر کیا کرو گے تم؟ پولیس کو رپورٹ کرو گے؟''

وقار بولا۔ ''پولیس کیا کرے گی... جو ہم نے کیا یا کہا اور تم نے سنا۔ اس کا گواہ کون ہے، ثبوت کہاں ہے؟''

اس شخص نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس لی۔ وہ سب خاموشی سے اس کی صورت دیکھتے رہے۔ غالباً وہ زیر لب کچھ پڑھ رہا تھا۔

بالآخر اس نے آنکھیں کھول کے پرسکون لہجے میں کہا۔ ''میں کون ہوں؟ یہی جاننا چاہتے تھے تم۔ تو میں ایک خودکش حملہ آور ہوں۔''

باقی سب لوگوں کی آنکھوں میں بے یقینی... دہشت، خوف اور حیرانی کے ملے جلے تاثرات نظر آنے لگے۔

''یہ سچ ہے... مجھے بھیجا گیا تھا۔ کسی اور ٹارگٹ کے لیے۔ اور یہاں میں وقت گزارنے کے لیے آیا تھا۔ اس بس کے گزرنے میں ابھی پون گھنٹا تھا۔ میرے ذہن میں کوئی شک یا شبہ نہیں تھا کہ اس بس میں سوار سب لوگوں کو مار دینا جہاد ہے، کارِ ثواب ہے۔ شہادت حاصل کر کے جنت میں جانے کا راستہ ہے۔''

ان سب کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ حیدر ایک دم اٹھا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' خودکش حملہ آور غرایا۔

حیدر بیٹھ گیا۔ ''کیا تم نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے؟'' کمال نے کہا۔ ''دیکھو! جب تم یہاں سے گزرنے والی بس کو اڑاؤ گے تو ہم سب بھی اڑ جائیں گے، ہمیں جانے دو۔''

''اس بس کو مجھے یہاں سے دو سو گز کے فاصلے پر اڑانا تھا۔ اگلے موڑ پر جہاں اس کی رفتار کم ہوتی ہے۔''

''آخر تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟'' حیدر نے پوچھا۔

''یہ حکم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں راہ راست پر ہوں اور حصول مقصد کے لیے ایسا ضروری ہے۔''

''بے گناہوں کا قتل؟''

''انہوں نے بھی ایسا ہی کیا تھا یا ان کے ساتھیوں نے۔ لیکن جب میں یہاں بیٹھ کے تمہاری باتیں سن رہا تھا تو میرے خیالات میں ایک تبدیلی آئی۔ میں نے موازنہ کیا، ان سے تمہارا۔ کون بڑا مجرم ہے، کون زیادہ خطرناک ہے۔ کس کا وجود زیادہ خرابی کا باعث ہے یا کس کے گناہ سنگین ہیں؟ تم اعتراف کر چکے تھے۔ میں نے سوچا کہ سزا کے زیادہ مستحق تم ہو۔ تم سب اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے، اس کے باوجود تم نے ایسے اخلاق جرائم کیے۔ میرے دماغ نے اور میرے دل نے متفقہ فیصلہ دیا۔ پہلے تمہی کو مرنا چاہیے۔''

وہ سب ایک دم اٹھ کر بھاگے۔ وہ دروازے تک بھی نہ پہنچے تھے کہ دھماکا ہوا۔ اس کی آواز دور دور تک سنی گئی لیکن خود ان کے کانوں نے کچھ نہیں سنا جو اپنی موت سے بھاگ رہے تھے۔

عین اس وقت شہر کی میونسپل کارپوریشن نے یہ قرارداد منظور کر لی کہ برگد چوک ختم کر دیا جائے کیونکہ اس سے ٹریفک میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ برگد کے درخت کو ہٹا کے اس کی جگہ چوراہے پر ایک ٹریفک سگنل نصب کر دیا جائے۔

www.pdfbooksfree.pk